دہشت ناک کہانیاں
ایم اے راحت
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

نمبر ایک چاندنی رات کا شکار

نمبر دو برف کے قیدی

نمبر تین بلیک بیگ

نمبر چار روح کا سفر

نمبر پانچ خون کی پیاسی

نمبر چھ خونی تجربہ

نمبر سات انتقام کا جنگل

نمبر سات وضع دار

نمبر آٹھ آخری بازی

نمبر نو گھاؤ

نمبر دس نقشِ دوام

نمبر گیارہ وحشت زادے

نمبر بارہ یادش بخیر

وقار عظیم

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

چاندنی رات کا شکار

وہ اپنے علاقے کا سب سے بہادر، دلیر، سفاک اور خونخوار انسان تھا۔ ان تمام خوبیوں کی بنا پر وہ اپنے علاقے میں شیطان کی طرح مشہور تھا اور ایک شیطان ہی سمجھا جاتا تھا۔ قتل و غارت کرتے وقت اُس کا پالا ایک عجیب و غریب سچویشن سے پڑ گیا

ایم اے راحت

ایک انسان کا ماجرا جو فطرتاً تو سانپ تھا لیکن جب انسان بنا تو اُس کا پالا سانپ سے پڑ گیا

کہتے ہیں شیطان کے ہاں ولی بھی پیدا ہو جاتا ہے اور ولی کے ہاں شیطان بھی۔ یہ مثال مکمل حقیقت رکھتی ہے اور اکثر اس کی عملی شکلیں نمودار ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی ہی ایک مثال شیر زاد خان کی تھی۔ شیر زاد خان، زور آور خان کا بیٹا تھا۔ زور آور خان جیسا نیک انسان دور دور کے علاقے میں نہیں تھا لوگ اس کی شریف النفسی کی قسمیں کھاتے تھے۔ اس علاقے کا سب سے بڑا زمیندار تھا لیکن پھلدار شجر کی طرح جھکا ہوا، ہر ایک کے کام آنے والا، ضرورت منداس کے پاس سے کبھی ناکام نہیں لوٹتے تھے۔ ہر طرف سے اس کے لئے دعائیں ہوتی تھیں۔

لیکن خدا نے اسے شیر زاد جیسا بیٹا دے کر نہ جانے کس گناہ کی سزا دی تھی۔ شیر زاد ولی کے گھر کا شیطان تھا۔ ہاتھی کی طرح طاقتور اور لحیم شحیم، بھیڑیے کی طرح خونخوار اور درندہ صفت، رحم نام کے کسی جذبے کا اس کے دل میں گزر نہیں تھا۔ نوجوانی کی عمر میں قدم رکھ چکا تھا لیکن اس کا لڑکپن ہی کیا کم قیامت تھا جو خدا نے اسے جوانی بھی دید،

بچپن ہی سے اس کے مشغلے اس کی خونی فطرت کی رہنمائی کرتے تھے۔ درختوں پر سپاٹے بھرنے والی گلہریوں کو انتہائی پھرتی سے پکڑ کر وہ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیتا اور ان کے تڑپنے کا تماشہ دیکھ کر خوشی سے قہقہے لگاتا۔ زور آور خان اس کے ان مشغلوں سے بہت فکر مند تھا، لیکن شیر زاد اکلوتی اولاد تھا اور زور آور خان اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس لئے ہول کھانے کے باوجود وہ بیٹے کو مکمل طور پر سے سرزنش نہ کر سکا اور خونی بیٹا اپنے خونی مشغلوں میں اضافہ کرتا رہا۔

پھر بارہ سال کی عمر میں اس نے پہلا قتل کیا۔ زرداد خان کا بیٹا شمشیر اس کا پہلا شکار تھا۔ شمشیر کی عمر دس سال تھی اور اکثر وہ شیر زاد کے ساتھ جھیل پر کھیلنے جاتا تھا۔ اس دن دونوں بچے جھیل میں مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ شیر زاد کوشش کے باوجود ایک بھی مچھلی نہ پکڑ سکا جب کہ شمشیر کے کانٹے میں لگنے والی یہ تیسری مچھلی تھی۔ شیر زاد کو غصہ آ گیا پہلے تو اس کا دل چاہا کہ جھیل میں آگ لگا دے لیکن یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی اس لئے نزلہ شمشیر پر گرا۔

"تم چالاکی سے میرے کانٹے میں پھنسنے والی مچھلیوں کو اپنی طرف بلا لیتے ہو!" اس نے غراتے ہوئے شمشیر سے کہا۔

"بکواس مت کرو۔ یہ تینوں مچھلیاں میری ہیں!"

شیر زاد نے اس کی مچھلیاں اپنے قبضے میں کر لیں اور پھر شمشیر کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"تو جھیل کے دوسرے کنارے پر بیٹھ، پھر دیکھتا ہوں کہ تیرے کانٹے میں مچھلی کیسے لگے گی؟"

"لیکن میں یہ مچھلیاں تمہیں نہیں دوں گا!" شمشیر بھی بپھر گیا اور شیر زاد نے اپنا چھوٹا سا شکاری چاقو نکال لیا۔

"یہ میری ہیں۔ انہیں کون لے سکتا ہے؟" شمشیر نے شیر زاد کے شکاری چاقو سے خوفزدہ ہوئے بغیر کہا۔

لیکن شیرزاد کی خونی فطرت عود کر آئی تھی، اب وہ مچھلیوں کے لئے نہیں بلکہ اپنی فطرت کی تکمیل کے لئے شمشیر کا دشمن ہو رہا تھا۔ جھیل کے کنارے پر پرواز کرنے والے پرندے شمشیر کی دلدوز چیخیں سن کر خوفزدہ ہو گئے۔ شیرزاد چاقو کے ایک وار سے مطمئن نہیں ہوا بلکہ اس نے پے در پے چھ وار کر کے شمشیر کو ہلاک کر دیا۔

اور جب بستی میں شمشیر کی جھیل کے کنارے پڑی ہوئی لاش کے بارے میں اطلاع پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ اس پرسکون بستی کے لوگ جیالے تھے، خوددار تھے لیکن باہمی محبت اور امن اور سکون سے رہتے تھے۔ اس بہیمانہ قتل سے بستی کے ہر فرد کو دکھ ہوا...... اور پھر قاتل کی تلاش میں دشواری نہ ہوئی۔ بستی کا ایک ایک فرد شیرزاد کا نام سن کر ساکت رہ گیا تھا۔

زور آور خان کے احسانات سے سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں کوئی کچھ نہ بول سکا لیکن زور آور خان نے شیرزاد کو رسیوں سے باندھ کر خود جرگہ کے سامنے پیش کر دیا تو بستی کے دل میں احترام اور بڑھ گیا۔

''تمہیں علم ہے زور آور خان، خون کا بدلہ خون ہوتا ہے؟''

''مجھے معلوم ہے اور میں اس قانون کا احترام اپنا فرض سمجھتا ہوں!'' زور آور خان نے لرزتی ہوئی لیکن پرعزم آواز میں کہا۔

جرگے کا سردار اس انسانیت کے پیکر کے ایثار کو فراموش نہ کر سکا۔ سب جانتے تھے کہ شیرزاد، زور آور خان کا اکلوتا فرزند ہے سب کو علم تھا کہ وہ اس کی دولت کا تنہا مالک ہے اور یہ بات بھی سب جانتے ہیں زور آوران نے اس کی پیدائش کے لئے کیسی کیسی منتیں مانی تھیں تب کہیں جا کر شیرزاد کا منہ دیکھ سکا تھا اور سب ہی کو معلوم تھا کہ زور آور خان بیٹے کی موت کا غم برداشت نہ کر سکے گا۔

لیکن قانون، قانون تھا۔ جرگہ کا سردار بھی شمشیر کے باپ کی اجازت کے بغیر شیرزاد کو معاف نہیں کر سکتا تھا۔ زرداد خان بیٹے کے غم میں پاگل ہو رہا تھا لیکن پاگل پن کے عالم میں بھی وہ زور آور خان کے اس احسان کو فراموش نہ کر سکا جو اس نے کسی کو کانوں کان خبر کئے بغیر کیا تھا۔ چنانچہ اس نے لرزتی ہوئی آواز سے شیرزاد کو معاف کرنے کا اعلان کیا۔ اس نے کہا۔

''میرا چراغ گل ہو چکا ہے۔ خدا شیرزاد کو انسان بننے کی توفیق دے۔ میں زور آور کے گھر کی روشنی نہیں چھینوں گا۔ میں نے شیرزاد کو معاف کیا، خدا بھی اسے معاف کرے۔''

اور جرگے میں غلغلہ بلند ہو گیا۔ زور آور خان نے زرداد خان کے پاؤں پکڑ لئے اور پھر اس نے زرداد خان کو اتنی دولت دی کہ ساری عمر اطمینان سے زندگی بسر کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بیٹے پر پابندیاں لگا دیں! شیرزاد باپ کی قید میں زخمی چیتے کی طرح تلملانے لگا لیکن ابھی بے بسی کی عمر تھی۔ وہ کچھ نہ کر سکتا تھا البتہ باپ کی طرف سے اس کے دل میں نفرت پیدا ہو گئی۔

یہ پابندی چھ ماہ تک جاری رہی اس دوران زور آور خان بیٹے کو نصیحتیں بھی کرتا رہا اور اس کے انسان بننے کے لئے دعا بھی۔ پھر چھ ماہ کی قید کے بعد شیرزاد پر سے پابندی کچھ نرم کر دی گئی۔ شیرزاد چالاک تھا اس نے ظاہر کیا کہ وہ اب شریف بن گیا ہے۔ لیکن درپردہ اس کی درندگی جاری رہی۔ شمشیر کو قتل کرنے میں اسے بے پناہ لذت ملی تھی اور قید کے دوران بھی وہ اس لذت کو فراموش نہ کر سکا۔ اس کا دل بے اختیار چاہتا تھا کہ وہ کسی اور کو قتل کر دے۔

لیکن فی الحال یہ ممکن نہیں تھا البتہ جب اس کی عمر اٹھارہ سال ہوئی تو ایک شام اسے زور آور خان کا پستول چرانے کا موقع مل گیا اس نے زور آور خان کا پستول غائب کر دیا اور اس وقت تک اسے چھپائے رکھا جب تک اس کی تلاش ترک نہ کر دی گئی۔ اب وہ ایک پستول کا مالک تھا اور پھر ایک شام وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں عام راستہ گزرتا تھا، اس راستے پر قافلے سفر کرتے تھے اور مختلف قبیلوں کے لوگ یہاں سے گزرتے تھے!

وہ تین بدنصیب انسان تھے جو بڑی بستی سے روزمرہ کے استعمال کا سامان لے کر اپنی بستی جا رہے تھے۔ ان کے خچر سست رفتاری سے سفر کر رہے تھے اور وہ بار بار انہیں تھپکیاں رسید کر رہے تھے تاکہ رات ہونے سے قبل گھر پہنچ جائیں۔ اچانک پستول کا دھماکہ ہوا اور ان میں سے ایک کی پیشانی میں سوراخ ہو گیا۔

دوسرے دونوں انسان گھبرا گئے لیکن وہ نہ تو فرار ہو سکے اور نہ مدافعت کے لئے کچھ کر سکے۔ شیرزاد کے پستول سے نکلی ہوئی دو اور گولیاں انہیں چاٹ گئیں اور ان کے خچر گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

پھر ایک اور قبیلے کے لوگوں نے اسی راستے سے گزرتے

ہوئے ان تینوں لاشوں کو دیکھا اور اس کی اطلاع بہت جلد اس قبیلے تک پہنچ گئی جس کے وہ تینوں آدمی تھے جس علاقے میں ان تین افراد کو قتل کیا گیا تھا وہ زور آور خان کا تھا۔ چنانچہ مرنے والے افراد کے قبیلے کا ایک وفد غیض وغضب میں ڈوبا ہوا زور آور کے قبیلے میں آیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ ان تینوں افراد کے قاتلوں کو ان کے حوالے کیا جائے، ان کا خون بہا دیا جائے ورنہ دوسری صورت میں جنگ کے لئے تیار رہا جائے۔

قبیلے کے ایک ایک فرد سے پوچھ گچھ کی گئی لیکن سب نے ان تین افراد کے قتل سے لاعلمی ظاہر کی۔ وفد کے افراد اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ قتل اس قبیلے کے لوگوں نے نہیں کیا۔ زور آور کے قبیلے کے سردار نے کہا کہ قاتلوں کے بارے میں اسے کوئی علم نہیں ہے اگر پتہ چل سکا تو اس قبیلے کے جرگے کو اطلاع دے دی جائے گی۔ دماغ ٹھنڈے رکھنے کی کوشش کی جائے ورنہ خونریزی ہوگی جسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا! لیکن بپھرے ہوئے وفد نے اس مصالحانہ رویے کو بھی مکاری سمجھا اور دھمکیاں دیتا ہوا واپس چلا گیا اور پھر قبیلے کی فضا میں پورے تیس سال کے بعد جنگ کے بادل منڈلانے لگے! از ور آور کے قبیلے کے لوگ صلح پسند اور امن کے حامی ضرور تھے، لیکن بزدل نہ تھے اور دنیا جانتی ہے کہ ٹھنڈے دماغ کے لوگ جب جنگ کرتے ہیں تو گرم دماغ والے ان کے سامنے نہیں رک سکتے!

اس قبیلے نے پورے تیس سال کے بعد جنگ کے لئے ہتھیار اٹھائے اور دوسرے قبیلے کے حملہ آور ہونے کا انتظار کرنے لگے اور پھر فروری کی ایک رات میں دوسرے قبیلے نے زور آور کے قبیلے پر حملہ کر دیا ان کا خیال تھا کہ زور آور قبیلے کے لوگ غافل ہوں گے۔ لیکن یہ خیال باطل ہو گیا۔ چنانوں نے آگ اگلنا شروع کر دی اور حملہ آور قبیلے کے لوگوں کو جان بچانا مشکل ہو گیا۔ ان کی پیش قدمی رک گئی اور وہ پوزیشن لے کر جنگ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن وہ بھی کمزور قبیلہ نہیں تھا۔ اس کے حامیوں نے اس کی مدد کی اور پورے تیرہ دن تک جنگ جاری رہی۔

زور آور کا قبیلہ محفوظ جگہوں کی وجہ سے اب بھی ان پر بھاری پڑ رہا تھا، کوئی بھی فرد جنگ پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن اب قبیلے کی آن کا سوال تھا۔ چنانچہ ہر فرد کو بہادری دکھانے کا موقع دیا گیا!

اور جب خونریزی کا موقع ملا تو شیر زاد کیوں پیچھے رہتا اس نے درخواست کی کہ اسے اپنے طور پر کام کرنے کی اجازت دی جائے اور اسے اجازت مل گئی۔ تب شیر زاد نے قبیلے کے چنے ہوئے جیالوں کو اکٹھا کیا یہ سب اس کی طرح کے نوجوان تھے اور اب اپنے دشمنوں کے خون کے پیاسے تھے اور جب انہیں شیر زاد جیسا بے جگر اور سنگدل رہنما ملا تو وہ جو کچھ نہ کر دیتے، کم تھا!

سات دن تک حملہ آور قبیلے نے برابر کی جنگ لڑی تھی۔ اس کا جس قدر نقصان ہو رہا تھا اتنا ہی نقصان دوسرے قبیلے کا ہو رہا تھا، لیکن بعد کے چھ دن حملہ آور قبیلے کے لئے مصیبتوں کے دن تھے۔ شیر زاد نے ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ وہ ہتھیار پھینکنے والوں کو بھی نہیں چھوڑ رہا تھا اس کا کام صرف قتل کرنا تھا اور حملہ آوروں کے قدم اکھڑ گئے۔ انہیں شیر زاد کی وجہ سے بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا اور وہ بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ فرار ہو گئے!

نکتہ بہ نکتہ

- ☆ آدمی غصے میں چھتے سے باہر ہو جاتا ہے۔
- ☆ اب ٹیپ کا بند نہیں' ٹیپ (Tape) کا بند چلے گا۔
- ☆ غربت وہ وائرس ہے جو ناقابلِ علاج بیماریاں پیدا کرتا ہے۔
- ☆ دنیا میں دو سپر طاقتیں ہوں گی یا ایک بھی نہیں ہوگی۔ یہ فطرت کا اصول ہے۔
- ☆ انسانی معاشرے کے سب سے خوب صورت اور خوش حال شہری' بچے۔
- ☆ تجسس ترقی کی بنیاد ہے اسی لیے بچے 'کیوں' کا لفظ سب سے زیادہ بولتے ہیں۔
- ☆ محبت کی شادی میں ہنی مون پہلے منا جاتا ہے۔
- ☆ لباس، جنگل کی چار دیواری۔
- ☆ لہجہ لفظوں سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔
- ☆ علم کی کمی کا احساس بھی علم سے پیدا ہوتا ہے۔
- ☆ ہونے کی کیا اہمیت، اگر آپ نظر نہیں آ رہے۔
- ☆ یہ کیا اچھا کیچ ہوتا، اگر پکڑ لیا جاتا۔
- ☆ میں دولت کا مذاق اُڑانے کے لیے تیار ہوں، ایک بار میرے پاس آئے تو۔

زور آور کے قبیلے نے شاندار جشن فتح منایا۔ اس جشن میں شیرزاد کو خراج تحسین پیش کیا گیا لیکن شیرزاد اپنی ٹولی کے ساتھ غائب تھا نہ جانے وہ کس گھات میں نکل گیا تھا! اس جشن میں جرگے کے سردار نے فیصلہ کیا کہ اس جنگ میں دشمن کو شکست دینے کے باوجود اس سے انتقام نہیں لیا جائے گا اور اسے خلوص دل سے معاف کر دیا جائے گا۔ اس سے کہا جائے گا کہ ان تین افراد کے قاتل کو جس وقت بھی گرفتار کیا گیا اس قبیلے کو بھیج دیا جائے گا! آئندہ امن کی راہیں ہموار کی جائیں گی۔

زور آور کے قبیلے نے یہ پیغام دوسرے قبیلے کو بھجوا دیا اور قبیلے کے شکست خوردہ افراد نے جو انتقام کے خوف سے اپنی بستیاں چھوڑ کر پہاڑوں میں روپوش ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے، اس پیغام کو سن کر فاتح قبیلے کے ممنون ہو گئے۔ انہوں نے فرار کی تیاریاں بند کر دیں! لیکن اسی وقت شیرزاد کی خونی ٹولی ان پر جا پڑی۔ اس نے ایسی تباہی مچائی کہ زمین آسمان کانپ اٹھے۔ اس نے قبیلے کا تمام ساز و سامان لوٹ لیا۔ اس کے بچے، بوڑھے، مرد اور عورتوں کو قتل کر دیا لوٹ کے مال میں چند حسین اور نوجوان لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ شیرزاد اپنے درندہ صفت ساتھیوں کے ساتھ لوٹ کا مال لے کر چل پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے قبیلے کے لوگ اس کے اس کارنامے پر بہت خوش ہوں گے۔ لیکن اسے اپنے باپ کا بھی خیال تھا۔ زور آور خان کم از کم اس کے ساتھ لڑکیوں کی موجودگی پسند نہیں کرے گا! چنانچہ وہ رات انہوں نے پہاڑوں میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

اور اس رات شیرزاد پہلی بار عورت کی لذت سے آشنا ہوا۔

ابھی تک اس کی فطرت صرف خونریزی کی طرف مائل تھی۔ لیکن اس رات اسے معلوم ہوا کہ مرد کی زندگی عورت کے بغیر بے مزہ ہے! وحشت و بربریت کی اس تاریک رات میں نوخیز اور جوان دوشیزاؤں کی دلدوز چیخیں چٹانوں کا کلیجہ شق کرتی رہیں اور شیرزاد کے وحشی ساتھیوں کے قہقہے ان چیخوں کا مذاق اڑاتے رہے۔

گلرنگ دوشیزاؤں کے مرمریں جسم خون میں ڈوب گئے اور اس رات کی صبح بے حد وحشت انگیز تھی۔ لٹی ہوئی عصمتیں چٹانوں پر برہنہ پڑی تھیں، ان کے جسموں پر زخم تھے، آنکھوں میں آنسو اور خاموش! سنگدل شیرزاد نے ان جاندار لاشوں کو دیکھا اور فیصلہ کیا کہ انہیں قبیلے میں لے جانا خطرناک ہے۔ چنانچہ اس نے ساتھیوں کو ان زندہ لاشوں پر نشانہ بازی کی دعوت دی اور ظلم کے رسیا تیار ہو گئے!

نیم مردہ لڑکیوں کو ٹھوکر مار کر اٹھایا اور انہیں بھاگنے کا حکم دیا گیا۔ زندگی سے کسے پیار نہیں ہوتا، نیم مردہ جسم کو لئے اپنی برہنگی کو بھولے ہوئے وہ فرار ہو کر ان بھیڑیوں کے چنگل سے نکل جانے کی کوشش کرنے لگیں اور بھاگتی ہوئی لڑکیوں کے جسموں کو گولی کا نشانہ بنانے کا کھیل شیرزاد اور اس کے ساتھیوں کو بہت ہی دلچسپ محسوس ہوا۔

فائرنگ کی آوازیں گونجتی رہیں اور چٹانیں ان کمزور اور مظلوم لڑکیوں کے خون سے غسل کرتی رہیں تھوڑی دیر کے بعد بہت سی چٹانیں خون سے سرخ ہو گئیں اور ان کے دامن میں آرزوؤں کی کہانیاں بے گور و کفن پڑی تھیں۔

اس دلچسپ کھیل سے فارغ ہو کر شیرزاد لوٹا ہوا مال لئے گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنے قبیلے کی طرف چل پڑا اور تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا گردن فخر سے بلند کئے قبیلے میں داخل ہوا اور اس کے منتظر لوگ اس کے استقبال کے لئے دوڑ پڑے۔

انہوں نے شیرزاد کا پرجوش استقبال کیا کیونکہ وہی اس جنگ کا ہیرو تھا۔ پرجوش استقبال کرنے والوں میں زور آور خان بھی تھا۔

لیکن جب شیرزاد نے لوٹا ہوا مال جرگے کے سردار کے سامنے پیش کیا اور اپنی بہادری کی داستان سنائی تو سردار غم خوف سے چیخ پڑا۔

''کس کی اجازت سے تم نے یہ خونریزی کی؟ کس کی اجازت سے تم نے لوٹ مار کی؟''

''یہ فاتح قبیلوں کا حق ہے سردار!'' شیرزاد نے کہا۔

''لیکن سردار کی اجازت سے۔ افسوس ہم نے انہیں کیا پیغام دیا اور تم نے کیا کیا؟ اب پہاڑوں میں بسنے والے قبیلے ہمیں بددیانت اور جھوٹوں کے نام سے پکاریں گے، کوئی ہمارے قول پر اعتماد نہیں کرے گا!''

''مجھے اس پیغام کا کوئی علم نہیں تھا سردار......!'' شیرزاد نے مکاری سے کہا۔

''صرف یہی بات سزا سے بچاتی ہے ورنہ تم سزا کے مستحق تھے۔'' سردار نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا اور شیرزاد غصے سے تلملاتا ہوا واپس آ گیا۔ اس کے خیال میں یہ اس کی حق تلفی تھی۔ اسے اس کی محنت کا پھل نہیں دیا گیا تھا۔

سردار نے پھر جرگے کو طلب کیا اور اس بات پر غور ہونے لگا کہ اب کیا کیا جائے......؟ کھویا ہوا اعتماد کیسے بحال کیا جائے۔ ابھی اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہونے پایا تھا کہ پامال شدہ قبیلے کے چھ افراد زخموں سے چور فریاد لے کر سردار کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے گھوڑوں پر مرمریں لاشیں لدی ہوئی تھیں۔ ان مظلوم اور بے گناہ لڑکیوں کی لاشیں جن کی عصمت دری کر کے انہیں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا تھا!

بستی سے جس جس فرد نے ان لاشوں کو دیکھا غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ فریاد لے کر آنے والوں نے جرگے کے سردار کو بتایا کہ ان کے ساتھ ظلم ہوا ہے اور ظلم کرنے والا کون ہے!

خدا کی قسم اس جرم کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ مجرموں کو سرِ راہ سنگسار کیا جائے گا انہیں ایسی عبرتناک سزا دی جائے گی کہ یہ حرکت کرنے والوں کے دل حرکت کرنا بھول جائیں گے!" سردار نے جوشِ غضب سے کہا۔

"لیکن ظالم اس قبیلے کے سب سے بااثر شخص زور آور خان کا بیٹا ہے۔" کسی نے سردار کو یاد دلایا۔

اگر زور آور نے بیٹے کی حمایت کی تو اسے بھی بیٹے کے جرم کا برابر کا شریک قرار دیا جائے گا اور اس کی سزا بھی وہی ہو گی جو اس کے بیٹے کی!" غصے سے لرزتے ہوئے سردار نے کہا اور پھر نرم لہجے میں بولا۔

"حالانکہ ہم زور آور پر شک کر کے گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں وہ جیسا انسان ہے، سب جانتے ہیں۔"

پھر خفیہ طور پر ان تمام افراد کے گھروں کی ناکہ بندی کرا دی گئی جو شیر زاد کے ساتھ شریک تھے اور سردار نے زور آور خان کو طلب کر لیا۔

زور آور خان جس وقت جرگے کی پتھریلی عمارت میں داخل ہوا تو تمام نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ سامنے ہی بانوں سے بنی ہوئی چار پائیوں پر مظلوم لڑکیوں کی لاشیں چادروں سے ڈھکی ہوئی رکھی تھیں۔ زور آور خان نے حیرت سے ان لاشوں کی طرف دیکھا اور پھر چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگوں کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا! پھر اس نے سردار سے سوال کیا۔

"مجھے کیوں طلب کیا گیا ہے سردار......"

"ایک اہم فیصلے کے لئے زور آور خان......!" سردار کی پاٹ دار آواز گونجی۔

"میں منتظر ہوں......" زور آور خان نے کہا......اور سردار نے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے ڈھکی ہوئی لاشوں پر سے کپڑے کھینچ لئے اور ان برہنہ کلیوں کو دیکھ کر زور آور خان کی آنکھیں جھک گئیں اس نے خوف سے جھرجھری لی۔

"یہ کیا ہے سردار...... خدا کے واسطے مجھے جلد ان کی مظلومیت کی داستان سنا دیں میرے صبر کا امتحان نہ لیں۔"

"فیصلہ یہ کرنا ہے زور آور خان کہ ان مظلوم لڑکیوں کی عصمت دری کر کے انہیں ہلاک کرنے والوں کے ساتھ کیا کیا جائے؟" سردار نے زور آور خان کے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔

"سلوک؟ ان ننگ انسانیت لوگوں کے جسم ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ ان کے خاندان کے ایک ایک فرد کو زندہ جلا دیا جائے تاکہ سانپوں کی نسل آگے نہ بڑھ سکے۔"

"ہمیں تم سے اسی جواب کی توقع تھی زور آور خان، لیکن اس میں تمہارے ضمیر کا امتحان بھی ہے، ٹھنڈے دل سے غور کر کے جواب دو کہ اگر ان لوگوں میں تمہارا بیٹا بھی شامل ہو، تو تم کیا کرو گے؟"

زور آور خان کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس کا پورا جسم لرزنے لگا اور اس نے غصے سے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اگر میرے بارہ بیٹے ہوتے اور اس ظلم میں شریک ہوتے تو میں ان میں سے ایک ایک کو سنگسار کرتا۔ پھر اس عورت کو کتیا کی موت مار دیتا جس نے ان بیٹوں کو جنم دیا ہوتا اور پھر خود علاقے کی سب سے بلند پہاڑی سے کود کر خودکشی کر لیتا کیونکہ وہ میرے بیٹے تھے۔"

زور آور خان کے پرجلال چہرے اور اس کے سخت الفاظ کو سن کر سب دہشت زدہ ہو گئے سردار بھی چند منٹ تک کچھ نہ بول سکا پھر اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"آفرین ہے زور آور خان لیکن اولاد اگر غلط نکل جائے تو ماں باپ قصوروار نہیں ہوتے۔ ہاں اس اولاد کی طرف داری ضرور ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگو زور آور خان اور اس المناک انکشاف پر ہمیں بھی اپنے برابر کا شریک غم سمجھو کہ ان لڑکیوں کی عصمت دری کر کے انہیں گولیوں کا نشانہ بنانے والوں کا سردار تمہارا بیٹا شیر زاد ہے اس

نے شکست خوردہ قبیلے کو لوٹا وہاں درندگی کی ایسی مثال قائم کی کہ رہتی دنیا تک ہم اس داغ کو اپنی پیشانی سے نہیں مٹا سکتے وہ قبیلے کی نوجوان لڑکیوں کو اٹھا لایا پھر اس نے اور اس کے ساتھیوں نے ان کلیوں کو مسل دیا اور ان کے پاک جسموں سے اپنی ناپاک خواہشات کی تکمیل کے بعد انہیں مشق ستم بنایا۔ یہ مظلوم لوگ فریاد لائے ہیں۔ ان کی دادرسی کرنی ہوگی زورآور خان۔ ہماری خواہش ہے کہ شیرزاد اور ان تمام لوگوں کو کل صبح ان فریادیوں کے سامنے سنگسار کیا جائے اور اس کام میں یہ خود شریک ہوں۔''

زورآور خان کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ اس کی آنکھوں سے اس کے تاثرات کا اندازہ لگانا مشکل تھا سردار اور دوسرے لوگ اس کے جواب کے منتظر تھے لیکن جب زورآور خان کئی منٹ تک خاموش رہا تو سردار نے کہا۔

''کیا تمہیں ہمارے اس فیصلے پر اعتراض ہے زورآور خان؟''

''نہیں'' زورآور خان نے انتہائی پرسکون لہجے میں کہا پھر بولا۔

''ظالم، بے حد چالاک ہے، سرداراس سے قبل کہ اس فیصلے کی اطلاع اسے پہنچے اور وہ فرار ہونے کی کوشش کرے، اسے گرفتار کر لیا جائے۔''

''مرحبا زورآور خان ہمیں صرف تمہارے فیصلے کا انتظار تھا ان سب لوگوں کے گھروں کی ناکہ بندی کر دی گئی۔ ابھی تھوڑی دیر کے اندر انہیں گرفتار کر کے تاریک خانقاہ میں قید کر دیا جائے گا۔'' سردار نے کہا اور پھر اس نے مجرموں کی گرفتاری کے احکامات صادر کر دیئے۔

شیرزاد کی غمزدہ ماں بے چینی سے زورآور کی منتظر تھی۔ بیٹے کی گرفتاری نے اسے شدید حیران کر دیا تھا۔ کل تک تو پورے قبیلے کی عورتیں اسے شیرزاد جیسے جیالے کو جنم دینے پر مبارک باد دینے آتی رہی تھیں اور شیرزاد کی ماں کی گردن فخر سے بلند ہوگئی تھی۔ اس نے زورآور خان کو شرمندہ کیا تھا کہ جس بیٹے کو وہ دن رات برا بھلا کہتا تھا، جس بیٹے کا مستقبل اسے بھیانک نظر آتا تھا اسی نے آج قبیلے کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے اور زورآور شرمندہ انداز میں مسکرانے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکا تھا۔ لیکن آج اسی بیٹے کو اس بے دردی سے کھینچ کر لے جایا گیا تھا، آخر کیوں؟

زورآور خان جیسے ہی گھر میں داخل ہوا، وہ بپھرے ہوئے انداز میں کھڑی ہوگئی۔

''کیوں گرفتار کیا گیا ہے میرے بیٹے کو؟ کیا جرم کیا ہے اس نے یہی نا کہ قبیلے کی عزت بچا لی ہے اور دشمنوں کو عبرت ناک شکست دے کر قبیلے کا سر اونچا کیا ہے۔ میں کہتی ہوں یہ انصاف ہے؟ کس کے حکم سے میرے شیر دل شیرزاد کو گرفتار کیا گیا ہے؟''

''انصاف چاہتی ہو تاجور؟'' زورآور خان نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''ہاں میں انصاف چاہتی ہوں۔ میں ان سازشیوں کی سزا کی طلب گار ہوں جنہوں نے میرے بیٹے کے خلاف سازش کر کے گرفتار کر لیا ہے۔ آخر کیا جرم کیا ہے میرے بیٹے نے؟''

''انصاف کیا جائے گا تاجور، پورا پورا انصاف کیا جائے گا۔ کل صبح تمہارے شیرزاد کو سنگسار کر دیا جائے گا۔ یہ جرگے کے سردار کا فیصلہ ہے لیکن ایک فیصلہ اور ہے جو میں نے کیا ہے۔''

زورآور خان نے بدستور پرسکون لہجے میں کہا۔

''سنگسار کر دیا جائے گا؟ میرے بیٹے کو؟'' شیرزاد کی ماں نے حیرت اور خوف کے ملے جلے انداز میں پوچھا، لیکن زورآور خان نے کوئی جواب نہیں دیا وہ خاموشی سے اندر چلا گیا اور پھر اس نے دیوار سے لٹکی ہوئی بندوق اتار لی۔ پھونک مار کر اس کی نال صاف کی، اس کا نشانہ دیکھا اور پھر دو کارتوس نکال کر اس کے چیمبر میں لگائے۔ بندوق ہاتھ میں لئے وہ باہر نکل آیا۔ تاجور اسی طرح سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔ زورآور خان کے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر بھی اس کے چہرے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

''ہاں تمہارے بیٹے کو سنگسار کیا جائے گا تاجور ایک ایسے جرم کی پاداش میں جس کے لئے یہ سزا ناکافی ہے۔ کاش اس کے لئے کوئی اس سے بڑی سزا تجویز ہوتی۔''

''اس نے کیا جرم کیا ہے؟'' تاجور نے غضب ناک شیرنی کی طرح پوچھا۔

''شکست خوردہ قبیلے کی چودہ لڑکیوں کو اغواء کرنے کا جرم، پہاڑوں میں لے جا کر ان کی عصمت دری کرنے کا جرم اور پھر ان کے پامال جسموں کو گولیوں کا نشانہ بنانے کا جرم...... صرف یہی جرم کئے ہیں اس نے۔ کیا تمہارے خیال میں اس کی سنگساری کے لئے یہ جرائم کافی نہیں ہیں؟''

''نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا، شیرزاد ایسا نہیں کر سکتا؟''

''اس نے کیا ہے تاجور، اس نے یہی کیا ہے، جرگے نے اسے سنگسار کرنے کی سزا دی ہے، لیکن میرے نزدیک یہ سزا کافی نہیں ہے تاجور، جرگے کے سردار نے انصاف سے کام نہیں لیا شیرزاد کو اس سے بڑی سزا ملنی چاہیے تھی۔ میں نے اپنے ضمیر کے مشورے سے شیرزاد کے لئے ایک سزا تجویز کی ہے۔ جسے سردار نے منظور نہیں کیا لیکن میرے خیال میں سزا کسی حد تک مناسب تھی شیرزاد کو وہی سزا ملنی چاہیے میں اپنے ضمیر کی آواز کو دبا نہیں سکتا ہوں۔ میں شیرزاد کو وہی سزا دینا چاہتا ہوں جو سردار نے منظور نہیں کی۔ میں نے سردار سے کہا تھا کہ اس جرم کے مجرم کو سنگسار کیا جائے اور اس کے اہل خاندان کو زندہ جلا دیا جائے تاکہ اس مجرم کی نسلیں تک تباہ ہو جائیں اور پھر اس کی نسل کا کوئی نوجوان اتنا سنگدل پیدا نہ ہو میں اب بھی اس فیصلے پر قائم ہوں۔ ہمارے خاندان کا چراغ شیرزاد تھا۔ شکر کرو تاجور آج تمہیں صرف ایک بیٹے کا غم ہے، خدا کی قسم اگر میرے بارہ بیٹے ہوتے تو ان میں سے ہر بیٹے کو یہی سزا دیتا تاکہ اس ناپاک خون کے جراثیم اس کی پشت کی کسی نسل کے فرد میں سرایت کر کے اس بہیمت کا دوبارہ مظاہرہ نہ کر پائیں۔ ہمارے جسم ناپاک ہیں تاجور، ہمارے جسم میں مس ہو کر چلنے والی ہوائیں جراثیم پھیلا سکتی ہیں مجھے اپنے خون کی گندگی کا شدید غم ہے جب میرے جسم سے شیرزاد کا ناپاک نطفہ تمہارے جسم میں منتقل ہوا تھا، کاش اس وقت کوئی سانپ مجھے ڈس لیتا، کاش اس وقت طوفان آ جاتا اور ہم دونوں چٹان کے نیچے دب کر مر جاتے، کاش ہماری زندگی میں وہ رات نہ آتی۔'' زورآور خان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

''ہمیں اس جرم کی سزا ملنی چاہیے تاجور کہ ہم نے اس درندہ صفت بیٹے کو کیوں پیدا کیا؟ میں نے اپنے اور تمہارے ایک معمولی سزا تجویز کی ہے میں تمہیں گولی مار دینا چاہتا ہوں، کیونکہ تم اس سنگدل شیطان کی ماں ہو، اور پھر میں پہاڑوں کی سب سے اونچی چٹان سے کود کر خودکشی کر لوں گا یہ میرا عزم ہے۔''

زورآور خان نے بندوق سیدھی کر لی اور تاجور کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اب وہ زورآور خان سے متفق تھی۔

فائر کی آواز ہوئی لیکن تاجور کے منہ سے چیخ نہ نکلی وہ چیخ کر اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس کی کوکھ سے جنم لینے والے نے دوسروں کو جو تکلیف پہنچائی تھی وہ اس تکلیف سے زیادہ تھی۔ وہ چیخ کر شرمندہ ہونا نہ چاہتی تھی زورآور خان کے دوسرے فائر نے اس کی تکلیف کا خاتمہ کر دیا۔

''میں تجھے آخری بار اپنے سینے سے لگا کر بوسہ نہیں دوں گا تاجور، کیونکہ تو ایک درندے کی ماں ہے۔'' زورآور خان نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر وہ اندر سے مٹی کے تیل کا کنستر اٹھا لایا اس نے گھر میں چاروں طرف تیل چھڑکا اور اسے آگ دکھا دی اس کے بعد وہ مکان کے عقبی حصے سے نکل کر بلند پہاڑی چٹان کی طرف چل دیا۔

برائے فروخت

ایک سابق اطالوی وزیر اور برازیلی سرجن کی تحقیق کے مطابق اٹلی کے چالیس باشندے گردوں کی بیماری میں مبتلا تھے۔ وہ گردے خریدنے بھارت گئے۔ وہاں انہوں نے اپنے ناکارہ گردوں کی جگہ بھارتیوں کے کارآمد گردے خرید کے پیوندکاری کروالی مگر اکثر مریضوں کو یہ تبدیلی راس نہیں آئی۔ پانچ اطالوی بھارت ہی میں چل بسے، اٹھارہ دوسری سنگین بیماریوں میں مبتلا ہو گئے۔ دوسری طرف بے چارے گردے بیچنے والے سب کے سب صرف چند ماہ میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ گردوں کی خرید فروخت ایک تجارت بن گئی ہے۔ نئے گردوں کے اکثر ضرورت مند بھارت کا رُخ کرتے ہیں۔ وہاں سودے بازی ہوتی ہے اور سفاک دلالوں کے سبب باہر سے آئے ہوئے صاحب حیثیت مریضوں کو دلی، بمبئی یا کلکتے میں دفن ہونا پڑتا ہے یا اُن کی لاش اُن کے وطن روانہ کر دی جاتی ہے۔ بھارت میں گردوں کی جراحی پر تقریباً دس لاکھ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ نصف رقم گردہ بیچنے والے کو ملتی ہے، باقی نصف ڈاکٹر اور دلال میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ شدید غربت کے باعث بہت سے لوگ اپنا گردہ فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ گردہ فرشوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے جن کی 'مرضی' میں اُن کے شوہروں کا 'حکم' بھی شامل ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ آدمی ایک گردے سے بھی زندگی گزار سکتا ہے لیکن مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بیشتر افراد زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ پاتے۔

''تو جانتا ہے معبود میں ایک قابل سزا انسان کو سزا دے رہا ہوں۔ میری نیت صاف ہے، تیری عطا کی ہوئی زندگی نعمت تھی، لیکن میں اس نعمت کا جائز استعمال نہ کر سکا اور میرے نطفے نے ایک ایسے شیطان کو جنم دیا جو میرے لئے باعث شرمندگی ہے۔''
اس نے بلند چٹان کے کنارے کھڑے ہو کر آسمان کی طرف منہ کر کے کہا اور چٹان سے چھلانگ لگا دی۔

☆......☆......☆

تاریک خانقاہ بلند و بالا پہاڑیوں کے درمیان ایک گہرا تاریک غار تھا جو بے حد کشادہ تھا ایک پرانی روایت کے تحت یہاں کسی بزرگ نے قیام کیا تھا۔ اس لئے یہ خانقاہ کہلاتی تھی، لیکن اب وہ جیل کی حیثیت سے استعمال ہوتی تھی۔ جرم کی سزا کے طور پر کسی کو دو چار دن کے لئے یہاں بھیج دیتا تھا اور لوگ یہاں آنے کے خوف سے لرز جاتے تھے۔

شیرزاد اور اس کے ساتھیوں کو ان کا جرم سنا دیا گیا تھا اور ایک رات کے لئے انہیں یہاں پہنچا دیا گیا۔ دوسری صبح ان کی زندگی کی آخری صبح تھی شیرزاد نے اس سزا کو قبول نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں اپنے قبیلے کے سردار کے لئے نفرت پیدا ہوگئی تھی وہ ایسی موت مرنے کو تیار نہیں تھا۔

اس وقت بھی وہ غار کی تاریک دیوار سے پشت لگائے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا اس کے تمام ساتھی موت کے خوف سے گہری گہری سانسیں لے رہے تھے کوئی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتا تھا اور تاریکی نے ان سب کے تاثرات کو چھپا رکھا تھا کافی دیر کی خاموشی کے بعد تاریکی میں اس کی آواز گونجی!

''کیا تم لوگوں نے ناانصافی کی اس موت کو قبول کر لیا ہے؟''

اس کی آواز کے جواب میں کوئی آواز سنائی نہ دی۔

''کیا تم سب موت کے خوف سے مر چکے ہو؟'' شیرزاد شیر کی طرح گرجا۔

''لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں شیرزاد......؟'' کسی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''خودکشی......'' شیرزاد نے اسی طرح گرج کر کہا......

''ہم خودکشی کر سکتے ہیں تاکہ مرتے وقت انہیں شکست دے دیں جنہوں نے ہمارے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ فتح کے بعد جشن فتح ہمارا حق تھا جو ہم نے اپنی مرضی کے مطابق منایا کیونکہ ہم فاتح تھے پھر انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ہمیں اس جشن کی سزا دیں؟''

''لیکن ہمیں خودکشی کس طرح کرنی چاہیے شیرزاد؟''

''میرے ذہن میں اس کے لئے ایک بہترین ترکیب آئی ہے خودکشی کا ایک باعزت طریقہ لیکن تم سب کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔'' شیرزاد نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ سب تاریکی میں آنکھیں پھاڑنے لگے۔

''کیا تم میرا ساتھ دو گے؟''

''ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔'' سب نے بیک وقت کہا۔

''تب پھر اٹھو غار کے دہانے کو ایک پتھر سے بند کیا گیا ہے اس پتھر کو بند کرنے میں جتنے آدمیوں نے طاقت صرف کی ہے ہماری تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے کیا ہم اس پتھر کو ہٹا کر دروازہ نہیں کھول سکتے؟''

''لیکن دروازے کے باہر پہریدار ہوں گے وہ ہمیں بھون ڈالیں گے۔'' کسی نے کہا۔

''ان کی گولیوں سے ہمیں موت ہی آئے گی نا۔ یہ موت اس موت سے بدرجہ بہتر ہوگی جو کل صبح ہمارا استقبال کرے گی پورے قبیلے کی نگاہ ہم پر ہوگی اور ہم پتھروں کی بارش میں سسک رہے ہوں گے۔ ہمارے دانت ٹوٹ جائیں گے، آنکھیں پھوٹ جائیں گی، جسموں کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی اور پھر ہمارے بھیجے باہر نکل پڑیں گے۔ کیا وہ موت اس موت سے اچھی ہوگی جو پہریدار کی گولیوں سے آئے گی؟''

''نہیں نہیں وہ موت ہمیں پسند نہیں ہے۔''

''تب اس موت کو پسند کر لو جس میں ہمارے بچ جانے کے امکانات بھی ہیں۔'' اور سب تیار ہو گئے۔

وہ دیواریں ٹٹولتے ہوئے غار کے دہانے کے قریب پہنچ گئے۔ سب نے اس بڑی چٹان پر ہاتھ رکھے جو غار کے دہانے کو ڈھکے ہوئے تھی اور اس پر طاقت صرف کرنے لگے سیدھے سادھے انسانوں نے ان کی تعداد کا خیال نہیں رکھا تھا۔ تاریک خانقاہ ایک دو آدمی کے لئے تو جیل کا کام دے سکتی تھی لیکن بیک وقت اتنے سارے آدمیوں کے لئے نہیں۔ چٹان دوسری طرف لڑھک گئی اور ٹھنڈے ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے جرگے والے ان قیدیوں کو اس مضبوط جیل میں بند کر کے مطمئن ہو گئے تھے انہوں نے کسی پہریدار وغیرہ کا خیال ہی نہیں رکھا تھا چنانچہ

باہر میدان صاف تھا۔
اور جب باہر سے کوئی تحریک نہیں ہوئی تو شیرزاد اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔ شیر کچھار سے باہر نکل آیا...... بپھرا ہوا خونخوار شیر...... اور اب جو کچھ نہ کرتا کم تھا۔ شیرزاد کے ساتھیوں کے لئے یہ زندگی غیر متوقع تھی...... وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے تاروں کی چھاؤں میں وہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے اور پھر ان نگاہیں دور بستی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کی طرف اٹھ گئیں۔

"وہ بستی اب ہمارے لئے نفرت کی بستی ہے ہمارا تعلق اب اس سے ختم ہو گیا ہے وہاں ہمارا کوئی عزیز نہیں ہے۔ اب وہ ہمارے دشمنوں کا شہر ہے کیا تم میں سے کوئی دشمنوں کے شہر میں جانا پسند کرے گا؟" شیرزاد نے پوچھا۔

"اب وہاں ہمارا کون ہے شیرزاد اب ہم وہاں جا کر کیا کریں گے؟" سب نے یک زبان کہا۔

"تب پھر تم زندگی کیسے گزارو گے قبیلے والے ہمارے فرار سے واقف ہو کر ہمیں علاقے کے کونے کونے میں تلاش کریں گے دوسرے قبیلے ان کی مدد کریں گے اور ایک ایک کر کے ہم سب گرفتار ہو جائیں گے کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟"

"ہماری رہنمائی کرو شیرزاد۔" انہوں نے کہا۔

"اگر تم شیرزاد پر بھروسہ کرو گے تو ماحول ہمارا تابع ہوگا لوگ ہمارے ناموں سے کانپیں گے' ہمارے دشمن ہمیں خراج ادا کر کے زندہ رہ سکیں گے ہم جو قبیلوں کے منہ پھیر سکتے ہیں اس پورے علاقے پر ہماری ہیبت ہوگی لیکن اس کے لیے تمہیں جان فروشی کرنی ہوگی کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟"

"ہم تیار ہیں۔" سب نے بیک وقت کہا۔

"تب آؤ دشمنوں کے اس شہر سے ہم گھوڑے اور ہتھیار حاصل کریں گے مزاحمت کرنے والے ہر شخص کو فنا کر دو' خواہ وہ تمہارا بھائی ہی کیوں نہ ہو اب ہماری الگ قوم ہے، ہمارا کوئی بھائی، کوئی عزیز نہیں ہے آؤ اور درندوں کا یہ دستہ راستے کی تاریکی میں غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی بستی کی طرف چل پڑا۔

انہوں نے خاموشی سے گھوڑے کھولے جس قدر اسلحہ مل سکتا تھا حاصل کیا اور پھر ان کے گھوڑے پہاڑوں کی طرف نکل گئے بستی کے لوگ اس طوفان سے بے خبر تھے جو اب شیرزاد کی شکل میں آنے والا تھا۔

انہیں تو دوسری صبح رات کے واقعات کا علم ہو سکا اور صبح بستی والوں کے لیے عجیب تھی زبانوں پر جہاں درندہ صفت شیرزاد کی خوفناک آزادی کے چرچے تھے وہیں اس کے فرشتہ خصلت باپ کی داستان بھی تھی اس غیور باپ کی داستان جو اپنے بیٹے کے جرم کا مجرم خود کو بھی قرار دے چکا تھا کیونکہ اس بیٹے نے اس کے ہاں جنم لیا تھا کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اس المیے پر نم نہ تھی۔

☆......☆......☆

برف کی بستی، سر شام سنسان ہو گئی نہ جانے یہ شام اتنی بھیانک کیوں تھی برف باری یہاں کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی سال کے بیشتر مہینوں میں برف باری ہوتی رہتی تھی اس لیے یہ برف کی بستی کہلاتی تھی۔ آج شام بھی موسم نے بتا دیا کہ برف باری ہوگی اور لوگوں نے تیاریاں کر لی تھیں۔ تمام کاروبار معمول سے پہلے بند ہو گئے تھے اور پختہ اور نیم پختہ مکانوں کے چراغ روشن ہو گئے تھے۔ لیکن آج بستی کے لوگوں کے ذہنوں پر بوجھ تھا ایک ناقابلِ بیان سا بوجھ ہر شخص محسوس کر رہا تھا لیکن کوئی کسی سے اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔

ماہ رخ بھی اس بوجھ سے خود کو آزاد نہ محسوس کر سکی حالانکہ برف باری اس کے دل میں خوشبوؤں کا طوفان لاتی تھی آسمان سے برستے ہوئے سفید ذرات اسے بہت پسند تھے اور وہ دعا کرتی کہ دن رات برف باری ہوتی رہے لیکن آج وہ اس موسم سے لطف اندوز نہ ہو رہی تھی نہ جانے یہ کیسا بوجھ تھا جو اس کے دل و دماغ پر طاری تھا باورچی خانے سے اس کی ماں کی آواز آ رہی تھی جو حسبِ معمول اس کے بھائی پر چیخ چلا رہی تھی اور کبھی کبھی چمٹے کی آواز بھی سنائی دے جاتی جو شاہ زمان کے جسم کے کسی حصے پر ہی پڑا ہوتا تھا۔

یہ شاہ زمان بھی خوب ہے اپنے کہنے کے مطابق جب تک وہ چولہے کے پاس بیٹھ کر دو چار جھڑکیاں' دو چار چمٹے نہیں کھا لیتا تھا اس کی دن بھر کی تھکن نہیں اترتی تھی۔ شاہ زمان خوبانیوں کی تجارت کرتا تھا۔ ایک چھوٹے سے حصے میں اس نے خوبانیوں کے درخت لگا لئے تھے۔ جو اس کی محنت سے خوب پھل دیتے تھے اور پھر وہ سیزن بھر تازہ خوبانیاں اور اس کے بعد خشک خوبانیاں فروخت کرتا تھا۔ اچھی خاصی گزر ہو رہی تھی باپ نے مکان کے پچھواڑے ترکاریاں لگا رکھی تھیں جو گھر کی ضروریات بخوبی پوری کر دیتی تھیں' کچھ بھیڑیں تھیں جن کی دیکھ بھال بھی

شاہ زمان اور ماہ رخ کے باپ نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی اس طرح چار افراد پر مشتمل یہ کنبہ خوشحال زندگی گزار رہا تھا۔ ماہ رخ کی عمر اٹھارہ سال تھی، شاہ زمان بائیس سال کا ہو چکا تھا لیکن والدین کو بیٹی کی شادی کی فکر تھی ماہ رخ جنگلی بیل کی طرح بڑھ رہی تھی اس کے چھلکتے ہوئے حسن کو دیکھ کر نہ جانے کتنے دلوں کے پیمانے لبریز ہو جاتے تھے۔ والدین کو اس بات کا پورا پورا احساس تھا اور وہ روزانہ کی آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کر رہے تھے تاکہ ماہ رخ کے ہاتھ پیلے کیئے جاسکیں۔

''ارے ماں جا موذی' سارا گوشت کچا ہی کھا جائے گا تو روٹی کے ساتھ کیا مجھے کھائے گا۔'' چمٹے کی سڑاک کے ساتھ ہی ماں کی آواز سنائی دی ماہ رخ بے اختیار ہنس پڑی وہی پرانا جھگڑا شاہ زمان پکتی ہوئی ہانڈی سے گوشت کی بوٹیاں نکال کر کھاتا رہتا تھا۔ شکر کے ڈبے سے شکر نکال کر پھانکتا رہتا اور ماں اس پر چیختی چلاتی رہتی۔

صحن سے باپ کے حقہ گڑگڑانے کی آواز سنائی دے رہی تھی، کیسی مانوس، کیسی میٹھی آوازیں ہیں یہ...... ماہ رخ نے سوچا اور وہ کچھ اور اداس ہوگئی اس تصور سے کہ ماں باپ اس کی شادی کی فکر کر رہے ہیں۔ پھر یہ مانوس آوازیں کیسی اجنبی ہو جائیں گی اور نہ جانے کون کون سی آوازیں نہ جانے وہ کیسی آوازیں ہوں۔ ماہ رخ نوجوان ضرور تھی، لیکن نوجوان لڑکیوں کی طرح اس کی جوانی بے لگام نہیں تھی۔ اس نے آج تک کسی مرد کو گہری نگاہ سے نہیں دیکھا تھا اسے والدین کی عزت کا پورا پورا احساس تھا اور بستی کے لوگ اس گھرانے کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کھڑکی سے ہوا کا نم جھونکا آیا اور ماہ رخ کو سردی کا احساس ہوا اس کا دل چاہا کہ کھڑکی بند کردے، لیکن نہ جانے کیوں اس نے اس خواہش پر عمل نہیں کیا سردی اس کے جسم میں سرایت کرتی رہی اور اسے پھر ایک عجیب سی ویرانی کا احساس ہوا۔

''ماہ رخ' روشنی کیوں نہیں کی؟'' باورچی خانے سے ماں کی آواز سنائی دی اور وہ چونک پڑی اسے کمرے میں چھا جانے والی تاریکی کا احساس ہوا۔ باہر اب بھی روشنی تھی' لیکن اندر اندھیرا پھیل گیا تھا ایک طویل انگڑائی لے کر وہ اٹھی آتش دان سے ماچس اٹھا کر اس نے مٹی کے تیل کا چراغ روشن کر دیا۔

اور چراغ روشن ہوتے ہی دھماکے ابل پڑے وہ بری طرح اچھل پڑی اور خوف زدہ نظروں سے چراغ کو دیکھنے لگی لیکن بہت جلد اسے احساس ہوگیا کہ دھماکے چراغ سے نہیں ہو رہے بلکہ باہر ہو رہے ہیں اس کے باپ کے حقے کی آواز بند ہوگئی ماں کی بک بک بھی بند ہوگئی اور شاہ زمان کی آواز سنائی دی۔

''یہ کیسے دھماکے ہیں بابا؟''

''گولیاں چل رہی ہیں۔'' بوڑھے گل زمان نے کہا۔

''کیا ہوا؟ کسی سے جھگڑا ہوگیا؟ میں دیکھوں؟''

''دماغ خراب ہے تیرا تاریکی میں چلنے والی گولیاں راستہ نہیں دیکھتیں۔'' ماں نے شاہ زمین کی قمیض کا کالر پکڑ کر کہا۔

''لیکن عورتوں کی طرح گھر میں گھسے رہنا بھی ٹھیک نہیں ہے ماں۔'' شاہ زمان نے کہا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' گل زمان نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ ماہ رخ جلدی سے کمرے میں پہنچی اور کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگی لیکن گولیاں چلنے کی آواز دور سے آرہی تھی البتہ باہر بھاگتے دوڑتے لوگ صاف نظر آرہے تھے۔

چند لمحات کے بعد ماہ رخ کا باپ ہانپتا کانپتا گھر میں داخل ہوا۔

''ڈاکو...... ڈاکو...... شیر زاد نے گاؤں پر حملہ کر دیا ہے۔'' اس نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ابھی وہ بڑی بستی کی طرف ہے لیکن جلد اِدھر کا رُخ کرے گا۔''

''خدا غارت کرے شیر زاد کو' اس بستی والوں کے پاس کیا رکھا ہے؟ جو اسے لوٹنے آگیا۔''

''ماہ رخ بندوق نکال دے' بیٹا گولیاں لے آ اور کھڑکی کے پاس سے ہٹ جا۔'' بوڑھے نے کہا اور ماہ رخ کوٹھڑی کی طرف گئی جہاں اس کے باپ کی پرانی بندوق اور تھوڑے سے کارتوس رکھے ہوئے تھے۔

''خدا غارت کرے' خدا غارت کرے۔'' ماں ایک ہی گردان کر رہی تھی اور ماہ رخ خوف زدہ انداز میں شیر زاد کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ''شیر زادان علاقوں کا بے تاج شہنشاہ تھا پورے علاقے کے قبائل اسے خراج ادا کرتے تھے اس کی درندگی کی داستانیں ہر زبان پر تھیں۔ خراج وصول کرنے کے باوجود تفریحاً قتل و غارت گری کرتا تھا اس کے ساتھی نوجوان طوفان کی طرح کسی بستی پر جا پڑتے اور مال و اسباب لوٹتے اور نوجوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتے، کوئی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا

تھا۔ شیرزاد کے لیے بہت سے قبائل نے اتحاد کر کے ایک باقاعدہ دستہ ترتیب دے دیا تھا، لیکن اس دستے کا ایک فرد بھی زندہ نہ بچ سکا اور ان قبائل کی بے شمار بستیاں نیست و نابود کر دی گئیں۔ سینکڑوں نوجوانوں کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ ایسا کوئی قدم اٹھاتا۔ جس نے شیرزاد کے لیے کوئی سازش کی' موت کے گھاٹ اتر گیا۔ بڑے بڑے جیالے اس کے نام سے کانپتے تھے اور کبھی مونچھ نہ نیچی کرنے والے قبائل بھی اسے خراج ادا کرنے پر مجبور تھے۔

اس طرح شیرزاد اس علاقے کے لیے قہر بن گیا تھا اس چھوٹی سی بستی کا اس نے رخ کبھی نہیں کیا تھا کیونکہ یہ معمولی حیثیت کی حامل تھی لیکن آج نہ جانے یہ طوفان اس طرف کیسے مڑ گیا تھا۔

''تو یہ خوف، یہ بوجھل ماحول، کسی خونی داستان کی ابتدا تھی۔'' ماہ رخ نے سوچا۔ گولیوں کی آواز تیز تر ہوتی گئی۔ آہ و بکا کی آوازیں ان کی آوازوں سے ہم آہنگ تھیں۔ لوگ جانیں بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے اور شیرزاد کے درندہ صفت ساتھیوں کے گھوڑے انہیں روند رہے تھے۔ بستی والوں نے حتی المقدور مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن طوفان کے آگے کہیں بند بندھتے ہیں؟ ذرا سی دیر میں ان کی مدافعت ختم ہوگئی اور اب صرف انہیں قتل کیا جا رہا تھا۔ لوٹا جا رہا تھا، ان کے مکانات کو آگ لگائی جا رہی تھی اور بڑی بستی کی تباہی کے بعد شیرزاد نے چھوٹی بستی کا رُخ کیا تھا اسے اس بات سے غرض نہیں تھی کہ کہاں کیا ملتا ہے۔ اسے تو صرف قتل و غارت گری سے دلچسپی تھی۔

چنانچہ چھوٹی بستی بھی مصیبت میں گھر گئی شاہ زمان نے کھڑکی کے پاس مورچہ سنبھال لیا اور دوڑتے ہوئے گھڑ سواروں پر نشانہ لگانے لگا۔

اس کا نشانہ بہت اچھا تھا اور ماہ رُخ نے اپنی آنکھوں سے تین سواروں کو خاک و خون میں لوٹتے دیکھا تھا۔ وہ بھائی کی دلیری پر بہت خوش تھی اور باپ کو شاہ زمان کے کارنامے کے بارے میں بتاتی جا رہی تھی۔ دوسری طرف ڈاکو بھی اس خطرناک مکان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اس کھڑکی سے ہونے والی فائرنگ انہیں شدید نقصان پہنچا رہی تھی۔

چنانچہ ایک ڈاکو نے دستی بم کا پن ہٹا کر اس کھڑکی کی طرف اچھال دیا۔ شاہ زمان کی تیز نظروں نے بم دیکھا اور ماہ رُخ کو

ساس

جارج نے اپنے دوست کو ہسپتال میں مرہم پٹی کراتے ہوئے دیکھ کر حیرت سے کہا۔

''ارے یار ہینک! کیا ہوا تمہیں؟ آج صبح ہی تو میں نے تمہیں ایک ریستوران میں سنہرے بالوں والی لڑکی کے ساتھ کافی پیتے ہوئے دیکھا تھا؟''

ہینک نے سرد آہ بھری۔ ''تمہی نے نہیں' میری ساس نے بھی دیکھا تھا۔''

لپیٹ میں لے کر دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی پتھروں کی دیوار اڑ گئی لیکن دونوں بہن بھائی بچ گئے تھے۔ ڈاکو انہیں مہلت نہیں دینا چاہتے تھے، چنانچہ کئی آدمی اندر گھس آئے اور ان کے سینوں پر بندوقیں رکھ دیں اسی وقت ایک تیز سیٹی کی آواز سنائی دی اور شاہ زمان اور اس کے باپ کی جان بچ گئی۔ ورنہ ڈاکو انہیں نشانہ بنانے جا رہے تھے۔

یہ سیٹی شیرزاد کی تھی اور اس کا مطلب تھا کہ بستی والوں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور اب کسی ڈاکو کو ایک گولی بھی چلانے کی اجازت نہیں ہے نہ جانے اس شریفانہ اصول کو شیرزاد نے کیسے اپنا لیا تھا پھر یہ بھی اس کی تفریحات میں ایک بات تھی حالانکہ کئی مرتبہ اسے نقصان بھی اٹھانا پڑا تھا۔

ڈاکوؤں نے ان چاروں کو کھڑا کیا اور دھکیلتے ہوئے باہر لے آئے تب ماہ رخ نے پہلی بار ڈاکو شیرزاد کو دیکھا اتفاق سے شیرزاد اس وقت ان کے مکان کے سامنے ہی تھا باہر اتنی روشنی اب بھی تھی کہ شیرزاد کے خوفناک چہرے کو دیکھ سکتی تھی کبھی یہ چہرہ خوبصورت بھی ہوگا لیکن ظلم کی لعنت نے اسے کریہہ بنا دیا تھا۔

شیرزاد نے بھی اسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا وہ بستی کی دوسری لڑکیوں کو بھول گیا جنہیں اس کے انتخاب پر پکڑا گیا تھا۔ بستی سے آہ و بکا کی آوازیں اب بھی بلند ہو رہی تھیں لیکن شیرزاد اب صرف ماہ رخ کو دیکھ رہا تھا پھر اس کا گھوڑا آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور ماہ رخ کے قریب پہنچ گیا اور پھر گھوڑے سے اتر گیا اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے جیسے وہ کوئی انوکھی چیز دیکھ رہا ہو...... اس کی زندگی میں پہلی لڑکی وہ تھی جب اس نے ایک فاتح کی حیثیت سے ایک قبیلے کو لوٹا تھا اور وہاں سے حاصل شدہ لڑکیوں پر تشدد کر کے انہیں قتل کر دیا تھا اس لڑکی نے اسے عورت کی لذت سے

متعارف کرا دیا تھا اور اس کے بعد جب وہ ڈاکو بن گیا تو اسی لڑکی کے جسم کی لذت نے لوٹ مار کے ساتھ لڑکیوں کے اغوا کی عادت بھی ڈال دی۔ شاذ و نادر ہی اس کی راتیں عورت سے خالی ہوتی تھیں اب تو اسے ان لڑکیوں کی شکلیں بھی یاد نہیں رہی تھیں جنہیں اس نے تباہ کیا تھا وہ سہمی سہمی لڑکیاں جو اسے دیکھ کر سکتے کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتی تھیں۔ شیرزاد کا نام ہی ان کے حواس پر بجلی گرانے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ شیرزاد ان بے جان لاشوں کو بھنبھوڑ کر رکھ دیتا اور وہ خوف سے کراہ تک نہ سکتیں۔

اور اب اس کی زندگی میں عورت کا نیا روپ آیا تھا۔ کیسا موہنی روپ تھا وہ سحر میں مبتلا ہو گیا ایسی پاکیزگی، ایسی تمکنت تو اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی یہ کیا ہے.....؟ اس کا دل دھڑ کنے لگا وہ خود کو لڑکی کے سامنے بے بس محسوس کرنے لگا۔ اس نے اپنا وجود ہلکا پھلکا محسوس کیا اور اسی عالم میں کئی منٹ گزر گئے۔

''اس کے بارے میں کیا حکم ہے سردار؟'' اس کے ایک ساتھی نے آگے بڑھ کر پوچھا اور شیرزاد نے چونک کر اسے دیکھا۔

اس کا ساتھی اس کے دیکھنے کے مفہوم کو غلط سمجھا اور اس نے دوسری لڑکیوں کی طرح ماہ رخ کے دونوں بازو پکڑ کر اسے بے دردی سے کھینچا اور شیرزاد کے جسم میں بجلی دوڑ گئی' زندگی میں پہلی بار عورت کی بے حرمتی اسے پسند نہ آئی اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھے بغیر پستول سیدھا کیا اور پستول کی گولی ساتھی کی پسلیاں چیرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

تب شیرزاد چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر اس نے اپنے ایک ساتھی کو بلا کر آہستہ سے کچھ کہا۔ ساتھی کے چہرے پر حیرانی کے آثار نمودار ہوئے لیکن اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ سردار کے حکم کی تعمیل کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی کرتا۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹا اور دوسرے ساتھیوں کو کچھ ہدایات دینے لگا۔

اور پھر لوٹ کا مال ماہ رخ کے مکان کے سامنے ڈھیر کیا جانے لگا۔ پوری بستی کا لوٹا ہوا مال ماہ رخ کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ شیرزاد نے ہاتھ سے کوئی اشارہ کیا اور ان لڑکیوں کو چھوڑ دیا گیا جسے اس نے منتخب کیا تھا لڑکیاں سہم کر ادھر ادھر دبک گئیں پھر شیرزاد آہستہ آہستہ آگے بڑھا اس نے اپنی کمر سے پستول نکالا اور پیٹی سے کارتوس نکال کر چیمبر میں بھرنے لگا۔

تمام لوگ حیرت و خوف سے یہ عجیب کارروائی دیکھ رہے تھے۔ شیرزاد نے پستول کو ایک نظر دیکھا اور پھر کچھ اور آگے بڑھ کر اس نے پستول ماہ رخ کے پیروں کے پاس رکھ دیا اور پھر سیدھا ہو گیا۔

''میں پھر آؤں گا'' اس نے آہستہ سے کہا اور پلٹ گیا۔ دوسرے لمحے وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور پھر آن کی آن میں گھوڑے ہوا ہو گئے۔

پوری بستی کے لوگ حیرت و خوف سے انہیں دیکھتے رہے اور جونہی آخری گھوڑا نگاہوں سے اوجھل ہوا بستی میں شور مچ گیا۔ لوگ اپنے اپنے عزیزوں کی لاشیں تلاش کرنے لگے۔ ماہ رخ کے باپ نے اپنی بیوی اور بیٹے کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور واپس مکان کی طرف بڑھ گیا۔

''یہ کیا ہوا بابا؟'' ماہ رخ نے حیرت سے پوچھا۔

''قیامت آئی اور گزر گئی۔ نہ جانے کتنے موت کا شکار ہوئے، دولت تو آنی جانی چیز ہے۔ آؤ اندر آؤ.....'' بوڑھے نے کہا۔ وہ ماہ رخ کو کیسے بتاتا کہ کیا ہوا؟ بستی کے لوگ بچ گئے تھے لیکن ماہ رخ محفوظ نہیں تھی۔ شیرزاد کی انوکھی حرکت وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ وہ ماہ رخ کی محبت کا شکار ہو گیا تھا لیکن پریشانی کی بات یہ تھی کہ وہ پھر آنے کو کہہ گیا تھا۔

بستی میں ماتم ہو رہا تھا، چاروں طرف سے بین کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لوٹ کا مال بدستور ماہ رخ کے مکان کے سامنے ڈھیر تھا لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

ماہ رخ کے مکان کا ایک حصہ بھی دستی بم سے تباہ ہو گیا تھا، لیکن مکان کافی بڑا تھا اور اس کے دوسرے حصے سالم تھے۔ ان سالم حصوں میں سے ایک حصہ میں ماہ رخ ایک بستر پر دراز تھی اور دوسرے کمرے میں اس کی ماں، بھائی اور باپ گردن جھکائے بیٹھے کسی سوچ میں غرق تھے، تھوڑی دیر کے بعد بوڑھے نے گردن اٹھائی اور بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیوں نہ ہم یہ بستی چھوڑ دیں۔''

''پھر کہاں جائیں گے بابا؟'' گل زمان نے کہا۔

''کسی اور بستی میں؟''

''مجھے کسی ایسی بستی کا نام بتادو جو شیرزاد کے ظلم سے آزاد ہو۔''

''تب پھر..... ممکن ہے بستی کے کسی آدمی کو شیرزاد سے کوئی نقصان نہ پہنچے' لیکن وہ بدبخت ہماری عزت کے درپے ضرور ہے' ہمیں وہ ضرور نقصان پہنچائے گا اور خدا نہ کرے کہ وہ میری ماہ

رخ کو......''

''ماہ رخ کو وہ اس وقت بھی اٹھا کر لے جا سکتا تھا بابا ممکن ہے خدا کوئی بہتر صورت نکال دے۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔''

بیٹے کی بات پر بوڑھا کافی دیر تک غور کرتا رہا اور پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر گردن ہلا دی۔

دوسری طرف ماہ رخ خیالات میں گم تھی۔ اس کے ذہن میں بھی شیر زاد کا تصور تھا اور وہ اس تصور سے لرز رہی تھی۔ کیسا بھیانک چہرہ تھا اور اس کے ساتھی کیسے خوفناک تھے۔ لیکن یہ انوکھی حرکت اس نے کیوں کی، وہ مجھے ایسے کیوں گھور رہا تھا اور میری وجہ سے اس نے اپنے ایک ساتھی کو کیوں مار دیا؟ پھر بستی کا لوٹا ہوا مال ہمارے سامنے ڈھیر کیوں کر دیا گیا اور وہ پھر آنے کا کہہ کر کیوں واپس چلا گیا؟

یہ سوالات اس کے ذہن میں چکرا رہے تھے اور وہ ان کا صحیح حل تلاش نہ کر پا رہی تھی۔ اس نے بابا سے بھی سوال کیا تھا، لیکن بابا نے بھی اسے ٹال دیا تھا۔ وہ سوچتی رہی بستی کے مصیبت زدوں کی مدد کے لیے اس کا دل تڑپ رہا تھا لیکن اس وقت اسے باہر جانے کی کون اجازت دے گا؟ وہ دور سے ان کی آوازیں سنتی رہی اور نہ جانے کب اسے نیند آ گئی۔

بستی کے دوسرے لوگوں کی طرح گل زمان بھی اپنے بیٹے کے ساتھ اپنے ٹوٹے مکان کی دیوار تیار کرنے لگا۔ ماہ رخ اور اس کی ماں بھی ان کی مدد کر رہے تھے لیکن بستی والوں کا رویہ ان کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ نجانے کیوں بستی والے گل زمان سے اجنبیت سی برتنے لگے تھے۔ گل زمان اس بات پر بہت حیران تھا کہ اگر یہ لوگ اس رات کے واقعے سے متاثر تھے تو پھر یہ اجنبیت کیسی؟ ماہ رخ کی وجہ سے تو ان کی عزتیں بچ گئی تھیں ورنہ وہ لڑکیاں شیر زاد کے قبضے میں ہوتیں اور وہ انہیں حاصل نہ کر سکتے پھر کیا بات ہے، ان کا مال بھی انہیں واپس مل گیا ہے۔ گل زمان نے اس میں سے ایک ذرہ برابر چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ آخر گل زمان نے فیروز بابا کو روک کر ان سے یہ سوال کیا۔

''وہ تم سے بھی خوف زدہ رہنے لگے ہیں گل زمان۔ شیر زاد نے تمہاری وجہ سے سب کا مال واپس کیا تھا۔ اب وہ تمہیں شیر زاد کا منظور نظر سمجھتے ہیں اور اسی لیے ان کے دلوں میں تمہارے لیے اجنبیت پیدا ہو گئی ہے۔''

''کیا وہ سب پاگل ہیں' کیا میں نے ان کے ساتھ کوئی برائی کی ہے؟ اگر بستی والے مجھے ٹھکرائیں گے تو میں یہ بستی چھوڑ دوں گا۔ میں نے تمام مصیبت اپنے کندھوں پر لے لی ہے۔ اگر بستی کی دوستی بیٹیوں کی عزت بچانے کے لیے میری جان بھی کام آ جائے تو میں جان دے دوں گا' پھر یہ اجنبیت کیسی؟ مجھ سے یہ بیگانگی برداشت نہیں ہوتی فیروز بابا۔''

''میں بستی والوں سے بات کروں گا۔'' فیروز بابا نے کہا اور گل زمان ٹھنڈی سانس لے کر کچھ سوچنے لگا۔

☆......☆......☆

شیر زاد کانٹوں کے بستر پر لوٹ رہا تھا۔ وہ اپنی بوٹیاں نوچ رہا تھا۔ اپنے بال نوچ رہا تھا۔ یہ کیا ہو گیا...... یہ کیا بات ہے...... کیا وہ پاگل ہو گیا ہے کیا وہ بزدل ہو گیا ہے؟ اگر نہیں تو یہ سب کیا ہے اس نے بستی کا مال کیوں واپس کیا؟ گو اسے لوٹے ہوئے مال سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ اسے خراج کی شکل میں اتنی دولت مل جاتی تھی کہ وہ اور اس کے ساتھی شہنشاہوں کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن یہ تو اس کا اور اس کے ساتھیوں کا شوق تھا۔ قتل و غارت گری، لوٹ مار...... ان کی یہی تفریح تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے چہروں پر بھی حیرت کے نقوش دیکھے تھے۔ لیکن اتنی ہمت کسی کی نہیں تھی کہ وہ اس بارے میں اس سے سوال کرتے۔

لیکن وہ خود سے سوال کر رہا تھا۔ یہ کون سا جذبہ تھا، کون سی خواہش تھی کہ اس نے سب کچھ اس لڑکی کے قدموں پر نچھاور کر دیا۔ آخر کیوں؟ اگر وہ اسے پسند آ گئی تھی تو دوسری لڑکیوں کی طرح اسے بھی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ ایسا کیوں نہیں کر سکا۔ بلکہ جب اس کے ایک ساتھی نے لڑکی کے بازو پکڑ کر کھینچے تو اسے بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اس کے ساتھ زیادتی کر رہا ہو اور اس نے بے دریغ اپنے ساتھی کو گولی مار دی۔

''کیوں...... وہ اس لڑکی سے کیا چاہتا ہے؟'' اس نے بے چینی سے اپنا سر پٹخا اور پھر اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ ایک طرف پانی سے بھرا ہوا ٹب رکھا تھا۔ اس نے ٹب میں اپنا چہرہ ڈال دیا۔ ٹھنڈے پانی نے اس کی آنکھیں کھول دیں، لیکن دل کی آگ تب بھی سرد نہ ہوئی...... رہ رہ کر اس لڑکی کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آ جاتا۔ اور پھر اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ممکن ہے وہ اس کی منتظر ہو...... یا ممکن ہے...... ممکن ہے۔ وہ سیدھا ہو گیا۔ اس نے ٹب کے پانی سے منہ دھویا۔ بال سنوارے اور پھر دوسرا لباس پہن کر اس نے ہتھیار سنبھالے اور انہیں اپنے جسم پر ڈال کر خاموشی سے غار سے نکل آیا۔ غار سے نکلنے کے لیے اس نے خفیہ راستہ استعمال کیا تھا۔

یہ اس کا مسکن تھا۔ پہاڑیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جس میں میلوں دور تک سرنگوں کے اس جال کے ذریعے کہیں سے

کہیں پہنچا جا سکتا تھا۔ سرنگ کے دہانے سے نکل کر وہ گھوڑوں کے اصطبل تک گیا۔ اپنا گھوڑا کھولا اور باہر نکل آیا۔ دوسرے لمحے اس کا گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ راستے اس کی نگاہوں سے معدوم تھے۔ اس کی آنکھوں میں صرف ایک چہرہ تھا اور وہ اس چہرے کے تصور میں سفر کر رہا تھا۔

اس کے دلی حالات شاید گھوڑے کو بھی معلوم ہو گئے تھے۔ اس نے گھوڑے کو کسی خاص راستے پر ڈالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن گھوڑا اسی راستے پر جا رہا تھا جہاں وہ جانا چاہتا تھا۔ گھوڑے کے سفر کو نہ جانے کتنا وقت لگ گیا۔ وہ تو اس وقت چونکا جب گھوڑے کی رفتار سست ہو گئی اور اس نے سامنے دیکھا تو کوئے یار سامنے تھا۔

اس نے گھوڑے کی پشت تھپتھپائی اور پھر عقل نے ساتھ دیا۔ وہ ڈاکو ہے۔ لوگ اس سے خوفزدہ ہیں۔ نفرت کرتے ہیں، گو وہ اسے خراج ادا کرتے ہیں، لیکن یہ خراج وہ خوشی سے نہیں دیتے۔ ایسی شکل میں اگر اس کے دشمن تنہا پا کر گھیر لیں، وہ اکیلا ہی بہت سوں کے لیے کافی تھا لیکن پھر بھی شیرزاد کے خاتمے کے لیے دس بیس اپنی جانیں دینے کے لیے فوراً تیار ہو جائیں گے۔

عقل روک رہی تھی، لیکن دل دیوانہ تھا۔ وہ کہہ رہا تھا صرف چند قدم پر موہنی صورت موجود ہے، جو ممکن ہے اس کی منتظر ہو۔ اس نے دل کی بات مان لی۔ گھوڑا دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ شام ہو چکی تھی اور برف باری کے آثار تھے۔ جب وہ چھوٹی بستی کے سرے پر پہنچا تو برف کے ننھے ننھے ذرات گرنے لگے لیکن وہ ان سے بے پرواہ آگے بڑھتا رہا۔ بستی سنسان ہو چکی تھی لوگ اپنے عزیزوں کو دفنا چکے تھے اور اب صبر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تاہم کبھی کبھی کسی مکان سے گریہ زاری کی آواز آ جاتی تھی۔ شیرزاد ان آوازوں سے بے نیاز آگے بڑھ رہا تھا۔ اور پھر وہ اس مکان کے سامنے پہنچ گیا جو اس کی منزل تھا۔ اس نے ایک درخت کے نیچے گھوڑے کو کھڑا کیا۔ مکان کی ٹوٹی دیوار پھر بن گئی تھی اور اس کے سامنے صفائی بھی ہو گئی تھی۔ وہ مکان کے چاروں طرف منڈلانے لگا اور پھر اس کی نگاہ ایک کھڑکی پر پڑی۔ کھلی ہوئی کھڑکی کے دوسری طرف چراغ روشن تھا اور چراغ کی پیلی روشنی میں ایک چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں رکھا ہوا کھڑکی کے باہر کے منظر میں گم تھا۔ یہ چہرہ وہی تھا جو شیرزاد کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر گیا تھا۔ وہ بے اختیار ہو گیا اور اس کے قدم کھڑکی کی طرف بڑھ گئے۔ پھر جب اس نے اپنا چہرہ کھڑکی کے سامنے کیا تو اندر موجود لڑکی کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ حیرت و خوف سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تم...... تم...... شیرزاد؟'' اس کے منہ سے نکلا۔

''میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں پھر آ ؤں گا۔'' شیرزاد نے کہا اور کھڑکی کے راستے اندر کود گیا۔ اب وہ ہر خطرے سے بے نیاز تھا اس نے لڑکی کے چہرے کو دیکھا وہ اس سے خوف زدہ نہیں تھی۔

''میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔'' اس نے کہا اور شیرزاد کا دل دھڑک اُٹھا۔

''سچ؟''

''ہاں۔''

''کیوں انتظار کر رہی تھیں؟''

''میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی تھی اس کا جواب نہ تو بابا نے مجھے دیا اور نہ ماں نے!''

''کون سی بات؟''

''تم ڈاکو شیرزاد ہو نا؟''

''ہاں لیکن تم صرف شیرزاد کہو۔''

''نہیں تم ڈاکو ہو مگر تم نے ہماری بستی کا لوٹا ہوا مال کیوں واپس کر دیا؟ میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی۔''

''میں نے سب کچھ تمہاری نظر کر دیا تھا۔ میں نے اس پوری بستی کی جان بخشی اس لئے کر دی تھی کہ یہاں تم رہتی ہو۔ میں نے پوری بستی کو تمہارے قدموں پر جھکا دیا ہے۔''

''میرے لیے یہ سب کچھ کیوں کیا تم نے؟''

''اس لئے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ ایسی محبت جیسی میں نے کسی سے نہیں کی۔ میں محبت سے نا آشنا تھا۔ میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی' اپنی ماں اور اپنے باپ سے بھی نہیں' ان دوستوں سے بھی نہیں جن کے ساتھ میں بچپن میں کھیل ہوں۔ لیکن میں نے تم سے محبت کی ہے۔ میرا دل تمہیں چاہنے لگا ہے میرے ایک اشارے پر ہر حسین لڑکی میری خلوت میں پہنچ جاتی ہے اور پھر جب وہ میرے بستر کی زینت ہوتی ہے تو ان کی آنکھوں میں خوف' ہونٹوں پر سکوت ہوتا ہے۔ وہ میری دست درازی پر ذرا بھی مدافعت نہیں کرتیں اور خود کو میرے حوالے کر دیتی ہیں۔ لیکن تمہیں دیکھ کر میرے دل میں ایک انوکھی خواہش پیدا ہوئی ہے۔ ایک عجیب خواہش میں چاہتا ہوں کہ میری سیج پر مسکراہٹ ہو' ادائیں ہوں' خوف نہ ہو' چاہت ہو' سکوت نہ ہو' قہقہے ہو' سپردگی نہ ہو' چھلاہٹ ہو' انکار نہ ہو...... اور میری اس خواہش نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔''

"تو......تو تم نے یہ سب کچھ میرے لیے کیا ہے؟" ماہ رُخ نے اس سے پوچھا۔

"ہاں...... بولو...... کیا تم میری محبت کا جواب محبت سے دو گی۔ میں تمہیں پوری زندگی کا ساتھی بنا لوں گا۔ میں...... میں......" شیرزاد کا جملہ پورا نہ ہو سکا اور ماہ رُخ نے اس کے چہرے پر تھوک دیا۔

شیرزاد ششدر رہ گیا۔ کیسا انوکھا تجربہ تھا۔ کسی نے اس کے چہرے پر نفرت سے تھوک دیا ہے۔ کسی کی حسین آنکھوں میں اس کے لیے خوف نہیں نفرت تھی اس نے چہرہ صاف نہ کیا اور شکست خوردہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"تو...... تو تم نے میری محبت کو ٹھکرا دیا۔ تت تو تم نے......"

"نکل جاؤ اس کھڑکی سے...... اپنے ساتھیوں کو لے کر آؤ اور مجھے اُٹھا کر لے جاؤ...... میں تم سے نفرت کرتی ہوں...... بے پناہ نفرت! تم درندے ہو۔ محبت انسانوں سے کی جاتی ہے' چلے جاؤ یہاں سے...... جاؤ اپنی وحشت کو آواز دو...... محبت والے دل تو درد سے لبریز ہوتے ہیں' وحشت کے پتلے محبت کے مفہوم سے بھی نا آشنا ہوتے ہیں۔ پہلے دل کو ٹٹولو' اس میں محبت پیدا کرو' تب کسی کی محبت پیدا کر سکو گے۔ نکل جاؤ یہاں سے ورنہ میں خودکشی کر لوں گی۔" ماہ رخ نے غیض و غضب سے لرزتے ہوئے کہا۔

اور شیرزاد پتھر کے بت کی طرح ساکت اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت غضب کی چنگاریاں نہیں' غم کے آثار تھے۔ پھر وہ خاموشی سے مڑا اور کھڑکی سے باہر گیا۔

ماہ رخ اس کے گھوڑے کو دیکھتی رہی اور جب وہ برف کی دھند میں غائب ہو گیا تو اس نے نفرت سے کھڑکی بند کر دی۔

کھڑکی بند کر کے جب وہ مڑی تو شاہ زمان اور گل زمان اس کے سامنے کھڑے تھے۔

گل زمان فخر سے بیٹی کو دیکھ رہا تھا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"تو نے باپ کی گردن فخر سے بلند کر دی ہے بیٹی لیکن اب ہم یہاں نہیں رہیں گے شاہ زمان ضروری سامان باندھ لو۔ ہم کہیں بھی چلے جائیں گے۔ ایسی جگہ جہاں شیرزاد کو ہمارے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو۔" اور شاہ زمان خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

"بیس آدمیوں پر مشتمل قافلہ ہے سردار' لڑکیاں بھی ہیں

کھچڑی

نئی نویلی دُلہن نے روتے ہوئے اپنی ساس سے کہا۔

"پتہ نہیں امی جان انہیں کیا ہو گیا ہے۔ وہ اچانک بدل گئے ہیں۔ ان کی ساری محبت نفرت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ پیر کو میں نے کھچڑی کھلائی تو انہوں نے بہت پسند کی۔ منگل کو کھچڑی کھلائی تو پسند کی۔ بدھ کو کھچڑی کھلائی تو پسند کی۔ جمعرات کو کھچڑی کھلائی تو پسند کی۔ جمعہ کو کھچڑی کھلائی تو پسند کی مگر جب سنیچر کو کھچڑی کھلائی تو ایکا یکی انہیں اس میں برائی نظر آنے لگی۔ چیخ چیخ کر سارا گھر سر پہ اٹھا لیا کہ مجھے کھچڑی سے نفرت ہے۔

اور سامان بھی، نہ جانے کون بدنصیب ہیں۔ میرا خیال ہے کسی اور ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ لڑکیاں بہت خوبصورت ہیں سردار' کیا حکم ہے؟" مخبر نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا اور شیرزاد کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

لیکن شیرزاد لمبے چاقو سے نوکدار لکڑی کو چھیلتا رہا۔ وہ ایک چٹان پر اداس سا بیٹھا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد کچھ یادیں اس کے ذہن کے پردے پر ابھر آئی تھیں۔ ان میں سے ایک بوڑھا چہرہ تھا، عبادت اور پاکیزگی سے پرنور چہرہ، جس پر سفید براق داڑھی لہرا رہی تھی اور نرم ہاتھ اس کے بالوں میں کنگھی کر رہے تھے اور یہ چہرہ زور آور خان کا تھا۔ اس کے باپ کا چہرہ......ایک اور چہرہ، محبت اور مامتا سے لبریز آنکھیں جو اس کی شکل سے روشنی حاصل کر رہی تھیں یہ ماں کی آنکھیں تھیں...... نہ جانے اسے یہ بھولی بسری کہانی کیوں یاد آ گئی تھی اور اس کہانی نے اس کے سینے کے اندر دل کا احساس دلایا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ دل بھی کوئی چیز ہے۔ ایسے وقت میں اس آدمی کی مداخلت اسے ناگوار گزری۔

"کیا حکم ہے سردار؟" مخبر نے پھر پوچھا۔

"بھاگ جاؤ...... جو دل چاہے کرو۔" اس نے مخبر کو جھڑک دیا اور وہ خوشی خوشی چلا گیا۔ آن کی آن میں درجنوں گھوڑے پہاڑ سے نیچے اترنے لگے۔ وحشت اور بربریت کا بازار گرم کرنے کے لیے۔ لیکن وہ ہر چیز سے بے نیاز تھا۔ تمام باتوں سے بے خبر تھا۔ وہ تو اس وقت چونکا جب گولیوں کی آوازیں اور انسانی چیخیں اسے سنائی دیں۔ وہ طلسم سے نکل آیا اور پھر اسے احساس ہوا کہ اس نے اپنے ساتھی سے کیا کہہ دیا تھا۔

وہ تیزی سے ایک بلند چٹان پر پہنچ گیا اور وہاں سے نیچے کا منظر دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھی قافلے پر ٹوٹ پڑے تھے۔ لوگ مر رہے تھے۔ ظلم و بربریت کا بازار گرم تھا، چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔

اور پھر اس کے کانوں میں ایک آواز اُبھری۔

''محبت کرنے والے دل تو درد سے لبریز ہوتے ہیں' پہلے اپنے دل کو ٹٹولو اس میں محبت پیدا کرو تب کسی کی محبت حاصل کر سکو گے اور پھر یہ آوازیں تیز ہو گئیں۔ یہ آوازیں چٹان سے نکل رہی تھیں۔ پہاڑوں سے نکل رہی تھیں اور اس کے کان پھٹے جا رہے تھے اس نے دونوں ہاتھوں سے کان بند کر لیے لیکن آوازیں تو اس کے دل سے نکل رہی تھیں۔

تب اس نے کانوں سے ہاتھ ہٹا لیے اور خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ وہ غار میں داخل ہوا اور وہاں سے اس نے بھاری مشین گن اٹھا کر کندھے پر رکھ لی۔ کارتوسوں کی پوری پٹی دونوں ہاتھوں سے سنبھالی اور غار سے نکل آیا۔ اس کے ساتھی قافلے پر قابو پا چکے تھے اور اب گرفتار شدگان کو رسی سے باندھ رہے تھے ان میں لڑکیاں بھی تھیں، مرد بھی تھے۔ شیرزاد نے ایک بلند چٹان پر مشین گن فٹ کر لی اور اس پر ریل چڑھانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور پھر اس کے ساتھیوں نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

شیرزاد غور سے انہیں دیکھ رہا تھا اور پھر اس کے دانت بھنچ گئے' جبڑوں کے مسلز اُبھر آئے اور مشین گن کا دہانہ کھل گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ وہ بلندی پر تھا اور اس کے ساتھی کوشش کے باوجود اس کے نشانے سے نہیں بچ سکے تھے اور اس ناگہانی مصیبت سے گھبرا گئے تھے۔ وہ سمجھ بھی نہ سکے کہ یہ مصیبت ان پر کہاں سے نازل ہو رہی ہے اور اسی حیرت میں وہ سب شکار ہو گئے۔ بندھے ہوئے لوگ سہمے ہوئے اس آفت خداوندی کو دیکھ رہے تھے جو ان کے دشمنوں پر نازل ہوئی تھی۔ آن کی آن میں ایک ایک ڈاکو موت کی آغوش میں پہنچ گیا اور آخری آدمی کو قتل کرنے کے بعد شیرزاد چٹان کے عقب سے نکل آیا۔ وہ نیچے اترنے لگا اور اپنے ساتھیوں کی لاشوں کے درمیان میں سے گزر کر ان کے پاس پہنچ گیا جو اسیر تھے وہ سب دہشت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے اس نے لمبا چاقو سیدھا کیا اور ان کی رسیاں کاٹنے لگا پھر اس نے ان سب کو آزاد کر دیا اور بھاری لہجے میں بولا۔

''میں تمہارے ساتھیوں کی زندگیاں تو نہیں لوٹا سکتا' مجھے ان کی موت کا افسوس ہے۔ ان پہاڑوں کے سب سے بلند حصے میں ایک غار ہے اس سے اندر چلے جاؤ وہاں بے شمار خزانہ موجود ہے اتنا خزانہ تم نے خواب میں بھی نہیں دیکھا ہو گا وہ سب تمہارا ہے' جاؤ اسے حاصل کر لو۔'' اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

وہ سب اسے حیرت سے دیکھتے رہ گئے تھے اور اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ گھوڑے پر بیٹھ کر ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

اسے اپنے راستے کی مشکلات کا احساس تھا وہ جانتا تھا کہ ڈاکو شیرزاد کی حیثیت ختم ہو جانے کے بعد اس کے دشمن اس کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے اسے کسی چٹان کی پشت پر پناہ نہ مل سکے گی۔ لیکن اب وہ تمام خطرات سے بے نیاز ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کو خوش خبری سنانا چاہتا تھا کہ اب وہ انسان بن گیا ہے۔ اس نے شیرزاد کی حیثیت ختم کر دی ہے اور اب وہ اس کی آغوش میں زندگی بسر کرنے کا خواہش مند ہے۔ اسے یقین تھا کہ ماہ رخ اتنی بڑی قربانی پر اسے گلے لگا لے گی۔

وہ تصور میں اپنی محبوبہ سے ہم آغوش' گھوڑا دوڑائے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بستی میں پہنچ گیا۔ وہ والہانہ انداز میں اپنی محبوبہ کے مکان کی طرف بڑھ گیا۔ راستے میں نظر آنے والے لوگ دہشت زدہ ہو کر بھاگ رہے تھے۔ گھروں کے دروازے بند ہو رہے تھے لیکن وہ سب باتوں سے بے نیاز تھا۔ اپنی محبوبہ کے مکان کے سامنے پہنچ کر وہ گھوڑے سے اتر گیا۔ اس بار وہ کھڑکی کے راستے نہیں' دروازے کے راستے اندر جانا چاہتا تھا۔

اور وہ دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اسے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔

لیکن...... مکان سنسان پڑا تھا...... کوئی انسان موجود نہ تھا۔ وہ ایک ایک کمرے کو دیکھتا رہا۔ تمام ضروری سامان غائب تھا۔ صرف فالتو سامان پڑا تھا۔ اس کا دل لرز گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح ایک ایک کونے کو تلاش کرتا رہا۔ اس نے تمام فرنیچر توڑ پھوڑ دیا اور پھر وہ وحشت زدہ انداز میں باہر نکل آیا۔ باہر بھی ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ سڑکیں گلیاں خالی ہو گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ ایک مکان کی طرف بڑھا اور اس کے دروازے پر دستک دی۔ سہمے ہوئے لوگوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس نے دروازے پر ایک زوردار لات رسید کر دی۔ اندر سے کئی سہمی سہمی چیخیں بلند ہوئیں اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ سہمے ہوئے لوگ ایک دوسرے سے چمٹے بیٹھے تھے۔

اس نے انہیں گھورا اور وہ لرزنے لگے پھر اس کے منہ سے

شکست خوردہ آواز نکلی۔

''میں تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا میں تم سے ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں' سامنے والے مکان کے لوگ کہاں گئے؟''

سہمے ہوئے لوگوں کے منہ سے آواز نہ نکل سکی تو اسے غصہ آ گیا۔

''جواب دو وہ کہاں گئے؟'' وہ دھاڑا۔

''چلے گئے...... چلے گئے...... پہاڑوں کے اس طرف کسی دوسری بستی میں......وہ مکان چھوڑ کر چلے گئے۔'' ایک سہمی ہوئی آواز نے کہا۔

''کسی کو نہیں معلوم وہ کہاں گئے؟''

''نہیں''

اور اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل آیا اور پھر گھوڑے پر سوار ہو کر آگے بڑھ گیا۔ اس کا ذہن تاریک ہو گیا تھا۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ اسے صرف ایک لگن تھی وہ ماہ رخ کو تلاش کرے اور وہ اسے تلاش کرنے لگا۔ پہاڑوں میں' چٹانوں میں ساری رات' اور پھر دوسری صبح' اس کا گھوڑا پہاڑوں میں بھٹکتے بھٹکتے بے دم ہو گیا اور پھر ایک جگہ گھوڑا گر پڑا۔ چند لمحے گہری گہری سانسیں لیتا رہا اور پھر دم توڑ گیا۔

''ماہ رخ......'' اس کے حلق سے وحشت زدہ آواز نکلی اور پہاڑوں میں گم ہو گئی۔ اس نے گھوڑے پر ایک نگاہ ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ سورج بلند ہوتا رہا۔ شام ہوئی اور رات ہو گئی۔ وہ چلتا رہا' شرابیوں کے سے انداز میں اور پھر بے دم ہو کر ایک جگہ گر پڑا۔ اس کے پاؤں سوج گئے تھے' حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے' بھوک اور تھکن سے نڈھال وہ اسی جگہ پڑا رہا۔ پھر چاند نکل آیا اور وہ بے بسی سے چاند کو تکنے لگا اور نہ جانے کیوں چاند نے کچھ عجیب سی شکلیں اختیار کر لیں۔ ایک پاکیزہ چہرہ' لوگ جس کے تقدس کی قسم کھاتے تھے' ممتا بھری آنکھیں......اور پھر......اس نے دیکھا چاند سرخ ہو گیا' خون کی طرح سرخ' اس سے خون ٹپکنے لگا اور اس نے اپنی پیشانی پر اس خون کی نمی محسوس کی' اس کا ہاتھ پیشانی کی طرف بڑھ گیا۔

اور اسی وقت اسے ایک پھنکار سنائی دی۔ ایک خوفناک پھنکار۔ وہ دہشت زدہ ہو کر اٹھ گیا ایک سانپ کا پھن اس کی پیشانی پر لہرا رہا تھا جونہی وہ اٹھا سانپ نے اس کی پیشانی پر کاٹ لیا اور وہ درد سے تڑپ اٹھا۔ اس نے چھلانگ لگانے کی کوشش کی اور چھلانگ لگا کر جس جگہ وہ گرا وہاں دوسرا سانپ موجود تھا۔ سانپوں کا جوڑا تھا جو چاندنی رات میں کسی کی مداخلت برداشت نہ کر سکا۔

شیرزاد تڑپتا رہا۔ سانپوں کا زہر اس کے پورے جسم میں درد بن کر دوڑ رہا تھا۔ زبان سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ رات میں آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔

''ماہ رخ......'' اس کے منہ سے آخری الفاظ نکلے اور اس کے ساتھ ہی ناک کانوں اور منہ سے خون کی پھوار ابل پڑی۔ آنکھیں دہشت زدہ انداز میں کھلی رہ گئیں۔

☆......☆......☆

ان کے پاس صرف دو گھوڑے تھے۔ انہیں پر سامان بھی لدا ہوا تھا۔ قدم قدم پر شیرزاد کے آدمیوں سے مڈبھیڑ کا خطرہ تھا۔ اس لیے وہ بہت احتیاط سے سفر کر رہے تھے۔ ماہ رخ' باپ کے ساتھ گھوڑے پر تھی اور شاہ زمان ماں کو سنبھالے ہوئے تھا۔ تیز دھوپ ہونے کی وجہ سے گھوڑے بری طرح ہانپ رہے تھے۔

''وہ چٹان محفوظ ہے' ہم اس کی چھاؤں میں کچھ دیر آرام کریں گے اور جب دھوپ کی تمازت ختم ہو جائے گی تو پھر سفر کریں گے۔'' گل زمان نے بیٹے سے کہا اور وہ چٹان کی طرف بڑھ گئے۔

جونہی وہ چٹان کے قریب پہنچے' ٹھٹک گئے۔ سامنے ہی کسی انسان کی لاش پڑی تھی۔

''اوہ' لاش ہے' نہ جانے کون بے چارہ ہے' ممکن ہے شیرزاد ہی کا شکار ہو۔ اس کی نظروں میں انسانی زندگی کی کیا قیمت ہے۔'' بوڑھے گل زمان نے لاش کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ سہمے ہوئے سے لاش کے قریب پہنچ گئے۔

لیکن اس کی شکل دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور ماہ رخ کے منہ سے نکلا۔

''یہ...... یہ تو شیرزاد ہے؟...... ہاں دیکھو بابا......؟ یہ شیرزاد ہی ہے۔'' اس کا لہجہ خوشی سے بھرپور تھا۔

''ہاں' شیرزاد ہی ہے۔ اوہ......شاید اسے سانپ نے ڈس لیا ہے۔''

''ایک موذی کا انجام دوسرے موذی کے ہاتھوں ہو گیا۔'' ماہ رخ نے نفرت سے کہا اور شیرزاد کے مردہ چہرے پر تھوک دیا۔

☆......☆......☆

دوسری جنگِ عظیم کے پس منظر میں بہت سی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ اس وقت لاکھوں کی تعداد میں اشرف المخلوقات ذلت آمیز قید کی زندگی گزار رہی تھی۔ لیکن اُن میں کچھ سرپھرے ایسے بھی تھے جو آزادی کے لیے سب کچھ کرنا جانتے تھے

ایم اے راحت

ایک خوفناک ایڈونچر بھرا شاہکار

قید کے دن قید کی راتیں ہزاروں داستانوں کی راتیں ہیں۔
فتہ پر نگاہ ڈالنے کے لئے زندگی کے ایک ایک واقع کو یاد کرنے لئے اس سے عمدہ اور کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ میں برطانوی فوج کا ستانی میجر تھا۔ جنگ عظیم کے سات سال سات صدیوں کی گزرے تھے۔ نجانے کہاں کہاں سرگرداں رہا۔ نجانے کہاں ں جرمنوں سے جنگ کی تھی۔ بالآخران کے ہاتھوں گرفتار ہو ۔ غالباً یہ انیس سو بیالیس کی بات ہے پورا سال جرمنوں کی قید لزار چکا تھا۔ نئے سال کی پہلی تاریخ کو ایک سو بارہ قیدی پورٹ طیاروں میں بھر کر کسی نامعلوم مقام کو روانہ کر دیئے ۔ میرے ساتھیوں میں دو ہندوستانی تھے۔ کچھ برطانوی بیلجیم چند باشندے تھے کچھ فرانسیسی تھے اور کچھ افریقی۔ ہم سب ایک رے سے ناآشنا تھے۔ اس ٹرانسپورٹ طیارے میں ایک رے سے شناسائی کسی طور پر ممکن نہیں تھی۔ بھیڑ بکریوں کی طرح وگ تنگ جگہ میں بھرے ہوئے تھے۔ لیکن ہماری منزل آ گئی۔ ب ویران پہاڑی علاقہ تھا۔ کس جگہ تھا اس کے بارے میں شاید ایک سو بارہ قیدیوں میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا۔ ہم لوگ بوں میں گزرنے والی زندگی کے بارے میں اچھی طرح جانتے ۔ یہاں بھی دھوپ سے جلی ہوئی لکڑی کی بیرکوں میں ہمیں منتقل دیا گیا تھا جن کے اطراف خاردار تاروں کی باڑھ تھی۔ دوسرے ن ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہمیں یہاں مزدوروں کی حیثیت سے لایا ہے اور یہاں اس علاقے میں ہمیں ایک رن وے تیار کرنا ہے سے قیدی پہلے سے اس جگہ موجود تھے ان میں رن وے تیار کرنے کے ماہرین بھی تھے جنہیں ہمارا سربراہ مقرر کر دیا گیا اور اس کے بعد کام کا آغاز ہو گیا۔

ایک جرمن افسر نے غلط سلط انگریزی میں لمبی چوڑی تقریر کر کے ہمیں بتایا کہ اس رن وے کو ہمیں مختصر عرصے میں تیار کرنا ہے اور اس کی تکمیل ہماری زندگی کی ضامن ہے۔ جرمن افسر نے یہ بھی کہا کہ خوراک کی کمی کی وجہ سے ان دنوں یہ ہدایات جاری کر دی گئی ہیں کہ فالتو گھاس کاٹ دی جائے اور خوراک بچائی جائے۔ تم لوگ فالتو گھاس کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہو گے لیکن رن وے کی تعمیر و تکمیل تمہاری زندگی کی ضمانت دے گی اور تمہیں اس کے معاملے میں زندگی دی جائے گی۔ کوئی بھی فالتو گھاس کی مانند کٹنا پسند نہیں کرتا اور اس کے لیے بہترین طریقہ کار یہی تھا کہ رن وے کی تعمیر میں پوری پوری دلچسپی لی جائے۔

قیدیوں کی زندگی سخت افسردگی اور بے چینی کے عالم میں گزر رہی تھی سب کے چہرے قیدیوں کے چہرے نظر آ رہے تھے اور ان کے لئے اتنے ہی الفاظ کافی تھے۔ سارا دن شدید دھوپ اور سخت تپش میں کام کرنا پڑتا تو شام تک اتنی سکت ہی نہ رہتی کہ ایک دوسرے سے گفتگو کی جائے لیکن رفتہ رفتہ جب ہم اس موسم کے عادی ہو گئے تو قیدیوں میں تھوڑی سی زندگی بیدار ہوئی۔ لیکن اپنی قید کے بارے میں وہ ایک ہی تاثر کا اظہار کرتے تھے وہ یہ کہ اب موت ہی انہیں اس قید سے نجات دلائے گی۔ سب کے انداز میں مایوسی پائی جاتی تھی۔

دو ہندوستانی قیدیوں میں سے ایک ایک چٹان اڑاتے

ہونے حادثے کا شکار ہو کر مر گیا۔ دوسرا اس کا سگا بھائی تھا' وہ بھی شدید بیمار ہو گیا اور کوئی بھی لمحہ اس کی موت کا لمحہ بن سکتا تھا۔ دوسرے لوگ اکثر ایک دوسرے سے ملاقاتیں کرتے تھے اور دل بہلانے کی کوشش کرتے تھے۔ کرنل جے تھامس بہت نفیس انسان تھا اور کچھ ایسے لوگوں کا شناسا جنہیں میں بھی جانتا تھا' چنانچہ اس کی اور میری گاڑھی چھن رہی تھی۔ اکثر جے تھامس کہتا:

''اگر ہمیں اسی قید میں مرجانا ہے مسٹر کریم خان تو کیوں نہ یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔''

''یعنی فرار۔'' میں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''ہاں' جو ہم قیدیوں کی زندگی گزار رہے ہیں۔''

''کاش یہ ممکن ہوتا۔''

''ہر ناممکن کو ممکن بنانا پڑتا ہے۔ ورنہ ناممکن' ناممکن ہی رہتا ہے۔'' میں نے پھیکی سی ہنسی کے ساتھ جے تھامس کی بات ٹال دی تھی۔ بھلا ان نامعلوم علاقوں سے فرار کس طرح ممکن تھا اور جرمنوں کا اصول بھی مجھے معلوم تھا۔ وہ کسی مفرور کو زندگی دینے کے قائل نہیں تھے۔ وہ کسی مفرور کو زندگی دے کر الجھنوں میں پھنسنا نہیں چاہتے تھے۔

اکثر اس طرح کے واقعات دوسرے کیمپوں میں پیش آئے تھے۔ ایک دو میں' میں نے بھی دلچسپی لینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ان کے نتائج میرے لئے انتہائی بھیانک تھے جن کی وجہ سے میں نے اپنے آپ کو خدا کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ میں زمیندار گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ والد صاحب کو خان بہادر کا خطاب ملا ہوا تھا۔ پھر جب برطانوی فوج کو جان فروشوں کی ضرورت ہوئی تو بھلا خان بہادر کا لڑکا ان میں شریک کیوں نہ ہوتا۔ مجھے میری مرضی کے خلاف فوج میں بھیج دیا گیا تھا اور میں نے اس مستقبل کو اپنا لیا تھا اور اس کے بعد یہ بات بھول گیا تھا کہ میں اپنی مرضی کے خلاف فوج میں شامل ہوا ہوں۔ بہت سے لوگ تھے بہت سے شناسا تھے بہت سی یادیں تھیں۔ جنہیں قید کی زندگی میں لاتعداد مرتبہ کر چکا تھا۔ لیکن ان سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ بے شمار قیدیوں سے فرار کے موضوع پر گفتگو ہوئی لیکن سب ہی کے چہرے لٹک جاتے تھے۔ کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس پرہول ویرانے سے نکل جانے کی کوشش کرے لیکن ایک رات میری زندگی میں بھی انقلاب آیا۔

وہ بوسیدہ سے لباس میں ملبوس عجیب سے چہرے والا نوجوان تھا۔ نجانے کس طرح میری بیرک میں داخل ہو گیا تھا اور میرے نزدیک ہی لیٹ گیا تھا۔ رات کے دوسرے پہر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نوجوان دراصل کوئی عورت ہے۔ ایک نوجوان اور پرکشش عورت' جس نے رات کی تنہائیوں میں مجھے اچھی طرح خود سے روشناس کرا دیا۔ لیکن بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ان کیمپوں میں عورت کا وجود نہیں تھا۔ لیکن یہ حسین دلکش اور نوجوان عورت مجھے تو کوئی بدروح معلوم ہوئی تھی۔ لیکن اس کی کوئی بھی حرکت بدنہیں تھی۔ رات کے چوتھے پہر اس نے مجھ سے کہا۔

اگر تم اس بات کے خواہشمند ہو کہ ہماری یہ خلوتیں حسین اور تابناک بن جائیں تو تمہیں فرار میں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ اس عورت کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کیا حیثیت رکھتے ہیں مجھے اس وقت احساس ہوا تھا۔ جب میں نے کسی حد تک مایوسی کا اظہار کیا تو اس نے مجھے غیرت دلاتے ہوئے کہا کہ میں فرار ہونے میں تنہا نہیں ہوں گا' بلکہ کچھ اور جیالے بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ رات کے آخری پہر وہ چلی گئی۔ لیکن واقعہ کے تیسرے دن کرنل جے تھامس نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔

''ہم لوگ فرار کا منصوبہ بنا چکے ہیں۔''

''اوہ کرنل کس طرح۔''

''یہ بات ابھی منظر عام پر نہیں آئی ہے۔ لیکن ایک انوکھا واقعہ ہوا ہے جس کی وجہ سے میں تیار ہو گیا ہوں۔''

''کیا واقعہ؟'' میں نے پوچھا۔

''اس روز میں اپنی بیرک میں تنہا تھا۔ رات کے تقریباً پونے دو بجے تھے کہ میں نے اپنے قریب ایک انسانی وجود کو محسوس کیا اور یہ صنف مخالف کا وجود تھا۔ ایک انتہائی دلکش اور خوبصورت عورت تھی وہ۔ اس نے مجھے تیار کر لیا کہ میں فرار کے منصوبے میں اس کا ساتھ دوں۔''

میں حیرت سے کرنل جے تھامس کی صورت دیکھتا رہ گیا تھا۔ پھر میجر ایڈورڈ نے بھی وہی کہانی سنائی اور اس کے بعد دوسرے چند افراد نے بھی جن میں پائلٹ اینڈریو بھی تھا۔ ہم لوگ بالکل ایک جیسے واقعات کا شکار تھے۔ لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ کسی نے دوسرے کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس سے پہلی رات وہ خود اس واقعہ سے دوچار ہو چکا ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کی باتوں پر مسکراتے تھے لیکن فرار کا منصوبہ بہرحال پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ رن وے کی تیاری مکمل ہونے کو تھی اور جو منصوبہ کرنل جے تھامس کی زبانی دوسرے لوگوں تک پہنچا۔ وہ یہ تھا کہ رن وے کے پہلے آزمائشی دن جب ایک طیارہ اس رن وے پر اترے گا تو اینڈریو اسے اڑانے کے لئے تیار ہوگا۔ جے تھامس ایسا ماحول پیدا کر دے گا کہ طیارے تک رسائی ہو سکے' باقی افراد اس کے لئے دوسری تمام چیزوں کا انتظام کریں گے۔ الغرض یہ منصوبہ انتہائی ذہانت اور ہوشیاری سے پایہ تکمیل کو پہنچا اور آخری رات جس کی دوسری صبح جرمن ٹرانسپورٹ

طیارے کی آمد متوقع تھی وہی عورت ہم سب سے آملی' اس نے اپنا نام جینس بتایا۔ اس سے زیادہ اس نے کچھ کہنے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ خود بھی ہمارے ساتھ فرار کے منصوبے میں شریک ہو گئی۔ علی الصبح ہم آپریشن کے لئے اپنی بیرکوں میں تیار تھے۔ ایڈورڈ نے بہت سی اسٹین گنیں اور دستی بم حاصل کر لئے تھے جو ہمارے مقاصد کی تکمیل کے لئے تھے۔ یہ سارے کام بیان کرنا تو آسان محسوس ہو رہا ہے لیکن جس انداز میں ہمیں انجام دینا پڑے یہ ہم ہی جانتے ہیں۔

طیارہ صبح سوا سات بجے رن وے پر اترا اور اس کا تالیوں کی گونج میں خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن اس کے فوراً بعد ہی تالیاں بجانے والے خاک وخون میں ڈوب گئے۔ پائیلٹ اینڈریو نے طیارے کا کنٹرول سنبھال لیا۔ ایک اور نوجوان کو پائلٹ بنا اور باقی تمام لوگ جن کی تعداد زیادہ نہیں تھی گولیاں اور بم برساتے ہوئے بالآخر طیارے میں داخل ہوئے۔ طیارے کا انجن اسٹارٹ ہوا اور نیچے آگ اور دھوئیں کے بادل چھوڑ کر ہم فضا کی بلندیوں میں پرواز کر گئے۔

کرنل بے تھا اس کے پاس نقشہ موجود تھا یہ فرار ہمیں بہت حیرت انگیز لگ رہا تھا۔ لیکن بہر طور اب ہمارا طیارہ فضا کی وسعتوں میں محو پرواز تھا۔ بشرطیکہ دوسرے جہاز اس کا تعاقب نہ کریں۔ لیکن یہ کس طرح ممکن تھا۔ دو جرمن فائٹر اس ٹرانسپورٹ طیارے کا تعاقب کرنے لگے اور اینڈریو اپنی فضائی مہارت استعمال کر کے انہیں چکر دیتا رہا۔ لیکن ہم لوگ راستہ بھٹک گئے تھے اور اب ہمارے چاروں طرف برف ہی برف پھیلی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں خطہ زمین کے کون سے علاقے میں تھے لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم برف کی دنیا میں سفر کر رہے ہوں۔

جرمن فائٹر شاید کسی خاص وجہ سے واپس چلے گئے تھے۔ کیونکہ کافی دیر سے ہمیں ان کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ لیکن پھر اینڈریو کی خوفزدہ آواز نے ہمارے دل دہلا دیئے اس نے فیول ختم ہونے کا اعلان کیا تھا اور کہا تھا کہ اب طیارے کو یہیں اتارنا پڑے گا۔ خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔

علاقہ بالکل ویران تھا۔ ہر رخ سے سمندر کی جانب ڈھلوان' گلیشیر' سمندر کی طرف کھسکتے جا رہے تھے اور ان کی وجہ سے سمندر کی سطح پر بڑی بڑی مہیب دراڑیں پڑ جاتی تھیں ان دراڑوں پر کہیں برف کی ہلکی ہلکی تہیں جم گئی تھیں جن کی وجہ سے یہ بے حد خطرناک تھیں۔ یہ سطح اتنی کمزور تھی کہ اگر اس کے کسی حصے پر پاؤں پڑ جاتا تو وہ ٹوٹ سکتی تھیں' یہ دراڑیں گلیشیر کی مسلسل حرکت کی وجہ سے بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ اینڈریو نے جب طیارہ اس علاقے میں اتارا تو دودھیا رنگ کی دبیز کہر پھیلی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے زمین کے نشیب وفراز نظر نہیں آرہے تھے۔ اوپر نیلا اور صاف آسمان تھا اور نیچے سفید کہر ایک جمے ہوئے سمندر کی مانند نظر آئی تھی۔ لیکن اینڈریو ہر خطرے کو مول لینے کا فیصلہ کر چکا تھا کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ لیکن نیچے اترتے ہوئے وہ اس کہر کی وجہ سے صحیح بلندی کا اندازہ نہیں لگا سکا۔ یکا یک جہاز کو زبردست جھٹکا لگا اور اس کا دایاں بازو ایک برفانی تودے سے ٹکرا گیا۔ گڑگڑاہٹ کی شدید آواز بلند ہوئی اور لیفٹیننٹ ایڈورڈ اپنی نشست سے اچھل کر گر پڑا۔ میجر مکلیش کھڑکی کے شیشے سے ٹکرا کر باہر برف پر جا گرا اور اس کی دونوں کلائیاں ٹوٹ گئیں۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی اسی طرح کے واقعات پیش آئے تھے۔

کو پائلٹ شکستہ کیبن سے گھسٹتا ہوا باہر نکلا لیکن باہر کا منظر

مولانا حسرت موہانی اور قائداعظم

مولانا حسرت موہانی کا شمار جدید اردو صحافت کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ آپ نے ۱۹۰۳ء میں رسالہ اردوئے معلیٰ کا آغاز کیا اور ۱۹۲۸ء میں اسے باقاعدہ اخبار بنا دیا۔ اردوئے معلیٰ میں مولانا حسرت ہندوستانی سیاست پر بے دھڑک تبصرے کیا کرتے تھے۔ مولانا کی زندگی کا مقصد انگریزوں کی مخالفت اور انہیں اپنے وطن عزیز سے باہر نکالنا تھا۔ آپ ہندوستان کے نوآبادیاتی درجے کے شدید خلاف تھے اور اپنے وطن کی انگریزوں سے مکمل آزادی چاہتے تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی فارن کمیٹی نے ۱۹۳۸ء میں مولانا کو اسلامی ممالک کے دورے پر بھیجا جس کے دوران آپ نے ان ممالک میں مسلم لیگ کے اور برصغیر کے مسلمانوں کے دوقومی نظریئے کو بھرپور انداز میں اُجاگر کیا۔ مولانا حسرت ایک ماہر اور قابل اقتصادی ماہر بھی تھے۔ بھارت کے صوبہ یو پی میں مسلمانوں پر کانگریس کی زیادتیوں پر آپ نے رپورٹ مرتب کی جسے قائداعظم نے بے حد سراہا۔ قائداعظم کی خواہش پر ہی آپ نے یہ رپورٹ تیار کی تھی۔ مولانا حسرت موہانی گاندھی کی چالاکیوں اور چالبازیوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ آپ نے گاندھی کے بارے میں کہا کہ ''گاندھی بہت چالاک آدمی ہے' ایک موقع ایسا آیا تھا کہ اس نے ہم سب کو اپنے فریب میں گرفتار کر لیا تھا۔ البتہ وہ قائداعظم کو کبھی بھی بیوقوف نہیں بنا سکا کیونکہ وہ اس کی شاطرانہ چالوں کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ اس نازک دور میں انہیں قائداعظم جیسا مخلص اور ذہین رہنما مل گیا ہے۔''

ابوبکر جعفری کی کاوش

دیکھ کر اس کے ہوش اُڑ گئے۔ طیارہ جس تودے سے ٹکرایا تھا اس کے قریب ہی ایک انتہائی گہرا درہ منہ کھولے جہاز کو نگلنے کے لیے تیار تھا اور طیارے کی دم کے پاس ایک اور دراڑ بنتی جا رہی تھی اور طیارہ آہستہ آہستہ درے کی جانب پھسلتا جا رہا تھا۔

بمشکل تمام ہوش و حواس بحال کیے گئے تو اس خوفناک بات کا انکشاف ہوا اور ماہرین جہاز سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد اس بات کا اعلان کیا کہ جہاز کے غار میں گرنے کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ وہ برف میں بری طرح دھنس گیا ہے۔ اس طرح تھوڑا بہت سکون ہوا۔ زخمیوں کو ٹوٹے ہوئے جہاز کے اندر لے آیا گیا تھا تاکہ سرد ہوا اور برف سے بچاؤ ہو سکے۔ جو سامان باہر گر گیا تھا اسے بھی اندر لے آیا گیا۔

ٹرانسپورٹ طیارے میں اس برفانی جہنم سے بچاؤ کا کوئی معقول بندوبست نہیں تھا لیکن خوش بختی یہ تھی کہ وہ یہاں موجود فوجیوں کے لئے تحائف لے کر آیا تھا جو کھانے پینے کی چیزوں اور دوسری اشیاء کی شکل میں تھا اور ہم نے اسے اسی حالت میں اغوا کر لیا تھا۔ جہاز کا وائرلیس ٹوٹ چکا تھا اور اب ہمارے پاس نہ تو روشنی کا کوئی انتظام تھا اور نہ ہی کوئی اور ایسی شے جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہو۔ سب سے ہولناک بات یہ تھی کہ ہمیں اس جگہ کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ منجمد کر دینے والی ہوائیں طیارے کے کھلے حصوں سے ٹکرا ٹکرا کر اندر داخل ہو رہی تھیں۔ چنانچہ اس سے بچنے کے لئے ترپال کے ٹکڑوں سے کھلے ہوئے حصے اچھی طرح ڈھانپ دیئے گئے۔ پیراشوٹوں کے انبار اپنے جسموں کے گرد لپیٹ لئے گئے تاکہ بدن گرم رہ سکیں لیکن اس کے باوجود برف کے باریک ذرات جہاز کے ہر سوراخ اور دراڑ سے اندر آ رہے تھے۔

ہم ایک دن اور ایک رات اسی طرح جہاز کے اندر قیام پذیر رہے۔ جینس ہمارے ساتھ تھی۔ جب موسم کسی قدر صاف ہوا تو ہم نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ لیکن صورت حال بڑی مایوس کن تھی۔ چاروں طرف برفانی سطح پر ناقابل عبور دراڑیں بکھری ہوئی تھیں اور جہاں تک نظر جاتی' برف کا بیکراں سمندر نظر آتا۔ ہم یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکے کہ کسی مناسب جگہ پہنچنے میں کتنا وقت لگ سکتا ہے۔ لیکن بہرحال متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ اس جہاز میں زندگی نہیں گزاری جا سکتی بلکہ زندگی کی تلاش میں سفر کرنا ہی پڑے گا اور اس کے بعد ہم لوگ باہر نکل آئے۔

لمبی چوڑی دراڑیں منہ پھاڑے ہمیں نگلنے کے لئے تیار تھیں۔ بہت کوشش کے بعد ایک طرف سے ایک مخدوش سا راستہ ملا جو ان دراڑوں کی زد سے باہر تھا اور ہم اسی سمت چل پڑے۔

لیکن یہ ہماری خام خیالی تھی۔ ابھی ہمارے سفر کے آٹھ گھنٹے پورے بھی نہیں ہوئے تھے۔ ہم ایک قطار کی شکل میں چل رہے تھے۔ آخری آدمی ایڈورڈ تھا۔ وہ باتیں کرتا ہوا چلا آ رہا تھا اس سے آگے میں اور پائلٹ اینڈریو تھے۔ ہمارے آگے میجر مکلیش اور جے تھامس اس سے آگے جینس اور دوسرے چند افراد چل رہے تھے کہ دفعتاً ایڈورڈ کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور ہم پلٹ کے دیکھنے لگے لیکن ایڈورڈ غائب تھا اور جہاں اب سے کچھ دیر پہلے ہم لوگ موجود تھے وہاں ایک غار منہ کھولے موجود تھا۔ ہمارے بدن دہشت سے سن ہو گئے۔ میں نے جلدی سے پیٹ کے بل لیٹ کر اس گڑھے میں جھانکا۔ نیلی برف اس کے اندر دور تک نظر آ رہی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا اور ایڈورڈ کو تلاش کرنے لگا۔ دفعتاً گہرائیوں میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایڈورڈ ایک چٹان سے ٹکرا کر رک گیا ہے اور ہاتھ پاؤں پھیلائے پڑا ہے۔ میرے ساتھی اینڈریو نے چیخ چیخ کر دوسرے افراد کو اس حادثے کی اطلاع دی اور ہم سب ایڈورڈ کی جان بچانے میں مصروف ہو گئے۔ پیراشوٹ کی رسیوں سے ایک مضبوط رسہ بنایا گیا اور اسے گہرائیوں میں لٹکا دیا گیا۔ یہاں تک کہ رسہ ایڈورڈ تک پہنچ گیا۔ ایڈورڈ کی کارروائی اب ہم صاف دیکھ سکتے تھے۔ رسے کا ایک پھندہ اس نے کمر میں باندھا اور دوسرا کلائی میں اور اس کے بعد ہمارے ساتھیوں نے اسے کھینچنا شروع کر دیا۔ ایک ایک فٹ کر کے ہم نے اسے تقریباً سو فٹ اوپر کھینچا۔ لیکن اب ایک اور مصیبت آ پڑی۔ اس گہرے کنوئیں کا منہ چھوٹا تھا اور برف کی ایک چٹان آگے جھکی ہوئی تھی۔ ایڈورڈ کو کھینچنے کے دوران برف کی چٹان سے کٹ گئی اور اب ایڈورڈ اس چٹان کے عین نیچے آ کر رک گیا۔ اسے مزید اوپر نہیں کھینچا جا سکتا تھا کیونکہ سر پر لٹکی ہوئی برف کی چٹان راستہ روکے ہوئے تھی۔ جے تھامس نے مشورہ دیا کہ ایڈورڈ کو تھوڑا اور نیچے لٹا دیا جائے تاکہ وہ چٹان سے کچھ اور دور ہو جائے پھر ایک رسی میں چھرا باندھ کر ایڈورڈ کے پاس پہنچا دیا گیا۔ اس چھرے کی مدد سے ایڈورڈ نے آہستہ آہستہ وہ چٹان کاٹی جو اس کے اوپر آنے کا راستہ روکے ہوئے تھی اور اسے باہر کھینچ لیا گیا۔

لیکن اس حادثے نے سب کے حوصلے پست کر دیئے تھے۔ چنانچہ سب ہی پژمردہ نظر آنے لگے تھے اور یہ تو ابتداء تھی۔ آگے نجانے ہمارے لیے کیا کیا تھا۔ چنانچہ سب ہی ہمت ہار گئے اور واپس اس غار نما جگہ کو پھلانگ پھلانگ کر طیارے کی طرف چل پڑے۔

برفانی طوفان مسلسل اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ جے تھامس کے پاؤں میں برف کی ٹھنڈک کی وجہ سے کچھ تکلیف ہو گئی تھی۔ لیکن بہرحال کسی نہ کسی طرح وقت کاٹا گیا۔ ہمارے ایک ساتھی ریڈیو

آپریٹر نے شکستہ ریڈیو کو اس قابل بنا لیا تھا کہ اس سے کسی اتحادی پارٹی سے بات کی جا سکے۔ ہم لوگوں نے انتہائی محنت کے بعد آگ جلانے کے ایسے بندوبست بھی کر لئے تھے جس سے برف میں جمی ہوئی خوراک کو قابل استعمال بنایا جائے۔ یوں کئی تاریک اور بھیانک راتیں گزر گئیں۔ ہم سب ایک دوسرے سے چپکے لاشوں کی مانند پڑے رہتے۔ جینس عموماً خاموش ہی تھی اور کسی سے کوئی گفتگو نہیں کرتی تھی۔ سب لوگ اس کے ساتھ گزارے ہوئے حسین لمحات کو بھول گئے تھے۔

بہر طور طوفانی ہواؤں کے دباؤ سے طیارے کی کیلیں ٹوٹنے کی وحشتناک آوازیں اُبھرنے لگیں اور رفتہ رفتہ طیارے کا پچھلا دھڑ اگلے سے علیحدہ ہو کر گڑھے کی جانب پھسلنے لگا۔ اس خوفناک عذاب سے بچنے کے لئے ہم نے اسے رسیوں اور تاروں کی مدد سے باندھا اور عارضی طور پر اسے روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ ریڈیو آپریٹر اب ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر سگنل لے رہا تھا۔ غالباً اس برف زار میں قیام کے ساتویں دن کی بات ہے کہ ہم نے ایک جہاز دیکھا لیکن سخت برفانی موسم کی وجہ سے ریڈیو کنٹرول پر اس سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ ہم لوگ مایوس ہو گئے جہاز ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اسی دوران طوفان زوروں پر آ گیا اور انتہائی خوفناک تباہی پھیلی جس میں ہم اپنے دو آدمیوں کو کھو بیٹھے۔ لیکن بہر طور ان تمام ہولناک واقعات سے نمٹنا ہی تھا جو کچھ بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ ہم زندگی سے بیزار ہوتے جا رہے تھے کبھی کبھی تو دل چاہتا کہ خود کو اسی حال میں چھوڑ کر موت کا انتظار کریں۔ لیکن ایسے موقعوں پر جینس مردانہ وار کھڑی ہو جاتی وہ ہم مردوں کو بزدلی کا طعنہ دیتی اور خود ہمیں چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی۔ میجر ایڈورڈ ہمیشہ اس کا ساتھ دیتا تھا اور اس کے بعد سب ہی سنبھل جاتے اور نئے سرے سے زندگی کی جدوجہد کا آغاز کر دیتے۔ پھر ایک اور بھیانک شام آئی۔ جینس آگے آگے چل رہی تھی کہ دفعتاً اس کے قدموں کے نیچے برف نکلی اس نے ادھر ادھر سہارا لینا چاہا لیکن ہاتھوں چڑھے دستانوں کی وجہ سے کناروں پر گرفت نہ کر سکی اس کے حلق سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور پھر اوپر سے منوں برف پھسل کر اس دراڑ میں گرنے لگی آن کی آن میں جینس برف کی اتھاہ گہرائیوں میں دفن ہو چکی تھی۔

اس حادثے نے ہمیں نڈھال کر دیا۔ سب ہی مایوس ہو گئے تھے۔ لیکن رات کے آخری حصے میں دفعتاً میجر ایڈورڈ کی چیخوں سے ماحول گونج اٹھا۔ اس پر وحشت کا دورہ پڑا تھا۔ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر جینس جینس چلا رہا تھا۔ شائد اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ لیکن پھر جو کہانی اس نے سنائی اس نے ہمارا ذہنی توازن خراب کر دیا۔ اس نے کہا۔ ''کسی زمانے میں جینس میری بیوی تھی ہم دونوں کے درمیان شدید محبت تھی اور ہماری شادی محبت کا نتیجہ ہی تھی لیکن پھر ہمارے درمیان چھوٹے چھوٹے اختلافات ہوئے۔ زیادتی میری ہوتی تھی بیشک زیادتی میری ہوتی تھی۔ جینس کچھ دن برداشت کرتی رہی پھر وہ بپھر گئی اور ہمارے درمیان طلاق ہو گئی۔ جینس مجھ سے الگ ہو گئی کچھ دن تک وہ الگ رہی لیکن پھر اس نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا کہ میں اسے معاف کر دوں وہ میرے بغیر نہ رہ سکے گی۔ میں نے اسے نفرت سے ٹھکرا دیا اور پھر میں اپنی کمپنی کے ساتھ نہ جانے کہاں کہاں پہنچا اور جینس کو بھول گیا۔ لیکن وہ مجھے نہ بھول سکی۔ صرف میری وجہ سے اس نے بھی فوج میں شمولیت اختیار کی اور مجھے تلاش کرتی رہی۔ پھر ایک ایسی جگہ وہ جان بوجھ کر گرفتار ہوئی جہاں میں بھی قیدی تھا اور وہ کیمپ میں آ گئی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے نکال کر لے جائے گی میں خود بھی اس قید سے فرار ہونا چاہتا تھا لیکن ہمت نہ تھی۔ اس نے کوششیں شروع کر دیں نہ جانے کیا جادو کیا اس نے لوگوں پر کہ فرار کے لئے بہت سے لوگ تیار ہو گئے۔ اس نے ہر شخص میں ایک نئی روح پھونک دی تھی اس کا عزم تھا کہ وہ میری زندگی بچائے گی۔'' لیکن ایڈورڈ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ہم سب ساکت رہ گئے۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا تھا کہ جینس نے کس طرح ہمیں اس فرار کے لئے تیار کیا تھا۔ لیکن کون زبان کھولتا اسی وقت آخری پہر میجر جینس جینس پکارتا ہوا دوڑ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے برف کی کہر میں داخل ہو گیا۔ اس کہانی اور اس المناک واقعے نے ہمارے دلوں کو بے حد افسردہ کر دیا تھا۔ لیکن تقدیر کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ پانچویں دن کی بات ہے کہ ایک سپلائی طیارہ ہمیں اپنے سروں پر منڈلاتا ہوا نظر آیا۔ اس پر اتحادی نشان بنا ہوا تھا۔ اس طیارے نے ہمارے لئے سامان خورد و نوش اور ضرورت کی دوسری چیزیں گرائیں جن کے حصول کے بعد ہماری جان میں جان آئی اور سفر میں قدرے آسانی ہو گئی۔ اس کے بعد طیارہ سارا دن وقفے وقفے سے ہمارے سر پر منڈلاتا رہا۔ ایک بار اس نے ہمیں ایک تحریری پیغام بھی دیا جس میں بتایا گیا کہ ہیلی کاپٹر کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ ہم یکجا اور محتاط رہیں۔ دوسرے دن صبح دس بجے فضا میں ہیلی کاپٹر نظر آیا اور ہمیں اٹھا کر ایک امدادی کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میجر ایڈورڈ دوڑتا ہوا نہ جانے کس طرح امدادی کیمپ تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے وہاں ہماری کہانی سنا کر مدد کی درخواست کی تھی لیکن اس پر نمونیے کا شدید حملہ ہوا تھا اور وہ بچ نہیں سکا تھا۔

☆......☆......☆

بلیک بیگ

ایشیا اور یورپ کے درمیان ہونے والی رقابت کا نتیجہ۔ ایشیا کے ڈاکٹر نے ایک عظیم کارنامہ سرانجام دے دیا جس کی وجہ سے اُسے یورپ میں ایک اعلیٰ اعزاز سے نوازا گیا۔ لیکن کچھ یورپین کو اُس کی یہ ترقی ایک آنکھ نہ بھائی اور اُس نے ایک خوفناک انتقام لینے کا سوچا......

ایم اے راحت

ایک ڈاکٹر کو پیش آنے والا خوفناک واقعہ جس کا دماغ ایک گوریلے سے تبدیل کر دیا گیا تھا

ڈاکٹر فیاض نے آخری بار عالیہ کے گال تھپتھپائے اور پھر دوسرے لوگوں کی طرف الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے جہاز کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ سیڑھیاں طے کر کے انہوں نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا۔ ڈاکٹروں اور دوسرے سی آف کرنے والے حکومت کے نمائندوں' اخبار نویسوں اور فوٹو گرافروں کے ہجوم نے ان کی طرف ہاتھ لہرائے۔ ان ہاتھوں میں عالیہ کا سفید ہاتھ بھی گردش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر فیاض نے ان کی طرف ہاتھ ہلایا اور پھر اندر داخل ہو گئے۔ ان کے پیچھے جہاز کے دوسرے مسافر بھی آ رہے تھے۔

جہاز میں اپنی کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے گہری سانس لی اور دوسرے مسافروں کو آتے جاتے دیکھتے رہے۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی حالانکہ عام حالات میں وہ ایک زندہ دل آدمی تھے اور ان کے ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔

جہاز کے آخری مسافر کے اندر آ جانے کے بعد سیڑھی ہٹا دی گئی پھر ایئر ہوسٹس نے مسافروں سے حفاظتی پیٹیاں کس لینے کی درخواست کی اور اس کے بعد جہاز فضا میں پہنچ گیا' مسافر پرسکون ہو گئے۔ لیکن ڈاکٹر فیاض کے ذہن میں وہ بے نام سی خلش بدستور تھی۔ حالانکہ یہ بے پناہ خوشی کا موقع تھا۔ دنیا نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کر لیا تھا۔ وہ ایشیا کے لیے ایک عظیم اعزاز لینے جا رہے تھے۔ یہ اعزاز صرف ان کے ملک کے لیے ہی نہیں بلکہ پورے ایشیا کے لیے باعث فخر تھا۔ یورپ کے مغروروں نے بہرحال ایشیا کی برتری تسلیم کی تھی اور ڈاکٹر فیاض اس کا ذریعہ تھے۔

ڈاکٹر فیاض دماغ کے ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے دماغ کے انتہائی کامیاب آپریشن کئے تھے اور اس سلسلہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے ایک غیر ملکی سفارتی نمائندے کے کاسہ سر میں ایک اور مردہ انسان کا دماغ رکھ دیا تو دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ یہ سفارتی افسر ایک کار کے حادثے میں سخت زخمی ہو گیا تھا۔ اس کا بھیجہ نکل پڑا تھا اور پاش پاش ہو گیا تھا۔ بظاہر اس کا زندگی سے تعلق ختم ہو گیا تھا۔ لیکن جسم کے کچھ اعضا کام کر رہے تھے۔ اسی وقت ڈاکٹر فیاض نے یہ تجویز پیش کی کہ اس کے سر کی ہڈیوں کو جوڑ کر اس میں دوسرا دماغ رکھا جا سکتا ہے اور پھر انہوں نے چند گھنٹوں کے اندر یہ کام کر دکھایا۔

سفارتی افسر کی شخصیت ضرور بدل گئی تھی لیکن اس کی زندگی بچ گئی اور کچھ عرصہ کے بعد وہ ایک عام انسان بن گیا۔

ڈاکٹر فیاض کے اس کارنامے نے پوری دنیا کو حیرت

میں ڈال دیا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر فیاض نے ایسے ہی کئی کامیاب آپریشن کئے اور ان کی شہرت پوری دنیا میں ہو گئی۔ چنانچہ اس سال پوری دنیا نے متفقہ طور پر سب سے بڑا ڈاکٹری کا اعزاز ڈاکٹر فیاض کو دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ ڈاکٹر فیاض کے ملک میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ ان کی حکومت نے انہیں مقامی سرکاری اعزاز دیئے اور انہیں اس کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے تیار کر دیا جس میں انہیں اعزاز ملنا تھا۔

اور آج وہ کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے یورپ کے ایک ملک جا رہے تھے۔ وطن سے باہر وہ درجنوں بار گئے تھے اس دوران ان کی نوجوان لڑکی عالیہ ہمیشہ تنہا رہی تھی۔ لیکن اس بار نہ جانے کیوں وہ عجیب سے تردّد کا شکار تھے' نہ جانے کیوں ان کا دل ملک سے باہر جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن انہوں نے اس تردّد کا اظہار کسی پر نہیں کیا اور بظاہر ہنسی خوشی تیار ہو گئے۔ ایئر پورٹ پر انہیں بے شمار افراد الوداع کہنے آئے تھے اور انہوں نے ان کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا۔

لیکن وہ تردّد ان کے دل سے دور نہیں ہوا تھا' انہوں نے پھر ایک گہری سانس لی اور ایئر ہوسٹس کی طرف دیکھنے لگے۔

''یس پلیز'' ایئر ہوسٹس ان کی طرف جھک آئی۔

''ایک گلاس پانی'' انہوں نے آہستہ سے کہا۔

اور ایئر ہوسٹس گردن جھکا کر چلی گئی۔ چند منٹ کے بعد اس نے ایک خوبصورت بلوریں گلاس میں پانی پیش کر دیا اور ڈاکٹر فیاض نے پانی پینے کے بعد گلاس واپس کر دیا پھر انہوں نے گردن جھٹکی اور اس تردّد کی وجہ دریافت کرنے لگے۔

آخر کیا وجہ ہے کیوں وہ اس کیفیت کا شکار ہیں اس طرح تو بلاوجہ کی ایک کوفت رہے گی۔ انہوں نے اپنی کیفیت کا تجزیہ کرنا شروع کر دیا۔ لیکن کوئی ایسی گرہ سامنے نہ آئی جس نے انہیں اس تردّد میں مبتلا کیا تھا اور پھر انہوں نے ایک ہی اندازہ قائم کیا یہ حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خوشی کی وجہ ہے۔ جس کا اظہار وہ کسی پر نہیں کر سکے۔ عالم خوشی میں انسان مختلف کیفیات کا شکار ہو جاتا ہے اور بہر حال یہ کیفیت ایسی نہیں ہے۔ جس پر وہ قابو نہ پا سکیں۔ انہیں خود پر کنٹرول کرنا ہوگا ورنہ وہ اس کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکیں گے ورنہ جانے ان کے بارے میں کیا کیا تاثر قائم کیا جائے گا۔ چنانچہ وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔

پھر انہوں نے اپنے بریف کیس سے اپنی دوا نکالی جو ان کے پاس موجود تھی۔ یہ دوا وہ اکثر سکون کے لیے استعمال کرتے تھے۔ دوا کی دو گولیاں کھا کر وہ اپنی سیٹ کی پشت سے ٹک گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ نجانے کتنے گھنٹے وہ مسلسل سوتے رہے' پھر ایئر ہوسٹس نے ہی انہیں جگایا تھا۔ جہاز ایک درمیانی ملک میں اتر رہا تھا۔

اس ملک میں چند گھنٹے قیام کے بعد جہاز آگے بڑھ گیا لیکن اب ڈاکٹر فیاض خود کو پرسکون محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی اس کیفیت پر قابو پا لیا تھا۔ بالآخر ان کا طویل سفر ختم ہو گیا۔ اس وقت ملک میں رات کے پونے بارہ بجے تھے۔ پورا ایئر پورٹ کہر میں ڈھکا ہوا تھا۔ تیز روشنیاں بھی کہر میں ڈوبی ہوئی ٹمٹما رہی تھیں۔ سردی کا احساس شدید تھا۔ ڈاکٹر فیاض نے اترنے سے قبل اوورکوٹ پہن لیا اور پھر فلیٹ ہیٹ سر پر جما کر وہ دوسرے مسافروں کے ساتھ جہاز کی سیڑھیاں نیچے اُترنے لگے۔

رن وے پر جہاز کے نزدیک ہی چند افراد اس سردی کے باوجود ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ انہوں نے ان کا پرجوش استقبال کیا اور پھر اپنا تعارف کرانے لگے۔ ڈاکٹر فیاض خوش اخلاقی سے ان سے ملے اور پھر استقبال کرنے والے انہیں ایک خوبصورت لمبی کار میں لے کر چل پڑے۔ ڈاکٹر فیاض اب پوری طرح مطمئن تھے اور اپنی کچھ عرصہ قبل والی کیفیت پر مسکرا رہے تھے۔

لمبی کار سفر کرتی رہی اور ڈاکٹر کا استقبال کرنے والے ان کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگے۔ ڈاکٹر ان کی عقیدت پر ممنون تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک اعلیٰ درجے کی خوبصورت

کوٹھی کے آہنی گیٹ پر پہنچ گئے۔ یہ کوٹھی شہر سے باہر ایک پرفضا مقام پر تھی۔ اس کے اطراف کے مناظر کو صاف نظر نہیں آ رہے تھے لیکن انداز ے سے بہت حسین معلوم ہوتے تھے۔ کار پورچ میں لگ گئی اور چند حسین لڑکیوں نے ڈاکٹر کو گلدستے پیش کیے۔

ڈاکٹر فیاض کے میزبان انہیں لئے ہوئے ایک خوبصورت کمرے میں پہنچ گئے۔ ایک بج چکا تھا۔ ان لوگوں نے ڈاکٹر سے آرام کرنے کے لیے کہا اور پھر انہیں اسی کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک خوبصورت سی ملازمہ ڈاکٹر کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی۔ ڈاکٹر فیاض نے لباس تبدیل کیا اب ان کی بے چینی بالکل رفع ہو چکی تھی۔ گرم کمرے کے گرم بستر پر انہیں نیند آ ئی اور وہ اطمینان سے سو گئے۔

دوسرے دن کافی دن چڑھے جاگے۔ ملازمہ نے ضروری انتظامات کر لئے تھے۔ چنانچہ گرم پانی سے عمدہ غسل کے بعد وہ تروتازہ ہو گئے۔ چند ڈاکٹر ان سے ملاقات کے لیے پہنچ گئے تھے۔ جنہوں نے ان کے ساتھ ناشتا کیا۔ کچھ اخباری نمائندے بھی موجود تھے جنہوں نے ڈاکٹر کے تاثرات قلمبند کئے اور اس کے بعد افسر مہمان نوازی نے انہیں دن بھر کا پروگرام بتایا۔ اس پروگرام میں چند ثقافتی اداروں کی سیر اور چند ہسپتالوں کا معائنہ شامل تھا۔ کانفرنس کا انعقاد چوتھے دن تھا۔

ڈاکٹر فیاض نے بہترین دن گزارا' بہت سے لوگوں سے ملے۔ جدید ترین ہسپتال دیکھے۔ کچھ دماغی مریضوں کا معائنہ کر کے ان کے معالجوں کو مفید مشورے دیئے اور پھر رات کو کچھ ثقافتی پروگرام دیکھنے کے بعد وہ واپس اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ اس گہما گہمی میں ان کا دل لگ گیا تھا اور اب وہ پوری دلجمعی سے کانفرنس میں شرکت کی تیاریاں کر رہے تھے۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ آرام کرنے لیٹ گئے اور حسبِ معمول آرام کی نیند سوئے۔ دوسرے دن کے لیے بھی مقامی لوگوں نے پروگرام ترتیب دیا تھا۔ اس دن وہ ان غیر ملکی ڈاکٹروں سے ملے جو دوسرے ممالک سے کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ تمام ڈاکٹر ان سے بڑی عقیدت کے ساتھ ملے اور پھر تیسرا دن بھی دلچسپ مصروفیات میں گزرا۔ چوتھے دن انہیں کانفرنس میں شریک ہونا تھا۔ چنانچہ اس رات وہ جلدی واپس آ گئے۔ انہیں اپنے طور پر کچھ تیاریاں کرنا تھیں۔ رات کو گیارہ بجے تک وہ ان تیاریوں میں مصروف رہے اور پھر آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ وہ جلد سو جانا چاہتے تھے تاکہ دوسرے دن چاق و چوبند رہیں۔

بستر پر لیٹنے کے بعد انہیں عالیہ یاد آئی۔ عالیہ ان کی اکلوتی بچی تھی جو چھ سال کی عمر میں ماں سے محروم ہو گئی تھی ڈاکٹر فیاض اس کے باپ ہی نہیں بلکہ اس کے لیے ماں کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ یوں تو عالیہ کے لئے کئی عورتیں ملازم تھیں جو ہر طرح اس کا خیال رکھتیں۔ لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر فیاض خود بھی عالیہ کی دیکھ بھال کرتے تاکہ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔

حالانکہ عمر زیادہ نہیں تھی' لیکن ان کے ذہن میں دوسری شادی کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ سوتیلی ماں کا وجود عالیہ کے لیے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح انہوں نے پوری زندگی تج دی اور اب عالیہ بائیس سال کی تھی۔ باپ پر جان چھڑکتی تھی ان کی شکل دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔

اور جب ڈاکٹر کے لیے عالمی اعزاز تجویز ہوا تو عالیہ خوشی سے پھولی نہیں سمائی تھی۔ اس نے اپنے عزیز دوستوں کی شاندار دعوت کی تھی اور اس پارٹی میں ڈاکٹر کو بھی شریک کیا تھا۔ پھر اس نے باپ کو خوبصورت تحفہ پیش کیا اور درحقیقت ڈاکٹر فیاض کے لیے بیٹی کا یہ تحفہ اس عالمی اعزاز سے برتر تھا جو انہیں ملنے والا تھا۔

انہوں نے مس عالیہ فیاض کا دلی شکریہ ادا کیا تھا اور یہ محفل قہقہوں پر ختم ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر فیاض کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ان کا پروگرام ایک ہفتے کا تھا اور وہ ایک ہفتہ جلد از جلد گزار لینا چاہتے تھے۔ تاکہ اپنی بیٹی سے جا ملیں۔ انہیں ایسا لگ رہا

تھا جیسے طویل عرصہ سے بیٹی سے جدا ہوں اور انہیں یقین تھا کہ عالیہ بھی ایسا ہی محسوس کر رہی ہو گی۔
حالانکہ وہ ایک ماڈرن فیملی رکھتے تھے۔ بے جا پابندیاں انہیں پسند نہیں تھیں لیکن مشرقی انداز کے قائل ضرور تھے۔ شوکت خانہ کو رونق محفل بنانا انہیں پسند نہیں تھا ورنہ عالیہ کو ساتھ بھی لا سکتے تھے۔ عالیہ بھی ان کے جذبات کا احترام کرتی تھی۔ اور اس نے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔
ڈاکٹر فیاض نے گہری سانس لی اور کروٹ بدل کر سونے کی تیاریاں کرنے لگے اور نہ جانے کب انہیں نیند آ گئی۔ اس وقت رات کا ایک بجا تھا جب کسی کھٹکے سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہمیشہ کچی نیند سوتے تھے۔ چند لمحات تک ان کا ذہن سویا رہا اور پھر وہ بیدار ہو گئے۔
کوئی وجہ ضرور تھی جس کی وجہ سے آنکھ کھلی تھی۔ انہوں نے پلٹ کر دروازے کی طرف نگاہ ڈالی اور وجہ سامنے تھی۔ چار قوی ہیکل آدمی ان کے سامنے موجود تھے۔ سیاہ چست لباسوں میں ملبوس' ان کے چہرے سیاہ نقابوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں سیاہ ہی رنگ کے پستول تھے۔ جن کی نالیں ڈاکٹر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔
ڈاکٹر فیاض کا منہ حیرت سے پھیل گیا۔
''اٹھو'' ان میں سے ایک آدمی نے سخت لہجے میں کہا اور ڈاکٹر فیاض تھوک نگل کر رہ گئے۔ تب ایک سیاہ پوش نے دوسرے کو اشارہ کیا اور دوسرے سیاہ پوش نے ایک چھوٹا سا سائفن ڈاکٹر کے چہرے کے سامنے کر دیا۔ سائفن سے ایک پھوار سی نکلی اور ڈاکٹر کی ناک سے ٹکرائی۔ وہ اچھل پڑے تھے۔ لیکن پھر ان کے دماغ میں گنجان لہریے رقص کرنے لگے اور آہستہ آہستہ ان کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔
''اٹھاؤ'' دوسرے سیاہ پوش نے پھر کہا اور دونوں آدمیوں نے پستول ہولسٹر میں لگا لیے اور پھر انہوں نے اطمینان سے ڈاکٹر کو اٹھایا اور باہر لے چلے۔
پوری کوٹھی سائیں سائیں کر رہی تھی۔ پورٹیکو میں

ایک بند وین کھڑی ہوئی تھی۔ سیاہ پوش ڈاکٹر کو اٹھائے ہوئے وین کے قریب پہنچے اور پھر وین میں بیٹھے ہوئے دو آدمیوں نے انہیں ایک اسٹریچر پر ڈال کر اسٹریچر بک پر رکھ دیا۔ چاروں سیاہ پوش وین میں آ بیٹھے اور وین اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔
تاریک راستوں پر اس کا سفر کافی دیر تک جاری رہا اور پھر وہ ایک اور کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ سفید رنگ کی یہ عمارت خاصی پراسرار لگ رہی تھی۔ وین اس کے پورٹیکو میں رک گئی اور اندر بیٹھے ہوئے لوگ پھرتی سے نیچے آئے اور پھر ڈاکٹر کا اسٹریچر اندر لے جایا گیا۔ کئی راہداریوں سے گزر کر وہ ایک ہال میں پہنچ گئے۔ ہال میں دن کا منظر تھا۔ چاروں طرف انتہائی طاقتور سرچ لائٹیں لگی ہوئی تھیں مختلف ساخت کی سائنسی مشینیں چاروں طرف نصب تھیں۔ ایک گوشے میں ایک ایک سپئیر ٹیبل کے گرد پڑے ہوئے صوفوں پر کچھ لوگ سفید لباس میں ملبوس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے کافی کی پیالیاں رکھی تھیں جو اب خالی ہو چکی تھیں۔
آنے والوں کو دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ سیاہ پوش کے ساتھیوں نے اسٹریچر ایک جگہ رکھ دیا اور خاموشی سے باہر نکل گئے۔ اب ہال میں سفید لباس والوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ سفید لباس والوں میں سے ایک نے ہال کا دروازہ بند کر دیا اور ان سب نے چہروں پر آپریشن ماسک پہن لیے اس کے بعد انہوں نے اسٹریچر ٹرالی دھکیلی اور ایک طرف لے جانے لگے۔ ہال کے ایک حصے میں پہنچ کر

ان میں سے ایک نے دیوار پر لگا ہوا بٹن دبایا اور دیوار میں ایک چوکور دروازہ کھل گیا۔

ٹرالی کو لئے ہوئے وہ دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ دوسری طرف بھی ایک پوشیدہ کمرہ تھا۔ اس کمرے میں چھت پر ایک بہت بڑی سرچ لائٹ لگی ہوئی تھی جس کے نیچے ایک جدید ترین آپریشن ٹیبل موجود تھی۔ آپریشن ٹیبل کے نزدیک تین نرسیں کھڑی ہوئی تھیں اور کمرے کے ایک کونے میں سفید رنگ کی میز پر ایک خوفناک گوریلا مردہ یا بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر فیاض کو سرچ لائٹ کے نیچے آپریشن ٹیبل پر منتقل کر دیا گیا اور پھر سرچ لائٹ روشن ہو گئی۔ اس کی تیز روشنی ڈاکٹر کے جسم پر پڑ رہی تھی۔

''سب کچھ تیار ہے نرس؟'' ایک ڈاکٹر نے پوچھا۔

''یس سر'' نرس نے جواب دیا۔

''کیا خیال ہے ڈاکٹر کوہل۔ پہلے گوریلے کو دیکھیں؟''

''یہی ضروری ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر کے برین کو نکالنے کے بعد گوریلے کا آپریشن مناسب نہ ہو گا۔ اتنی دیر ڈاکٹر کا برین اسپیس خالی نہیں رہنا چاہیے۔''

''بالکل ٹھیک' نرس اس ٹرالی کو یہاں سے ہٹا دو'' اور تینوں نرسوں نے مل کر ڈاکٹر والی آپریشن ٹیبل دھکیل کر دوسری طرف سرکا دی اور پھر وہ گوریلے والی میز کو سرچ لائٹ کے نیچے لے آئیں۔ تب ڈاکٹروں نے دستانے پہنے اور پھر ایک ڈاکٹر نے ایک چوکور بکس اٹھا لیا۔ اس نے ایک پتلی سی ڈوری گوریلے کے سر پر باندھی اور بکس میں لگا ہوا ایک سوئچ آن کر دیا۔ گراریوں کے چلنے کی کڑکڑاہٹ گونج اٹھی اور بکس سے ایک آری نکل آئی۔

''او۔ کے'' ڈاکٹر نے کہا اور پھر اس نے آری گوریلے کے سر پر رکھ دی۔ جسے ایک چھوٹے سے اسٹینڈ پر اوپر اٹھا دیا گیا تھا۔ تیز کڑکڑاہٹ کے ساتھ آری گوریلے کے سر کی ہڈی کاٹنے لگی۔ ڈاکٹر چابکدستی سے اپنا ہاتھ گھما رہا تھا اور چند ساعت کے اندر اس نے نہایت صفائی سے گوریلے کے سر کا اوپری خول علیحدہ کر دیا۔ اس کے بعد اس نے آری رکھ دی۔ نرس ایک بڑی ٹرے میں سرجری آلات سجائے کھڑی تھی اس نے ایک باریک قینچی اُٹھا کر ڈاکٹر کے سامنے کر دی اور ڈاکٹر قینچی لے کر گوریلے کے دماغ کی باریک نسیں کاٹنے لگا۔ نہایت مشکل کام تھا لیکن ہوشیار ڈاکٹر نے گوریلے کی ایک ایک جھلی کاٹ کر اپنا کام مکمل کر لیا۔ پھر اس نے آلات کی مدد سے گوریلے کا مغز اس کے سر سے نکال لیا اور اسی وقت ایک نرس ایک چھوٹی سی ٹرالی لے کر اس کے قریب پہنچ گئی جس میں ایک طشت رکھا ہوا تھا۔ طشت میں بادامی رنگ کا سیال بھرا ہوا تھا۔ اک سیال میں گوریلے کے مغز کو رکھ دیا گیا اور ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی۔ اس نے چہرے سے ماسک ہٹا لیا اور نرسیں گوریلے کو دھکیل کر دور لے گئیں۔

''کیا آپ مجھے ایک سگریٹ پینے کی اجازت دیں گے ڈاکٹر کوہل؟'' آپریشن کرنے والے ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے دوسرے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''ضرور ڈاکٹر۔'' دوسرے ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر وہ خود بھی اس کے ساتھ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''آپ لوگ تیاریاں کریں۔'' اس نے چلتے ہوئے دوسرے لوگوں سے کہا اور پھر وہ دونوں باہر نکل آئے۔ رات خاموش تھی۔ وہ پراسرار تاریکی میں کھڑے ہو کر سگریٹ کے گہرے گہرے کش لیتے رہے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے گفتگو نہیں کی تھی۔ پھر سگریٹ ختم کرنے کے بعد واپس ہال میں چل پڑے اور ہال سے گزر کر اس کمرے میں واپس آ گئے۔

یہاں نرسیں اور دوسرے ڈاکٹر اپنا کام کر چکے تھے۔ ڈاکٹر فیاض کی میز آپریشن لائٹ کے نیچے تھی اور دوسرے تمام لوازمات بھی تیار تھے ایک مخصوص انجکشن کے ذریعہ ڈاکٹر کو ہوش میں لے آیا گیا تھا کیونکہ یہ ضروری تھا اور ڈاکٹر ان پر سوالات کی بھرمار کئے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں میز سے کسے ہوئے تھے جن کی وجہ سے وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔

اس نے ان دونوں کو گردن گھما کر دیکھا اور دونوں ڈاکٹر مسکراتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئے۔

''تم لوگ بھی نہیں بتاؤ گے' تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' ڈاکٹر فیاض نے متوحش لہجے میں پوچھا اور ڈاکٹر کوبل مسکراتا ہوا سامنے آ گیا۔

''ڈاکٹر فیاض' بلاشبہ تم برین اسپیشلسٹ ہو' بلاشبہ تمہارے کارنامے شاندار ہیں' لیکن ہمارے خیال میں جو عالمی اعزاز تمہیں ملنے والا ہے وہ تمہیں نہیں ملنا چاہیے۔ کیونکہ ایشیا ابھی اس قابل نہیں ہوا کہ یورپ پر سبقت لے جائے۔ ہم یہ اعزاز تمہیں نہیں ملنے دیں گے' یہ ہماری توہین ہوگی۔''

''لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں نے تو یہ اعزاز نہیں مانگا۔''

''تمہارا یہی قصور کیا کم ہے ڈاکٹر کہ تم نے ایک ایشیائی ہوتے ہوئے مغرب پر سبقت لے جانے کی کوشش کی ہے۔ ہم لوگ کسی میدان میں تمہیں آگے نہیں دیکھنا چاہتے۔''

''یہ تمہاری کم ظرفی ہے ڈاکٹر! میں نے کسی کو نیچا دکھانے کے لیے کچھ نہیں کیا ہے جو کچھ کیا ہے انسانیت کی بھلائی کے لیے کیا ہے۔'' ڈاکٹر فیاض نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔

''جو کچھ بھی کہہ لو ڈاکٹر بہر حال تم مغرب سے یہ اعزاز نہ لے جا سکو گے۔''

''میں ہر قسم کے اعزاز پر لعنت بھیجتا ہوں۔ مجھے جانے دو میں اپنے وطن واپس چلا جاؤں گا۔''

''یہ بھی اب ممکن نہیں ہے ڈاکٹر'' کوبل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''ایک دلچسپ تماشہ'' ڈاکٹر کوبل نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے لہجے کی درندگی پر ڈاکٹر فیاض کے جسم میں خوف کی لہریں دوڑنے لگیں۔

''کک...... کیسا تماشہ؟'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''بدقسمتی سے وہ تماشہ تم نہ دیکھ سکو گے۔ ہاں وہ اخبارات تم تک ضرور پہنچا دیئے جائیں گے جن میں اس تماشے کی تفصیل ہو گی کیوں ڈاکٹر'' کوبل نے مسکراتے ہوئے دوسرے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

''ہاں بے چارے ڈاکٹر فیاض کو اس تفصیل سے تو محروم نہ رکھا جائے۔''

''اچھا ڈاکٹر تم سے دوبارہ ملاقات ہو گی۔ فی الحال رخصت۔'' ڈاکٹر کوبل نے کہا اور پھر ان دونوں نے چہرے پر ماسک لگا لیے۔

کوبل نے ایک نرس کے ہاتھ سے سرنج لے لی جس میں ایک سیال بھرا ہوا تھا پھر اس نے سرنج کا سیال ڈاکٹر فیاض کے بازو میں اتار دیا اور ڈاکٹر کا جسم ساکت ہو گیا۔ اس کا ذہن جاگ رہا تھا۔ لیکن وہ بے حس و حرکت تھا۔ اس کے حواس تحریک کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ تب دوسرے ڈاکٹر

نا قابل یقین

کولمبیا کے دو کوکین فروش نیوجرسی کے ایک شخص سے سودا کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایک بلند و بالا عمارت میں داخل ہوئے جس کی چھت پر بہت بڑا انٹینا نصب تھا۔ انہوں نے ۳۴ ہزار ڈالر فی کلو کے حساب سے سودا طے کیا اور چلے آئے۔ جس عمارت میں سودا طے ہوا اسی میں نیوجرسی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

☆......☆......☆

کیلیفورنیا میں ایک خاتون نے اپنے والدین سے رقم اینٹھنے کے لیے متعدد بار اپنے اغوا کا ڈرامہ رچایا۔ اس طرح اس نے اپنے والدین سے کل ۳ لاکھ ۵۰ ہزار ڈالر کی رقم بٹور لی۔ وہ اپنے والدین کو نوٹ لکھ کر بھیجتی۔ ''مجھے قرض کی عدم ادائیگی پر اغوا کر لیا گیا ہے۔ اتنی رقم بھیجیں۔'' ساتھ ہی پولیس کو اطلاع نہ کرنے کی تنبیہ بھی کرتی۔ آخری رقعے میں اتنا زیادہ معاوضہ طلب کیا گیا کہ رقعہ پڑھتے ہی اس کے باپ کو دل کا دورہ پڑا اور جاں بحق ہو گیا۔ بعد از اں چھان بین سے پتہ چلا کہ بیٹی نے ساری رقم کوکین کے نشے میں اُڑا دی۔

جستجو طیبب جعفری۔ لاہور

نے آری لی اور پھر آری ایک تیز کڑکڑاہٹ کے ساتھ چل پڑی اور ڈاکٹر کی پیشانی سے خون رسنے لگا۔ اس کے سر کی ہڈی کٹتی جارہی تھی یہاں تک کہ اس کا پورا کاسہ سر علیحدہ ہو گیا اور ڈاکٹر اس کی باریک نسیں کاٹنے لگا۔ کام انتہائی ہوشیاری سے جاری تھا۔ ڈاکٹر کے ہاتھوں کی پھرتی قابلِ دید تھی۔ پھر اس نے ڈاکٹر فیاض کا قیمتی دماغ نکال لیا اور اسے بھی ایسے ہی سیال میں ڈال دیا جس میں گوریلے کا دماغ پڑا ہوا تھا۔ پھر اس نے نرس کو اشارہ کیا اور نرس وہ ٹرالی لے آئی جس میں گوریلے کا دماغ رکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے آلات کی مدد سے گوریلے کا دماغ ڈاکٹر کے سر میں رکھ دیا۔ پھر وہ ایک خاص سیال کی مدد سے ڈاکٹر کے سر کی نسوں کو گوریلے کے دماغ کی نسوں سے جوڑنے لگا۔ انتہائی مشکل اور مہارت کا کام تھا جسے ڈاکٹر پورے اعتماد سے کر رہا تھا۔

تمام لوگ سانس روکے کھڑے تھے یہاں تک کہ آخری نس بھی پیوست ہوگئی اور پھر ڈاکٹر نے سر کا پیالہ دوبارہ ڈاکٹر فیاض کے سر پر رکھ دیا۔ اس دوران نرس ایک ٹرالی دھکیل لائی جس پر ایک عجیب ساخت کی مشین رکھی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے ایک کپڑے سے ہاتھ صاف کیے اور پھر مشین سے ایک پائپ نکال لیا۔ اس نے مشین کا بٹن آن کیا اور پائپ سے ایک غیر محسوس سا دھواں خارج ہونے لگا۔ ڈاکٹر پائپ کے سرے کو ڈاکٹر فیاض کے سر کے جوڑ پر گھمانے لگا اور جوڑ کا خون غیر معمولی طریقے سے خشک ہونے لگا۔ چند لمحات کے بعد ایک خفیف سا نشان بھی نہیں رہا تھا اور ڈاکٹر کے سر کا پیالہ مضبوطی کے ساتھ جڑ چکا تھا۔

''ڈاکٹر کوبل پلیز'' اس نے ڈاکٹر کوبل سے کہا اور ڈاکٹر نے نرسوں کو اشارہ کیا۔ نرسیں اس ٹرالی کو دھکیل کر لے گئیں اور پھر ڈاکٹر کوبل نے ایک اور مشین میں لگی ہوئی نلکیاں ڈاکٹر فیاض کی نسوں میں پیوست کر دیں۔ نلکیوں کے ذریعہ ایک چمکدار سرخ خون ڈاکٹر فیاض کے دماغ میں منتقل ہونے لگا یہ خاص قسم کا خون تھا جو دماغ کو فوری تقویت بخشنے کے لیے تھا اور جس سے آپریشن کا احساس بھی چند ساعت کے بعد فنا ہو جانا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر ڈاکٹر کوبل پھر اس دوسرے ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا جو صوفے پر آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔

''کیا آپ تیار ہیں ڈاکٹر؟''

''ہاں وقت کم ہے اور کام زیادہ۔'' ڈاکٹر مستعدی سے کھڑا ہو گیا۔ اس دوران گوریلے والی ٹرالی آپریشن لائٹ کے نیچے لے آئی گئی تھی اور ڈاکٹر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر فیاض کا دماغ گوریلے کے جسم میں منتقل ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

عظیم الشان عمارت پر بہت سے ممالک کے پرچم لہرا رہے تھے۔ عمارت کے سامنے خوبصورت وردی میں ملبوس بہت سے خصوصی پولیس کے جوان پہرہ دے رہے تھے۔ اخباری نمائندوں کی جماعت سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ کانفرنس کے خاتمے کے بعد ڈاکٹروں سے سوالات کرے۔ البتہ انہیں کانفرنس میں شریک ہونے سے نہیں روکا گیا تھا چنانچہ پریس گیلری کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ملک ملک کے ڈاکٹر اپنی سیٹوں پر پہنچ چکے تھے ان کی سیٹوں کے سامنے ان کے ملک کا چھوٹا سا پرچم اور اس ملک کا نام تحریر تھا۔ تقریباً تمام سیٹیں پُر تھیں۔ صرف چند مقامی ڈاکٹر نہیں آئے تھے لیکن ان کے بارے میں اطلاع ملی تھی کہ وہ کانفرنس چیمبر سے ملحقہ روم میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر فیاض بھی نہیں آئے تھے جو آج کی اس کانفرنس کے ہیرو تھے۔ لوگ بے چینی سے ان کے منتظر تھے۔ پھر مقامی ڈاکٹر بھی کانفرنس ہال میں آ گئے اور ایک میزبان ڈاکٹر نے افتتاحی تقریر شروع کی۔ اس نے کہا۔

''معزز مہمانوں کی آمد پر میں اپنے ملک کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں خاص طور پر ایشیا کے مایہ ناز ڈاکٹر فیاض کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس سال دماغ کی دنیا میں حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے ہیں۔ بلاشبہ ہم

ان کے ہم پیشہ ہونے کی حیثیت سے ان پر فخر کر سکتے ہیں اور سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ پسماندہ ایشیا میں ایسی عظیم شخصیت نے جنم لیا ہم بھی ایشیائی بھائیوں کی ترقی کے خواہش مند ہیں ہم انہیں ہر میدان میں آگے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر انسانیت کی بھلائی کے لیے پیدا ہوتا ہے اس سلسلہ میں جو بھی جہاں بھی جو کچھ بھی کرے وہ پوری ڈاکٹر برادری کے لیے کار آمد ہوتا ہے ہم اپنے معزز مہمان سے بہت کچھ سیکھنے کے خواہشمند ہیں اور انہیں اس سال کے سب سے بڑے ڈاکٹری اعزاز ملنے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔"

افتتاحی تقریر کے خاتمے پر تالیاں گونج اٹھیں لیکن لوگوں کی نگاہیں ڈاکٹر فیاض کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس وقت کانفرنس ہال کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر فیاض چند لوگوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ اخباری نمائندوں نے دھڑا دھڑ تصویریں بنانا شروع کر دیں۔ لیکن ڈاکٹر فیاض کی کوئی تصویر سامنے سے نہیں لی جا سکی۔ وہ ساتھ آنے والوں میں گھرے ہوئے تھے اور اگر نہ گھرے ہوتے تو ان کے چہرے کی وحشت صاف نظر آ جاتی۔ لوگوں میں گھرے ہوئے وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں ان کی سیٹ تھی اور پھر انہیں لانے والے منتشر ہو گئے۔

"میں ڈاکٹر فیاض سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مہمانوں کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔" مقامی ڈاکٹر نے کہا اور لوگوں کی نگاہیں ڈاکٹر فیاض کی طرف اُٹھ گئیں۔ جن کی آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں اور جن کے چہرے سے وحشت عیاں تھی۔

"ڈاکٹر فیاض پلیز۔" میزبان ڈاکٹر نے پھر درخواست کی لیکن ڈاکٹر فیاض وحشت زدہ نگاہوں سے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ لوگوں کے چہروں سے حیرت عیاں ہونے لگی۔ میزبان بھی حیران نظر آ رہا تھا۔

"سب لوگ آپ کے منتظر ہیں ڈاکٹر۔" میزبان نے کہا۔ ڈاکٹر فیاض کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکلی۔ وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے اور پھر انہوں نے میزبان کا گریبان پکڑ لیا۔ دوسرے لمحے ایک زوردار جھٹکے سے انہوں نے میزبان ڈاکٹر کی قمیض پھاڑ دی اور تمام لوگ بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔

میزبان ڈاکٹر کی آنکھیں شدید حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

ڈاکٹر فیاض اپنی سیٹ کے پیچھے سے نکل کر آئے تھے اور وہ مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے سینہ پیٹ رہے تھے۔ پھر وہ بے ہنگم انداز میں اچھلنے کودنے لگے اور فوٹوگرافروں نے ان کی تصویریں کھینچنا شروع کر دیں۔

میزبان اور مہمان ڈاکٹر ششدر کھڑے ہوئے تھے۔ پھر میزبان ڈاکٹر آگے بڑھے اور انہوں نے جھک کر کہا۔

"ڈاکٹر فیاض پلیز کیا آپ کچھ طبیعت خراب محسوس کر رہے ہیں؟"

اور جواب میں ڈاکٹر فیاض نے میزبان کی گردن پکڑ لی اور اسے سر سے اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے لگے' مہمان چیخ پڑے تھے۔ اس وقت چند سیکورٹی گارڈز اندر آ گئے اور انہوں نے ڈاکٹر فیاض کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ڈاکٹر فیاض بمشکل ان کے قابو میں آ سکے تھے اور سیکورٹی گارڈز انہیں ملحقہ روم میں لے گئے۔

"ہم معزز مہمانوں سے معذرت خواہ ہیں۔ نہ جانے ڈاکٹر فیاض کو کیا ہو گیا ہے۔ صبح وہ ٹھیک تھے ہم نے ان سے فون پر بات چیت کی تھی۔ ہم کوشش کریں گے کہ ڈاکٹر کی حالت نارمل ہو جائے۔ براہِ کرم چند مہمان میرے ساتھ آئیں۔"

اور بہت سے لوگ میزبان ڈاکٹر کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔

لیکن اندر ڈاکٹر فیاض کی کیفیت پہلے سے بھی خراب تھی۔ انہوں نے ایک سیکورٹی گارڈ کو زخمی کر دیا تھا اور ہر ایک کی طرف پھاڑ کھانے کو دوڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر حیران

کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے تب میزبان ڈاکٹروں میں سے ایک نے کہا کہ

''اب کیا کیا جائے؟ ایسی صورت میں تو اعزاز کا اعلان بھی نہیں کیا جاسکتا۔''

''یقیناً'' ایک مہمان ڈاکٹر نے تائید کی اور ڈاکٹر کمرے سے نکل آئے۔ اخباری نمائندوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ سب حالات جاننے کے لیے بے چین تھے۔ چنانچہ میزبان ڈاکٹر نے کہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ ڈاکٹر فیاض شدید خوشی کے عالم میں ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ ہم انہیں صحیح پوزیشن میں لانے کی سرتوڑ کوشش کریں گے اس کے ساتھ ہی یہ تقریب منسوخ کردی گئی ہے۔''

اخباری نمائندوں نے بہت سے سوالات کیے لیکن ان کے جواب میں میزبان ڈاکٹروں نے معذوری کا اظہار کیا اور کہا:

''ہم سخت پریشان ہیں براہِ کرم ہماری پریشانیوں میں اضافہ نہ کریں۔''

اور اس طرح یہ تقریب سنسنی خیز اختتام کو پہنچی۔ دوسرے روز اخبارات کی سرخیوں نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ ڈاکٹر فیاض کے سفارتخانے کے ذریعہ ان کے ملک کو اس سانحہ کی اطلاع دی گئی۔

سب حیران تھے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر فیاض کو اسپتال پہنچا دیا گیا۔ جہاں مقامی ڈاکٹر ان کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ چند غیر ملکی ڈاکٹروں نے بھی اپنی خدمات پیش کردیں لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ پھر ڈاکٹر فیاض کے ملک سے ایک خصوصی ٹیم اس سلسلہ کی تحقیقات کرنے پہنچی۔ میزبان ملک نے ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا تھا۔ باہر سے آنے والوں کے بھی بیانات لیے گئے۔ سب نے یہی بتایا تھا کہ ڈاکٹر پچھلی رات کو ٹھیک تھے نہ جانے ایک دم انہیں کیا ہوگیا۔

بہرحال پوری دنیا کو ایک مایہ ناز ڈاکٹر سے محروم ہو جانا پڑا تھا۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ میزبان ملک نے پیشکش کی تھی کہ وہ ڈاکٹر کے دماغ کا اپریشن کرنا چاہتے ہیں ممکن ہے کچھ کارآمد نتائج برآمد ہوں۔

اجازت دے دی گئی اور ڈاکٹر فیاض کے دماغ کے تین اپریشن کیے گئے لیکن نتیجہ صفر رہا تب میزبان بھی مایوس ہوگئے۔

اور اس واقعے کے پورے ایک ماہ بعد غمزدہ عالیہ فیاض ڈاکٹر کو ایک خصوصی طیارے سے لے کر اپنے وطن واپس آ گئی۔ ڈاکٹر اسے بھی نہیں پہچان سکے تھے۔ وہ انسانوں کی سی ایک بات بھی نہ کرتے۔ عالیہ کو بھی انہوں نے دو دفعہ نقصان پہنچایا اور اس طرح انہیں انہی کی کوٹھی کے ایک مخصوص حصے میں قید کردیا گیا۔

عالیہ کی دنیا تاریک ہوگئی۔ شفیق باپ کو کھو بیٹھی تھی۔ معمولی بات نہیں تھی۔ ملکی طور پر اس سلسلہ میں خاصی تگ و دو کی گئی اور پھر ڈاکٹر کو ناقابل علاج قرار دے دیا گیا۔ ایک ہی بات سامنے آئی تھی وہ یہ کہ ڈاکٹر شدید خوشی کے عالم میں ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں اور اب یہی توقع کی جاسکتی تھی کہ کوئی اور ذہنی جھٹکا ان کے حواس درست کرسکتا ہے۔

☆......☆......☆

دور کہیں پانی گرنے کی پُرشور آواز سنائی دے رہی تھی جو ذہن کو ناگوار محسوس ہوتی تھی۔ ڈاکٹر فیاض کی آنکھ کھلی تو ذہن کو عجیب سناٹا محسوس ہوا۔ لیکن پھر اس سناٹے کو چیرنے والی آواز ان کے کانوں تک پہنچنے لگی اور ان کے حواس جاگنے لگے۔ آنکھوں کے سامنے گنجان لہریے رقصاں تھے اور سر چکرا رہا تھا۔

انہوں نے آنکھیں بند کرلیں اور حواس درست کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب قدرے حواس بہتر ہوئے تو انہوں نے حالات پر غور کیا اور آہستہ آہستہ انہیں سب کچھ یاد آنے لگا۔ انہیں غاصب یاد آئے جو انہیں اعزاز سے محروم رکھنا چاہتے تھے۔ انہیں وہ اپریشن روم یاد آیا جہاں انہیں اغوا کرکے لایا گیا تھا اور وہ اچھل پڑے۔

کیا وہ ان کے چنگل سے بچ گئے؟ انہوں نے سوچا لیکن کس طرح؟ کون پہنچ گیا تھا وہاں؟ اور اب وہ کہاں

ہیں؟ کیا انہی کی قید میں؟ انہوں نے متوحش نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ عجیب سا کمرہ تھا۔ بالکل کسی پرانے قلعے کی مانند۔ دیواریں سخت کنکریٹ کی بنی ہوئی تھیں۔ کسی قدر بلندی پر ایک روشندان تھا جس سے دھوپ کا ایک سفید دھبہ اندر رینگ آیا تھا۔ دیواروں پر سیاہ رنگ کی کائی جمی ہوئی تھی۔

اگر وہ اپنوں میں ہوتے تو اس خطرناک جگہ پر نہ ہوتے۔ انہوں نے اس کمرے کا دروازہ تلاش کیا اور دروازہ انہیں نظر آ گیا۔ پتھر کے ٹکڑوں سے تراشے ہوئے کواڑ تھے جو یقیناً باہر سے بند ہوں گے۔

انہوں نے ایک گہری سانس لی یقیناً وہ ان لوگوں کی قید میں تھے لیکن وہ ان سے کیا چاہتے تھے اس طرح ..؟ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر گردن کھجائی اور اس وقت انہوں نے اپنی کلائی کو غور سے دیکھا اور ان کے جسم پر چونٹیاں رینگنے لگیں۔ ان کی کلائی پر لمبے لمبے بال تھے تب انہیں ایک ناگوار سی بو محسوس ہوئی۔ اور یہ بو انہیں کے نتھنوں سے آ رہی تھی۔ انہوں نے وحشت زدہ نگاہوں سے اپنے جسم کو دیکھا اور ان کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔

یہ ان کا جسم تو نہ تھا یہ تو کسی گوریلے کا جسم تھا یہ تو آہ یہ کیا ہوا...... یہ کیا ہوا.....؟ وہ وحشت بھری آواز میں چیخے لیکن ان کے حلق سے ایک بھیانک چنگھاڑ نکل کر رہ گئی۔ یہ ان کی آواز نہیں تھی۔

آہ۔ ظالمو یہ تم نے کیا کیا۔ مجھے اعزاز کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو صرف اپنے ملک کی سربلندی کے لیے یہاں آ گیا تھا۔ ورنہ مجھے تو میری چھوٹی سی دنیا ہی پسند تھی۔ یہ اعزاز دیا ہے تم نے انسانیت کی بھلائی کے لیے کام کرنے کا؟ یہ صلہ دیا ہے تم نے مجھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انہیں سفید فام ڈاکٹر کے الفاظ یاد آ گئے جو نہیں چاہتا تھا کہ یہ اعزاز انہیں ملے۔ وہ بلک بلک کر روتے رہے۔ ان کا سینہ شدت غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ انہیں عالیہ یاد آ رہی تھی جو ان کی منتظر ہو گی۔ عالیہ ان کی اکلوتی بچی.. کیا حال ہو گا اس کا جب وہ اس سے نہیں ملیں گے۔

فائل۔ مفعول

معروف شاعر جوش ملیح آبادی مرحوم ایک مرتبہ وفاقی وزیر اطلاعات ونشریات مولانا کوثر نیازی مرحوم سے ملاقات کرنے ان کے دفتر گئے۔ وفاقی وزیر بہت مصروف تھے اور فائل پر فائل دیکھ رہے تھے۔

کافی دیر تک جوش مرحوم وفاقی وزیر کو کام کرتا ہوا خاموشی سے دیکھتے رہے۔ بالآخر وفاقی وزیر سے گلہ کرتے ہوئے گویا ہوئے کہ ”مولانا آپ سے ملاقات نہیں ہوتی۔“

مولانا نے جواب دیا۔ ”جوش صاحب کیا کروں فائل میں فائل ہو گیا ہوں۔“

جوش نے فوراً ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”مفعول کہیے۔“

علی حیدر۔ ٹنڈوالہ یار

انہیں وہ کیفیت یاد آئی۔ جب وہ اپنے ملک سے روانہ ہو رہے تھے۔ ان کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ سفر کریں لیکن وہ اپنے ملک کے لیے اعزاز لینے جا رہے تھے۔ اس موقع پر وہ کسی توہمی کمزوری کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ان کا دل کہہ رہا تھا کہ: ”یہ عالیہ سے آخری ملاقات ہے۔ یہ سفر ان کے لیے منحوس ہے۔ کاش دل کی بات ہی مان لی جاتی۔“ وہ ایک دیوار کے سہارے بیٹھے روتے رہے۔

اور نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ پھر اچانک انہیں بائیں سمت ایک چوکور کھڑکی کھلتی نظر آئی اور وہ چونک پڑے۔ کھڑکی سے ایک بڑی ٹرے اندر آ گئی۔ جس پر کھانے کا سامان سجا ہوا تھا۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ اُٹھے۔ ان کا دل کچھ کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ کیسے غم کی بات تھی ایک ذہین ترین انسان اور جانور کے جسم میں۔ وہ جس نے انسانیت کی بھلائی کے لیے زندگی وقف کر دی تھی اور انسانوں نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا۔ کھانے کی ٹرے کئی گھنٹے رکھی رہی پھر ہٹا لی گئی۔

پورے دو دن تک انہوں نے کچھ نہیں کھایا۔ ان کا ذہن ناکارہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ بھوک پیاس نے ان کے قویٰ مضمحل کر دیئے تھے۔ اب وہ کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ کھانے کی ٹرے

ایک مخصوص وقت پر اسی خانے میں رکھی نظر آتی اور پھر چند گھنٹوں کے بعد ہٹالی جاتی۔ آج تیسرا دن تھا۔ ڈاکٹر فیاض کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ سکتے کے عالم میں تھے اور موت کا انتظار کر رہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے عالیہ کی سوگوار صورت تھی۔ اس کے سفید ہاتھ الوداعی انداز میں ہلتے نظر آ رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

دفعتاً پتھروں کی جڑی ہوئی سلیں اپنی جگہ سے کھسکنے لگیں۔ یہ دروازہ تھا جو کھل رہا تھا لیکن فیاض اپنی جگہ سے بھی نہ ہل سکے۔ وہ خاموشی سے پڑے کھلتے ہوئے دروازے کو دیکھ رہے تھے۔ پھر دروازہ پوری طرح سے کھل گیا اور پھر چار آدمی اندر آ گئے۔ ان سب کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں۔ وہ چاروں اسٹین گنیں ان کی طرف تان کر کھڑے ہو گئے۔ تب تین آدمی اور اندر آ گئے۔ ان کے جسموں پر اعلیٰ تراش کے سوٹ تھے۔

اور ڈاکٹر فیاض ان میں سے ایک کو پہچان گئے۔ یہ ڈاکٹر کوبل تھا جس نے ان کے آپریشن میں حصہ لیا تھا۔ وہ تینوں ڈاکٹر فیاض کو دیکھتے رہے۔ ڈاکٹر فیاض خاموشی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

''ہم آپ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں ڈاکٹر فیاض'' کوبل کے ساتھی ڈاکٹر نے کہا۔

''آپ بول تو نہیں سکتے لیکن میرا خیال ہے لکھ تو بخوبی سکتے ہوں گے۔ اگر پسند کریں تو لکھ کر گفتگو کریں۔''

اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور اس نے ایک پیڈ اور قلم ڈاکٹر فیاض کے سامنے رکھ دیا۔ ڈاکٹر فیاض نے اپنے بھدے ہاتھ میں بمشکل قلم پکڑا اور پھر پیڈ پر ٹیڑھے میڑھے الفاظ میں لکھا۔

''اب کیا گفتگو کرنا چاہتے ہو؟''

کوبل نے یہ تحریر پڑھی اور بولا۔

''آپ نے حالات کا بخوبی اندازہ لگا لیا ہو گا ڈاکٹر فیاض۔ اب آپ ہمارے قبضے میں ہیں۔ آپ کی دیوانگی کی تحقیقات ہو رہی ہیں لیکن ہمارا پروگرام مکمل ہے۔ اس میں کوئی جھول نہیں ہے۔ کوئی ہمارے اوپر شبہ نہیں کر سکتا۔ پھر ایک نہ ایک دن یہ معاملہ دب جائے گا۔ لوگ آپ کو بھول جائیں گے۔ اس وقت ہم آپ سے ایک سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔''

ڈاکٹر فیاض نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا اور ڈاکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہم آپ کا ایک اور آپریشن کریں گے اور آپ کا ذہن ایک ایسے انسان کے ذہن سے بدل دیں گے جو ہمارا اپنا آدمی ہو گا۔ اس کے بعد آپ سے کام لیں گے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آپ ہمارے وفادار ہوں گے اور اگر آپ نے ہمارے ساتھ تعاون کیا تو آپ کی لڑکی کو بھی آپ سے ملا دیا جائے گا۔ ورنہ دوسری صورت میں ہم آپ کو ہر وہ تکلیف پہنچائیں گے جو پہنچا سکتے ہیں۔ اگر آپ ہم سے تعاون کریں گے تو آپ کی لڑکی کو زندگی دی جا سکتی ہے۔''

''میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا گیا ہے؟'' ڈاکٹر فیاض نے لکھا۔

''اس کی وجہ آپ کو بتائی جا چکی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ آپ مغربی ڈاکٹروں پر سبقت لے جائیں۔''

''تب مجھے میرا جسم واپس کر دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی بیٹی کو لے کر گمنامی کی زندگی میں چلا جاؤں گا اور پھر کبھی انسانیت کی بھلائی کے لیے کوئی اقدام نہیں کروں گا۔'' ڈاکٹر نے لکھا۔

''یہ اب ممکن نہیں ہے ڈاکٹر جو ہم کہہ رہے ہیں وہی کیا جائے۔ اگر آپ نے اس کے خلاف کیا تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ خاموشی سے اسی ویرانے میں مر جائیں گے اور ہم آپ کی لاش نہایت احترام سے دفن کر دیں گے اور سب کچھ بھول جائیں گے۔''

ڈاکٹر فیاض سوچنے لگے۔

بے شک وہ مکار دشمن کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ انہوں نے آج تک کسی انسان کو دکھ نہیں پہنچایا تھا۔ وہ ہمیشہ انسانیت کی بھلائی کے لیے سرگرداں رہے تھے لیکن انہیں احساس ہو رہا تھا کہ وہ دنیا سے پیچھے رہے ہیں۔

اس دور کے لوگ ظالم ہیں، سفاک ہیں۔ انہیں صرف خود سے غرض ہے وہ اپنے وقار کے لیے سب کچھ کرتے ہیں۔

"تو پھر... اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے کیوں نہ ان جیسا بنا جائے۔ مکاری کے جواب میں مکاری سے کیوں نہ کام لیا جائے اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مکاری سے کام لیں گے چنانچہ انہوں نے قلم لے کر لکھا:

"مجھے سوچنے کی مہلت دو۔"

"ضرور..... میرا خیال ہے آپ عقلمند انسان ہیں اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں گے۔ ہم اب آپ کے جواب کا انتظار کریں گے جواب کے لیے عرصہ کا تعین آپ کی مرضی پر ہے یہ پیڈ اور قلم آپ کے پاس موجود ہے آپ ہمیں جب چاہیں جواب لکھ دیں اور ہاں زندہ رہنے کے لیے خوراک ضروری ہے آپ کو آپ کی پسند کی خوراک مہیا کی جائے گی۔"

ڈاکٹر فیاض خاموش رہے اور وہ لوگ مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے۔ دروازہ بند ہو گیا اور ڈاکٹر فیاض اپنی جگہ سے اُٹھ گئے۔ وہ کچھ فیصلے کر چکے تھے اور اب ہوشیاری سے ان فیصلوں پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد لذیذ کھانوں کی ٹرے پھر اس خانے کے اندر آ گئی۔ انہوں نے ٹرے اٹھائی اور کھانے میں مصروف ہو گئے۔

تین دن کے بعد کھانا ملا تھا۔ پانی کی بوتل سے پانی پینے کے بعد وہ آرام کرنے لیٹ گئے۔ جسم بے جان ہو گیا تھا کئی گھنٹے تک وہ خاموش پڑے رہے۔ پھر جب چائے کی ٹرے آئی تب ہی وہ اُٹھے تھے۔

اس دن کے بعد وہ باقاعدگی سے روزمرہ کی مصروفیات میں مصروف ہو گئے۔ کسی خاص چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ پرچہ لکھ کر ٹرے میں رکھ دیتے اور ان کی ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔

چالاک دشمنوں کو زیر کرنے کے لیے اس سے زیادہ چالاکی کرنا ہوتی ہے۔ جلد بازی ہمیشہ کام بگاڑ دیتی ہے۔ ڈاکٹر فیاض کو ان باتوں کا پورا پورا احساس تھا چنانچہ وہ خاموشی سے وقت کے منتظر تھے وہ ان لوگوں کو اپنے بے

قرار ہونے کا یقین نہیں دلانا چاہتے تھے۔ حالانکہ عالیہ سے دوران کا ہر لمحہ اذیت سے گزر رہا تھا لیکن وہ دل پر جبر کیے ہوئے تھے۔

اور پھر تقریباً ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔ وہ دنوں کا صحیح حساب نہیں رکھ سکے تھے اور پھر انہوں نے اپنی اسکیم پر عمل درآمد کا فیصلہ کر لیا۔

ایک دوپہر کھانا آیا تو انہوں نے ٹرے نہیں اٹھائی اور خاموش پڑے رہے۔ ٹرے واپس لے جانے والے نے جب ٹرے اسی جگہ بھری ہوئی پائی تو وہ حیران رہ گیا۔ پہلے کی بات دوسری تھی لیکن اب تو ڈاکٹر باقاعدگی سے کھانا کھا لیتے تھے۔ اس نے ٹرے ہٹائی اور خانے سے اندر جھانکنے لگا۔ ڈاکٹر فرش پر اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ ٹرے لے جانے والا خانہ بند کرنا بھی بھول گیا اور پھر کئی آدمی خانے سے اندر جھانکنے لگے۔ پھر ایک آواز سنائی دی۔

"ڈاکٹر فیاض کیا بات ہے؟ آپ خیریت سے تو ہیں؟" لیکن ڈاکٹر فیاض نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے پڑے رہے۔ تب خانہ بند ہو گیا اور وہ سب خانے کے سامنے سے ہٹ گئے۔ پھر طویل عرصہ میں دوسری بار دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور چار آدمی اندر آ گئے۔ ڈاکٹر فیاض کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لیکن انہوں نے سانس روک لی تھی اور ان کے جسم میں ہلکی سی جنبش بھی نہیں تھی۔ اس وقت کامیاب اداکاری ہی کام آ سکتی تھی۔ کھلی ہوئی آنکھوں سے انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ان میں سے ایک کے پاس اسٹین گن موجود ہے جسے اس نے سیدھا کر

رکھا ہے لیکن پھر ڈاکٹر کی حالت دیکھ کر وہ چونک پڑے۔

''ارے یہ کیا ہوا؟'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''کک کیا ہوا؟'' دوسرے نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''یہ...... یہ تو مر گیا۔''

''مگر کیسے...... ؟''

''کیا معلوم؟'' پہلے نے کہا پھر وہ چاروں تیزی سے ڈاکٹر کے قریب پہنچ کر جھک گئے۔ ڈاکٹر اب بھی بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ وہ صرف اسٹین گن والے کا جائزہ لے رہے تھے اور اندازہ لگا رہے تھے کہ کس پوزیشن میں آنے سے اسٹین گن پر قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ پہلا ہی حملہ کامیاب ہونا چاہیے ورنہ کھیل بگڑ جائے گا۔

''بالکل زندگی نہیں ہے' مگر یہ تو بہت برا ہوا' ہم سے جواب طلب کیا جائے گا۔'' اس نے سراسیمہ لہجے میں کہا اور اسی وقت ڈاکٹر کو موقع مل گیا۔ ان کے دونوں ہاتھ اُٹھے اور دوسرے لمحے انہوں نے پوری قوت سے اسٹین گن والے کی ناک پر ہاتھ مارا دوسرا ہاتھ اسٹین گن کو گرفت میں لے چکا تھا۔

ڈاکٹر فیاض کے جسم میں گوریلے کی پوری توانائی موجود تھی۔ ہاتھ کھانے والے کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ عجیب سی آوازیں حلق سے نکالتا ہوا زمین پر لوٹنے لگا۔ دوسرے لوگ بھونچکے رہ گئے لیکن اتنی دیر میں ڈاکٹر فیاض اسٹین گن لے کر کھڑے ہو گئے تھے اور پھر اسٹین گن کی غراہٹ کے ساتھ ہی سامنے موجود تینوں آدمیوں کی دلدوز چیخیں اُبھریں اور وہ زمین پر تڑپنے لگے۔ زخمی نے اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اسٹین گن کی گولیاں اسے بھی چاٹ گئیں۔ دوسرے لمحے ڈاکٹر فیاض دروازے کی طرف بڑھے انہیں خدشہ تھا کہ باہر اور لوگ موجود نہ ہوں اور دروازہ بند ہو جائے۔ لیکن باہر خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہاں ان چاروں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

اس طرف سے مطمئن ہو کر ڈاکٹر فیاض نے اس عمارت کا جائزہ لیا اور پھر اس کے ایک ایک کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ کھانے پینے کا سامان' ہتھیار' فرسٹ ایڈ کا سامان اور دوسری ایسی ہی چیزیں وہاں موجود تھیں۔ ایک وائرلیس سیٹ بھی نظر آیا۔ لیکن ان میں کوئی چیز ڈاکٹر کے کام کی نہیں تھی۔ پھر وہ عمارت کے باہری حصے میں نکل آئے اور انہوں نے پورے ماحول کا جائزہ لیا۔

ایک طویل عرصہ کے بعد کھلی ہوا ملی تھی۔ ڈاکٹر فیاض گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ عمارت ایک بلند پہاڑی پر واقع تھی۔ نیچے تک کچی سڑک گئی تھی اور اس کے بعد ذیلی سڑک ایک اور چوڑی سڑک سے جا ملی تھی۔

عمارت کے کمپاؤنڈ میں ایک چھوٹا ٹرک کھڑا تھا۔ انہوں نے اسٹین گن اور اس کا ایمونیشن' ایک فرسٹ ایڈ بکس اٹھایا اور باہر آئے۔ یہ تمام چیزیں انہوں نے ٹرک پر رکھیں اور پھر اسٹیئرنگ پر جا بیٹھے۔ انہیں خوف تھا کہ گوریلے کے جسم میں وہ کہیں ٹرک ڈرائیو نہ کر سکیں۔

لیکن ٹرک اسٹارٹ کر کے آگے بڑھنے میں انہیں کوئی دقت نہ ہوئی اور انہوں نے سکون کی سانس لی۔ انہیں اپنی مخدوش پوزیشن کا احساس تھا۔ انسانی شکل میں ہوتے تو کہیں چھپنے کی آسانی ہوتی لیکن موجودہ شکل ان کے لیے پریشان کن تھی' تاہم اس اذیت ناک قید سے نجات مل جانے پر وہ خوش تھے۔ اب حالات جو بھی شکل اختیار کر جائیں۔

ٹرک پہاڑی ڈھلان سے نیچے اترنے لگا اور پھر وہ ذیلی سڑک پر پہنچ گئے۔ ذیلی سڑک پر ٹرک دوڑاتے ہوئے وہ سوچ رہے تھے کہ وہ اب کس طرف جائیں۔ شہر کا رُخ کریں' جنگلوں میں روپوش ہونے کی کوشش کریں۔ ایسی شکل میں تو کسی انسان کے قریب بھی نہیں جا سکتے تھے۔ انسان انہیں دیکھ کر ہی دہشت زدہ ہو جاتے۔ وہ کس کی ہمدردی حاصل کریں۔

ٹرک نے ذیلی سڑک طے کر لی اور پھر وہ بڑی سڑک پر مڑے ہی تھے کہ انہیں فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں اور وہ چونک پڑے۔ دوسرے لمحے انہوں نے ٹرک کو نیچے اتار

دیا اور اسٹین گن لے کر خاموشی سے نیچے اُتر گئے۔

☆......☆......☆

آرماک کا قصور صرف یہ تھا کہ اس کا رنگ کالا تھا۔ خدوخال بھدے تھے۔ لیکن اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ وہ خود تو اس رنگ کا ذمہ دار نہیں تھا۔ لیکن سفید فام اس سے نفرت کرتے تھے۔ بے پناہ نفرت' اسے بچپن سے ہی حقارت ملی تھی۔ اس کی نسل کے دوسرے لوگوں نے اس حقارت کو تقدیر سمجھ لیا تھا۔ لیکن آرماک نے یہ حقارت قبول نہیں کی تھی۔ اسے یاد تھا کہ اس نے ایک سفید فام خاندان میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کا باپ اس سفید خاندان کا ایک ادنیٰ ملازم تھا۔ ماں اور باپ دن رات اپنے آقاؤں کی خدمت کرتے لیکن اس خدمت کے بدلے میں انہیں ہمیشہ نفرت ملی تھی۔ یہ اس کی آنکھوں کے سامنے کی بات تھی کہ ایک شام سفید فام آقا اس کے باپ سے سخت ناراض ہو گیا۔ اس نے چمڑے کے ہنٹر مار مار کر اس کے باپ کو زخمی کر دیا اور اس کا باپ ہسپتال جا کر چل بسا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی ماں اسے لئے ہوئے اسی خاندان کی خدمت کرتی رہی اور بالآخر ایک رات سردی سے ٹھٹھر کر مر گئی۔ تب سفید خاندان نے اس ننھے بچے کو گھر سے نکال دیا وہ ان کے لیے بیکار تھا اور ننھے آرماک نے سیاہ فاموں کے یتیم خانے میں پرورش پائی۔

لیکن اس کے دل میں سفید نسل سے نفرت پروان چڑھ رہی تھی۔ اس نے ان تمام حالات کو تقدیر نہیں سمجھ لیا تھا اور یہ نفرت پرورش پاتی رہی۔ وہ یتیم خانے میں جوان ہو رہا تھا ایک مجہول اور حسرت زدہ ماحول میں۔ لیکن نفرت کے پودے جڑ پکڑتے جا رہے تھے۔ یتیم خانے کے دوسرے سیاہ نوجوان چند ہی روز میں اسے اپنا لیڈر ماننے لگے اور رات کی تاریکیوں میں وہ انہیں نفرت کا سبق دیتا رہتا۔ اس نے اپنے اجداد پر مظالم کی ایک ایک تفصیل انہیں سنائی اور ان میں ہر نوجوان قہر بن گیا۔

اور پھر بظاہر حسرت زدہ یتیم خانے کے اندر ایک عظیم تحریک اُبھری اس کا نام ''بلیک بیگ'' تھا۔ یہ تنظیم دہشت

لاہور

لاہور ڈویژن 4 اضلاع لاہور' قصور' شیخوپورہ' اوکاڑہ اور ان کی 14 تحصیلوں پر مشتمل ہے۔ ضلع لاہور کی 4 تحصیلیں لاہور سٹی' لاہور چھاؤنی' ماڈل ٹاؤن اور صدر ہیں۔ پاکستان کے دل لاہور شہر کی آبادی 50 لاکھ 63 ہزار اور 400 سو 99 افراد پر مشتمل ہے۔ لاہور شہر میں سال بھر میں کافی بارشیں ہوتی ہیں جن کی سالانہ اوسط 28.8 انچ ہے۔ قدیم لاہور شہر ایک محفوظ چار دیواری کے اندر واقع ہے جس میں 12 دروازے اور ایک موری ہے۔ لاہور ہمیشہ سے ہی تعلیم' ادب' ثقافت' مصوری' پہلوانی اور موسیقی کا مرکز رہا ہے۔ لاہور تاریخی شہر بھی ہے۔ تاریخی طور پر مغل دور کا شاہی قلعہ' بادشاہی مسجد' مسجد وزیر خاں' شالا مار باغ' شہنشاہ جہانگیر' ملکہ نور جہاں اور نور جہاں کے بھائی آصف جاہ کے مقبروں کے علاوہ چوبرجی' حضوری باغ اور کئی مغل شہزادوں اور شہزادیوں کے نام سے موسوم باغات ہیں۔ جو اب شہر کی گنجان آبادیوں میں ڈھل چکے ہیں۔ تحریک پاکستان میں بھی لاہور شہر کا بھرپور کردار رہا ہے اور لاہور کے منٹو پارک میں 1940ء میں تاریخی قرار پاکستان منظور کی گئی جس کی یاد میں اب منٹو پارک کے مقام پر یادگار کی تعمیر کی گئی اور منٹو پارک کو یادگار پارک کا نام دیا گیا۔ سکھ عہد کا گوردوارہ اور رنجیت سنگھ کی مڑھی لاہور شہر میں سکھوں کے دور حکومت کی یاد دلاتی ہے۔ انگریزوں کے عہد میں لاہور میں گورنر ہاؤس' جی پی او' لارنس گارڈن' چیفس کالج' اسمبلی ہال' ٹاؤن ہال اور ریلوے اسٹیشن تعمیر کیے گئے۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن کا شمار دنیا کے بڑے ریلوے اسٹیشنوں میں ہوتا ہے۔ برصغیر کی قدیم ترین درسگاہ پنجاب یونیورسٹی کے علاوہ لاہور میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج اور گورنمنٹ کالج بھی انگریزوں کے دور کی یاد دلاتے ہیں۔ لاہور شہر ہمیشہ سے بزرگانِ دین کا بھی مرکز رہا ہے یہاں حضرت داتا گنج بخش' حضرت میاں میر' حضرت مادھو لال حسین شاہ' حضرت پیر مکی' حضرت بابا شاہ جمال' حضرت میراں حسین شاہ نے تبلیغ دین کی اور دین کی شمع روشن کی۔ ان تمام ہستیوں کے علاوہ بھی یہاں پر بہت سے بزرگان دین کے مزارات یہاں پر ہیں جو ہر خاص و عوام کے لیے مرجع خلائق ہیں۔ شہر ثقافتی شہر ہونے کی وجہ سے لاہور پاکستان کی فلم انڈسٹری کا مرکز ہے اور تمام بڑے بڑے فلمی اسٹوڈیو یہیں واقع ہیں۔ لاہور کے بارے میں جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ لاہور کے بارے میں ایک پنجابی کہاوت ہے کہ'' جنے لہور نئیں ویکھیا اوجمیا ای نئیں'' یعنی (جس نے لاہور نہیں دیکھا سمجھو وہ پیدا ہی نہیں ہوا) ویسے بھی لاہور لاہور اے۔

سید ابدال۔ لاہور

پسند تھی اور اس کا مقصد صرف سیاہ فاموں کے حقوق کی حفاظت تھی۔

بلیک بیگ کے پاؤں مضبوط ہوتے گئے اور پہلی بار ایک بارونق بازار میں آٹھ سفید فاموں کو کتے کی طرح مار دیا گیا۔ جنہوں نے ایک سیاہ فام سیلز گرل کو قتل کر دیا تھا۔ سیاہ فام سیلز گرل نوجوان تھی۔ اس کا جسم بے حد حسین تھا۔ آٹھ نوجوانوں کا ایک گروہ جنرل اسٹور میں داخل ہو کر اسے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ سیلز گرل نے ان میں سے ایک نوجوان کے تھپڑ مار دیا۔ تو دوسرے نوجوان نے پستول نکال کر اسے گولی مار دی۔ پولیس آ گئی سفید فام نوجوانوں سے صرف بیان لے کر انہیں چھوڑ دیا گیا' لیکن ابھی سیلز گرل کی لاش بھی نہ اُٹھی تھی کہ سیاہ رنگ کی ایک وین بازار میں رکی اور ان آٹھ نوجوانوں کو بھون کر رکھ دیا گیا۔ وین سے بلیک بیگ کا نعرہ لگایا گیا اور پھر وہ ہوا ہو گئی۔

بات معمولی نہیں تھی' بڑے پیانے پر فسادات شروع ہو گئے۔ کالوں کی بستیوں پر حملے ہوئے' بے شمار لوگ قتل کر دیئے گئے' لیکن اس بار سفید فاموں کو انتہائی تلخ تجربات ہوئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان فسادات کا ایسا سخت ردِعمل ہو گا۔ بلیک بیگ نے پورے شہر میں تباہی مچا دی' بڑی بڑی عمارتوں کو آگ لگا دی گئی بہت سے ہوٹلوں میں بم کے دھماکے کیئے گئے' بے شمار سفید فاموں کو بر سر عام گولی سے اڑا دیا گیا۔ یہاں تک کہ حکومت کو فوجی امداد طلب کرنی پڑی تب کہیں جا کر فسادات رکے۔

سیاہ فام لیڈروں سے گفتگو ہوئی۔ تحقیقات ہوئی' لیکن جو لوگ سامنے تھے' بے قصور ثابت ہوئے اور پھر شہر کی دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر نظر آئے' جن میں مطالبہ کیا گیا کہ ملک میں موجود ایک ایک سیاہ فام کے حقوق کی حفاظت کی جائے ان کی بہبود کے پروگرام بنائے جائیں اور انہیں بھی معزز شہری تسلیم کیا جائے ورنہ بلیک بیگ پورے ملک میں تباہی مچا دے گی۔

کانفرنسیں ہوئیں' تشویش کا اظہار کیا گیا۔ نفرت کے بل پاس ہوئے لیکن بات سفید فاموں کی سوچ سے کہیں آگے تھی۔ بلیک بیگ کی تلاش کی ہر کوشش ناکام رہی۔ اس کے سرغنہ کے بارے میں پتہ نہ چل سکا۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ پودا کہاں سے اُبھرا ہے۔ بلیک بیگ نے ایک ہفتے کا نوٹس دیا تھا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ایک ایک سیاہ فام کے حقوق کی فہرست جاری کی جائے۔ ان حقوق کی تفصیل بھی درج تھی اور یہ ایسے مطالبے تھے جو ناقابلِ عمل تھے چنانچہ انہیں مسترد کر دیا گیا اور ایک ہفتہ پورا ہوتے ہی قیامت آ گئی۔ ایئر پورٹ بموں سے اُڑا دیا گیا۔ سرکاری عمارتوں پر خوفناک حملے ہوئے۔ بڑی بھیانک صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ مجبوراً حکومت کو چند اعلانات کرنے پڑے۔ سیاہ فاموں کی بستیوں کی حفاظت کی ذمہ داری لی گئی۔ ان پر ظلم نہ کرنے کے وعدے ہوئے اور ان پر بادلِ نخواستہ عمل ہوا' سفید فاموں کے ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔

لیکن وہ اس چوٹ کو بھول نہیں سکتے تھے۔ اس تنظیم کی جڑوں کی تلاش جاری رکھی گئی۔ خفیہ طور پر ایک محکمہ ترتیب دیا گیا جس کے ممبران انتھک محنت سے اس تنظیم کے ہیڈ کوارٹر کو تلاش کرنے لگے۔ لیکن ان کے لیے سخت مشکلات درپیش تھیں۔ اب سیاہ فاموں پر ہاتھ ڈالنا اس قدر آسان نہ تھا جب تک ان کے بارے میں مکمل یقین نہ ہو جائے۔ یقین ہونے کی صورت میں بھی وہ خفیہ طور پر اسے گرفتار کر کے ہلاک کر دیتے تھے اور اس کی لاش اس طرح غائب کرتے کہ اس کا نام و نشان نہ رہے۔

آرماک اب یتیم خانے سے بہت دور تھا۔ سیاہ فاموں کی تنظیم بلیک بیگ کا ہیڈ کوارٹر اب یتیم خانے کے نیچے تعمیر ہونے والی خفیہ عمارت میں تھا۔ لیکن اس کے سرگرم ممبر اس سے الگ ہی رہتے۔ انتہائی خاص موقعوں پر ہی وہ سب لوگ وہاں جمع ہوتے تھے۔

آرماک اپنی کارروائیوں میں مصروف تھا کہ ایک دوپہر اسپیشل محکمے والوں کی نگاہوں میں آ گیا۔ ہر چند وہ اس کی حقیقت سے واقف نہیں تھے انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ تنظیم کا سربراہ ہے انہیں بس اس پر شبہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ آرماک کی فورڈ

چلی اور ان کی جیپ بھی ان کے پیچھے لگ گئی' جس کا احساس آرماک کو بہت جلد ہو گیا۔

وہ خفیہ محکمے کی کاوشوں سے غافل نہیں تھا۔ ان کے طریقۂ کار کا بھی اندازہ لگا چکا تھا۔ اس لیے اس نے ان کے نرغے سے نکل جانا ہی مناسب سمجھا۔ اس کی کار کی رفتار تیز ہو گئی کیونکہ اس وقت وہ اپنے ہمدردوں سے بہت دور تھا۔ ان سے رابطہ قائم کرنا بھی ناممکن تھا' چنانچہ نکل جانے ہی میں عافیت تھی۔

بھری پری سڑکوں پر تعاقب آسان تھا اور نکل جانے میں دشواری تھی۔ اس لیے ایک چوراہے سے اس نے رُخ بدل دیا اور ایک سڑک پر لگ گیا جو سنسان تھی اور شہر سے باہر جاتی تھی۔ یہاں وہ اپنی بہترین ڈرائیونگ کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔ ان لوگوں سے بھڑنا مناسب نہیں تھا کیونکہ ان کی تعداد زیادہ تھی اور اس وقت اس کے ساتھی اس کی مدد کو نہیں آ سکتے تھے۔

سنسان سڑک پر آتے ہی اس نے کار کی رفتار بڑھا دی لیکن جہاں اس سنسان سڑک سے اسے فائدہ ہوا تھا وہیں اس کے دشمن کو بھی خاطر خواہ فائدہ ہوا تھا یہاں انہیں چیک کرنے والا کوئی نہیں تھا اور بہت جلد آرماک کو بھی احساس ہو گیا کہ اس نے سنسان سڑک پر آنے کا فیصلہ غلط کیا تھا۔

بھرے پُرے بازار میں وہ کم از کم اس پر گولیاں نہیں چلا سکتے تھے۔ رہا تیز ڈرائیونگ کر کے نکل جانے کا سوال تو جیپ والے بھی شاندار ڈرائیور ہو سکتے تھے اور اس کا اندازہ اسے جلد ہو گیا جیپ بھی برق رفتاری سے آ رہی تھی اور فاصلہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ جیپ بھی شاید خاص قسم کی تھی۔

پھر جیپ والوں نے پہلا فائر کیا اور آرماک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ آج شاید ستارے ہی گردش میں ہیں ورنہ غلط فیصلہ نہ ہوتا۔ بہرحال وہ انتہائی جدوجہد کرنا چاہتا تھا۔ اگر موت ہی مقدر ہے تو یہی سہی۔ اسے خوشی تھی کہ اس کا مشن جڑ پکڑ چکا ہے اور اب اس کی موت کے بعد بھی سیاہ فاموں کی وہ کیفیت نہیں ہو سکتی جو تھی۔ اب اس جیسے درجنوں لیڈر ہو سکتے تھے۔ کالے جاگ اُٹھے تھے اور انہوں نے اپنی طاقت کا لوہا منوا لیا تھا۔

آرماک اب کار کو اس انداز میں دوڑا رہا تھا کہ جیپ سے کیے گئے فائروں کے نشانے غلط ہو جائیں ابھی تک وہ اس میں کامیاب تھا۔ جیپ سے اب لگاتار فائر ہونے لگے تھے۔ لیکن ایک بھی گولی کارآمد نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اس سے آرماک کو یہ نقصان پہنچا تھا کہ اسے کار لہرانے کے لیے رفتار سست کرنی پڑتی تھی جبکہ جیپ بدستور اسی رفتار سے چلی آ رہی تھی اور فورڈ سے اس کا فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا اور پھر جب جیپ اور کار کا فاصلہ کم ہو گیا تو آرماک نے فائرنگ کے خطرے کو نظر انداز کر دیا اس نے کار کو سیدھا دوڑایا۔ ایکسلیٹر پر اس کے پاؤں کا دباؤ آخری حد تک ہو گیا اور فورڈ بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح آگے بڑھ گئی۔ جیپ کافی پیچھے رہ گئی تھی اور اب جیپ والوں کو بھی نئے سرے سے تگ و دو کرنا پڑی۔ فاصلہ اچانک حد سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اب فائرنگ بھی بیکار تھی کیونکہ کار گولیوں کی پہنچ سے باہر تھی۔ چنانچہ جیپ کی رفتار بھی تیز ہونے لگی۔ وہ طوفانی انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ شہر سے کتنی دور نکل آئے ہیں۔ بس اندھا دھند دوڑ ہی ہو رہی تھی اور پھر یہ آنکھ مچولی کافی طویل ہو
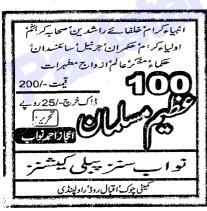
گئی۔ کار کئی موڑوں پر گھوم کر کافی دور نکل گئی تھی۔
دفعتاً کار کے انجن سے چیخیں بلند ہونے لگیں اور آرماک کی نگاہیں پٹرول میٹر پر جا پڑیں۔ پٹرول کی مقدار بتانے والی سوئی زیرو پر لرز رہی تھی۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اب کچھ کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اُونچی نیچی پہاڑیاں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔ کار اب جھٹکے کھانے لگی تھی۔ جیپ بالکل قریب آتی جارہی تھی اور اب اس سے دوبارہ فائرنگ ہونے لگی تھی۔ فورڈ کی چیخیں ناقابل برداشت ہونے لگیں۔ آرماک نے اسے آخری حد تک دوڑایا اور ایک بار پھر جیپ سے دور ہونے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ انجن بند ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی آرماک نے کار کا دروازہ کھول دیا پھر جونہی کار رُکی وہ نیچے کود گیا۔
لیکن اس کے دشمن غافل نہیں تھے بیک وقت بہت سی گولیاں چلیں اور آرماک سڑک کے نشیب میں اُترنے کی کوشش کرنے لگا۔ فائرنگ پھر ہوئی اور اس بار وہ کامیاب ہو گئے۔ یوں بھی جیپ آرماک کے قریب پہنچ چکی تھی آرماک کی داہنی ران میں انگارے اُتر گئے وہ اوندھے منہ گرا اور جیپ اس کے سر پر پہنچ گئی۔
اس وقت اگر اس کے دشمن چاہتے تو اسے جیپ سے کچل بھی سکتے تھے لیکن انہوں نے یہ مناسب نہیں سمجھا اور جیپ اس کے قریب آ کر رک گئی۔ اس میں بیٹھے ہوئے چاروں آدمی بھی چھلانگیں لگا کر نیچے آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے انہوں نے آرماک کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ آرماک کی ران سے خون کا فوارہ بلند ہو رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف کھڑے خونخوار وحشیوں کو دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک طرف کھڑے ہوئے آدمی نے بوٹ کی ٹھوکر اس کے منہ پر رسید کی اور اس کی مسکراہٹ خون میں ڈوب گئی۔
''کھڑے ہو جاؤ۔'' اس نے دوسری ٹھوکر آرماک کی داہنی پنڈلی پر رسید کرتے ہوئے کہا۔
''مشکل ہے۔'' آرماک نے خون تھوکتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں اب سکون تھا۔
''بلیک بیگ کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟''
''میں جانتا تھا' میں جانتا تھا۔ آج کل تم لوگوں کے ذہنوں پر بلیک بیگ کا بھوت سوار ہے۔'' آرماک نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''جواب دو ورنہ زبان کاٹ لوں گا۔''
''میں جانتا ہوں دوستو تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے اگر میں کچھ نہ بتا سکا تب بھی نہیں کیونکہ تم خوفزدہ ہو۔ تم جانتے ہو کہ اگر تمہارے اس سلوک کی اطلاع ہماری تنظیم کو مل جائے تو وہ تم سے انتقام لے گی۔''
''ہوشیار ہو۔ بہر حال تم تسلیم کرتے ہو کہ تمہارا تعلق بلیک بیگ سے ہے؟''
''اس مقدس تنظیم سے تعلق ہمارے لیے عبادت ہے۔''
''تب پھر اپنی عبادت گاہ کا پتا بتا دو۔'' سفید فام نے اس کی پیشانی پر گھونسہ رسید کرتے ہوئے کہا اور آرماک پھر گر پڑا۔
''ہر صاحب مذہب اپنی عبادت گاہوں کو ناپاک قدموں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔'' آرماک نے کہا اور سفید فام لاجواب ہو گئے۔
''گولی مار دو ٹیلر۔ ہم شہر سے کافی دور نکل آئے ہیں واپس بھی جانا ہے۔ اسے گولی مار کر اس کی لاش کار میں ٹھونس دو اور پھر کار کو کسی کھڈ میں دھکیل دو۔'' ایک سفید فام نے پستول سیدھا کر لیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
اور اسی وقت ان پر قیامت ٹوٹ پڑی' اسٹین گن کی آواز تھی۔ سفید کربناک چیخیں سنائی دیں اور انہوں نے جیپ کی طرف دوڑ کر شاید اس کی آڑ لینے کی کوشش کی لیکن اسٹین گن کی گولیوں نے انہیں موقع نہ دیا اور وہ اوندھے سیدھے ایک دوسرے کے اوپر گر پڑے۔ آرماک ان کے نیچے دب گیا تھا۔ لیکن اس کے چہرے سے مسرت پھوٹ پڑی تھی یقیناً اس کی تنظیم کے کچھ لوگ ادھر آ نکلے تھے۔ اس نے اپنی مخصوص سیٹی بجا کر اپنی زندگی اور ان لوگوں کی

ہلاکت کی اطلاع دی لیکن چند لمحات تک کوئی تحریک نہ ہوئی۔ اس کے آدمی حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس نے لائن کلیئر ہونے کی دوسری سیٹی بجائی۔ قاعدے سے اس سیٹی کا جواب ملنا چاہیے تھا لیکن جواب نہ ملا۔ تب اس نے حیرت سے گردن گھمائی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کے محسن اس کے آدمی نہیں ہیں پھر کون ہے؟

اس نے سفید فاموں کی لاشیں خود پر سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن اس کی ران سے کافی خون بہہ گیا تھا اس لیے وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ تب اس نے ایک عجیب سی کھر کھر کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی ایک غیر انسانی چاپ بھی محسوس ہو رہی تھی اور پھر اپنا محسن اسے نظر آ گیا۔ لیکن وہ جو کوئی بھی تھا اسے دیکھ کر آرماک ششدر رہ گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا وہ ایک طویل القامت گوریلا تھا۔ خوفناک گوریلا لیکن اس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی اور گولیاں اسی نے چلائی تھیں۔

آرماک نے پھر اسے غور سے دیکھا، ممکن ہے گوریلے کی کھال میں کوئی انسان ہو لیکن قد و قامت..... قد و قامت کسی انسان کا نہیں تھا۔ وہ سو فیصد گوریلا ہی تھا۔ سست رفتاری سے چلتا ہوا وہ اس کے قریب پہنچ گیا اور آرماک کسی قدر خوفزدہ ہو گیا۔ نہ جانے وہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کرے۔

لیکن گوریلے نے اس پر پڑی ہوئی لاشیں اُٹھا اُٹھا کر ایک طرف پھینک دیں اور پھر اس نے کسی انسان ہی کی طرح اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس میں زندگی کے آثار تلاش کیے۔ آرماک حیرت کی گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ پھر گوریلے کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں نے اسے دیکھا اور آرماک کو اپنے ذہن میں سنسناہٹ محسوس ہونے لگی۔ تب گوریلے نے جھک کر اسے اٹھا لیا اور پھر وہ اسے دونوں ہاتھوں میں اُٹھائے چل پڑا۔ آرماک نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ نہ جانے گوریلا اسے کہاں لے رہا تھا۔

گوریلا سڑک سے اتر گیا اور پھر آرماک کو ایک ٹرک نظر آیا۔ جو سڑک کے نشیب میں کھڑا تھا۔ گوریلا اسی ٹرک کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''اوہ شاید ٹرک میں وہ لوگ ہوں جنہوں نے اس گوریلے کو ٹرینڈ کیا ہو'' آرماک نے سوچا۔ گوریلے نے اسے ٹرک میں ڈال دیا۔ لیکن ٹرک پر اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ گوریلا واپس ہو گیا اور پھر آرماک نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلتے ہوئے محسوس کیا پھر ٹرک اسٹارٹ ہو کر چل پڑا۔

آرماک کو اپنے ذہن پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ ران کے زخم کی تکلیف کی شدت کو وہ اب تک نظر انداز کیے ہوئے تھا لیکن ٹرک سے لگنے والے جھٹکے ناقابل برداشت تھے۔ اس کے حواس گم ہوتے جا رہے تھے۔ اگر اس حیرت انگیز گوریلے کو دیکھ کر اس کا ذہن نہ بٹ گیا ہوتا تو شاید اب تک وہ تکلیف سے اور زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے بے ہوش بھی ہو گیا ہوتا۔

ٹرک نے ایک مختصر سفر کیا۔ اس دوران آرماک سوچتا رہا کہ اُٹھ کر گوریلے کو ڈرائیونگ کرتے ہوئے دیکھے۔ بڑا حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین منظر ہوتا لیکن وہ اتنی ہمت نہ کر سکا اور اسی طرح پڑا رہا۔ پھر ٹرک رُک گیا اور گوریلا نیچے اُتر آیا۔ پھر وہ ٹرک کے پچھلے حصے میں پہنچ گیا اور اس نے ٹرک میں رکھے ہوئے سامان کو ٹٹولا۔ پھر اس میں سے فرسٹ ایڈ بکس نکال لیا۔ آرماک اب پوری دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گوریلے نے سامان سے ایک پیڈ اور قلم بھی نکال لیا۔

آرماک کی بند ہوتی ہوئی آنکھیں پھر کھل گئیں۔ اب گوریلا کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا اور پھر اس نے اپنی تحریر آرماک کی طرف بڑھا دی۔

آرماک نے جلدی سے کاغذ لیا اور پھر وہ اس ٹیڑھی میڑھی رائٹنگ کو دیکھنے لگا۔ لکھا تھا:

''اگر تمہیں زیادہ تکلیف ہو تو میں آپریشن کر کے گولی نکال بھی سکتا ہوں یا پھر صرف وقتی ڈریسنگ کر دوں؟''

آرماک کی آنکھیں شدید حیرت سے پھیل گئیں۔ ایسا عجیب و غریب گوریلا اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا جو

رائفل چلا سکتا ہو۔ٹرک ڈرائیو کر سکتا ہو اور انگلش کی غلطی کیے بغیر لکھ بھی سکتا ہو۔

''جب تم لکھ سکتے ہو تو بات سمجھ بھی سکتے ہو گے؟''
اس نے دریافت کیا اور گوریلے نے گردن ہلا دی۔

''مجھے بتاؤ تم کون ہو؟''

''دلیر نوجوان تمہاری ہمت قابلِ داد ہے یوں سمجھ لو میں بھی خطرے میں ہوں۔میرے بارے میں جاننے کے بجائے یہ بتاؤ کہ تمہارا کوئی ٹھکانہ بھی ہے؟'' گوریلے نے کاغذ پر لکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''ہاں میرا ٹھکانہ موجود ہے۔پہلے تم مجھے فرسٹ ایڈ دو۔اس کے بعد ہم گفتگو کریں گے۔ہاں ذرا سی برانڈی مل جائے گی؟'' گوریلے نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''خیر کوئی بات نہیں۔'' آرماک نے کہا اور پھر وہ گوریلے کو فرسٹ ایڈ بکس کھولتے دیکھنے لگا۔شاید اس حیرت انگیز واقعے پر کوئی یقین نہ کرے اب اس بات میں شبہ نہیں تھا کہ وہ گوریلے کی کھال میں کوئی انسان نہیں بلکہ درحقیقت گوریلا ہی تھا لیکن وہ کون ہے' کہاں سے آ گیا؟ اسٹین گن اس کے پاس کہاں سے آئی؟ یہ تمام باتیں حیرت انگیز تھیں۔

گوریلے نے باقاعدگی سے اس کا زخم صاف کر کے ضروری ادویات لگائیں اور پھر عمدہ قسم کی بینڈیج کر دی۔پھر اس نے آرماک کو کھانے کی ایک گولی دی جسے آرماک نے نگل لیا۔اس کے بعد اسٹین گن سنبھال کر بیٹھ گیا۔پیڈ اور قلم اس کے پاس رکھا ہوا تھا۔آرماک خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں تمہارے بارے میں سخت حیرت زدہ ہوں۔''
آرماک نے بالآخر کافی دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

''فی الحال تم مجھے اپنی ادنیٰ دوست سمجھو۔بعد میں میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔یہ بتاؤ یہ جگہ خطرناک تو نہیں ہو گی۔کیا ان کے ساتھی تمہاری تلاش میں یہاں آ سکتے ہیں؟'' گوریلے نے لکھا اور کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''ممکن ہے نکل آئیں۔یہاں سے دور نکل چلو' میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔'' آرماک نے کاغذ پڑھنے کے بعد کہا۔

''تمہارے ٹھکانے کی طرف ہم رات کو چلیں گے۔دن میں کھلی سڑکوں پر میرا ڈرائیونگ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔'' گوریلے نے لکھا اور ٹرک سے نیچے اتر گیا۔آرماک گردن ہلانے لگا تھا۔

تقریباً آدھی رات کو ٹرک شہر میں داخل ہوا۔آرماک اس وقت گوریلے کے پاس بیٹھا اسے راستہ بتاتا جا رہا تھا۔اس کے علاوہ پولیس کی طرف سے بھی ہوشیار تھا لیکن راستے میں پولیس سے کوئی ٹکراؤ نہ ہوا اور وہ بلیک بیگ کے ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔بہت سے سیاہ فام دوڑ پڑے اور گوریلے کو دیکھ کر ان کی بھی وہی حالت ہوئی جو آرماک کی ہوئی تھی۔گوریلے نے آرماک کو سہارا دے کر اتارا تھا اور پھر آرماک کے دوسرے ساتھیوں نے اسے سنبھال لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد آرماک اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا انہیں اپنی کہانی سنا رہا تھا اور ہیڈ کوارٹر میں موجود ڈاکٹر اس کی ران کے آپریشن کی تیاریاں کر رہے تھے۔

''یہ میرا بہت بڑا محسن ہے دوستو! اس کی ہیئت پر نہ جاؤ۔اس کی شخصیت بہت پراسرار انداز میں سامنے آئے گی۔میں فی الوقت اتنا ہی کہوں گا کہ اس کے ساتھ وہی سلوک کرو جو محسن کے ساتھ کیا جاتا ہے۔'' آرماک نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور اس کے ساتھی اس کی داستان پر انگشت بدنداں رہ گئے۔بہرحال وہ ایک جانور کا احترام کر رہے تھے۔آرماک کے آپریشن کے وقت ڈاکٹر فیاض اس کے کمرے سے نکل گئے۔مبادا انہیں دیکھ کر آپریشن کرنے والے ڈاکٹروں کا دھیان نہ بٹے' لیکن آپریشن کے بعد آرماک نے فوراً انہیں بلایا تھا۔ان کے قریب ہی ایک چوڑی کرسی اور میز ڈال دی گئی تھی۔میز پر پیڈ رکھا ہوا تھا۔قلم بھی موجود تھا۔

آرماک ایک آرام دہ بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔اور اس کے نزدیک ہی ایک سیاہ فام لڑکی موجود تھی جو شاید اس کی

سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

''میں تمہاری کہانی سننے کے لیے بے چین ہوں دوست! آپریشن بھی میں نے بمشکل کرایا ہے' جب تک میں تمہارے بارے میں معلوم نہ کرلوں گا سکون سے نہیں سو سکوں گا۔''

''میرا خیال ہے تمہارے جسم سے کافی خون بہہ گیا ہے رات بھی خاصی گزر گئی ہے۔ آرام کرو میں صبح کو اپنی کہانی لکھ دوں گا۔'' گوریلے نے کہا۔

''میں رات بھر نہ سو سکوں گا۔ ہاں کر تمہاری کہانی سن لوں تو پھر سکون کی نیند آئے گی۔'' آرماک نے کہا اور گوریلے نے قلم اور پیڈ سنبھال لیا۔ پھر وہ ایک ایک شیٹ لکھ کر سیکرٹری کو دینے لگا۔ سیکرٹری اسے پڑھ پڑھ کر آرماک کو سنانے لگی۔ سیاہ فام لڑکی حیرت سے گوریلے کو لکھتا دیکھ رہی تھی۔ لیکن پہلی شیٹ پڑھنے کے ساتھ ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ گوریلے نے لکھا تھا:

''آرماک...... میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں۔ میرا جسم گوریلے کا ہے لیکن اس میں انسانی دماغ موجود ہے۔ میں ایک ایشیائی ڈاکٹر ہوں۔ جس نے انسانیت کی بھلائی کے لیے بہت کچھ کیا تھا' لیکن انسانوں نے اس کا صلہ یہ دیا جو موجودہ شکل میں تمہارے سامنے ہے۔''

سیاہ فام سیکرٹری گوریلے کی تحریر کردہ شیٹیں سناتی رہی اور آرماک کے چہرے کے تاثرات بدلتے رہے۔ پوری کہانی سننے کے بعد اس کے تاثرات بالکل بدل گئے تھے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ پھر اس نے غیظ کے عالم میں کہا۔

''ہاں میرے دوست یہ گوری چمڑی والے ایسے ہی سنگدل ہیں۔ صرف رنگ کی بنیاد پر انہوں نے انسانیت کی تذلیل کی ہے۔ میں بھی رنگ ہی کا شکار ہوں۔ میرے دوست میری اور میرے ساتھیوں کی شخصیت بھی مسخ کر دی گئی تھی۔ میری کہانی بھی تم سے تھوڑی سی مختلف ہے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے انسانیت اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ سنو دوست میں تمہارے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں ان ڈاکٹروں کی نشاندہی کر سکو گے جنہوں نے تمہارا ذہن تبدیل کیا ہے؟ سنو آرماک وعدہ کرتا ہے میری پوری تنظیم اس کام کے لیے کام کرے گی اور اس وقت تک چین کا سانس نہ لے سکے گی جب تک تمہیں تمہاری شخصیت واپس نہ دلا دے۔''

گوریلے کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے لکھا:

''میری بچی میرے لیے تڑپ رہی ہو گی۔ نہ جانے انہوں نے میرے جسم کا کیا کیا ہو گا۔ اگر تم میری مدد کرسکو تو انسانیت سے بدظن نہ ہوں گا۔''

''میں تمہارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔''

''کیا تمہارے پاس افرادی طاقت ہے؟''

''ہاں۔ اب میں تمہیں اپنی تنظیم کے بارے میں بتانے میں عار نہیں سمجھتا۔'' آرماک نے بلیک بیک کے بارے میں پوری تفصیل اسے بتا دی۔ گوریلے کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''تب تو بہت کچھ کر سکتے ہو۔'' اس نے لکھا۔

''یقیناً مجھے بتاؤ میں کس انداز میں کام کروں؟'' اور گوریلا ایک طویل تحریر لکھنے لگا۔

بڑا اور مہنگا ترین ڈھانچہ

21 اگست 1990ء کو ساؤتھ ڈاکوٹا امریکہ میں 85 اور 65 ملین سال کے درمیان رہنے والے ایک عظیم الجثہ گوشت خور جانور کا ڈھانچہ ملا۔ یہ ڈھانچہ قدیم جانوروں کے محقق اور شکاری ہینڈرکسن نے دریافت کیا۔ ڈھانچہ 13 فٹ بلند اور 41 فٹ لمبا ہے۔ اس کی کھوپڑی 4.9 فٹ لمبی ہے۔ اس کے جبڑے میں 58 دانت موجود ہیں جن کی لمبائی "7.5 اور "12 کے درمیان ہے۔ زندگی میں اس کا اندازاً وزن 6.4 ہو گا۔ 1997 میں شکاگو کے فیلڈ میوزیم نے نیلام عام میں یہ ڈھانچہ 83 لاکھ 62 ہزار اور 5 امریکی ڈالرز میں خرید لیا۔ یہ کسی بھی ڈائنوسار کے ڈھانچے کی سب سے زیادہ قیمت ہے۔

ابوبکر جعفری۔ اسلام آباد

☆......☆......☆

ہوم منسٹر مسٹر ڈگلس پارکر سلیپنگ سوٹ پہن کر جونہی خواب گاہ میں داخل ہوئے پشت سے ان کے سر پر ایک زوردار ضرب پڑی اور اس سے قبل کہ ان کی چیخ بلند ہوا ایک چوڑا ہاتھ ان کے منہ پر آ جما اور پھر ان کے حواس تاریکی میں ڈوب گئے تو دونوں سیاہ فاموں نے انہیں اٹھایا اور احتیاط سے باہر نکل آئے۔ لوگوں کی نگاہوں سے بچتے ہوئے خوبصورت عمارت کی عقبی چار دیواری سے باہر نکل آئے جہاں سیاہ رنگ کی ایک وین ان کی منتظر تھی۔ ان کے لواحقین کو احساس بھی نہ ہوا کہ انہیں اس خاموشی سے اغوا کیا گیا ہے پھر جب ان کی مسز سولہ سنگھار کر کے اور خود کو ضرورت سے زیادہ پرکشش بنا کر خواب گاہ میں داخل ہوئیں تو شوہر کو نہ پا کر حیران رہ گئیں۔ انہوں نے سوچا کہ شاید وہ باتھ روم میں ہوں۔ چنانچہ وہ فوم کی مسہری پر رنگین لحاف میں گھس گئیں۔ ان کی آنکھیں باتھ روم کے دروازے کی طرف اُٹھ گئیں۔ لیکن کافی دیر گزرنے کے بعد جب ڈگلس پارکر باتھ روم سے باہر نہ آئے تو انہیں تشویش ہوئی۔ وہ گرم لحاف سے نکل کر باتھ روم کے دروازے پر پہنچیں اور انہوں نے مترنم آواز میں پکارا۔

''کیا تم اندر ہو ڈارلنگ؟''

لیکن ڈارلنگ اندر نہیں باہر تھے۔

☆......☆......☆

پلاننگ کمیشن کے سیکرٹری آ ذجر کن کلب کی تفریحات سے فرصت پا کر اپنی لمبی کار میں آ بیٹھے۔ ان کے ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ مسٹر آ ذجر کن نے پشت سے ٹیک لگائی ہی تھی کہ ان کی کھوپڑی میں ستارے ناچ گئے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور پھر ان کی آنکھوں کی روشنی آہستہ آہستہ کم ہو گئی۔ کار اسی رفتار سے دوڑ رہی تھی پھر ایک سنسان سی سڑک پر پہنچ کر رکی اور اسی وقت ایک سیاہ وین ان کی کار کے قریب رک گئی۔ مسٹر آ ذجر کن کو ان کے ڈرائیور نے ایک آدمی کی مدد سے وین میں پہنچا دیا اور وین اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔ مسٹر آ ذجر کن کی کار کو اسی جگہ چھوڑ دیا گیا تھا۔

☆......☆......☆

اٹامک انرجی کمیشن کے سربراہ مسٹر گو لمبے ایک اہم پراجیکٹ کا معائنہ کر کے واپس لوٹ رہے تھے۔ خاصی رات گزر چکی تھی۔ انہیں سخت بھوک لگ رہی تھی اور وہ دل ہی دل میں اپنی مصروفیات کو کوس رہے تھے جن کی وجہ سے وہ وقت پر کھانا بھی نہیں کھا سکتے تھے۔ ان کا ڈرائیور برق رفتاری سے کار چلا رہا تھا۔ بریف گارڈن کے چوراہے سے جیسے ہی ان کی کار مڑی اچانک ایک زوردار آواز ہوئی اور اگر ان کا ہوشیار ڈرائیور کار کو کنٹرول نہ کر سکتا تو یقیناً وہ اُلٹ جاتی۔

اُچھلتی ہوئی کار سڑک سے نیچے اتر گئی اور مسٹر گو لمبے بدحواس ہو گئے۔

''کیا ہوا؟'' انہوں نے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''ٹ...... ٹائر برسٹ ہو گیا ہے۔'' ڈرائیور نے جواب دیا۔

''لعنت ہے...... اس وقت......'' مسٹر گو لمبے دانت پیس کر بڑبڑائے۔ ''اب کیا ہوگا؟''

لیکن اس سے قبل کہ ڈرائیور انہیں اس بات کا جواب دیتا سڑک پر کسی کار کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں اور مسٹر گو لمبے چونک پڑے۔

''جاؤ کار روک کر لفٹ لو میں کسی مناسب جگہ پر اتر جاؤں گا جہاں ٹیکسی مل جائے۔ تم ٹائر بدل کر گھر پہنچ جانا۔''

''یس سر۔'' ڈرائیور نے جواب دیا اور وہ سڑک پر کھڑے ہو کر کار روکنے لگا۔ کار اس کے بالکل قریب پہنچ گئی اور اس نے لفٹ کی استدعا کی۔

''ضرور'' اندر سے شائستہ لہجے میں کہا گیا۔ اندھیرے کی وجہ سے ڈرائیور کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ مسٹر گو لمبے شکریہ ادا کر کے اندر بیٹھ گئے اور کار چل پڑی۔ دوسرے لمحے مسٹر گو لمبے کی گردن کی پشت پر ایک ضرب

پڑی اور ان کے حلق سے عجیب وغریب آوازیں نکلنے لگیں۔ لیکن پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے انہیں دبوچ لیا تھا۔

غرض یہ حادثوں کی رات تھی۔ پورے شہر سے تقریباً پون درجن افراد کو اغوا کیا گیا تھا۔ اور اس رات کی صبح بڑی سنسنی خیز تھی۔ حکومت کے اہم ستون نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ پولیس ہیڈ کوارٹر کو ایک کے بعد ایک اطلاع مل رہی تھی۔ غائب ہونے والے ایسی اہمیت رکھتے تھے کہ حکومت کے ہوش اُڑ گئے۔

آہنی پنجروں میں ان کی آنکھ کھلی تھی۔ یہ پنجرے ایک دوسرے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ وہ آپس میں گفتگو کر سکتے تھے۔ ان سب کو رات ہی میں ہوش آ گیا تھا لیکن دن کی روشنی میں وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر چونک پڑے۔ تقریباً سب ہی ایک دوسرے کے صورت آشنا تھے۔ ایک دوسرے سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ سب ہی حکومت کے اہم ستون تھے لیکن اغوا کا مقصد ان کے لیے نامعلوم تھا۔

''ایک بات میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں...!'' چیف پلاننگ آفیسر نے سیکورٹی ڈائریکٹر سے کہا۔

''یہ حرکت بلیک بیگ کے علاوہ کسی کی نہیں ہے۔ مجھے اغوا کرنے والے سیاہ فام تھے۔''

''تب تو......تب تو ہم سخت مصیبت میں ہیں۔ ان لوگوں کے چنگل سے نکلنا آسان نہ ہوگا۔'' سیکورٹی ڈائریکٹر نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''شاید یرغمال کے طور پر وہ ہمارے بدلے کوئی بڑا مطالبہ کریں گے۔'' پلاننگ آفیسر نے کہا۔

''شاید۔'' سیکورٹی ڈائریکٹر نے ٹھنڈی سانس لی اور پھر وہ دونوں چونک کر سامنے دیکھنے لگے۔ چار آدمی ان کی طرف آ رہے تھے وہ چاروں سیاہ فام تھے۔ آنے والوں کو دیکھ کر ان کی روحیں قبض ہونے لگیں اور پھر وہ چاروں ایک پنجرے کے قریب پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور سیکورٹی ڈائریکٹر کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ سیکورٹی ڈائریکٹر خاموشی سے باہر نکل آیا اور وہ اسے لئے ہوئے ایک طویل راہداری سے گزر کر ایک دروازے کے قریب پہنچ گئے اور پھر وہ دروازے سے ایک ہال میں اندر داخل ہو گئے۔ سیکورٹی ڈائریکٹر منہ پھاڑے ہال کا منظر دیکھ رہا تھا۔

کسی ہسپتال کا چھوٹا سا آپریشن تھیٹر معلوم ہو رہا تھا۔ چاروں سیاہ فاموں نے اسے ایک سفید رنگ کی میز پر لٹا کر کس دیا۔ سیکورٹی ڈائریکٹر وحشت زدہ نظروں سے چاروں جانب دیکھ رہا تھا۔

''کک...کیا کر رہے ہو تم لوگ؟'' اس نے خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''وہی...جو تم کر چکے ہو؟'' سیاہ فام نے زہریلے لہجے میں کہا اور پھر میز کے پاس سے ہٹ گیا۔ سیکورٹی ڈائریکٹر کے حواس گم ہوئے جا رہے تھے۔ پھر ایک طرف کا دروازہ کھلا اور اس سے ایک خوفناک مخلوق اندر گھس آئی۔ سیکورٹی ڈائریکٹر کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس طویل القامت گوریلے کو دیکھ رہا تھا۔ گوریلے کے پیچھے چند سیاہ فام نرسیں ایک بڑی ٹرالی گھسیٹتی ہوئی لا رہی تھیں جس میں نہ جانے کیا کیا رکھا ہوا تھا۔ گوریلا اس کے بالکل قریب پہنچ گیا اور پھر ایک ماسک چہرے پر چڑھا لیا۔ اس کے بعد ایک اور ٹرالی اسٹریچر لایا گیا جس پر ایک کتا بندھا ہوا تھا۔

سیکورٹی ڈائریکٹر پاگل پن کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کا ذہن یہ سب کچھ برداشت نہیں کر رہا تھا۔ گوریلا اس کے پاس سے ہٹ کر کتے کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اس نے اوزار اٹھائے اور کتے کی کھوپڑی کا آپریشن کرنے لگا۔ سیکورٹی ڈائریکٹر تھوک نگلتے ہوئے اس خوفناک گوریلے کو کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

تیرہ دن تک اخبارات عجیب عجیب قیاس آرائیاں کرتے رہے۔ خصوصی پولیس نے درجنوں جگہوں پر چھاپے مارے۔ بہت سے بے گناہ لوگوں کو پکڑ کر ان پر

مظالم کی انتہا کر دی لیکن ابھی تک کوئی سراغ نہیں پا سکی تھی۔ پورے ملک میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ اغوا ہونے والے ملک کے اہم ستون تھے۔ ان کا نقصان کسی طور پر برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

پھر چودھویں روز پولیس ہیڈ کوارٹر کو ایک چونکا دینے والی اطلاع ملی۔ سیکورٹی ڈائریکٹر پراسرار طور پر اپنے مکان کی خواب گاہ میں پہنچ گئے تھے۔ ان کی سوگوار مسز صبح کو جاگیں تو وہ ان کے برابر کے بستر پر موجود تھے۔ آن کی آن میں یہ اطلاع بجلی کے کرنٹ کی طرح دوسرے محکموں تک دوڑ گئی اور بڑے بڑے افسروں کی گاڑیاں سیکورٹی آفیسر کی رہائش گاہ پر پہنچ گئیں۔ سیکورٹی ڈائریکٹر کی مسز نے ان سب کا استقبال کیا تھا۔ وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ڈائریکٹر صاحب گہری نیند میں سو رہے ہیں انہیں جگانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

افسران ان کا انتظار کرنے لگے۔ کافی دیر کے بعد ایک ملازم دوڑا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی کہ ڈائریکٹر صاحب جاگ اُٹھے ہیں لیکن وہ ایک ایک کو دیکھ کر منہ سے ''کوں کوں'' کر رہے ہیں۔ شاید ان کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں۔

افسران خواب گاہ کی طرف چل پڑے جب وہ خواب گاہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ڈائریکٹر صاحب چاروں ہاتھوں پیروں کے بل کھڑے ہوئے تھے اور اپنی بچیوں کے سامنے کوں کوں کر رہے تھے۔ وہ شاید تصوراتی دم ہلانے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کا پچھلا حصہ باقاعدگی سے متک رہا تھا۔ انہوں نے افسران کی طرف دیکھا اور ان کے ہونٹ چڑھ گئے۔ وہ زور زور سے غرانے لگے اور پھر انہوں نے اگلے دونوں ہاتھ اُٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔

افسران گھبرا کر دروازے پر ہی رک گئے۔ وہ پھٹی پھٹی سی نگاہوں سے سیکورٹی ڈائریکٹر کو دیکھ رہے تھے اور پھر انہوں نے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں۔ ڈائریکٹر کی اہلیہ کا چہرہ بھی دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ پھر کچھ افسران گہری سانس لے کر ایک دوسرے سے کانا پھوسی کرنے لگے تھے۔ پھر ان میں سے ایک ڈاکٹر کو فون کرنے چلا گیا۔ اسی دن کی دوسری اطلاع اس سے بھی زیادہ چونکا دینے والی تھی۔

پولیس کے کچھ نوجوانوں نے پلاننگ کمیشن کے سیکرٹری مسٹر آ وَجر کن کو ایک سڑک سے پکڑا تھا۔ مسٹر آ وَجر کن منہ میں ایک ہڈی دبائے سڑک پر سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ ان کے پیچھے بچوں کی ایک ٹولی لگی ہوئی تھی جو ہنستی قہقہے لگاتی آ رہی تھی۔ پولیس کے نوجوانوں نے جب مسٹر آ وَجر کن کو پکڑا تو وہ زور زور سے ان پر بھونکنے لگے۔ انہوں نے کئی نوجوانوں کی کلائی پر کاٹا بھی تھا۔

حکومت بوکھلا اٹھی۔ ایک ہی نوعیت کے دونوں کیس تھے۔

لیکن بات یہیں ختم نہ ہوئی اٹامک انرجی کمیشن کے سربراہ مسٹر گولبے بھی واپس آ گئے تھے اور پورے گھر میں ''میاؤں میاؤں'' کرتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے باورچی خانے میں رکھا ہوا گوشت منہ میں دبایا تھا اور مسہری کے نیچے گھس گئے تھے۔ وہاں وہ دونوں ہاتھوں میں گوشت دبا کر دانتوں سے نوچتے رہے تھے۔ گھر والے انہیں مسہری کے نیچے سے نکالنے میں کسی طور پر کامیاب نہ ہوئے تھے۔

بیسویں دن تک آخری اغوا شدہ آدمی بھی واپس آ گیا۔ ان سب کو ایک خصوصی ہال میں جمع کر دیا گیا اور ڈاکٹروں کی کئی ٹیمیں ان کا معائنہ کر رہی تھیں۔ ان میں کوئی کتے کی طرح بھونکتا' کوئی بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرتا' کوئی دنبے کی طرح ڈکراتا۔ عجیب مضحکہ خیز صورت حال تھی لیکن حکومت کے ذمہ داروں کے دل ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ اس کیفیت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے۔ ڈاکٹروں کی ٹیم کے ایک خصوصی اجلاس میں مشترکہ معائنے کے بعد اعلان کر دیا گیا کہ ان لوگوں کے دماغ بدل دیئے گئے ہیں۔ ان سب کے ذہنوں کے آپریشن کر دیئے گئے ہیں اور پھر یہ متفقہ فیصلہ حکومت تک پہنچا دیا گیا اور حکومت کے ایوان ہلنے لگے۔

تب اکیسویں دن وزیر داخلہ کو ایک خط ملا۔ ایک آدمی یہ خط لے کر آیا تھا جو وزارت داخلہ ہی کا ایک ممتاز رکن تھا۔ اس نے بتایا کہ علی الصبح کوئی اس کے چوکیدار کے پاس آیا اور اسے یہ خط دیتے ہوئے کہا کہ اسے اپنے مالک تک فوراً پہنچا دے۔ حکومت کا خط ہے۔ بہر حال وزیر داخلہ نے خط کھولا اور پھر وہ خط کی تحریر پڑھ کر سکتے میں رہ گئے۔

لکھا تھا۔

''غاصب اور بدکردار انسانو! میں ڈاکٹر فیاض تم سے مخاطب ہوں۔

تم نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا تقاضا ہے کہ میں تمہارے ان ساتھیوں کو پوری زندگی اسی طرح رہنے دوں۔ لیکن میں آج بھی انسانیت کا بہی خواہ ہوں۔ میں اب بھی نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھی زندگی بھر بلی کتوں کی زندگی گزاریں۔ چنانچہ میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔ ان دونوں ڈاکٹروں کو میرے حوالے کر دو جنہوں نے میرا دماغ تبدیل کیا تھا۔ میرا جسم انہیں دے دو تاکہ وہ آپریشن کر کے مجھے میرا دماغ واپس دے دیں۔ اگر تم نے میرا جسم تلف کر دیا ہے تو پھر یاد رکھو! میں تمہارے ساتھیوں کے دماغ ضائع کر دوں گا جو میرے پاس محفوظ ہیں۔ دوسری صورت میں اپنا جسم حاصل کرنے کے بعد میں ان لوگوں کے محفوظ دماغ تمہارے حوالے کر دوں گا۔

''تمہیں یہ بھی احساس ہوگا کہ میں ٹھیک ہونے کے بعد تمہارے کرتوت دنیا پر واضح کر دوں گا۔ لیکن میں کسی کو تمہاری حرکت کے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ میں اس کام کے لیے تمہیں صرف تین دن دے رہا ہوں۔ کل صبح کے اخبارات میں تم ایک چھوٹا سا اشتہار دے دو جس میں تمہیں اپنی منظوری کا اظہار کرنا ہے۔ ایک سیاہ حاشیے کے اندر لفظ ''منظور ہے'' لکھ دو اور وقت لکھ دو میں فون پر تم سے رابطہ قائم کر لوں گا۔

ڈاکٹر فیاض''

ایک بار پھر کھلبلی مچ گئی۔ دو گھنٹے کے اندر اندر ملک کے بڑے بڑے افسران وزارتِ داخلہ کے کانفرنس ہال میں جمع ہو گئے سب کے رنگ اُڑے ہوئے تھے۔

بادل نخواستہ طے کیا گیا فوری طور پر ایک طیارہ ڈاکٹر فیاض کے ملک جائے اور وہاں سے ڈاکٹر کے جسم کو لے آئے۔ پھر دونوں ڈاکٹروں کو ان کے کہنے کے مطابق ان کے حوالے کر دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ وہ ان سے پورا تعاون کریں۔ یہ بحث چھوڑ دی گئی کہ ڈاکٹر فیاض نے یہ سب کچھ کیسے کیا؟ ان کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

ان سنسنی خیز واقعات کے پورے ایک ماہ کے بعد ڈاکٹر فیاض مقامی حکام کے ساتھ ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا رہے تھے۔ ان کے ساتھ آنے والوں کے چہرے ندامت سے لٹکے ہوئے تھے۔

''ہم آپ سے وعدے کی پابندی کی اُمید کرتے ہیں ڈاکٹر'' پروٹوکول آفیسر نے دبی زبان سے کہا۔

''یقیناً۔ میں ایک باوقار ملک کا باشندہ ہوں۔ طیارے کے پرواز کرنے کے ٹھیک سات گھنٹے کے بعد ان لوگوں کے دماغ تمہیں مل جائیں گے کیونکہ اس وقت میں اپنے ملک کی حدود میں داخل ہو چکا ہوں گا۔'' ڈاکٹر فیاض نے حقارت آمیز مسکراہٹ سے کہا۔

''ہم آپ سے کوئی دغا بازی نہیں کریں گے ڈاکٹر۔''

''میں جانتا ہوں تم ایسا نہ کرنے پر مجبور ہو۔'' ڈاکٹر نے حقارت سے کہا۔ کوئی کچھ نہ بولا۔

''آپ اپنا دوسرا وعدہ بھی یاد رکھیں گے ڈاکٹر؟''

''ہاں۔ ہاں۔ مجھے تمام وعدے یاد ہیں۔ فکر نہ کرو۔'' ڈاکٹر نے کہا اور پھر وہ طیارے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ پروٹوکول آفیسر اور دوسرے لوگ ہاتھ ہلا رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھ بلند کر کے لہرایا لیکن یہ الوداعی پیغام رن وے پر کھڑے ہوئے لوگوں کے لیے نہیں تھا بلکہ دور عام لوگوں کی گیلری میں کھڑے ہوئے آرماک کے لیے تھا۔ جس کی مدد سے ڈاکٹر نے اپنی کھوئی ہوئی زندگی واپس حاصل کر لی تھی۔ آرماک نے ان کے احسان کا بھرپور صلہ دیا تھا۔

☆......☆......☆

روح کا سفر

وہ اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہونا چاہتا تھا لیکن اُسے موت سات سمندر پار دیارِ غیر میں آئی۔ لیکن اُس کی روح کو چین نہ ملا اور آخرکار وہ دوبارہ زندہ ہو گیا۔ اور دو مجرموں کو اپنا آلہ کار بنا لیا

ایم اے راحت

ایک شخص کی کہانی جو اپنی لاش سمگل کروانا چاہتا تھا

میں نے جرائم کی دنیا کس طرح اپنائی یہ ایک طویل کہانی ہے اور ان بیشمار عام کہانیوں سے مختلف نہیں ہے جو مجھ جیسے انسانوں سے منسوب ہوتی ہیں۔ تعارف کے طور پر اتنا بتا دوں کہ میرا تعلق ایک شریف لیکن غریب گھرانے سے ہے اور میرے والدین نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنی اولاد کو بڑا آدمی بنانے کی کوشش کی۔ یہ چھوٹے لوگ اپنی اولاد کو بڑا بنانے کے لئے جو جتن کرتے ہیں وہ آپ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہوں گے لیکن بہت کم خوش نصیب ہی ایسے ہوتے ہیں جو اپنی ان کوششوں میں کامیاب ہو جاتے ہیں ورنہ عام طور سے ان کی جدوجہد کی داستان ان کی قبر کے کتبوں پر کندہ ہوتی ہے اور وہ اس جدوجہد میں ناکام ہو کر قبر کی گہرائیوں کو اپنا لیتے ہیں۔

میرے باپ نے بھی مجھے بڑا آدمی بنانے کے لئے اپنی زندگی چھوٹی کر لی۔ سخت اور انتھک جدوجہد نے اسے ٹی بی کا مریض بنا دیا اور وہ اپنے بیٹے کے مستقبل کا خون تھوک تھوک کر ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے کے خون تھوکنے کی باری ہوتی ہے۔ سو میں نے بھی ابتدا میں خون تھوکا۔ لیکن بہت جلد میرا مرض دور ہو گیا۔ یہ شرافت کا مرض بھی عجیب ہوتا ہے۔ آدمی کو بالکل ناکارہ کر دیتا ہے کسی کام کا نہیں رہتا کمبخت۔

لیکن مجھے ''حکیم'' احمد خان مل گیا۔ ماہر جیب تراش، نقب زن۔ چھوٹے موٹے جرائم کا ماہر۔ لوگ اسے کچھ بھی کہتے ہوں لیکن میں اسے اپنا حکیم ہی تصور کرتا ہوں۔ اس نے میری ناکامی کا مرض دور کر دیا اور مجھے اپنی لائن پر لگا لیا۔

چنانچہ ابتداء میں نے چھوٹے چھوٹے کاموں سے کی۔ لیکن احمد خان جاہل تھا اور میں تعلیم یافتہ۔ پھر میں اس سے زیادہ ذہین کیوں نہ ہوتا پھر میں نے اپنی ذہانت سے جرائم کی نت نئی راہیں نکالیں اور لوگوں کے لباس ٹٹولنا چھوڑ دیئے۔ گھروں میں گھسنا چھوڑ دیا۔ میں دوسرے جرائم کرتا تھا۔ ایسے جرائم جن میں ذہانت کارفرما ہوتی تھی اور بہر حال ایک درمیانہ درجے کی زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

لیکن ایک بدقسمتی تھی جب عیش کی زندگی ملی تو تنہا رہ گیا تھا۔ ماں بھی مر گئی اور اس دنیا میں ماں کے علاوہ میرا اور کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ زندگی کسی قدر بدمزا ہو گئی تھی پھر میں نے اس بدمزگی کو دور کرنے کے سہارے تلاش کئے اور نہ جانے کیوں تقدیر میرے اوپر مہربان ہو گئی۔

میری اس تقدیر کا نام نینا تھا۔ مقامی عیسائی لیکن رنگ و روپ انگریزوں کی مانند۔ سنا ہے اس کی ماں چھ سال انگلینڈ میں رہی جو ایک ہسپتال میں نرس تھی۔ وہاں سے آئی تو نینا اس کے ساتھ تھی اور اس کا سیاہ فام باپ جوزف اپنی اس پھول سی بچی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

بہر حال مجھے نینا کے ماضی اور اس کے خاندان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے تو نینا سے پیار تھا اور وہ بھی دل و جان سے مجھے چاہتی تھی۔ کیوں نہ چاہتی میں اس کے پورے خاندان کی پرورش کر رہا تھا۔ بی اے تک تعلیم میں نے ہی تو مکمل کرائی تھی ورنہ اس کا باپ جوزف شراب پینے کے علاوہ اور کوئی کام کرنے

کے قابل ہی کہاں تھا۔

ابتداء میں اپنی ذہانت سے میں نے نیما کو اپنے کاروبار کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہونے دیا۔ لیکن محبوب سے بھی کوئی بات چھپائی جاتی ہے۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ میرا خیال تھا کہ نیما سخت پریشان ہو جائے گی رو رو کر مجھ سے کہے گی کہ میں برائی کے راستے چھوڑ دوں۔ کہیں کسی مصیبت کا شکار نہ ہو جاؤں' لیکن نیما ایک روشن خیال لڑکی تھی۔ وہ دقیانوسی اور فرسودہ روایات سے دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے مسعود۔ اس دنیا کا دھندہ ایسے ہی چلتا ہے۔ تم کوئی انوکھا کام نہیں کر رہے۔''

''تو...... تو نیما۔ تم..... تم اس بات پر مجھ سے ناراض نہیں ہوئیں؟'' میں نے خوشی کے عالم میں کہا۔

''میں جاہل نہیں ہوں مسعود۔ اس دنیا کو بہت قریب سے جانتی ہوں۔ ہاں لیکن ایک بات ضرور کہوں گی۔ وہ یہ کہ خود کو محفوظ رکھ کر کام کرو۔''

''اس سلسلہ میں تم فکر مت کرو۔''

''میں خود بھی زندگی کے اس رخ سے دلچسپی رکھتی ہوں۔ اگر تمہیں کبھی ایک ذہین ساتھی کی ضرورت محسوس ہو تو...... میں......''

''تو...... تو گویا نیما''؟ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''تو میں تمہارے ساتھ کام کرنے کو تیار ہوں'' نیما نے جواب دیا۔

''واقعی'' میں نے خوشی کے عالم میں پوچھا۔

''خلوص دل سے''

خوشی اور دو دو۔ حسین محبوبہ اور حسین ساتھی۔ میں نے اس حسین ساتھی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور نیما کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ میں نے اس کی حیثیت ہمیشہ محفوظ رکھی۔ میں نے اسے خطرناک کاموں میں استعمال نہیں کیا۔ لیکن اس سے ایسے کام لیتا رہا جن میں اس کی ذات براہ راست کبھی ملوث نہ ہو میں نے اسے ایک نمایاں مقام دیا۔ خود اس سے دور رہ کر اسی سوسائٹی کا ایک اعلیٰ مقام دیا اور اس کے اعلیٰ مفاد کو اپنے مفاد میں دوسرے طریقے سے استعمال کیا۔ ایک چھوٹے سے سلسلہ میں نیما نے میری ضمانت بھی کرائی لیکن میں ذرا کم ہی پھنسنے والوں میں سے ہوں۔

تو یہ ہے میرا اور نیما کا تعارف۔ ہر انسان کی زندگی یوں تو واقعات اور حادثات کا مجموعہ ہے اور پھر خاص طور سے ہم جیسے لوگوں کی تو بات ہی اور ہے۔ ہماری زندگی کافی تیز ہوتی ہے۔ عام زندگی گزارنے والے لوگوں کی کہانیاں مختصر ہوتی ہیں۔ بس ایک ڈگر پر چلنا لیکن ہم۔

''ہاں تو میں اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ سنانے جا رہا ہوں۔ بلاشبہ یہ کہانی میری اور نیما کی زندگی کی انوکھی کہانی ہے۔

ان دنوں کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی۔ نیما کے پاس ایک خوبصورت کار تھی۔ ایک حسین بنگلہ تھا۔ اس کا چھوٹا سا کاروبار تھا۔ یہ ساری چیزیں اسے میں نے مہیا کی تھی۔ لیکن میں خود ایک درمیانہ درجے کے فلیٹ میں رہتا تھا جو کرائے کا تھا۔ یہاں عام سا فرنیچر تھا اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ لوگ میری طرف سے مشکوک نہ ہوں۔

میں اور نیما اکثر لمبی ڈرائیونگ پر نکل جاتے تھے اس کے والدین کو میرے اس ساتھ پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا کیونکہ میں نے ان کی زندگی بنا دی تھی۔

تو اس رات ہم گلرنگ پوائنٹ سے واپس آ رہے تھے۔ یہ اعلیٰ درجے کا ریستوران تھا جس میں اعلیٰ درجے کے لوگ ہی جاتے تھے۔ رات کے تقریباً پونے بارہ بجے تھے۔ سر شام ہی ہم ایک کلب پہنچ گئے تھے اور وہاں کی تفریحات میں حصہ لیتے رہے تھے۔ نیما ڈرائیونگ کرتے کرتے ہولے ہولے گنگنا رہی تھی کہ اچانک اس کی گنگناہٹ رک گئی اور اس کے ساتھ کار کی رفتار بھی سست ہو گئی۔

''کیا ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''شاید کوئی حادثہ؟''

''کیا مطلب؟'' میں نے آنکھیں پھاڑ کر سڑک پر دیکھا۔ کار کچھ اور آگے بڑھ گئی اور روشنیاں ایک وجود کو اجاگر کرنے لگیں جو سڑک کے درمیان پڑا ہوا تھا۔ ''اوہ شاید کوئی اسے ٹکر مار کر چلا گیا۔''

''ہاں...... برائیوں کی مختلف اقسام ہوتی ہیں'' نیما نے کہا اور کار کنارے کر کے روک دی۔ پھر دونوں دروازے کھول کر نیچے اتر گئے۔

''اگر کوئی اس وقت ہمیں دیکھ لے تو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچے گا کہ ہم نے ہی اسے زخمی کیا ہے''

''بلاشبہ...... لیکن اس خوف کی وجہ سے اسے چھوڑا تو نہیں جا سکتا۔ ممکن ہے یہاں سے گزرنے والے دوسرے لوگوں نے بھی اسے دیکھا ہو اور یہی سوچ کر آگے بڑھ گئے ہوں کہ کہیں کوئی مصیبت ان کے گلے نہ پڑ جائے۔'' نیما نے جواب دیا۔

اس دوران ہم سڑک پر پڑے شخص کے قریب پہنچ گئے اور پھر اس پر جھک گئے۔ لیکن...... وہ کسی کار یا کسی دوسری سواری کے حادثے کا زخمی نہیں تھا۔ کوئی اور ہی بات تھی۔ یقیناً کوئی اور ہی بات تھی۔ اس کے بدن پر عمدہ تراش کی پتلون اور قمیص تھی۔ دونوں پاؤں سمٹے ہوئے تھے ایک ہاتھ سینے پر تھا دوسرا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ پھیلے ہوئے ہاتھ پر موٹی رسی کا ایک پھندا نظر آ رہا تھا پاؤں کے نزدیک سو ڈالر کا ایک نوٹ پڑا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور وہ گہری گہری سانس لے رہا تھا۔

''زندہ ہے۔'' نیا نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''ہاں...... لیکن زخمی نہیں معلوم ہوتا۔''

''ممکن ہے پشت پر زخم ہو'' نیا نے کہا اور میں نے جیب سے دستانے نکال کر ہاتھوں میں پہن لئے۔ پھر میں نے اسے پلٹ کر دیکھا۔ لیکن کمر پر بھی کوئی زخم نہیں نظر آ رہا تھا اور نبض بھی معمول کے مطابق چل رہی تھی۔

''اب'' ...... میں نے سوال کیا۔

''اسے یہاں تو نہیں چھوڑ سکتے۔''

''ظاہر ہے جب اتنا کیا ہے تو اسے کسی ہسپتال تک پہنچانے کی کوشش بھی کی جائے۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ایک بات کہوں مسعود؟''

''ہاں کہو''

''میرے خیال میں اسے ہسپتال لے جانا حماقت ہے۔ کوئی زخم وغیرہ تو ہے نہیں۔ سانس بھی نارمل ہے۔ رسی اور نوٹ پُراسرار ہیں۔ ممکن ہے کسی سازش کا شکار ہوا ہو اور صرف بیہوش ہو۔ ان حالات میں ہم الجھن میں پھنس سکتے ہیں۔''

''پھر؟'' میں نے وہاں پر نیا کی بات سے اختلاف کیا۔

''کیوں نہ اسے گھر لے چلیں۔ ہوش میں آنے کا انتظار کریں گے ممکن ہے اس سے کچھ معلوم ہو جائے۔'' نیا نے تجویز پیش کی۔

''او کے نیا۔ تم کار کا دروازہ کھولو میں اسے ہاتھوں پر اُٹھا کر لاتا ہوں۔'' میں نے کہا اور نیا نے گردن ہلا دی اور پھر اس نے جھک کر نوٹ اور رسی کا عجیب وغریب پھندا اٹھا لیا اور نیا کار کی طرف بڑھ گئی۔

میں نے جھک کر نوجوان کو اٹھایا۔ درمیانہ جسامت کا ایک اسمارٹ نوجوان تھا۔ مجھے اسے اٹھانے میں دقت نہیں ہوئی۔ نیا نے عقبی دروازہ کھول دیا تھا۔ میں نے احتیاط سے اسے

براعظم افریقہ

براعظم افریقہ دنیا کے کل زمینی رقبے کے 20.3 فیصد پر مشتمل ہے اور یہ دنیا کا دوسرا بڑا براعظم ہے۔ اس کا رقبہ 30065000 مربع کلومیٹر (11608156 مربع میل) ہے۔ براعظم افریقہ کا بلند ترین مقام تنزانیہ میں واقع ماؤنٹ کلیمن جارو ہے جس کی بلندی 5895 میٹر (19340 فٹ) ہے۔ جبکہ پست ترین مقام جبوتی میں واقع جھیل آسل ہے اس کی سطح سمندر سے پستی 512 فٹ (156 میٹر) ہے۔ براعظم افریقہ میں 53 ممالک واقع ہیں جن کی آبادی کی گنجانی 69 افراد فی مربع میل یا 27 افراد فی کلومیٹر ہے۔ براعظم افریقہ کا رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک سوڈان ہے اور سب سے چھوٹا ملک سیچیلیس ہے۔ جبکہ آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک نائیجیریا ہے اور سب سے چھوٹا ملک سیچیلیس ہے۔ براعظم افریقہ کا سب سے گنجان آباد ملک موریشیس ہے اور سب سے کم گنجان آباد نمیبیا ہے۔ براعظم افریقہ کی سب سے بڑی جھیل وکٹوریہ جھیل ہے جو 69484 مربع کلومیٹر رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔

پچھلی سیٹ پر لٹا دیا اور پھر خود اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا تاکہ اسے سنبھال سکوں۔ نیا نے اسٹیرنگ سنبھال لیا تھا۔

''چلوں مسعود؟''

''ہاں جلدی چلو۔ کہیں عقب سے کوئی دوسری کار نہ آ جائے'' میں نے کہا اور نیا نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

''تمہیں اس کے جسم پر کسی زخم کا احساس تو نہیں ہوا'' نیا نے مجھ سے پوچھا۔

''بظاہر تو بالکل نہیں ہے۔''

''بظاہر سے کیا مراد ہے؟''

''ممکن ہے کوئی اندرونی چوٹ ہو نیا'' میں نے کہا اور نیا نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے گردن ہلا دی۔

''اوہ...... ہاں اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے'' اس نے کہا تھا۔

''تمہارے پاس ابتدائی طبی امداد کا سامان تو موجود ہوگا نیا؟''

''ہاں...... کیوں نہیں''
''ہم اسے ہوش میں لانے کی کوشش کریں گے''
''ضرور...... لیکن قصہ کیا ہو سکتا ہے۔ اور مسعود اس امکان کا تم جائزہ تو لو کہ رسی کے پھندے سے اس کی گردن دبانے کی کوشش تو نہیں کی گئی۔'' نیا نے اچانک کہا اور میں بھی چونک پڑا۔ یہ بات قرین قیاس ہو سکتی تھی۔ لیکن اندھیرے میں اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔ گردن کے نشانات تو ہم روشنی میں ہی دیکھ سکتے تھے۔ میں نے اپنی ناکامی کا اعلان کر دیا۔
''ہاں اس طرح مشکل ہے۔ مجھے فوراً احساس ہو گیا تھا'' نیا مسکراتی ہوئی بولی۔
''کیوں''؟
''میرا مطلب ہے تمہاری ممی اور ڈیڈی۔''
''ڈیڈی تو جیسا کہ تمہیں پتہ ہے نشے میں دھت پڑے رہتے ہیں۔ رہیں ممی تو وہ ہمارے کسی معاملے میں دخل نہیں دیتی۔''
''ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن کوئی ایسا موقع کبھی آیا بھی نہیں۔''
''تو اس بات کی فکر کیوں کرتے ہو''
''نہیں فکر کی بات نہیں ہے۔ بس ایسے ہی سوچ رہا تھا۔ دراصل فلیٹ اس معاملے میں بالکل بیکار جگہ ہے۔ وہاں تو کوئی راز راز رہ ہی نہیں سکتا۔ سب ایک دوسرے کی کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ کون کیا کر رہا ہے۔''
''میرے ایک پڑوسی تو تقریباً ہر تیسرے دن میرا انٹرویو لیتے ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''کیسا انٹرویو؟'' نیا نے پوچھا۔
''یہی کہ میں کیا کرتا ہوں کتنی آدمی ہے کاروبار کیسا چل رہا ہے۔ والدین کونسے گاؤں میں رہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ''
''انہیں تم سے کیا دلچسپی پیدا ہو گئی؟''
''بھتیجی کی وجہ سے''
''کیا مطلب؟''
''کوئی بھتیجی ہے ان کی۔ اور اس کے والد ریکروٹنگ ایجنٹ ہیں۔ آج شادی کرو کل دوبئی چلے جاؤ۔ کئی بار کہہ چکے ہیں''
''وہ اپنی بھتیجی کو دوبئی کیوں نہیں بھیج دیتے۔ ویسے ڈارلنگ میں تم سے کئی بار کہہ چکی ہوں کہ فلیٹ چھوڑ دو''
''اور میں کئی بار تمہیں اس کا جواب دے چکا ہوں۔ تمہارے ساتھ رہ کر میں تمہاری شخصیت کو مشکوک نہیں کرنا چاہتا۔ بس میں چاہتا ہوں کہ پہلے تم خوب دولتمند بن جاؤ تاکہ ایک دولت مند لڑکی سے شادی کر کے میری زندگی بھی آرام سے گزرے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا اور نیا بھی ہنسنے لگی۔ اسی وقت میں نے نوجوان کی کراہ سنی اور چونک پڑا۔
''اوہ...... یہ ہوش میں آ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔
''اچھا ہے۔ ہم بھی پہنچ چکے ہیں۔'' نیا نے جواب دیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہماری کار بنگلے کے پورچ میں رک گئی۔ میری نگاہیں نوجوان پر تھیں جو اپنی گردن مسل رہا تھا اور اب پوری طرح ہوش میں معلوم ہوتا تھا۔
کار رکی تو وہ اچھل پڑا۔ اس نے وحشت زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر اچانک اٹھنے کی جدوجہد کرنے لگا۔
''اوہ...... بدحواس نہ ہو تم دشمنوں میں نہیں ہو۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔
''تم...... تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔ تم مجھے۔ میں تم سے کمزور نہیں ہوں۔'' وہ خوفزدہ لہجے میں بولا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
''طاقتور آدمی میں تم سے طاقت آزمائی نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو تمہارا مددگار ہوں۔ ہم دونوں نے تمہیں سڑک پر پڑے پایا تھا اور تمہاری امداد کرنے کے خیال سے تمہیں لے آئے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ پھر چونک پڑا۔
''دونوں نے؟'' اس نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔
''ہاں...... میری منگیتر اور میں۔'' میں نے جواب دیا اور اس نے گردن گھما کر نیا کو دیکھا تب اس کے چہرے پر کسی قدر سکون کے آثار پھیل گئے۔ وہ عمدہ قسم کی انگریزی بول رہا تھا اور اب اس کے خدوخال سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ مقامی باشندہ نہیں ہے۔
''آہ...... اوہ...... وہ دونوں...... وہ دونوں'' اس نے کہا اور پھر دوبارہ گردن مسلنے لگا۔
''ان کی بات کر رہے ہو جنہوں نے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔'' میں نے پوچھا اور اس نے گردن ہلا دی۔
''یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آؤ اندر آؤ۔'' نیا نے کہا اور نوجوان نے میرا سہارا لے کر کار سے نیچے اتر آیا۔ اس کی ٹانگوں میں لغزش تھی۔ اس لئے میں اسے سہارا دے کر اندر لایا اور نیا اسے اپنے بیڈ روم سے ملحقہ کمرے میں لے گئی۔ یہاں

بستر موجود تھا۔
اس نے کمرے کی روشنیاں جلائیں اور نوجوان سے بستر پر لیٹ جانے کو کہا۔
''نہیں شکریہ۔ میں بیٹھوں گا اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے کہا اور ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا۔
''ٹھہرو...... میں تمہارے لئے برانڈی لاتی ہوں'' نیا نے کہا اور مجھے وہاں رکنے کا اشارہ کر کے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ برانڈی کی بوتل اور گلاس لے کر اندر آ گئی۔ اس نے نوجوان کو برانڈی دی اور وہ ایک ہی دفعہ اسے حلق میں اتار گیا۔ پھر پیاسی نگاہوں سے بوتل کو دیکھنے لگا۔
''اور لو گے؟'' نیا نے پوچھا اور اس نے گردن ہلا دی۔
تب نیا نے اسے اور برانڈی دی۔ اس بار نوجوان نے اس کے چھوٹے چھوٹے سپ لئے تھے۔ پھر وہ ہونٹ خشک کرتا ہوا بولا۔
''میں...... تم دونوں کا''
''شکر گزار ہوں۔ کیوں...... یہی کہو گے نا'' نیا مسکرا کر بولی۔
''ہاں...... تم لوگوں نے بے لوث میری مدد کی ہے۔ جبکہ...... جبکہ اس ملک میں میں نے بڑی بے حسی پائی ہے۔ کوئی کسی کا ہمدرد نظر نہیں آتا۔''
''تم مقامی تو نہیں ہو۔''
''نہیں...... میں یورپ کا باشندہ ہوں۔''
''ہمارا بھی یہی خیال تھا۔ اب تمہاری حالت کیسی ہے؟''
''اب ٹھیک ہوں'' انہوں نے میری گردن میں رسی کا پھندا ڈال کر مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی لیکن۔ پھر دور سے ایک کار کی روشنیاں نظر آئیں اور وہ فرار ہو گئے۔''
''شکر ہے وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ کیا تمہیں پولیس کی مدد درکار ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''نہیں ہمدرد انسانو۔ تمہارا شکریہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ پولیس سے مدد لوں۔''
''اوہ...... کیوں؟''
''اس لئے کہ...... کہ میں بھی کوئی اچھا انسان نہیں ہوں۔'' نوجوان نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔
''کیا میں تمہیں اور برانڈی دوں؟'' نیا نے ہمدردی سے کہا۔
''نہیں شکریہ''
''کیا تم اپنا تعارف کرانا پسند کرو گے؟''
''میرا نام ایلس ہے۔ ایلس جم۔''
''خوب۔ یہ نیا ہے اور میرا نام مسعود ہے۔'' میں نے کہا اور اس نے احسان مند نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے گردن خم کر دی۔
''ایلس...... میرا خیال ہے اب تم اس بات سے آگاہ ہو گئے ہو کہ ہم نے صرف انسانی رشتے کے تحت تمہاری مدد کی ہے اور اس میں کوئی لالچ پنہاں نہیں ہے۔ ہر انسان جستجو کا مریض ہوتا ہے اور ہم دونوں بھی اس مرض سے الگ نہیں ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں تمہارے بارے میں جاننے کا اشتیاق ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں کہ اگر اپنے بارے میں نہ بتانا چاہو تو نہ بتاؤ۔ تمہیں مجبور نہیں کیا جائے گا۔''
''آہ...... میں تم لوگوں کا شکر گزار ہوں۔ تم نے واقعی میرے اوپر احسان کیا ہے ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ واپس آتے اور...... اور'' ایلس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔
''لیکن انہوں نے تمہیں رسی سے ہلاک کرنے کی کوشش کیوں کی؟''
''غیر مسلح تھے لیکن ہر قیمت پر مجھے قتل کرنا چاہتے تھے''
''تعجب ہے۔ لیکن اس کے پس پردہ کوئی کہانی ہوگی؟''
''ہاں...... لیکن تم...... تم لوگ......''
''ہاں کہو۔ رک کیوں گئے؟''
''دیکھو دوستو۔ میں خلوص دل سے کہہ رہا ہوں کہ میں تمہیں اپنی کہانی ضرور سناؤں گا لیکن...... لیکن''
''ہاں ہاں ایلس آگے کہو''
''تم مجھے پولیس کے حوالے تو نہیں کرو گے''
''اوہ...... لیکن کیوں...... ہم ایسا کیوں کرنے لگے؟''
''کیونکہ مجھے غیر قانونی طور پر یہاں لایا گیا ہے''
''لایا گیا ہے؟''
''ہاں...... میرا پاسپورٹ وغیرہ بھی نہیں ہے۔ پہلے مجھے مڈل ایسٹ میں لایا گیا اور پھر یہاں اسمگل کر دیا گیا''
''اوہ۔ لگتا ہے جیسے تم کسی خطرناک گروہ کے چکر میں پھنسے ہوئے ہو؟''
''ہاں میرے دوست' ایسی ہی بات ہے۔'' ایلس گہری سانس لے کر بولا۔
''ٹھیک ہے ایلس ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں نہ تو پولیس کے حوالے کریں گے اور نہ کسی کو تمہارے بارے میں بتائیں گے ہم تمہاری بھرپور مدد کریں گے اور تمہارے ساتھ ہر تعاون کریں

گے۔ یہ تعاون غیر مشروط ہے۔'' میں نے کہا۔

''تعجب ہے۔ تعجب ہے''

''کیوں''؟

''اس ملک میں مجھے تمہارے علاوہ کوئی ہمدرد نہیں ملا۔ میں تمہاری اس ہمدردی سے بے حد متاثر ہوا ہوں''

''کوئی بات نہیں ایلس۔ ہاں تمہارے نزدیک ایک سو ڈالر کا نوٹ بھی ملا ہے۔''

''اوہ...... کیا نوٹ تمہارے پاس موجود ہے''؟ ایلس نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں تمہاری امانت...... یہ لو'' میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا اور ایلس اس نوٹ کو بغور دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''یہی نوٹ میری بربادی کے ذمہ دار ہیں۔ آہ میں انہی کا شکار ہوں''

''وہ کیسے؟''

''تم روشنی میں اس نوٹ کو دیکھو۔ اس نے نوٹ واپس میری طرف بڑھا دیا اور میں نوٹ کو بغور دیکھنے لگا۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ایک عام نوٹ ہے''

''اصلی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں'' میں چونک پڑا۔

''اسے...... میں نے بنایا ہے۔'' اس نے جواب دیا اور میں اور نیا تعجب سے اچھل پڑے۔ نیا نے نوٹ میرے ہاتھ سے اچک لیا اور اسے روشنی میں بغور دیکھنے لگی۔ پھر اس نے شدید حیرانی سے کہا۔

''میرے خدا۔ کوئی باریک سے باریک نگاہ والا یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو بالکل اصلی معلوم ہوتا ہے''

''یہ صرف رنگ اور برش کا کمال ہے۔ یہاں تک کہ دائرلائن جو آپ دیکھ رہی ہیں برش سے ڈالی گئی ہے''

''کمال کی بات ہے۔ واقعی کمال کی بات ہے'' میں نے تحسین آمیز انداز میں کہا۔

''اب تو تمہارے بارے میں جاننے کا اشتیاق اور شدت اختیار کر گیا ہے'' نیا مسکراتی ہوئی بولی۔

ایلس گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

''کیا یہ بات تمہارے لئے قابل اعتراض نہیں ہے کہ میں جعلی نوٹ بناتا ہوں؟''

''نہیں۔ ہم اخلاقیات کے قائل نہیں ہیں۔ دنیا کا کاروبار انوکھے انداز میں چل رہا ہے۔ چند لوگوں کا تعین ہم کیوں کریں۔''

''آپ نے درست کہا۔ میں برطانیہ کی ایک قابل احترام اور معزز فیملی سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرا خاندان بہت اچھا ہے۔ لیکن''

''لیکن کیا؟''

''لیکن میں اس نیک نام خاندان کا بدنصیب فرد ہوں''

''اوہ۔ یہ بدنصیبی؟''

''وہی بتانے جا رہا ہوں۔ میرے والد مسٹر گراہم لندن کی عدالت کے جج تھے۔ ایک قابل عزت شخص۔ لیکن ان کے دشمنوں نے مجھے چھ سال کی عمر میں اغوا کر لیا۔ وہ میرے والد سے انتقام لینا چاہتے تھے''

''اوہ۔ لیکن اس دشمنی کی بنیاد کیا تھی''؟

''چند افراد نے ان کے ہاتھوں سے سزا پائی تھی اور ان کے دشمن بن گئے تھے''

''اوہ یہ بات تھی''

''ہاں مجھے اغوا کر لیا گیا اور مجھے جرائم کے راستے پر ڈال دیا گیا مجھے ہر فن میں طاق کیا گیا۔ میں فطری طور پر مصور تھا لیکن میری فنکارانہ صلاحیتوں کو دوسرا رنگ دے دیا گیا اور اس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔''

''خوب'' میں نے گردن ہلا دی۔

''میں نے ہر قسم کا نوٹ ڈیزائن کیا اور انہوں نے کروڑوں روپے کی جعلی کرنسی چھاپی۔ لیکن مجھے اپنے کردار سے نفرت تھی میں ہمیشہ ان کے جال سے نکلنے کے لئے کوشاں تھا۔ اور......'' وہ خاموش ہو گیا۔

''تم نکل بھاگے''؟ میں نے سوال کیا اور میرے اس سوال پر اس نے جن نگاہوں سے مجھے دیکھا اس وقت میں ان کا مفہوم نہیں سمجھ سکا تھا۔ لیکن آج میں اس مفہوم سے پوری طرح واقف ہوں۔''

''ہاں۔ میں نکل بھاگا''

''اور انہوں نے تمہارا تعاقب کیا''

''ہاں۔ وہ خاموش ہو گیا''

''میرے ذہن میں ہانڈی پک رہی تھی۔ اتفاق سے ایک ایسا آدمی ہاتھ لگ گیا تھا جو میرے لئے انتہائی کارآمد ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کارآمد انسان سے فائدہ کس طرح اٹھایا جائے۔ وہ

بیچارہ تو خود مصائب کا شکار تھا۔

تاہم میں نے کسی جلد بازی سے کام نہیں لیا اور چند ساعت غور کرتا رہا پھر میں نے کہا۔

''تمہاری کہانی سن کر واقعی دکھ ہوا ہے مسٹر ایلس۔ لیکن تمہارا فن قابل داد ہے۔''

''مجھے اس فن سے شدید نفرت ہے۔''

اب ہم نے اُسے مزید نہ کریدا اور اُسے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ نیما نے اُسے میرے بیڈروم میں بھیج دیا۔

''کیا خیال ہے مسعود اس شخص کو ہم اپنے لیے کام کرنے پر تیار کر سکتے ہیں؟''

''طویل کام ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے تیار کس طرح کیا جائے۔''

''ہاں اصل کام یہ سوچنا ہے۔ ہم سوچیں گے۔ ہمارے ذہن اتنے کند نہیں ہیں۔ اس کے لئے ہمیں اس کے ساتھ بہترین سلوک کرنا چاہئے تاکہ اخلاقی طور پر وہ ہمارا گرویدہ ہو جائے'' نیما نے کہا اور میں نے گردن ہلانے لگا۔

بہرحال اس کے بعد دیر تک میں نیما کے ساتھ رہا ہم دونوں مختلف انداز سے سوچتے رہے اور پھر سارے کام دوسرے دن پر ملتوی کر کے میں اس فلیٹ پر چلا آیا۔ لیکن دوسری صبح میں نے ناشتہ نیما اور ایلس کے ساتھ ہی کیا تھا۔ ایلس کافی حد تک پر سکون نظر آ رہا تھا۔

''جب کسی کام کی تکمیل ہونی ہوتی ہے تو اس کے لئے راستے خود بخود نکل آتے ہیں'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب ایلس''؟ میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

''طویل عرصہ سے میں ان لوگوں کے چنگل سے نکل جانے کی سوچ رہا تھا۔ لیکن ہمت ہی نہیں پڑی۔ یہاں آ کر میں نے سوچا کہ اب اس پروگرام کو عملی جامہ پہنا ہی دوں گا اور اس کے لئے میں نے کوشش شروع کر دی۔ پھر جب میں نے عملی قدم اٹھایا تو مجھے سہارے بھی ملتے چلے گئے تم لوگوں کا تعاون میرے لئے جتنا قیمتی ہے میں بیان نہیں کر سکتا۔''

''بلاشبہ..... ہم آخری حدود تک تمہاری مدد کے لئے تیار ہیں'' میں نے گفتگو کی اس ابتداء کو غنیمت جانا اور شروع ہو گیا۔

''مجھے یقین ہے اور اس کے لئے میں آپ لوگوں کا بے حد شکر گزار ہوں کاش میں بھی آپ کے لئے کچھ کر سکتا۔''

''ہر کام کے لئے صلہ ضروری نہیں ہوتا ایلس ہم تمہاری بے لوث مدد کرنا چاہتے ہیں۔ اسے اتفاق کہہ لو کہ ہاتھ ہمارے بھی صاف نہیں ہیں چھوٹے موٹے کام ہم بھی کر لیا کرتے ہیں''۔

''تمہاری مراد مجرمانہ کارروائیوں سے ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں ڈیئر ایلس..... میں اس سے انکار نہیں کروں گا''

''آہ میرے دوست۔ یہ تمہاری صاف دلی کی علامت ہے۔ معاشرے نے انسان کو اتنا مجبور کر دیا ہے کہ اپنی اچھی فطرت کے باوجود اسے برائیوں کی جانب راغب ہونا پڑتا ہے۔ میں اسے تمہاری مجبوری ہی سمجھتا ہوں ورنہ جو لوگ دلوں میں ہمدردی کا ایسا جذبہ رکھتے ہوں وہ فطری طور پر بُرے نہیں ہو سکتے۔''

''اب اسے کچھ کہہ لو'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ پھر اچانک ہی میں نے پوچھا۔

''تم ان نوٹوں کے لئے جو رنگ وغیرہ استعمال کرتے ہو کیا وہ آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں؟''

''ہاں..... زیادہ مشکل پیش نہیں آتی''

''ایک نوٹ کی تیاری میں کتنا وقت لگ جاتا ہے؟''

''خاصا..... کیونکہ وہ ماسٹر نوٹ ہوتا ہے پھر اس سے دوسرے رنگوں کی چھپائی ہوتی ہے۔ لیکن تم نے یہ سوال کیوں کیا؟''

''اوہ۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ دولت کے حصول کا

بابل کے معلق باغات

سات عجائبات عالم میں سے دوسرے نمبر پر آنے والا عجوبہ بابل کے معلق باغات ہیں۔ بنوکدنصر (بخت نصر) کے عہد کا آغاز بابل عراق میں چھٹی صدی قبل مسیح میں ہوا۔ بنوکدنصر نے یہ عظیم الشان باغات تعمیر کرائے۔ حقیقتاً یہ باغات معلق نہیں تھے۔ بلکہ ایسی جگہ پر لگائے گئے تھے جو درجہ بدرجہ بلند ہوتی ہوئی 350 فٹ تک پہنچ گئی۔ ان کی چوٹی پر ایک بڑا حوض پانی سے بھرا رہتا تھا۔ مختلف درجوں کے باغوں کو اسی حوض سے پانی فراہم ہوتا تھا۔ ان درجوں کی تعمیر میں اس امر کا خیال رکھا گیا تھا کہ زمین ایسی ہو کہ نہ تو درختوں کی نشوونما میں کمی آئے نہ ہی پانی کی زائد مقدار نچلے درجوں میں جا کر دوسرے باغوں کو خراب کرے۔ بابل کے صفحۂ ہستی سے مٹنے کے بعد یہ باغات بھی ختم ہو گئے۔

جذبہ کس دل میں نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ہم مالی طور پر زیادہ مضبوط نہیں ہیں۔''

''اس کے لئے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ چھپے ہوئے نوٹوں کا ایک بڑا ذخیرہ میری تحویل میں ہے۔ تقریباً ایک کروڑ ڈالر کی مالیت کے نوٹ۔ جنہیں میں نے چالاکی سے ان کے قبضے سے نکال کر پوشیدہ کر لیا تھا۔ یہ نوٹ آج بھی میرے پاس ہیں۔''

ناشتے پر ہمارے ہاتھ رک گئے۔ نیما کی آنکھوں میں قندیلیں جل اٹھی تھیں۔ لیکن دوسرے لمحے ہم نے خود کو سنبھال لیا اور ناشتے میں مصروف ہو گئے۔

''تم نے یہ نوٹ کہاں چھپائے ہوئے ہیں؟''

''ایک محفوظ جگہ۔ میں تمہیں وہاں لے جا سکتا ہوں''

''عمدہ خبر ہے۔ لیکن اس کے لئے تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

''دولت‘ جیسا کہ تم نے کہا کہ دولت کی ضرورت ہر شخص کو ہوتی ہے میں بھی اپنی زندگی کے لئے دولت ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ نوٹ میرے لئے بھی بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر تم میری مدد کرو تو میں ان میں سے آدھی رقم تمہیں دینے کو تیار ہوں۔ پچاس لاکھ ڈالر کی رقم کم نہیں ہوتی۔ تم ساری زندگی عیش وعشرت سے گزار سکتے ہو۔''

''ہمیں منظور ہے اور اس کے عوض ہم تمہاری ہر طرح کی مدد کے لئے تیار ہیں۔'' میں نے اس موقع پر کوئی تکلف مناسب نہیں سمجھا تھا۔

''میں نوٹ تمہارے حوالے کر دوں گا لیکن دوست کیا تم ان نوٹوں کو اس ملک میں استعمال کر سکتے ہو؟'' اس نے پوچھا اور میرے ہونٹ سکڑ گئے۔

واقعی اس موضوع پر نہیں سوچا تھا۔ اگر مقامی کرنسی بھی ہوتی تو یہ کام مشکل تھا۔

''میرا خیال ہے نہیں''

''اس کے لئے تمہیں یورپ کا سفر کرنا ہوگا''

''ہاں بلاشبہ''

''تو پھر کیوں نہ تم میرے ساتھ لندن تک کا سفر کرو۔ وہاں پہنچ کر ہم انہیں پھیلا دیں گے اور میں اس کام میں تمہاری پوری معاونت کروں گا''

''لندن کا سفر''؟ میں نے پرخیال انداز میں کہا۔

''ہاں......لندن......نوٹوں کو تبدیل کرنے کے بعد تم یورپ کے دوسرے ممالک کی سیر کو نکل جانا۔ زندگی اسی کا نام ہے'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے نیما کی صورت دیکھی۔ نیما کی آنکھوں میں خواب رقصاں تھے۔ تب میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''مجھے منظور ہے ایلس۔ لیکن کیا تمہیں ان نوٹوں پر پورا بھروسہ ہے۔ کیا ہم یہ کام آسانی سے کر سکتے ہیں؟''

''ہر کام محنت طلب ہوتا ہے۔ نوٹوں کو لندن لے جانے کے لئے تمہیں شدید محنت کرنا ہوگی۔ رہی ان کے تبدیل ہونے کی بات تو یہ میری ذمہ داری ہے لیکن ان میں سے کچھ نوٹ تو ہمیں یہیں تبدیل کرانے ہوں گے۔ تمہارے ہاں ڈالر کا خفیہ کاروبار بھی تو ہوتا ہے''

''ہاں چھوٹی موٹی رقم۔ بڑا کاروبار پھنسا دے گا۔ اور پھر اس قدر کھلے پیمانے پر کام کرنے والی کوئی پارٹی موجود بھی نہیں ہے۔''

''میرا بھی یہی مقصد ہے۔ تم سفر کے اخراجات اور دوسری ضرورتوں کے لئے تقریباً دس ہزار ڈالر تبدیل کرا لو تا کہ سفر میں ہمیں دقت نہ ہو''

''عمدہ خیال ہے۔ لیکن ڈالرز کا وہ ذخیرہ کہاں ہے؟''

''تم جس وقت کہو میں تمہیں وہاں لے جا سکتا ہوں۔ اسے اس جگہ سے نکال کر محفوظ مقام پر منتقل کرنا تمہارا کام ہے۔'' ایلس نے لاپرواہی سے کہا اور ہم دونوں نے اس کے الفاظ کی سچائی کو پوری طرح محسوس کیا۔

ناشتے کی میز سے اٹھنے کے بعد میری اور نیما کی ایک میٹنگ ہوئی۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ نیما ضرورت سے زیادہ خوش اور مسرور ہے۔

''یہ تو۔ یہ تو بڑی عمدہ بات ہوئی''

''بظاہر!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا مطلب۔ کیا تم اس پروگرام میں کوئی......کوئی؟''

''یہ بات نہیں ہے نیما۔ بس دوسرے بہت سے خیالات ہیں''

''مثلاً؟''

''اس شخص کی سچائی''

''کیا وہ مشکوک ہے؟''

''بظاہر تو نہیں''

''باطن کی گہرائیوں میں کیوں جا رہے ہو مسعود۔ اگر غلط صورت حال پیش آئے گی تو دیکھا جائے گا۔''

''ہاں یہ درست ہے''
''اس کے علاوہ نوٹوں کا معاملہ رہ جاتا ہے''
''ہاں یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ ان نوٹوں کی کیفیت کیا ہے۔ انہیں تبدیل کرنا آسان تو نہیں ہوگا''
''لیکن۔ یہاں ڈالر کا کاروبار کرنے والے بیشمار لوگ ہیں۔ ان سے رابطہ قائم کرو جو اس کاروبار کو پردے میں کرتے ہیں کچھ کمیشن ہی تو دینا ہوگا۔''
''ہاں۔ بس یہ سارے کام ہونے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کن بات کہی جاسکتی ہے''
''اور اگر یہ سارے کام پروگرام کے مطابق ہو گئے تو''
''تو پھر یورپ کے حسین شہر اور ہم'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور نیا میری گردن میں جھول گئی۔ وہ بیحد مسرور نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک ہم دونوں خوش آئندہ تصورات میں ڈوبے رہے اور پھر سنبھل گئے۔
''یہ ساری باتیں ایک جگہ مسعود۔ لیکن اب سب سے اہم بات تو سوچو'' نیا نے کہا۔
''وہ کیا۔ میں نے سوال کیا؟''
''فرض کرو اگر ساری باتیں اپنی جگہ درست نکلتی ہیں اور ایلس کروڑوں ڈالرز کی رقم ہمارے حوالے کر دیتا ہے تو کیا انہیں استعمال کرنے کے لئے لندن یا یورپ کے کسی شہر جانا ضروری ہے''؟
''کیوں نہیں نیا'' یہ بات تو پہلے ہی ہو چکی ہے'' میں نے کہا۔
''ٹھیک ہے' لیکن انہیں لندن تک لے جانے کے سلسلے میں کیا کیا جائے گا؟''
''ہاں...... یہ تمہارا سوال خاصا اہم ہے۔ اس کے لئے ہمیں کوئی ایسا پروگرام بنانا پڑے گا نیا جو ذہانت سے بھرپور ہو اور جس میں ہمارے پھنسنے کا کوئی امکان نہ رہے'' میں نے جواب دیا۔
''میرا مطلب ہے' کیا اتنی بڑی رقم منتقل کرنا کیا آسان کام ہوگا''؟
''یقیناً نہیں''
''تب پھر''؟
''پھر کیا۔ اس کے لئے ہم کوئی ترکیب سوچیں گے اور اگر ہم یہ کام نہ کر سکے تو پھر ہم میں اور عام لوگوں میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا''

''ٹھیک ہے مسعود' لیکن اس کے لئے خاصی ذمہ داری کے ساتھ کچھ کرنا ہوگا' کوئی ایسا پروگرام' کوئی ایسا کھیل جو انوکھی اہمیت کا حامل ہو۔ نوٹوں کو عام انداز میں اسمگل کرنا میرے خیال میں خاصا پریشان کن رہے گا''
''تم اس سلسلے میں فکر مت کرو نیا سب سے پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا واقعی ایلس کے بنائے ہوئے نوٹ اتنے مکمل ہیں کہ ہم انہیں باآسانی بازار میں لے جا سکتے ہیں' بھئی بات صرف اس ملک کی نہیں ہے' یورپ میں تو لوگوں کی نگاہیں اور زیادہ تیز ہوتی ہیں وہ اصلی اور نقلی کی پہچان کر سکتے ہیں۔ ان حالات میں۔ میرا مطلب تم سمجھ رہی ہوگی''
''ہاں ہاں یقیناً''
''تو یہ دوسرا پروگرام تو ہم بعد میں سوچیں گے' سب سے پہلی تو یہ اندازہ لگانا ہے کہ وہ نوٹ کس کنڈیشن کے ہیں اور جس طرح سے یہ نوٹ ہم نے دیکھا' وہ سب بھی اسی سے ملتے جلتے ہیں یا اس سے مختلف ہیں' اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ بہر طور ایلس کی سچائی کا اندازہ کرنا بھی ضروری ہے''
''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ تو پھر اس سلسلے میں فوری اقدام کیا کر رہے ہو''؟ نیا نے پوچھا۔
''بس جیسا کہ ایلس نے بتایا کہ وہ نوٹ ہماری تحویل میں دینے کو تیار ہے تو میں اس کام پر سب سے پہلے عمل کرنا چاہتا ہوں''
''اوہ...... لیکن کیا تم نوٹوں کا ذخیرہ لے آ ؤ گے''؟
''ہاں نیا۔ دراصل میں اسی انداز میں کام کرنے کا عادی ہوں جب تک کوئی چیز اپنی تحویل اپنی گرفت میں نہ ہو۔ میں اس پر بھروسہ نہیں کرتا''
''بالکل ٹھیک ہے۔ تمہاری کامیابی کی یہی دلیل ہے'' نیا نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔
''بس میں ایلس سے بات کروں گا۔ اگر موقع ملا تو آج ہی'' میں نے کہا اور نیا نے مسکرانے لگی۔
''ٹھیک ہے'' نیا نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
''اب مجھے اجازت دو دوپہر کے بعد آ ؤں گا۔ میرا خیال ہے دوپہر کا کھانا تم ایلس کے ساتھ کھا لینا۔ میں کچھ ضروری کاموں میں مصروف رہوں گا'' میں نے کہا اور نیا نے گردن ہلا دی۔
تھوڑی دیر کے بعد میں وہاں سے چلا آیا۔ بلاشبہ میری مجرمانہ زندگی میں اتنا بڑا کام مجھے پہلی بار ملا تھا۔ مشکل بھی تھا اور

اہم بھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سے جو مالی منافع حاصل ہونے والا تھا۔ وہ اتنا تھا کہ میں آئندہ زندگی کے بیس سالوں میں بھی اتنا پیسہ نہیں کما سکتا تھا۔ وہاں سے سیدھا اپنے فلیٹ پر واپس آیا' اور اپنے بستر پر دراز ہو کے ان حالات پر غور کرنے لگا۔

میرا ذہن مختلف ترکیبیں سوچ رہا تھا' میں نے اس سلسلے میں ہر بات کو ذہن میں رکھا تھا۔ ایلس کی سچائی پر شبہ کرنا ذرا احمقانہ سی بات تھی۔ جس انداز میں وہ مجھے ملا تھا اگر میں اس پر توجہ نہ دیتا تو ظاہر ہے وہ مجھ تک پہنچ ہی نہ سکتا تھا اور یہ سوچنا کہ وہ کس پروگرام کے تحت باقاعدہ میرے پاس آیا ہے۔ ذرا بھی ممکن نہیں تھا اور اس کے بعد اس کی کہی ہوئی بات۔ لیکن اس کا فیصلہ بھی جلد ہی ہو جاتا اور اگر وہ نوٹ میرے حوالے کر دیتا تو گویا اب سارا معاملہ صرف اس بات تک رہ گیا تھا کہ نوٹ کیا میری تحویل میں آتے ہیں اور اس کے لئے میں نے یہی بہتر سمجھا کہ نوٹوں کو نیما کے مکان پر منتقل کر دوں' نیما کا مکان ظاہر ہے میری ملکیت تھا اور میں جانتا تھا کہ ابھی تک کوئی شخص اس سلسلے میں مشکوک نہیں ہے۔ چنانچہ اس طرف سے اطمینان تھا۔ بہت دیر تک میں اس بارے میں سوچتا رہا۔ پھر میں نے دوسرے معاملات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ نجانے کب تک میں انہی خیالات میں ڈوبا رہا اور پھر چونک پڑا۔ گھڑی دیکھی تو شاید حیرت ہوئی۔ کئی گھنٹے ہو چکے تھے یہ سب کچھ سوچتے ہوئے۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور باہر نکل آیا۔ ایک ریستوران میں کھانا کھایا' کافی پینے کے بعد وہیں سے نیما کے مکان میں فون کیا۔

دوسری جانب نیما نے ہی فون ریسیو کیا تھا۔

''ہیلو'' اس کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو نیما''

''ہیلو مسعود۔ کیا حال ہیں؟''

''ٹھیک''

''کہاں ہو''؟

''ایک ریستوران سے بول رہا ہوں۔ ہمارے مہمان کا کیا حال ہے''؟

''وہ بھی ٹھیک ہے کم گو اور کھویا کھویا انسان ہے' بہت مختصر گفتگو کرتا ہے' میں نے بھی زیادہ الجھنے کی کوشش نہیں کی''

''ٹھیک کیا۔ میں تھوڑی دیر کے بعد پہنچ رہا ہوں'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ پھر تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میں نیما کے پاس پہنچ گیا اور ہم دونوں ایلس کے پاس۔ ایلس کے چہرے پر الجھن کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ بس ایک غم آلود کیفیت۔ اس نے ہمیں دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔ بڑی پھیکی مسکراہٹ تھی۔

''ہیلو ایلس''

''جناب''

''کیسی گزر رہی ہے؟''

''زندگی کی بات کر رہے ہیں شاید''؟

''ہاں'' میں نے کہا اور عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر افسردگی سے بولا۔

''کچھ لوگ۔ زمین کا بوجھ ہوتے ہیں مسٹر مسعود۔ زمین انہیں کسی طور پر قبول نہیں کرتی اور۔''

''تم اتنی مایوسی کی گفتگو کیوں کر رہے ہو ایلس؟''

''نہیں جناب۔ نہیں۔ میں جو کچھ سوچتا ہوں ٹھیک ہی ہے''

''کیا مطلب''؟

''میری ذات کیوں میرے لئے سکون کا باعث نہیں رہی۔ میں ہمیشہ تشنہ رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ یہ سوچا ہے کہ کیا میں کسی کی توجہ کا مرکز رہا ہوں۔ کیا کوئی مجھ سے دلچسپی رکھتا ہے۔ ایسے لوگ بھی نہیں ملے۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی کی نگاہوں میں اپنے لئے ہمدردی نہیں پائی۔''

''اوہ۔ مجھے افسوس ہے ایلس''

''نہیں جناب۔ براہ کرم افسوس نہ کریں۔ میں نہیں جانتا قصور کس کا ہے۔ میرے باپ کا' اس کے پیشے کا یا میری تقدیر کا''

''لیکن اب تو تم حالات کی زنجیر توڑ چکے ہو۔ اب تو تم ان لوگوں کے چنگل سے نکل آئے ہو''؟ میں نے کہا۔

''شاید'' وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔

''کافی پلواؤں آپ دونوں کو''؟ نیما نے اس گفتگو میں دخل دیا۔

''ہاں ضرور کیوں مسٹر ایلس''؟ میں نے ایلس کو دیکھ کر کہا اور اس نے گردن ہلا دی۔ نیما اٹھ کر چلی گئی۔

''آپ لوگ بیحد ہمدرد ہیں'' ایلس نیما کے جانے کے بعد بولا۔

''شکریہ ایلس۔ ویسے زندگی کے اس رُخ میں بھی تم عورت سے دور رہے؟''

''میں نہیں سمجھا؟''

''میرا مطلب ہے کہ تمہاری زندگی میں کچھ دلچسپیاں تو

شامل ہوں گی؟''

''نہیں جناب۔ میں ہمیشہ کچھ لوگوں کا قیدی رہا ہوں مجھے کبھی اتنی آزادی نہیں دی گئی کہ میں اپنے طور پر کچھ سوچ سکتا۔''

''اوہ۔ لیکن کیوں؟'' کیا تم نے انہیں ہمیشہ مشکوک رکھا۔''

''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ لیکن انہوں نے ہمیشہ میرے اوپر دباؤ رکھا۔ دراصل ان کے ذہنوں میں ایک انتقامی جذبہ کام کر رہا تھا۔ وہ مجھے خوش دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ جہاں میری کوئی دلچسپی پاتے مجھے وہاں سے دور کر دیتے۔''

''انوکھا۔ انتقام تھا۔'' میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

''ہاں۔ قصور میرے پاپا کا تھا۔ انہوں نے اپنے فرائض سے مجبور ہو کر انہیں سزائیں دی تھیں۔ لیکن شکار میں بنا۔''

''بہر حال مجھے افسوس ہے۔ اس کے بعد سے تم اپنے والدین سے کبھی نہیں ملے؟''

''کبھی نہیں۔''

''ان کے بارے میں معلومات بھی نہیں حاصل کیں؟''

''نہیں۔ میں ان سے بے خبر نہیں رہا۔ وہ لوگ تو اب مجھے بھول چکے ہوں گے۔''

''اوہ۔ لیکن ایلس اب تو تم ان حالات سے نکل چکے ہو؟''

''ہاں۔ میں نکل چکا ہوں۔'' اس کی مجبور مسکراہٹ پھر اُبھر آئی۔

''تو اب تمہیں خوش ہونا چاہیے۔''

''ہاں۔ اب میں خوش ہوں۔'' اس نے مصنوعی انداز میں کہا اور میں نے محسوس کیا کہ نیما درست کہتی ہے۔ وہ انوکھی فطرت کا انسان ہے۔''

''میں اب تمہاری فوری مدد کرنا چاہتا ہوں ایلس۔ میں خود کو پارسا ظاہر نہیں کروں گا۔ دراصل میرے ذہن میں معقول دولت حاصل کرنے کا تصور موجود ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے تم سے ہمدردی بھی ہے۔''

''میں تمہاری صاف گوئی کی قدر کرتا ہوں مسعود۔''

''تب پھر تم وہ نوٹ میرے حوالے کب کر رہے ہو؟''

''جب تم پسند کرو؟''

''آج ہی رات۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

قرآن مجید

☆ قرآن مجید کی سورۃ توبہ ایسی سورۃ ہے جس میں ایک مرتبہ بھی بسم اللہ نہیں آتی۔

☆ سورہ النمل میں دو مرتبہ بسم اللہ آتی ہے ایک بار شروع میں دوسری بار آخر میں۔

☆ سورۃ یٰسین کو روح القرآن کہا جاتا ہے۔

☆ قرآن پاک میں خانہ کعبہ کے لیے مسجد الحرام کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

☆ صحابی رسول حضرت عثمانؓ کو جامع القرآن کہا جاتا ہے۔

☆ قرآن مجید میں ۱۴ سجدہ تلاوت آتے ہیں۔ پہلا سجدہ تلاوت پارہ ۹ میں ہے۔

☆ قرآن مجید میں سات سو مقامات پر نماز کی تاکید آئی ہے۔

☆ قرآن مجید میں ایہا النبی ۲۳ مرتبہ ذکر خیرات ۱۵۰ مرتبہ اور ۷۰ مرتبہ دعا مانگنے کی تاکید آئی ہے۔

☆ قرآن مجید میں سب سے زیادہ ذکر حضرت موسیٰؑ کا آتا ہے۔

''ٹھیک ہے۔'' ایلس نے بدستور لاپرواہی سے کہا۔

''لیکن ایلس۔ وہ نوٹ تمہارے کسی شناسا کے پاس ہیں کیا؟''

''شناسا؟ ہاں ویرانے ہی میرے شناسا ہو سکتے ہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''کیا مطلب؟''

''ہاں۔ ایک عمارت ہے کہا جاتا ہے مغل شہنشاہوں نے وہ عمارت بنوائی تھی۔ اب تو وہ کھنڈرات میں بدل چکی ہے۔ میں نے وہ نوٹ اس عمارت میں چھپائے تھے۔''

''اوہ۔ کیا اس کے نزدیک کوئی خشک تالاب بھی ہے۔''

''ہاں۔ میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔''

''خوب۔ اسے لال بارہ دری کہتے ہیں۔ مغلوں کی عمارت ہی تھی۔ محفوظ ترین جگہ ہے۔ شہر سے تقریباً تیس میل دور۔''

''ہاں۔ اتنی ہی ہوگی۔''

''نوٹ کسی بیگ میں ہیں۔''

''چمڑے کے مخصوص تھیلے میں ہیں جنہیں وہ لوگ استعمال کرتے ہیں۔''

"کتنے تھیلے ہیں؟"
"دس۔"
"یہ سارے سوالات میں نے اس لئے کئے ہیں کہ انہیں لانے کے لیے پروگرام طے کرلوں۔"
"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ میرے خیال میں اس کے لئے آپ کو کسی بند گاڑی کا بندوبست کرنا چاہیے مسٹر مسعود۔"
"ٹھیک ہے بندوبست ہو جائے گا۔ تقریباً دس بجے ہم یہاں سے چلیں گے۔ میں پونے دس بجے پہنچ جاؤں گا۔" میں نے کہا اور اس نے گردن ہلا دی۔ اسی وقت نیا کافی کے برتن اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ اس نے مسکرا کر ہم دونوں کی طرف دیکھا اور پھر کافی بنا کر سرو کرنے لگی۔ اس کے بعد خاموشی سے کافی پی گئی اور پھر میں نے نیا کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ میں نے نیا کو اس سلسلہ کی تفصیل بتادی تھی۔

لال بارہ دری کے وسیع کھنڈرات رات کی تاریکی میں بیحد مہیب لگ رہے تھے ایلس باہر کا آدمی تھا اور مشرقی روایات کے بارے میں اسے کچھ معلومات نہیں تھی' اس لئے اس کے ذہن میں کوئی خاص بات نہیں ہوگی۔ لیکن میں نے لال بارہ دری کے کھنڈرات کے بارے میں انوکھی کہانیاں سنی ہوئی تھیں' کچھ لوگوں کے چشم دید واقعات اور کچھ روائتیں ان کھنڈرات کو بے حد خوفناک بنا کر پیش کرتی تھیں انہیں آسیب زدہ قرار دے دیا گیا تھا اور رات کی تاریکی میں اس سڑک پر آمد ورفت بیحد کم ہوا کرتی تھی۔ لیکن دولت کی کشش انسانی حواس پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ میں نے ان ساری روایات کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ یوں بھی میں ان فرسودہ روایات سے زیادہ متاثر نہیں تھا۔ لیکن اس وقت تو میں بھی ان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ حالانکہ جوں جوں میرے قدم آگے بڑھ رہے تھے میرے ذہن میں انوکھے تاثرات جاگ رہے تھے پھر ہم لال بارہ دری کے بالکل نزدیک پہنچ گئے۔ گاڑی سڑک سے اتار کر کچے پر کھڑی کر دی گئی۔ یہ وین میں نے کرائے پر حاصل کی تھی اور میرے خیال میں میرے لیے بیحد کارآمد تھی۔ بارہ دری کے ٹوٹے دروازے سے اندر داخل ہو کر ہم بائیں سمت مڑ گئے۔ اس جگہ کو ہاتھی خانہ کہا جاتا تھا۔

ہاتھی خانے تک جانے کے لیے تقریباً بارہ سیڑھیاں اترنا پڑتی تھیں اس کے دونوں جانب تین تین فٹ کی چوڑی جگہ تھی جس سے گزر کر دوسری طرف جایا جاسکتا تھا۔ ذرا سی بھی لغزش ہو جائے تو پندرہ سولہ فٹ کی گہرائی میں جا پڑو۔ چنانچہ ایلس ہاتھی خانے میں جانے والی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں لمبی لمبی ٹارچیں تھیں جن سے ہم اس حصے کو منور کر رہے تھے۔

میں نے اس دوران ایلس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ ہاتھی خانے کا بھیانک ماحول رگ و پے میں سرد لہریں دوڑا رہا تھا۔ لیکن بہرحال ایلس بھی تو موجود تھا۔ ہاتھی خانے کی اس کوٹھڑی میں جہاں ہاتھیوں کی خوراک بھری ہوتی ہے داخل ہو کر ہم رک گئے۔ تب ایلس نے ایک طرف روشنی ڈالی اور میں نے چمڑے کے دو بے رنگ تھیلے دیکھ لیے جو اوپر نیچے چنے ہوئے تھے۔

ایک ایک لمحہ بدن سرد کر رہا تھا۔ ایک انوکھا احساس ذہن میں جاگ رہا تھا۔ بہرحال ہم نے تھیلے لئے اور سنبھل کر چلتے ہوئے باہر نکل آئے۔ میں نے نیا کو اس سلسلہ کی تفصیل بتادی تھی۔

"چلیں ایلس؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں۔" اس نے بھاری آواز میں کہا اور میں نے وین اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ایلس پر اب مجھے اعتماد ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جھوٹا انسان نہیں ہے۔ بس اب آخری بات رہ گئی تھی یعنی نوٹ کیسے ہیں۔"

اور دوسرے دن یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ نوٹوں کے حصول کے بعد دیر کرنا حماقت تھی چنانچہ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ نوٹ ہم نے احتیاط سے ایک جگہ پوشیدہ کر دیئے تھے اور ایلس ہمارا پورا مددگار تھا۔

دوسرے دن میں نے خفیہ طور پر ڈالر کا کاروبار کرنے والے ایک ایجنٹ سے ایک ہزار ڈالر کے نوٹ بدلوائے اور کسی کو کوئی شبہ نہیں ہو سکا۔ نوٹ بالکل تسلی بخش تھے پھر تیسرے دن میں نے پانچ ہزار ڈالر کے نوٹ بدلوائے اور ایک بڑی رقم میرے پاس جمع ہو گئی۔ نوٹوں کے اصلی ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکا۔"

"نوٹوں کے غلط ہونے کا خیال تم دل سے نکال دو۔" ایلس نے کہا۔
"ہاں ایلس۔ اس بات کا یقین مجھے ہو گیا ہے کہ یہ نوٹ انتہائی شاندار ہیں۔ چنانچہ یہ مرحلہ طے ہو گیا ہے۔ تقریباً سات ہزار ڈالر میں بدلوا چکا ہوں اور یہ رقم اتنی ہے کہ ہم آسانی سے ساری ضروریات پوری کر سکتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے ایلس کہ ہم یہ نوٹ کیا برطانیہ میں آسانی سے بدلوا سکیں گے؟"

''یہ ذمہ داری تم میرے اوپر چھوڑ دو۔ اگر تمہیں ان کے چلانے میں ذراسی بھی دقت اور پریشانی کا شکار ہونا پڑا تو اس کا ذمہ دار میں ہوں گا۔ تم چاہو تو ان ڈالرز کو بینکوں میں بھی بدلوا کر دیکھ سکتے ہو۔''

''مجھے یقین ہے ایلس۔'' میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

تب ایلس میری صورت دیکھتے ہوئے بولا۔

''لیکن ان کو لے جانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرو گے۔ اور کس طرح لے جاؤ گے؟''

''طریقہ کار۔ میں نے ایلس کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی ترکیب ہے تو مجھے بتاؤ۔ ورنہ میں اپنے طور پر تو سوچ ہی رہا ہوں۔''

''میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔'' ایلس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''کیا'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''میں تمہیں اس کے بارے میں مکمل تفصیلات بتاؤں گا۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے غور کر لینا کہ کیا تم مطمئن انداز میں یہ سب کچھ کر سکتے ہو۔''

''ترکیب کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''کچھ عرصے قبل' میرے خیال میں تقریباً چھ ماہ یا پانچ ماہ قبل ایک معزز جوڑا یہاں آیا تھا۔ عورت کا نام اینی کوک تھا اور مرد مسٹر ہڈسن۔ ان دونوں کا تعلق بھی برطانیہ کے ایک اچھے خاندان سے تھا۔ لیکن دونوں بدعنوانیوں کا شکار ہو گئے تھے اور ان کی مجبوریاں انہیں اس گروہ میں گھسیٹ لائیں۔ انہوں نے روپیہ کمانے کے لیے گروہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ لیکن ہڈسن تیز مزاج انسان تھا اینی کاک کی بے عزتی پر ایک دن وہ گروہ کے ارکان سے لڑ گیا اور دونوں کو قتل کر دیا گیا۔ ان کی لاشیں ضائع کر دی گئیں اور پھر کبھی ان کے بارے میں کوئی بات سننے کو نہیں ملی۔ اتفاق سے ان کے کاغذات اور پاسپورٹ اور دوسری چیزیں میرے پاس رہ گئیں۔''

''تمہارے پاس۔'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں۔''

''کہاں ہیں؟''

''انہی تھیلوں میں سے ایک موجود ہیں۔''

''اچھا پھر؟''

''ان دونوں کا تعلق بھی لندن کے ایک اچھے گھرانے سے تھا اور تمہاری حکومت کو ابھی ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔''

''خوب۔''

''اگر ہڈسن یہاں کسی ٹریفک کے حادثے کا شکار ہو جائے تو اس کی لاش لندن لے جانے کے لئے اینی کوک کوشش کر سکتی ہے۔''

''میں نہیں سمجھا۔''

''میری مراد مس نیا سے تھی۔ اینی کوک کی حیثیت سے وہ ہڈسن کی لاش برطانیہ لے جا سکتی ہیں۔ یہ لاش سرکاری تابوت میں ہوگی اور مس اینی کوک اس تابوت کے ساتھ ہوں گی۔ کام صرف یہ کرنا ہوگا کہ بالکل ایسا ہی تابوت اور ہوگا جسے اس وقت تبدیل کر دیا جائے گا جب لاش کا تابوت جہاز پر لے جایا جائے گا۔''

''اوہ۔'' میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔ ایلس کی تجویز لاجواب تھی۔ میں اس کا مقصد سمجھ رہا تھا۔

''اور اس دوسرے تابوت میں؟'' میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''نوٹ ہوں گے۔''

''لندن ایئر پورٹ پر کیا ہوگا۔'' میں نے پوچھا۔

''وہاں حالات میں سنبھال لوں گا یہ میری ذمہ داری ہے۔ اس کے لئے کوئی اور بہتر طریقہ کار اختیار کیا جائے گا۔''

''ہاں۔ لیکن ڈیئر ایلس۔ کام بیحد مشکل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اتنی تعداد میں نوٹ لے جانے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں ہوگا لیکن۔ اس کے لیے چند مشکلات بھی پیش آ سکتی ہیں۔''

''مثلاً؟''

''چلو ہم نے نیا کو میک اپ کر کے اینی کاک بنا دیا لیکن ہڈسن؟''

''وہ کردار میں ادا کروں گا۔''

''تم؟''

''ہاں میں۔ تم میرے لیے بھی پاسپورٹ وغیرہ کا بندوبست کر دینا۔ تمہارے روانہ ہونے کے فوراً بعد کسی دوسرے طیارے سے میں لندن پہنچ جاؤں گا اور ایئر پورٹ پر تمہاری مدد کروں گا۔''

''یعنی لاش کی حیثیت سے تم خود کو پیش کرو گے؟''

''ہاں۔''

''تمہیں دقت نہیں ہوگی۔''

''ہرگز نہیں۔ کیونکہ میں حبسِ دم کر لیتا ہوں۔ وہ لوگ سو فیصدی مجھے لاش ہی کہیں گے۔'' ایلس نے جواب دیا۔

''ایلس کی گفتگو میں مجھے جگہ جگہ سقم نظر آ رہے تھے۔ کچھ بے ربط سی بات تھی۔ مشکل ترین مرحلوں کے لیے وہ ایسے انوکھے حل پیش کر رہا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ اگر وہ خود ہی تھوڑی سی کوشش کر لیتا۔ لیکن اس کی شخصیت میں ایک انوکھا پن تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت نہ جانے وہ بیچارہ کس احساس کا شکار تھا۔

''بہر حال یہ معاملات ہمارے درمیان طے ہو گئے اور میں سخت محنت میں مصروف ہو گیا۔ میں نے اپنے تمام تر تعلقات اور ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے ضروری مسائل حل کئے چند ایسے لوگوں کو اپنی مدد کے لئے تیار کر کیا جو اہمیت رکھتے تھے۔ انہیں انتہائی معقول معاوضہ پیش کیا۔ بہر حال یہ سارے کام مکمل کرانے میں تقریباً پندرہ دن صرف ہو گئے۔ اور اب ہم اپنی کارروائی پر عمل کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔

''یہاں تک کہ وہ آخری رات آ گئی جب ہمیں اپنے ڈرامے کو اسٹیج کرنا تھا۔ شہر کی ایک بھری سڑک کا انتخاب کیا گیا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ مجھے اس ڈرامے میں صرف ایک تماشائی کا کردار ادا کرنا تھا۔ نیا کے چہرے پر اینی کاک کا میک اپ تھا اور ایلس مسٹر ہڈسن کے روپ میں اس کے ساتھ تھا۔ نیا اپنے ڈرامے کی پوری پوری ریہرسل کر چکی تھی۔ چنانچہ ایک سڑک کراس کرتے ہوئے اچانک ہڈسن زمین پر گر پڑا۔ اس نے دو چار مرتبہ ہاتھ پاؤں رگڑے اور پھر سرد ہو گیا۔

''نیا کی چیخ پر بے شمار لوگ جمع ہو گئے۔ پولیس کے ذمہ دار افراد بھی پہنچ گئے اور چونکہ معاملہ ایک غیر ملکی کا تھا اس لئے خاصی توجہ دی گئی۔ میں بھی تماشائیوں میں شریک تھا۔

پولیس کی ایک گاڑی میں مسٹر ہڈسن کو ہسپتال لے جایا گیا۔ نیا بھی روتی سسکتی ساتھ تھی۔ پوری توجہ سے مسٹر ہڈسن کی نگرانی کی جا رہی تھی لیکن ڈاکٹروں کی پوری ٹیم نے ان کا معائنہ کرنے کے بعد انہیں مردہ قرار دیا۔

خاصی ہنگامی کیفیت تھی پولیس کے بڑے بڑے افسر جمع ہو گئے تھے۔ موت کے بارے میں پوری رپورٹ حاصل کر لی گئی۔ برطانوی سفارتخانے کو بھی اطلاع دے دی گئی۔ پاسپورٹ وغیرہ موجود تھے۔ نیا نے سسکتے ہوئے بتایا کہ وہ اور اس کا منگیتر یہاں سیر کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ اس کا منگیتر ہڈسن کچھ بیمار تھا اور اس سے قبل بھی ایک بار اسے یہی دورہ پڑا تھا۔

تعجب کن رپورٹ ڈاکٹر کی تھی۔ کوئی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اس شخص نے حبس دم کیا ہوا ہے۔ بہر حال نیا کی درخواست پر لاش کو لندن پہنچانے کا بندوبست کیا گیا۔ یہ بندوبست سفارتخانے نے ہی کیا تھا اور نیا کو ہر طرح کی سہولت فراہم کی گئی اس موقع پر میں نیا اور ہڈسن کے مقامی دوست کی حیثیت سے سامنے آیا اور میں نے بھی ان دونوں کے ساتھ جانے کی پیشکش کر دی۔

''سارے کام انتہائی تسلی بخش طور سے انجام گئے تھے۔ آخری کام یہ تھا کہ میں اپنے مخصوص لوگوں کو جن کو میں نے اپنے کام کے لیے تیار کیا تھا' وہ تابوت فراہم کر دوں جو ہمیں بدلنا تھا۔ چنانچہ یہ آخری کام بھی دھڑکتے دل سے میں نے پایہ تکمیل کو پہنچا دیا۔ نوٹوں سے بھرا تابوت ان کے حوالے کر کے میں نیا کے پاس آ گیا جس نے ماتمی لباس پہنا ہوا تھا اور جس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''اب ہماری نگاہیں لاش کے تابوت پر تھیں۔ لیکن پھر ہمیں اسے نگاہوں سے اوجھل کرنا پڑا۔ تابوت جہاز میں پہنچا دیا گیا تھا اور پھر انتہائی عجلت میں ہمارا کارکن ہمارے پاس پہنچ گیا۔

''کام ہوشیاری سے کر دیا گیا ہے جناب۔'' اس نے ہمیں اطلاع دی۔

''شکریہ۔ تمہارا معاوضہ!'' میں نے نوٹوں کا ایک بنڈل اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے پھرتی سے لباس میں چھپا لیا۔

''دوسرے تابوت کا کیا کروں؟''

''بس اسے کسی مناسب جگہ چھوڑ دو۔ فی الحال وہ کہاں ہے؟''

''ایک بڑی بس میں رکھا ہوا ہے۔''

''تم نے پروگرام کے مطابق اس کا تالا کھول دیا؟''

''ڈھکن بھی کھول دیا ہے۔''

''بس تمہارا کام ختم۔ اب تم اسے ضائع بھی کر سکتے ہو۔ لیکن دیکھ لینا وہ خالی بھی ہے یا نہیں۔''

''بہتر جناب۔'' کارکن نے کہا اور چلا گیا۔ میں اور مس اینی کاک یا نیا جہاز میں آ گئے۔ ہم دونوں اطمینان سے ایک ہی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ نیا تو بہترین اداکاری کر رہی تھی لیکن گھبرائی ہوئی تھی۔

طیارے نے پرواز شروع کر دی۔ نیا گم سم تھی۔ پھر جب میں نے محسوس کیا کہ کوئی ہماری جانب متوجہ نہیں ہے تو میں نے نیا کو مخاطب کیا۔

"تم تو ضرورت سے زیادہ خاموش ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے؟"

"اوہ مسعود۔ میں واقعی خوفزدہ ہوں۔"

"کیوں؟"

"بس بیشمار خیالات ہیں۔ جن میں ایک سب سے زیادہ خوفناک ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ایلس کس طرح لندن پہنچے گا۔ اگر وہ نہ پہنچ سکا اور تابوت چیک کرلیا گیا تو؟" نیا نے کہا۔

"اتنا خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا نیا۔ اس کے بعد ہم کروڑ پتی بن جائیں گے۔ بہرحال ایلس چالاک آدمی ہے ممکن ہے اس نے پہلے ہی انتظامات کر لیے ہوں۔"

"کیا تمہاری نگاہوں میں اس کی شخصیت صاف ہے؟" نیا نے سوال کیا۔ اور میں پُرخیال انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"تمہارا کیا خیال ہے نیا؟"

"میں نے ہمیشہ اس کے اندر ایک مظلومیت سی محسوس کی ہے۔ خود میں گم۔ کھویا کھویا جیسے کوئی بات سوچ رہا ہو۔"

"اس کے علاوہ؟"

"بس مسعود۔ کیا کہوں میں۔ نہ جانے کیوں وہ مجھے ہمیشہ پُراسرار سا لگا ہے۔"

"یہاں تک میں تم سے متفق ہوں۔"

"آخر کیوں؟"

"بعض کردار آپ اُلجھے ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان میں کوئی گہرائی نہیں ہوتی لیکن بس ایک انوکھا پن ہوتا ہے ان میں۔"

"ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ باقی باتیں سب ٹھیک تھیں۔ جیسے یہ نوٹ اور اس کی دوسری باتیں۔"

"بہرحال اس وقت تک پریشان نہیں ہونا جب تک کہ کوئی الجھن نہ پیش آئے۔ ورنہ سفر کا مزا کرکرا ہو جائے گا۔"

"مزا۔" نیا ہنسنے لگی۔

"کیوں تمہیں اختلاف ہے؟"

"سو فیصدی۔ یہ سفر سولی کے راستے کا سفر ہے۔ جب تک ہم اپنا کام مکمل نہ کرلیں پُرسکون کیسے رہ سکتے ہیں؟" نیا نے کہا۔ میں خاموش ہو گیا۔ نیا کافی حد تک درست کہہ رہی تھی۔ واقعی جب تک ہم لندن کسٹم سے نہ نکل جائیں یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ہم خطرات سے دور ہو گئے۔

دولت مشترکہ

وہ ممالک جو برطانوی نوآبادی ہوتے تھے اپنی آزادی کے بعد برطانیہ سے علامتی اتحاد رکھنے کے لیے تنظیم دولت مشترکہ میں شمولیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان ممالک میں دنیا کی 30 فیصد آبادی یعنی 1.7 بلین افراد بستے ہیں۔ دولت مشترکہ کا ہیڈ کوارٹر لندن میں واقع ہے اس کے جنرل سیکرٹری ڈان میکینکلن کا تعلق آسٹریلیا سے ہے۔ اس کے رکن ممالک کی تعداد 54 ہے۔

دولت مشترکہ باہمی اتفاق رائے اور دیگر مسائل کے حل کے لیے مل جل کر کام کرنے والی تنظیم ہے جس کا کسی قسم کا کوئی منشور، پالیسی یا آئین وغیرہ نہیں ہے۔

پاکستان بھی اس تنظیم کا ممبر تھا لیکن 1972 میں پاکستان نے دولت مشترکہ کی رکنیت چھوڑ دی۔ مگر 1989 میں پاکستان دوبارہ دولت مشترکہ کا رکن بن گیا لیکن اکتوبر 1999ء میں فوجی انقلاب کے بعد اس کی رکنیت معطل کر دی گئی۔ آئرلینڈ، جنوبی افریقہ اور فجی بھی مختلف اوقات میں اس تنظیم کو چھوڑ گئے مگر جنوبی افریقہ 1994ء میں دوبارہ اس کا رکن بن گیا۔ چند ممالک جیسے مصر، عراق، اردن، مائنمار (برما)، فلسطین، سوڈان، برطانوی صومالی لینڈ، جنوبی کیمرون اور اومان برطانوی نوآبادی رہنے کے باوجود دولت مشترکہ کے رکن نہیں ہیں۔ اسی طرح موزمبیق دولت مشترکہ تنظیم کا واحد ملک ہے جو کبھی برطانوی نوآبادی کا حصہ نہیں رہا۔

نیا سے گفتگو کے بعد تو بہت سے وسوسے میرے ذہن میں بھی جاگ اُٹھے تھے۔ واقعی اگر ایلس بروقت لندن ایئرپورٹ نہ پہنچ سکا تو۔ میں حالات پر غور کرنے لگا۔ ایلس ایک تابوت میں بند ہے۔ کوئی بھی دقت ہو سکتی ہے۔ تابوت پولیس کے ہاتھ لگ سکتا ہے۔ یا کوئی بھی ایسی بات۔ ممکن ہے اسے دوسرے طیارے تک پہنچنے میں دیر ہو جائے۔ ہر طرح سے ایک ہی خطرہ سامنے آ جاتا ہے۔ لندن ایئرپورٹ پر کسٹم چیکنگ کے دوران کیا ہوگا۔ ساری ذمہ داری نیا پر آ پڑی تھی۔ ہو سکتا ہے بروقت کوئی انتظام نہ ہو سکے۔ ایسی صورت میں نیا سو فیصدی اس تابوت کی ذمہ دار تھی کیونکہ وہی ہڈسن کی بیوہ کی حیثیت سے سفر کر رہی تھی۔

بہر حال اس سفر میں گھٹن تھی۔ خوف تھا اور [illegible] بھی برحق تھی۔ کافی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ [illegible] کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''میرا خیال ہے اب تم پریشانی [illegible] ہو گئے؟''

''اس قدر تو نہیں نیما۔ لیکن بہر حال تمہاری سوچ وزن رکھتی ہے۔''

''کیا فرق پڑتا ہے مسعود۔ بہر حال بہترین مستقبل کے لیے اگر خطرات سے گزرنا پڑ رہا ہے تو ٹھیک ہے۔''

''ہاں۔ یہ بھی درست ہے۔''

لندن تک کا سفر جن تصورات اور خیالات میں گزرا وہ سوہانِ روح تھے۔ پھر طیارہ لندن ایئر پورٹ پر پہنچ گیا۔ اب ہم کسی حد تک نڈر ہو گئے تھے۔ نیما نے ایک تجویز پیش کی۔ اس نے کہا کہ میں الگ رہ کر حالات سنبھالوں گا۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔

''لیکن مسعود۔ سوچو تو سہی......''

''نہیں نیما۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ہم دونوں پھنس گئے تو بے دست و پا ہو کر رہ جائیں گے۔ بہتر ہے کہ تم دور رہ کر نگاہ رکھو۔''

''نہیں نیما۔ میرا ضمیر اس کی اجازت نہیں دیتا۔ براہِ کرم تم اس کے لیے مجھے مجبور نہ کرو۔ جو کچھ ہوگا ساتھ ہی بھگتیں گے۔''

''اوہ! تم ضد کر رہے ہو۔ اندازہ لگالو۔ الیس کا کوئی وجود نہیں ہے وہ کسی آفاقی ذریعہ سے تو یہاں نہ پہنچ سکے گا۔''

''ممکن ہے اس نے کوئی اور۔'' میں اچانک خاموش ہو گیا دو کسٹمز والے ہماری جانب آئے تھے۔ خشک چہرے والے افسر تھے جن کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ نہ جانے کیوں دل میں ایک خوف اُبھر آیا۔

''مس اینی کاک۔'' ان میں سے ایک افسر نے ہاتھ میں پکڑے ایک کاغذ کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی۔ میں ہوں۔''

''مسٹر ہڈسن کی لاش آپ ہی لائی ہیں؟''

''جی ہاں۔ وہ میرا منگیتر تھا۔'' نیما نے سسکی لے کر کہا۔

''براہِ کرم ہمارے ساتھ تشریف لائیں۔'' افسر نے کہا اور نیما کے اعصاب میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ تب میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

''میرا نام مسعود رضوی ہے۔'' میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

''[illegible]'' [illegible] کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''[illegible] اینی کاک ایشیا میں میرے مہمان [illegible] یہاں آیا ہوں۔''

''[illegible] بھی تشریف لائیے۔'' افسر نے [illegible] اور ہم دونوں ان کے ساتھ چل پڑے۔ [illegible] ہمارا تابوت تھا اور [illegible] ہماری اصلیت واضح ہونے والی تھی چند دوسرے افسران [illegible] ہوئے تھے۔

''مس اینی کاک۔'' ہمیں ساتھ لانے والے ایک افسر نے ہمارا تعارف کرایا ''اور ان کے ایشیائی دوست مسعود رضوی۔''

''ہیلو۔'' افسر نے خوش اخلاقی سے کہا اور ہمیں بیٹھنے کی پیشکش کی۔

''میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں مس کاک۔ لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم غمزدہ مسافروں کے ساتھ بھی وہ سلوک نہیں کر سکتے جو ہمیں کرنا چاہیے اور اس کی وجہ سماج دشمن عناصر ہیں جو نت نئے طریقوں سے حکومت کو دھوکا دینے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ ابھی چند روز قبل ایسے ہی ایک تابوت کے اندر موجود لاش کے مردہ بدن میں افیون کی بھاری مقدار موجود پائی گئی۔ بتائیے ہم کیا کریں۔ لوگ موت کے بعد بھی مذاق جاری رکھتے ہیں۔ چنانچہ مس کاک ہماری خواہش ہے کہ ہم آپ کی اجازت سے اس تابوت کو کھول کر لاش کا ایک مشینی جائزہ لے لیں۔ کیا آپ ایک اچھے شہری کی مانند ہم سے تعاون کریں گی؟''

''اوہ۔ اوہ۔'' نیما رو پڑی۔ شاید خوف سے لیکن میں نے آگے بڑھ کر سہارا دیا۔

''قانون سے تعاون فرض ہے مس کاک لیکن جناب کیا کوئی ایسی صورت ممکن نہیں ہے کہ آپ اس تابوت کو نہ کھولیں ہم آپ کے اطمینان کے لیے؟''

''ہرگز نہیں جناب۔ ہم اخلاقی قدروں کو بھی اہمیت دیتے ہیں لیکن اس سے زیادہ ہمارے فرائض۔ براہِ کرم آپ اس کاغذ پر دستخط کر دیں۔'' افسر نے ایک فارم نیما کی طرف بڑھا دیا۔

ہم دونوں ہی کو احساس ہو گیا کہ ہم بری طرح پھنس گئے ہیں۔ میرا ذہن سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے کس طرح ہم اپنے اوپر سے یہ الزام دور کریں گے اور اس کے لیے ایک ہی

ترکیب کارگر تھی یہی جو حقیقت تھی۔ یعنی تابوت بدل دیا گیا۔ حالانکہ یہ ایک معمولی کوشش تھی۔ لیکن بہر حال ہاتھ پاؤں مارنے کے لیے ایک راستہ تو تھا۔ وہ براوقت آ گیا تھا جس کا خوف ہمیں تھا۔ ہماری آنکھوں میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ بہر حال نیا نے لرزتے ہاتھوں سے فارم پر دستخط کر دیئے۔ دوسری طرف تابوت کو مشین پر لے جانے کی کارروائی مکمل ہو گئی تھی ہمیں بھی ساتھ آنے کی دعوت دی گئی۔ لیکن میں نے معذرت کر لی۔

''آپ لوگ اپنا فرض پورا کریں۔ میرا خیال ہے کہ مس اینی کاک کو کسی اور آزمائش میں نہ ڈالیں۔'' میں نے کہا اور افسروں نے گردن ہلا دی۔ تابوت کو مشینی ذرائع سے کھولا جانے لگا۔ میں اور نیا پتھر کے بتوں کی مانند ساکت بیٹھے ہوئے تھے آنے والا ہر لمحہ ہماری موت تھا۔ میری نگاہیں افسروں پر جمی ہوئی تھیں نہ جانے وہ کیا کارروائی کر رہے ہیں۔

میری ہمت نہ ہوئی کہ میں ان کے نزدیک جاؤں لیکن افسروں کے چہرے پرسکون تھے۔ تقریباً بیس منٹ تک وہ مصروف رہے اور پھر تابوت کا ڈھکنا بند کر دیا۔

یہ بیس منٹ۔ اُف یہ بیس منٹ ہمارے اوپر کس قدر بھاری تھے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ایک لمحہ ہتھوڑوں کی طرح ذہن پر ضرب لگا رہا تھا۔ تب ایک آفیسر ہماری طرف بڑھا اور ہماری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ آفیسر ہمیں موت کا فرشتہ محسوس ہو رہا تھا جو ہماری روح قبض کرنے کو آ رہا تھا۔

تب آفیسر نیا کے سامنے جھکا۔

''تابوت کو ابھی باہر پہنچا دیا جائے گا۔ ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور آپ کے تعاون کے شکر گزار بھی۔''

کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آفیسر طنز کر رہا ہو۔ میں نے عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ آفیسر نے کاغذات ہمارے حوالے کر دیئے تھے لیکن۔ لیکن وہی ہوا جو اس نے کہا تھا اور یہ ناقابلِ یقین بات تھی۔ افسروں نے تابوت میں کیا دیکھا۔ نہ جانے انہوں نے کیا دیکھا۔

تابوت باہر لے جایا گیا تو ہم بھی ساتھ تھے۔ نیا کے حواس ساتھ نہ دے رہے تھے۔ اس نے میرے بازوؤں کا سہارا لے لیا تھا۔

''مسعود۔ مسعود۔ یہ کیا ہوا؟''

''خدا جانے۔'' میں نے بھی گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

''تم بھی تجزیہ نہیں کر سکے؟''

''کیا تجزیہ کروں؟''

''وہ میرے ذہن میں ایک خیال ہے۔''

''کیا؟''

''شاید ان لوگوں نے دھوکا کیا!''

''کس نے؟''

''جن سے تم نے تابوت بدلنے کی بات کی تھی۔ انہوں نے اپنا فرض پورا نہیں کیا اور رقم اینٹھ لی۔''

''ممکن ہے لیکن۔ لیکن ایلس کہاں مر گیا اس نے تو ہمیں مروا ہی دیا تھا۔''

''یہ بھی اب پوچھنے کی بات ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''اتنی دیر تابوت میں رہنے کے بعد وہ اب سچ مچ مر گیا ہوگا اوہ خدا کی پناہ۔ تم سچ ہی کہہ رہی ہو۔ لیکن۔ لیکن اس طرح تو۔ تو۔ اوہ نیا۔ میرے خیال میں ان فرض ناشناس لوگوں نے ہماری مدد کی ہے۔ ہمارے اوپر احسان کیا ہے۔''

''لیکن نوٹوں کا تابوت۔'' نیا ایک سسکی لے کر بولی۔

''جہنم میں جائے۔ اب لندن تک تو آ ہی گئے ہیں۔ یہاں تقدیر آزمائی کریں گے۔ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔''

نیا ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئی۔ تابوت کو باہر پہنچا دیا گیا اور جونہی ہم اس کے قریب پہنچے ایک سیاہ رنگ کی وین ہمارے پاس پہنچ گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ سے جو شخص نیچے اترا اسے دیکھ کر ہمارے حواس بالکل ہی ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ ایلس تھا۔

نیا بھی پاگلوں کی طرح مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایئر پورٹ کے خلاصیوں کی مدد سے تابوت وین میں رکھوایا اور پھر دوسری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ''آیئے۔ آپ لوگ بھی آیئے۔''

''آؤ نیا۔'' میں نے طویل سانس لے کر کہا اور نیا بادلِ ناخواستہ وین میں بیٹھ گئی۔ اس کے نزدیک ہی میں بھی بیٹھ گیا تھا۔ ایلس نے وین اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ہم دونوں کے ذہن میں جوالا مکھی کھول رہا تھا۔

وین آگے بڑھتے ہی میں نے کہا۔

''ایلس اگر تم نہیں چاہتے کہ دماغ کی رگیں پھٹنے سے ہماری موت واقع ہو جائے تو......''

''تو؟'' اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔

''تو ہمیں حقیقتِ حال بتا دو؟''

''تو اپنے محسنوں کا برا کب چاہوں گا۔'' ایلس نے

جواب دیا۔
''تو بتاؤ۔ تابوت میں کیا ہے؟''
''وہی جو ہم لائے تھے؟''
''گویا کسی مسٹر ہڈسن کی لاش؟'' میں نے کہا۔
''اوہ۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ تابوت تو بدل دیا گیا تھا۔''
''بدل دیا گیا تھا؟''
''ہاں۔''
''لیکن دوسرے تابوت میں کیا تھا؟''
''نوٹ۔''
''کیا یہ ماننے کی بات ہے ایلس؟''
''میں نہیں سمجھا۔''
''کسٹم حکام آنکھوں سے معذور نہیں تھے نہ ہی ان لوگوں سے ہمارے تعلقات تھے کہ وہ ہمارے ساتھ رعایت کر گئے۔''
''لیکن میں نے آپ سے وعدہ بھی تو کیا تھا مسٹر مسعود کہ کسٹم ہاؤس کے معاملات میں سنبھال لوں گا۔''
''بے شک۔ لیکن تم کسٹم ہاؤس میں موجود نہیں تھے۔''
''میں اپنے کام میں مصروف تھا۔ اب اس میں میرا کوئی قصور تو نہیں ہے۔ آپ لوگوں کو میں نے کسی تکلیف سے دوچار تو نہیں ہونے دیا۔'' اس نے کہا اور اس کی بات معقول تھی۔ لیکن ظاہر ہے میرا ذہن صاف نہیں تھا۔ میں کسٹم حکام میں الجھا ہوا تھا۔ وہ لوگ مطمئن کس طرح ہوئے انہوں نے تابوت میں کیا دیکھا۔
''میں نے نیما کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی الجھنوں کا شکار تھا۔ پھر ہم دونوں چونک پڑے۔
''لیکن اب تم کہاں جا رہے ہو ایلس؟''
''اپنی رہائش گاہ پر۔ کیوں؟''
''بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔''
''میں طویل عرصہ تک آپ کا مہمان رہا ہوں۔ کیا اب آپ لوگ میرے مہمان نہیں ہو گے؟''
''کیوں نہیں۔ تمہارا شکریہ۔''
''میں آپ کو لندن اور اس کے نواح کی سیر کراؤں گا اور اس کے بعد آپ یورپ کی سیر کا آغاز کریں اور جہاں جی چاہے جائیں۔''
''میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وین برق رفتاری سے ایک سنسان علاقے سے گزر رہی تھی۔ لندن دیکھنے کا بیحد شوق تھا لیکن ذہنی کیفیت کسی طرف متوجہ نہیں ہونے دے رہی تھی۔

ہم ایک چھوٹے سے خوشنما بنگلے میں داخل ہو گئے اور ایلس نے وین روک دی۔ پھر وہ نیچے اُتر کر بولا۔
''ایشیائی مہمانوں کو میں اپنی اس چھوٹی سی رہائش گاہ میں خوش آمدید کہتا ہوں۔''
''کیا تابوت نہیں اتارو گے ایلس؟'' میں نے پوچھا۔
''کیوں نہیں؟''
''میری خواہش ہے کہ تم اسے ابھی اتار لو اور کھول کر مجھے دکھا دو۔''
''اوہ ضرور۔ اس خواہش کا احترام مجھ پر فرض ہے۔ لیکن براہِ کرم کیا آپ بتانا پسند کریں گے مسٹر مسعود کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟''
''جو میں سوچ رہا ہوں ایلس اسے سن کر تم خوش نہ ہو گے۔''
''میں وعدہ کرتا ہوں کہ ناخوش بھی نہیں ہوؤں گا۔''
''تب میرا خیال ہے ہم کسی سازش کا شکار ہوئے ہیں کوئی ایسا منصوبہ جو تمہارے ذہن میں پہلے سے ہو۔ ممکن ہے تابوت میں سچ مچ کسی مسٹر ہڈسن کی لاش موجود ہو۔''
''اوہ۔ حالات کے تحت یہ کیسے ممکن ہے۔ جو کچھ ہوا ہے تمہارے علم میں ہے۔ مسٹر ہڈسن کے بارے میں، میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا ہے۔''
''تابوت میں لاش موجود نہیں ہے۔''
''آؤ تابوت اتار لیں۔'' اس نے کہا اور میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔ ہم دونوں نے مل کر تابوت اتارا اور اندر لے گئے۔ نیما ساتھ تھی۔
''کیا اس عمارت میں اور کوئی نہیں ہے؟'' میں نے اندر پہنچ کر پوچھا۔
''نہیں۔ میرے علاوہ یہاں کوئی نہیں رہتا۔''
''تعجب ہے۔ لیکن یہ اندر سے صاف ستھری ہے۔''
''ہاں۔ ہر چیز پر تعجب نہ کریں۔ اب آپ اس تابوت کو کھول لیں۔'' ایلس نے کہا اور میں نے بیقراری سے تابوت کا ڈھکن اٹھا لیا۔ اندر نوٹ چنے ہوئے تھے میں ان نوٹوں کو دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔
نیما بھی خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ تب اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''حسب وعدہ۔ اس میں سے آدھے نوٹ آپ لوگوں کے ہیں آپ ان میں سے کوئی گڈی لے کر باہر نکل جائیں۔

انہیں چلانے میں آپ کو کوئی دقت نہیں ہوگی۔ اب آیئے میں آپ لوگوں کو آپ کی رہائش گاہ دکھا دوں۔"

عمارت کا ایک خوبصورت بڑا کمرہ اس نے ہمارے لیے مخصوص کر دیا۔ نوٹوں کا ایک بڑا حصہ اس نے ہمارے حوالے کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک کار بھی مہیا کر دی۔ نہ جانے کیوں یہ سب کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ بیحد عجیب۔"

اس عمارت میں پہلی رات گزارتے ہوئے نیما نے بھی یہی بات کہی۔

"مسعود۔ مسعود۔ کیا یہ سب کچھ کوئی خواب نہیں ہے نہ جانے کیوں مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کیا واقعی۔ اور۔ اور۔"

"صرف ایک بات ذہن میں الجھی ہوئی ہے نیما۔" میں نے پریشانی سے کہا۔

"کیا؟"

"کشم حکام کو کیا ہوا تھا۔"

"خدا بہتر جانے۔" نیما نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

"اس نے دیانت داری سے ہماری رقم ہمارے حوالے کر دی ہے۔ میرا خیال ہے نیما ہمیں اب یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ نہ جانے کیا معاملہ ہے۔ اس سے پہلے کہ کسی مصیبت میں پھنس جائیں ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"یوں بھی اب مہمان نوازی کا جواز نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن اس کا تذکرہ کرو گے ایلس سے؟"

"وہ انکار کر دے گا۔"

"ہاں۔ لیکن اس سے معذرت کر لیں گے۔"

"کیوں نہ خاموشی سے نکل جایا جائے۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد۔"

"اس کے بعد کیا؟"

"میرا مطلب ہے کہ نقدی اور لندن سے نکلنا بھی تو مشکل ہوگا۔"

"ایلس سے خوفزدہ ہو کر۔"

"نہیں۔ لیکن سوچ لو۔ وہ ہمیں تلاش کر لے گا۔"

"ہوں۔" میں نے پُر خیال انداز میں گردن ہلائی۔ اور پھر ایک تجویز کے تحت کہا۔

"تب پھر نیما۔ ہم دو تین دن یہاں گزاریں گے اور اس دوران ہم یہ نوٹ بینکوں میں پہنچا دیں گے۔ اور ان کے ٹریولر چیک بنوا لیں گے۔ کچھ رقم یہیں بینکوں میں رہنے دیں گے۔ کہیں سے بھی یہ رقم نکلوائی جا سکتی ہے۔ اس کام کے مکمل کرنے کے بعد ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

ہم دونوں اس تجویز پر متفق ہو گئے اور میں نے دوسرے دن ہی اپنی کارروائی شروع کر دی۔ ایلس نے ہمارے لیے بہترین سہولتیں مہیا کی تھیں۔ وہ خود بہت کم گھر میں رہتا تھا۔ میں جس بینک میں نوٹ لے کر گیا کوئی توجہ نہیں دی گئی کسی کو نوٹوں کے نقلی ہونے کا شبہ نہیں ہوا تھا۔

بہر حال تین چار دن کے اندر یہ کام بھی مکمل ہو گیا۔ اس شام ایلس گھر میں موجود تھا۔ میں نے اس سے گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا اور شام کو ہم اس کے قریب پہنچ گئے۔

ایلس نے ہمارا پُر جوش استقبال کیا اور بڑے خلوص سے مسکرایا۔ "ہیلو مسٹر مسعود۔"

"ہیلو ایلس۔ بھئی اب تو تمہارا مہمان بنے کئی دن ہو گئے اب ہمیں اجازت دو۔"

"مجھے علم تھا۔" اس نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

"کیا علم تھا؟"

"یہی کہ اب آپ لوگ جانا چاہتے ہیں۔"

"اوہ۔ تم ہم پر نگاہ رکھ رہے تھے؟"

"نہیں میرے دوست کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ دوستوں پر کوئی نگاہ رکھتا ہے۔" اس نے ممنون لہجے میں کہا۔

انسانی جسم

- ☆ انسانی جسم میں تقریباً پچاس ہزار مسام پائے ہیں۔
- ☆ انسانی بالوں کے حصے میں سب سے زیادہ گندھک پائی جاتی ہے۔
- ☆ انسان کا دایاں پھیپھڑا بڑا ہوتا ہے۔
- ☆ انسانی جسم میں جلنے اور سانس لینے کا عمل ایک جیسا ہوتا ہے۔
- ☆ انسانی جسم کی سب سے سخت ہڈی دانت ہیں۔
- ☆ انسانی جسم میں پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے خون چلتا ہے۔
- ☆ انسانی جسم میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے دل کی دھڑکن زیادہ ہوتی ہے۔
- ☆ انسانی جسم 206 ہڈیوں پر مشتمل ہے۔
- ☆ انسانی جسم میں 620 ارادی عضلات پائے جاتے ہیں۔

"پھر تمہیں کیسے معلوم؟"

"بہت سی باتیں ہم پر منکشف ہو جاتی ہیں۔ آیئے میرے ساتھ۔" اس نے کہا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"کہاں ایلس؟"

"بس میرے کمرے تک۔" اس نے کہا اور ہم دونوں اُٹھ گئے۔ ایلس کے ساتھ میں اور نیما اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں تابوت پڑا ہوا تھا وہی تابوت جس میں نوٹ لائے تھے۔ اس کے گرد بڑی کرسیوں پر اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم بیٹھ گئے۔

"میں آپ دونوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں مسٹر مسعود اور مس نیما۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو اپنی مختصر کہانی سناؤں گا میں دنیا کا بدترین انسان ہوں دوستو۔ میں نے پہلے بھی اپنی کہانی کا ایک مختصر حصہ سنایا تھا جو سو فیصدی سچا تھا۔ میرا خاندان برطانیہ کا مشہور خاندان ہے لیکن مجھے اس خاندان کا سرمایہ نہیں مل سکا۔ کیونکہ میرے باپ کے دشمنوں نے مجھے اغواء کر لیا تھا اور پھر انہوں نے میرے باپ کو اطلاع بھی دے دی کہ وہ مجھے ہلاک کرنے کے بجائے جرائم کے راستے پر ڈالیں گے۔"

اس واقعے کو کافی شہرت ملی تھی۔ پولیس نے مجھے تلاش کرنے کی کافی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہی اور ایک طویل عرصہ میں نے ان لوگوں کے ساتھ گزارا۔ میں ان کی سازش سے لاعلم تھا اور جب مجھ پر یہ سازش منکشف ہوئی تو میں اپنے اہل خاندان سے ملنے کے لیے بے چین ہو گیا۔

میری ماں کا انتقال ہو چکا تھا اور میرا باپ کچھ اور عزت اور شہرت حاصل کر چکا تھا۔ میں نے جب اس سے اپنا تعارف کرایا تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ لیکن مجھے اس خاندان میں قبول کرنے سے اس نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ میں اس خاندان میں کسی ایسے انسان کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنی بے گناہی کا رونا رویا لیکن۔ میری ایک نہ سنی گئی۔ میں اپنے باپ کے ذہن سے نکل گیا تھا۔

تب میں مایوس ہو گیا اور اسی مایوسی نے میرے اندر انتقام کا جذبہ پیدا کیا۔ میں نے اس گروہ سے بغاوت کر دی اور اس کے کئی ممبر میرے ہاتھوں مارے گئے۔ میں ان لوگوں کا تعاقب کرتا ہوا ہی تمہارے ملک پہنچا تھا۔ وہاں میں ان کا شکار ہو گیا۔"

"تم؟" میں تعجب سے چونک پڑا۔

"ہاں۔ اُس رات گروہ کے کچھ افراد مجھ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے اور رسی کے پھندے کے ذریعے مجھے ہلاک کر دیا گیا۔"

"ہلاک کر دیا گیا؟" نیما چونک پڑی۔

"ہاں مس نیما۔ اس وقت میں مردہ تھا جب آپ نے مجھے پایا۔"

"لیکن لیکن......؟"

"لیکن میری روح نے یہ موت قبول نہیں کی اور میں۔ میں نے آپ کے سامنے آنکھیں کھول دیں۔ زندگی میں مجھے اپنے خاندان میں جگہ نہیں ملی لیکن موت کے بعد میں اس خاندان میں رہنا چاہتا تھا۔"

"تو تم زندہ نہیں ہو؟" میں نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ افسردگی سے بولا۔

"میری آخری خواہش یہ ہے کہ مجھے میرے آبائی قبرستان میں دفن کیا جائے اور اس کے لیے میں نے آپ لوگوں کا سہارا لیا ہے۔"

"لیکن۔ لیکن۔" میں نے بوکھلائے انداز میں کہا۔

"روح پر کچھ پابندیاں ہوتی ہیں۔ میں ہر ایک کو اپنا حال نہیں سنا سکتا تھا۔ یہ بے پناہ دولت میں نے ان لوگوں کے درمیان رہ کر حاصل کی ہے۔ یہ ڈالر اصلی ہیں اور ان میں کوئی نوٹ جعلی نہیں ہے۔ میں آپ کے کام آیا ہوں اس لئے آپ لوگ میرے کام آئیں۔"

"اوہ۔ لیکن ایلس؟"

"تابوت میں میری لاش ہی تھی۔ اصلی لاش دیکھ کر کسٹم حکام مطمئن ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد میں نے تابوت خالی کر دیا۔"

"اور یہ نوٹ؟"

"میں نے عرض کیا نا یہ میری ملکیت ہیں آپ کو زندگی کے کسی حصے میں ان نوٹوں کی وجہ سے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ مجھے یقین ہے میرے دوست کہ آپ میری یہ آخری خواہش ضرور پوری کریں گے۔ میرا خاندان بہت مشہور ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ مجھے خاموشی سے وہاں دفن کر دیں۔ میرا کام ختم ہو چکا ہے اور اب آپ کا اخلاقی فرض ہے کہ آپ ایک حرماں نصیب کی آخری خواہش پوری کر دیں۔"

وہ اُٹھا اور تابوت میں جا کر لیٹ گیا۔ نیما دہشت سے مجھ سے چمٹ گئی۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ بمشکل تمام میں نے اسے سہارا دیا اور پھر میں نے تابوت میں لیٹے ہوئے ایلس کو دیکھا۔ اس کا چہرہ بدرونق تھا اور زندگی کی کوئی رمق اس کے وجود میں موجود نہیں تھی۔

☆......☆......☆

خون کی پیاسی

ٹرین کے سفر میں ایک حسین ہمسفر کے ساتھ اُس نے سوچا کہ سفر بہت اچھا گزرے گا لیکن جب اُس پر اپنے ہمسفر کے متعلق کچھ انکشافات ہوئے تو پانی سر سے گزر چکا تھا' وہ ایسے حالات میں گھر گیا جن کے متعلق وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا

ایم۔اے راحت

ایک ایسی لڑکی کی کہانی جو اپنے دشمنوں سے انتہائی جدید طریقے سے انتقام لے رہی تھی

چاند پور کے چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی رات کے ٹھیک بارہ بجے تھے۔ اس پسنجر ٹرین میں' میں پہلی بار ہی سفر کر رہا تھا۔ اب تک میرے سفر کے چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ ریاست رام پور سے چلے ہوئے ٹرین کو چھ گھنٹے ہوئے تھے اور میں نے اسے ارہرہ سے پکڑا تھا جو رام پور سے تیس میل پر واقع ہے۔

نصف شب کی وجہ سے اسٹیشن بالکل سنسان معلوم ہو رہا تھا۔ عمارت کے چند کمرے روشن ضرور تھے مگر یہ روشنی اندر تک ہی کفالت کر رہی تھی۔ میں نے سر نکال کر نیم پختہ پلیٹ فارم کو غور سے دیکھا۔ چونکہ ایک گھنٹہ پہلے میرا سگریٹ ختم ہو چکا تھا اور ڈبے میں میرے علاوہ کوئی مسافر بھی نہیں تھا۔ جس سے سگریٹ مستعار مانگ لیتا۔ مگر پلیٹ فارم کی اداسی نے مجھے اور بھی مایوس کیا کوئی خوانچے والا بھی نہیں تھا میں نے مایوس ہو کر سر اندر کر لیا اور دھندلی روشنی میں تازہ اخبار پڑھنے کی ناکام کوشش کرنے لگا گاڑی رُک جانے کی وجہ سے لائٹ بھی بہت مدہم سی تھی تاہم جلی سرخیاں اب بھی پڑھی جا سکتی تھیں۔

کمپارٹ کا دروازہ کسی نے کھولا تو میں ادھر متوجہ ہو گیا ایک اسمارٹ سا نوجوان ایک قلی کے پیچھے اندر داخل ہوا۔ قلی نے ایک بڑا سا صندوق سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ بکس اتنا بڑا اور چوڑا تھا کہ دو ایک برتھوں کے درمیان والی تمام جگہ اس بکس سے پر ہو گئی۔ ڈبے میں کوئی مسافر میرے علاوہ نہیں تھا اس لیے اس بکس کی وجہ سے کوئی قباحت بھی نہیں تھی پورا ڈبہ اب بھی خالی پڑا تھا۔

نوجوان میرے سامنے والی برتھ پر آ کر بیٹھ گیا اس نے قلی کو اُجرت کے علاوہ ٹپ بھی دی تھی اس کے علاوہ اس کی خوش پوشاکی میرے لیے توجہ کا باعث تھی۔ چار گھنٹے سفر میں منہ باندھے بیٹھا رہا تھا اس لیے ایک ہم سفر آ جانے سے اس وقت مجھے دلی مسرت ہوئی تھی اس کی بھوری آنکھوں سے نسوانیت ٹپک رہی تھی۔ گاڑی روانہ ہوئی تو ہماری اجنبیت بھی ختم ہو گئی میں نے نوجوان کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"غالباً کسی لمبے سفر پر جا رہے ہیں۔"

نوجوان نے نہایت خندہ پیشانی سے مسکرا کر جواب دیا۔

"جی کانپور تک جانا ہے اور یہ گاڑی آپ جانتے ہیں کل شام تک کانپور پہنچے گی۔"

میں حیران رہ گیا۔ اس نوعمر نوجوان کی آواز میں بلا کی نسوانیت تھی۔

جب اس نے جواب دیا تو میں یہ سمجھ رہا تھا کوئی

لڑکی مجھ سے مخاطب ہے اگر وہ پس پردہ کسی سے گفتگو کرتا تو ہرگز کوئی اسے مرد کہنے پر آمادہ نہ ہوتا مجھے خاموش پا کر نوجوان بولا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟ میرا خیال ہے آپ بھی۔" پھر وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

"آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔" میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر مصافحہ کیا۔ نوجوان کا ہاتھ بھی نسوانی ہاتھ کی طرح نرم و نازک تھا۔

پھر میں نے قدرے تامل کے بعد اپنا نام بتایا۔

"آپ کا اسم شریف؟"

"دیانند ستیارتھی ڈی اے وی کالج کانپور میں فلسفہ کا لیکچرار ہوں۔"

اس تعارف سے مجھے خوشی تو ہوئی لیکن اب نوجوان کے مقابلے میں خود کو ہلکا پا رہا تھا چونکہ میں ایک معمولی سا بزنس مین ہوں۔ کچھ اسی قسم کے جذبات کا میں نے اظہار کیا مگر نوجوان نے اس کے برعکس میرے ادب و احترام میں کوئی کمی نہ ہونے دی۔ وہ نہایت خوش گفتار اور لطیفہ گو ثابت ہوا یہی وجہ تھی کہ اتنی رات گزر جانے کے باوجود میری آنکھوں میں نیند کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

"میں تو اس اسٹیشن سے روانہ ہوا ہوں۔" اس نے اپنا ٹفن کیریئر اٹھا کر کہا۔ لیکن آپ کافی دور سے سفر کر رہے ہیں یقیناً راستے میں آپ کو بڑی دشواری ہوئی ہوگی اس ذیلی لائن پر نہ تو اسٹیشن ہی اچھے ہیں اور جو ہیں بھی ان پر کوئی انتظام وغیرہ نہیں کیا جاتا۔ یقین جانئے بہت سے اسٹیشن تو پانی اور روٹی جیسی بنیادی ضرورتیں بھی پوری کرنے سے قاصر ہیں۔"

نوجوان نے ٹفن میں سے چند پوریاں نکالیں اور پھر کانچ کے ایک پیالے میں آلو کی سبزی رکھ کر ڈبہ میری طرف بڑھا دیا۔

"میرا خیال ہے آپ اس بھینٹ کو ضرور سویکار کریں گے۔" دیانند نے ادب سے کہا۔

"شکریہ ستیارتھی صاحب' میں شام کو کھا پی کر چلا ہوں اور اس وقت قطعی بھوک نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو بالکل ناممکن بات ہے جناب میں ہمیشہ گھر سے بھوکا چلتا ہوں اور ڈبے میں بیٹھ کر کھانے میں بڑا آنند ملتا ہے۔ اب آپ کو میرا ساتھ دینا ہی پڑے گا۔" اس نے میرا ڈبہ میرے قریب رکھ دیا۔

"سنیئے تو۔" میں نے کہا۔

"یہ تو بالکل زبردستی والی بات ہے آپ کو بھوک لگی ہے آپ شوق سے کھانا کھائیں۔"

"مگر شریمان جی۔ میں کبھی تنہا نہیں کھاتا۔ گھر میں بھائی بہن اور کانپور میں دوستوں کے ساتھ۔ اب آپ زیادہ اعتراض نہ کریں۔ آپ کو ہماری قسم۔" آخر میں اس کا لہجہ بالکل نسوانی ہو گیا تھا۔

دیانند کا خلوص قابل ستائش تھا اس لیے مجبوراً مجھے اس کی پیش کش قبول کرنا پڑی۔ یوں بھی سفر کی وجہ سے کھانا جلد ہضم ہو گیا تھا پھر اتنے خلوص کو ٹھکرانا میری نگاہ میں ایک برائی سے کم بات نہ تھی۔

ہم نے ایک ساتھ کھانا ختم کیا۔ پانی کا انتظام میرے پاس بھی تھا مگر پانی بھی مجھے دیانند کے تھرماس کا پینا پڑا وہ مجھ سے پہلے تھرماس کھول چکا تھا۔

چند پوریاں کھا کر اور ٹھنڈا پانی پی کر فرحت محسوس کر رہا تھا لیکن سگریٹ کی طلب میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ میں شائد دیانند سے سگریٹ کے بارے میں کچھ کہتا لیکن اپنی فطری حیاء کے سبب نہ کہہ سکا۔ مگر دو منٹ بعد یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔

اس نے اپنی اٹیچی کھولی اور پھر دوسرے لمحے اس کے ہاتھ میں کریون اے کا ڈبہ اور ماچس موجود تھی۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے سگریٹ کے ڈبے کو دیکھا مگر پھر فوراً ہی دوسری طرف دیکھنے لگا۔ شائد دیانند میری دلچسپی کا راز پا گیا تھا۔

اس نے سگریٹ کا ڈبہ کھول کر میری طرف بڑھا دیا اور کمال شائستگی سے کہا۔

"آپ شوق فرماتے ہوں تو سگریٹ حاضر ہے۔"

"شکریہ" میں نے ایک سگریٹ نکال لیا اور جب

دیانند بھی اپنی سگریٹ ہونٹوں میں دبا چکا تو اس نے ماچس جلا کر پہلے میری سگریٹ جلائی پھر اپنی سگریٹ سلگانے لگا۔

میں درمیانے درجے کا سگریٹ پیتا ہوں اتنی اعلیٰ سگریٹ بس کبھی کبھار ہی پی ہے شائد اسی لیے چند کش لینے کے بعد میرا جسم سناٹے میں آ گیا۔ میں نے سوچا۔ شائد یہ اس وجہ سے ہو کہ میں نے بہت دیر سے سگریٹ نہیں پیا ہے۔

دوسرا خیال یہ بھی تھا کہ اعلیٰ کوالٹی کے سگریٹ میں نشہ کچھ زیادہ ہوتا ہے

سگریٹ ختم ہونے سے پہلے ہی میری حالت غیر ہوگئی۔ اب میں بالکل مجہول سا ہوگیا تھا۔ ہاتھ پاؤں ہلانے کی سکت بھی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ جلتا ہوا سگریٹ بھی برتھ پر ہی گرا دیا جسے دیانند نے بجھا کر باہر پھینک دیا۔ دیانند اسی وقت اٹھ کر کھڑکیاں بند کرنے لگا پھر وہ دروازہ اندر سے بند کر کے واپس آ گیا۔ اب اس کے چہرے پر بڑی پراسرار مسکراہٹ تھی میں ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ مگر ہلنے جلنے اور بولنے کی طاقت سلب ہو چکی تھی میرے حواس خمسہ پوری طرح بیدار تھے مگر قوت عمل بالکل مفقود ہو چکی تھی۔

اور جب دیانند نے مجھے بانہوں سے پکڑ کر اٹھایا تو میری حالت ایک اپاہج سے مشابہ تھی۔ دیانند نے مجھے سیٹ سے اٹھا کر نچلی برتھ پر لٹا دیا اس کے بعد وہ چابی سے بڑے ٹرنک کا دروازہ کھولنے لگا میں اس کی تمام حرکات دیکھ رہا تھا ہر آہٹ سن رہا تھا مگر زبان بولنے سے معذور تھی۔ ٹرین اپنی عمومی رفتار سے چھک چھک کرتی چلی جا رہی تھی۔ ان دنوں تمام گاڑیاں کوئلے سے چلا کرتی تھیں اور ایسی گاڑیاں چھوٹے اسٹیشنوں پر بھی کافی دیر رُکا کرتی تھیں۔

میل ٹرینوں کے مقابلے میں ان گاڑیوں میں تکلیف تو زیادہ ہوتی تھی۔ مگر گاؤں اور قصبات کے باشندوں کو ایسی گاڑیاں بہت مناسب رہتی تھیں اول تو ہر اسٹیشن پر رکنے کی وجہ سے سواریاں آرام سے چڑھ اتر سکتی تھیں پھر یہ کہ ان گاڑیوں کی تعداد بھی خاصی تھی جس کی وجہ سے ٹرین میں زیادہ رش بھی نہیں ہوتا تھا۔

پندرہ بیس منٹ گزر چکے تھے غالباً کوئی اسٹیشن آنے والا تھا۔ گاڑی کی رفتار کچھ کم ہوگئی تھی مگر دیانند نے کمال مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے اسی وقت ٹرنک کا تالہ کھول دیا بعد ازاں اس کا بھاری بھرکم اوپری ڈھکن اٹھا دیا اب وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ میں حیرت سے اس نوجوان کی حرکات دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے قریب رُک کر پہلے تو ایک نظر مسکرا کر میری جانب دیکھا پھر مجھے دونوں ہاتھوں پر لاش کی مانند اٹھا لیا۔ عجیب بے بسی کا عالم تھا وہ بھی۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اب وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہے مگر صرف سوچ کر رہ گیا۔

اس کمبخت سگریٹ نے مجھے زندہ لاش میں منتقل کر دیا تھا۔ دیانند نے مجھے آہستہ سے صندوق میں لٹا دیا۔ یہ صندوق یوں لگتا تھا جیسے میرے ناپ سے ہی بنایا گیا تھا جب نوجوان مجھے لٹا کر ہٹ گیا تو پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ میرے برابر کوئی دوسرا جسم بھی موجود ہے۔

میں کسی گوشت پوست کے انسان کے قریب ہی بے حس وحرکت لیٹا ہوا تھا برابر والے جسم کی گرمی اور ساخت کا اندازہ اس کی قربت سے واضح ہو رہا تھا اور میں یہ جان چکا تھا کہ یہ بھی میری طرح کوئی اس بلا کا شکار ہے۔

''کاش اس وقت میں آزاد ہوتا میرے سامنے اس دبلے پتلے لیکچرار کی کیا حقیقت تھی میں اسے دو ہاتھوں میں سیدھا کر دیتا مگر وائے ناکامی کے۔ میں تو ہل جل بھی نہیں سکتا تھا۔

دیانند نے ٹرنک کا ڈھکنا بند کر کے پھر قفل لگا دیا۔ ٹرین اب کافی آہستہ ہو چکی تھی وہ شائد رکنے والی تھی۔ دھچکے کم ہوتے ہوئے نفی کی حد تک رہ گئے تھے اور اب یوں لگتا تھا جیسے گاڑی پانی پر تیر رہی ہو پھر معمولی سا دھچکا لگا اور زنجیریں بجنے کی آواز پیدا ہوئی۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر کھڑی ہوگئی تھی۔

عجیب وغریب صندوق تھا وہ بھی۔ آج بھی سوچتا

ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ماتھے پر پسینہ آ جاتا ہے حالانکہ میں اس میں بند تھا اور بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اس کے باوجود کسی قسم کی گھٹن کا احساس نہیں تھا نامعلوم کس طرف سے اندھیری گور میں تازہ ہوا آ رہی تھی بہر حال تاریکی دل کو ہولائے رہی تھی لیکن خوف کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔ دوبارہ جب ٹرین آگے روانہ ہوئی تو میں کسی قدر مطمئن ہو چکا تھا۔ میں نے تن بہ تقدیر حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور ہر مصیبت جھیلنے کے لیے خود کو آمادہ کر چکا تھا۔

دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ٹرنک کا تالا آواز کرنے لگا دیانند نے قفل کھول دیا تھا۔

ٹرنک کا دروازہ کھلتے ہی تازہ ہوا اور روشنی بکس میں دوڑ آئی۔ میں نے دیکھا دیانند کے بجائے ایک نہایت حسین و جمیل دوشیزہ ٹرنک پر جھکی ہوئی اپنے نازک ہاتھوں سے مجھے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی اور باریک ساڑھی میں اس نوجوان لڑکی کا سرخ سپید جسم کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ اس نے گلابی ساڑھی کے ساتھ گلابی کامدانی کا بلاؤز پہنا ہوا تھا اور دلہن کی طرح زیورات سے آراستہ تھی اس کے جسم سے پھوٹتی ہوئی سوندھی خوشبو میرے دل و دماغ کو تازہ کر رہی تھی۔ وہ دلکش انداز میں مسکراتی جا رہی تھی۔

مجھے اس نے با آسانی اس قبر سے نکال کر پھر سے برتھ پر ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور ایک بار پھر سے ٹرنک کا قفل لگانے لگی کمپارٹ میں اب بھی میرے اور اس کے علاوہ کوئی تیسرا پسنجر نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرا اور دیانند کا سامان جوں کا توں رکھا تھا۔ بھوری آنکھوں والی یہ دوشیزہ دیانند کی بہن معلوم ہوتی تھی۔

اب میں سخت حیران تھا کہ چند منٹ قبل اس کمپارٹ میں دیانند موجود تھا اچانک وہ کہاں چلا گیا اور یہ دوشیزہ اتنی جلدی کہاں سے آ گئی۔ بالفرض وہ پچھلے اسٹیشن سے سوار ہوئی تھی تو اس کا سامان کہاں ہے اور کیا وہ بالکل تنہا سفر کر رہی ہے یہ بھی مان لیا جائے کہ وہ تنہا سفر کر رہی ہے تو پھر دیانند کہاں گیا؟ اگر دیانند کے لیے یہ سوچا جائے کہ وہ پچھلے اسٹیشن پر اتر گیا تھا تو اس کا سامان کمپارٹ میں کیوں ہے؟

پھر میں غور سے اس دوشیزہ کو دیکھنے لگا جو اس سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی جہاں دیانند بیٹھا تھا اوہ۔ اچانک میرے دل نے کہا۔ یہ تو دیانند ہی ہے بالکل وہی نقش و نگار ہیں وہی آواز فرق صرف لباس اور بالوں کا ہے پہلے دیانند سر پر ٹوپی اوڑھے ہوئے تھا اور سوٹ میں ملبوس تھا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے سامنے والی برتھ پر گہرے رنگ کا وہی سوٹ رکھا ہوا دیکھا جو دیانند نے پہن رکھا تھا۔

"کیا سوچ بچار ہو رہا ہے۔" دوشیزہ نے مسکرا کر کہا اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا یہ آواز میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ اچھا تو یہ دیانند ہی ہے نہیں بلکہ یہ وہ عورت ہے جو پہلے دیانند بن کر مجھ سے متعارف ہوئی تھی اور مجھے پوریاں کھلائی تھیں اس کے بعد سگریٹ۔ اوہ کس قدر عجیب تھی وہ سگریٹ میرے لب ہل بھی نہ سکے حالانکہ میں دنیا جہاں کی باتیں سوچ رہا تھا۔ دوشیزہ اب تک میری جانب میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

میری نگاہوں میں ہزاروں سوالات تھے مگر اس کے بشرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ نہیں بتانا چاہتی پھر وہ ایکدم اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس بار لڑکی نے برتھ پر رکھا ہوا سگریٹ کا ڈبہ اٹھایا اور اس میں سے سگریٹ نکال کر میرے قریب آ گئی اس کے دوسرے ہاتھ میں ماچس دبی ہوئی تھی۔

لڑکی نے ایک سگریٹ جبراً میرے ہونٹوں میں گھسیڑ دی حالانکہ میں ہرگز دوبارہ اس مصیبت کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا مگر اس وقت میرا کوئی عمل میرے اپنے اختیار میں نہیں تھا۔

ڈبہ اس نے پھر سے برتھ پر رکھ کر ماچس جلائی اور میرا سگریٹ سلگا دیا۔

غیر ارادی طور پر میں سگریٹ کے کش لینے لگا اس بار بھی پہلا کش لیتے ہی مجھ سے بیٹھے رہنا دوبھر ہو گیا۔ میں اب تک برتھ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا مگر

اب لیٹنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا میرا دماغ گھوم رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے پوری گاڑی پھرکنی کی مانند گولائی میں چکر کھا رہی ہے۔

نہ معلوم کب تک یوں ہی بے سدھ پڑا رہا دوبارہ جب آنکھ کھلی تو لڑکی کی گرم سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کیں۔

"اٹھیے۔ اب صبح ہونے والی ہے۔" اس نے اپنا نرم و نازک بدن میرے جسم سے مس کر کے کہا۔

اس وقت میری حالت دیدنی تھی۔ میرے لیے یہ سب کچھ خواب کی سی کیفیت سے زیادہ نہیں تھا۔ ایسا خواب جس میں کبھی لرزا دینے والے واقعات سامنے آتے ہیں اور کبھی اتنے رومانی مناظر کہ انسان خود پر قابو نہ رکھ سکے۔

یہ منظر اتنا ہی جذباتی تھا کہ میں بے اختیار ہو سکتا تھا مگر ذہن پر گزشتہ واقعات کا غبار چھایا ہوا تھا۔ فی الحقیقت میں اب تک سخت خوفزدہ تھا۔ یہ سارے واقعات میرے نزدیک بالکل غیر فطری تھے اور میں دل ہی دل میں اس کو بدروح سمجھ بیٹھا اور اب خدا جانے مجھ سے وہ کیا کام لینا چاہتی ہے۔ ضرور یہ کوئی نازیبا حرکات کی مرتکب ہوگی اور مجھے بھی کسی ایسے ہی گورکھ دھندے میں الجھائے گی۔

یہ سوچ کر میں جان چھڑانے کی فکر میں تھا مگر میرے حواس پر اس کی حسین قربت کا اثر بھی ہو رہا تھا لڑکی کے لباس سے خوشبو کے بھبکے میری ناک میں داخل ہو رہے تھے اس نے اپنے نصف جسم کا سارا بوجھ میرے بدن پر ڈال کر مجھے از خود رفتہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی تاہم میں خود پر جبر کر کے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔

اچانک لڑکی نے اپنا خوبصورت منہ میرے قریب لا کر بڑے پیار سے کہا۔

"گوتم بابو۔ کیا ابھی اور سونے کا وچار ہے دیکھو صبح ہونے والی ہے پورب میں پو پھٹنے لگی ہے۔"

میں نے ہاتھ اٹھانا چاہا اور یہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کہ اب میرا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ پھر میں نے اپنے پورے جسم کو ایک دم اس لڑکی سے الگ کر لیا اس عجلت کی وجہ سے لڑکی کا سر برتھ سے ٹکرا گیا اور خود میرے بھی ہلکی سی چوٹ آ گئی تھی۔ مگر پھر سے تندرست ہونے کی خوشی میں مجھے اس چوٹ کا رتی بھر احساس نہیں ہوا۔

"تم کون ہو؟ اور یہ تم مجھے گوتم بابو کیوں کہہ رہی ہو؟" پہلی بار میں نے خوفزدہ لہجے میں اس سے کہا۔

"میں تمہاری دھرم پتنی رادھا ہوں۔ راجن گڑھ کے پنڈت رام دیال کی بیٹی۔" وہ مسکرا کر بولی اور پھر رُک کر بولی۔

"اور تم میرے پتی دیو ہو گوتم بابو پنڈت کشن لال کے سپتر راجن گڑھ سے چار میل دور گومتی کے کنارے تمہارا گاؤں اور میرا سسرال ہے تم تو اس کا نام بھی بھول گئے ہو گے۔ خیر میں بتاتی ہوں اس گاؤں کا نام ہے نرائن

فیض آباد میں ایک ڈپٹی کمشنر تھے سید صدیق حسن۔ ایک بار وہ دورے پر کسی تحصیل میں گئے۔ وہاں کے زمین دار نے اُن کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد ڈپٹی کمشنر نے اس سے کہا۔ "محترم! آپ کے ذمے بہت سی مال گزاری باقی ہے براہِ کرم جلد ادا کر دیجئے گا۔"

زمین دار چونک پڑا۔ اُس نے حیرانی سے کہا۔ "حضور! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں میرے ذمے تو ایک پیسہ بھی باقی نہیں ہے۔ میں سارا حساب بے باق کر چکا ہوں۔" اس نے اپنے کارندے کو بلایا اور اُس سے اِس بیان کی تصدیق چاہی۔ معلوم ہوا کہ ڈپٹی کمشنر کی شکایت درست ہے کیونکہ کارندے نے مال گزاری کی رقم ادا کرنے کے بجائے خرد برد کر لی تھی۔ ڈپٹی کمشنر نے زمین دار سے کہا۔ "آپ ایسے بددیانت آدمی کو ملازمت سے برخاست کیوں نہیں کر دیتے؟"

زمین دار نے جواب دیا۔ "حضور میں اسے ہزار مرتبہ برخاست کر چکا ہوں لیکن یہ مردود برخاست ہوتا ہی نہیں۔ کہتا ہے اللہ بخشے مجھے آپ کے والد نے ملازم رکھا تھا، وہی برخاست کر سکتے ہیں۔ آپ کو کوئی اختیار نہیں ہے۔"

گنج۔ یہ کانپور سے صرف دو میل دور ہے اب تو وہ بھی شہر سے مل گیا ہے یہاں کی آبادی میں بھی زبردست اضافہ ہوگیا ہے۔ گومتی کے کنارے پر آباد ہونے کے کارن یہاں ہر وقت یاتریوں اور اشنان کرنے والوں کا آنا جانا رہتا ہے پھر کنارے پر بنے ہوئے مندر اور شمشان' یہ سب گاؤں کو شہر بنانے کا ذریعہ بن گئے ہیں۔''

''یہ بکواس ہے فراڈ ہے۔'' میں نے کھڑے ہو کر کہا۔'' میں گوتم بابو نہیں ہوں۔ اور کچھ بتاؤں یہ کہ میرے گاؤں کا نام نرائن پور نہیں بلکہ میں مارہرہ کا باشندہ ہوں۔''

میں نے نہایت جلے کٹے لہجے میں کہا تھا مگر رادھا مسکرا رہی تھی۔ پھر وہ برتھ سے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور بے اختیار چوڑیوں اور زیورات سے لبریز گوری بانہیں میرے گلے میں حائل کر دیں۔ میں نے احتجاج کے طور پر ان بانہوں کو الگ کرنا چاہا مگر نرم نازک ہاتھ اس وقت آہنی سلاخوں کی مانند سخت ہو گئے تھے۔

''تم آخر کیا بلا ہو۔'' میں نے زچ ہو کر کہا۔'' اور مجھ سے کیا چاہتی ہو۔''؟

''صرف ایک ماہ کے لیے تم سے چند کام لینے ہیں مگر ایک شرط پر۔ میں تمہیں اس کا معاوضہ دوں گی اس کی دو صورتیں ہیں اگر تم کام کے بدلے معاوضے میں رقم چاہو گے تو دے دی جائے گی اس صورت میں تمہیں میرے جسم سے کوئی مطلب نہ ہوگا۔'' لیکن میں نے اس کی بانہیں ہٹا کر کہا۔

''پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور مجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہو پھر یہ کہ اس کام کے صلے میں مجھے کیا معاوضہ دیا جائے گا۔ ہاں میں ایک بات صاف طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں شادی شدہ آدمی ہوں اور تعلیم یافتہ بھی۔ میری بیوی بہت خوبصورت ہے اور شادی کو صرف ایک سال ہوا ہے۔''

''یہ میں نے اس لیے کہا کہ تم جان لو کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ میں تم سے جسمانی رشتہ نہیں رکھنا چاہتا بلکہ میں تو اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔''

رادھا بڑے اطمینان سے مسکرا رہی تھی۔ پھر اس نے ایک لفظ کہے بغیر میرا ہاتھ پکڑا اور باتھ روم کی طرف چل دی۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا تو سامنے لگے ہوئے شیشے میں مجھے اپنی شکل نظر آئی اپنی شکل دیکھ کر ایک دلدوز چیخ میرے منہ سے نکل گئی میرے اپنے وجود کی بجائے ایک دوسرا جسم موجود تھا جس سے میری کوئی مناسبت ہی نہیں تھی۔ اب میرے سر پر ایک چھوٹی سی چوٹی بھی تھی جیسے ہندو رکھتے ہیں اس کے علاوہ چہرے کے نقش ونگار جسمانی ساخت حتیٰ کہ قد میں بھی فرق آ چکا تھا۔

میرا دماغ اس وقت بھی میرا ہی دماغ تھا مگر جسمانی طور پر میری حالت یکسر بدل گئی تھی۔

''اوہ۔'' میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ رادھا اب بھی میرے قریب ہی کھڑی تھی۔ پھر میں نے اپنے شانوں پر اس کے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کیا۔

سر اٹھا کر دکھ بھری نظروں سے میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اب رادھا کی نگاہوں میں بلا کی شفقت نظر آ رہی تھی۔ اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا اور میں دھیرے دھیرے اٹھ کر اس کے برابر ہی کھڑا ہوگیا۔ ذرا دیر محبت پاش نظروں سے میری طرف دیکھ کر اس نے کہا۔

''سنو جی۔ میں آپ کو زیادہ کشٹ نہیں دوں گی آپ صرف ایک ماہ اپنی زبان بند رکھنے کا وعدہ کریں۔ اس ایک ماہ میں آپ کے لیے بہت سی عجیب باتیں ہوں گی مگر ان کا سمبندھ آپ کی ذات سے نہیں ہوگا اور نہ آپ کو کوئی کشٹ بھگتنا پڑے گا۔''

''مگر رادھا دیوی۔'' میں نے پہلی بار اس کا نام لیا۔ اس بار وہ کھل اٹھی تھی۔ ''یہ کیا اسرار ہے کہ میں دفاعی طور سے۔'' رادھا نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''ان باتوں کے لیے ابھی سے من میں اندیشوں کو جگہ مت دو اگر دیکھنا چاہتے ہو تو آؤ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ چابیاں سنبھالتی ہوئی ایک بار پھر ان برتھوں کے درمیان آ گئی جہاں وہ پراسرار بڑا صندوق رکھا ہوا تھا۔ اس نے قفل کھولا اور جب ڈھکنا اٹھایا تو

میرے لیے ایک خوفناک منظر موجود تھا۔
بکس میں رکھا ہوا انسانی جسم میرا اپنا جسم تھا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے اسے چھو کر دیکھا۔ مگر وہ جسم تو بالکل ٹھنڈا تھا بالکل مردہ۔ حالانکہ وہ مکمل میرا جسم تھا میرا لباس پہنے ہوئے۔''

''یا اللہ۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں زندہ ہوں اور میرے سامنے میرا فوت ہوا جسم بھی موجود ہے۔ وہ جسم ایک ناقابل تردید حقیقت کے روپ میں میرے سامنے تھا۔

میں نے خوف بھری آنکھوں سے رادھا کی طرف دیکھا مگر رادھا نے اسی وقت مسکرا کر ڈھکنا بند کر دیا اور پھر سے قفل لگا دیا۔ جب ہم واپس اپنی سیٹوں کی طرف آ رہے تھے گاڑی آہستہ ہو گئی تھی شاید کوئی اسٹیشن نزدیک تھا۔ اس بار بھی ہم کھڑکی کے قریب والی دو سیٹوں پر بیٹھے جو ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔

صبح کاذب ہو چکی تھی اندھیرا چھٹنے لگا تھا اور میں سوچ رہا تھا آج کا سورج میرے لیے نہ معلوم کیا مصائب لے کر آ رہا ہے۔ پھر میں نے اپنے دل سے چند سوالات کیے۔ میں نے کہا۔'' کیا میں اس بلا سے بچ سکتا ہوں۔'' جواب میں دماغ نے کہا'' ہرگز نہیں۔''

پھر میں نے سوچا۔ کیا میں اس خوبصورت بلا کو دھوکا دے کر نکل سکتا ہوں اور اگر نکل گیا تو کیا سعیدہ میری بیوی اور دیگر گھر والے مجھے پہچان سکیں گے اپنا سکیں گے۔

اس بات کا جواب بھی نفی میں تھا۔ پھر میں نے سوچا۔'' اچھا تو اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

'' قسمت پر بھروسہ کر کے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دینا چاہیے۔'' دماغ نے جواب دیا۔

میں بے اختیار ہو کر دل ہی دل میں خود کو کوسنے لگا کہ کیوں کانپور جانے کا قصد کیا۔ خالہ زاد بھائی کی شادی کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں تھا۔ مگر دماغ نے اس کے خلاف بھی مجھے ٹوکا۔

'' کیا معلوم تھا کہ ایسے واقعات سے سابقہ ہوگا

اور پھر دماغ کی اس بات کی دل نے بھی تصدیق کر دی۔ یہ کوئی نسبتاً بڑا اسٹیشن تھا یہاں گاڑی نصف گھنٹے تک کھڑی رہی۔ پلیٹ فارم پر کافی چہل پہل تھی اور گاڑی رکتے ہی چند مسافر ہمارے ڈبے میں بھی آ گئے تھے۔ یہ لوگ ہم سے کافی دور ہٹ کر الگ بیٹھے تھے۔ شاید رادھا کو دیکھ کر ان لوگوں نے یہی سوچا ہو کہ میں اپنی دلہن کو رخصت کرا کے لا رہا ہوں۔ رادھا لباس اور زیورات کی وجہ سے دلہن معلوم ہو رہی تھی۔

میں نے ایک باوردی چائے والے کو بلا کر چائے اور ناشتہ لانے کو کہا۔ بیرا فوراً ہی آرڈر لے کر چلا گیا۔ اب رادھا نے دوسرے لوگوں کی آمد کی وجہ سے تھوڑا سا گھونگھٹ نکال لیا تھا وہ اس وقت شرمیلی گڑیا سی لگ رہی تھی ذرا دیر پہلے کی رادھا اور اس دلہن میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

بیرا چائے اور ناشتہ لے آیا۔ میں نے ضد کر کے اپنے ساتھ رادھا کو بھی ناشتہ کرایا لیکن وہ بری طرح شرما رہی تھی جب بیرا برتن لے جا رہا تھا تو میں نے اسے نوٹ دے کر سگریٹ منگایا وہ فوراً ہی مطلوبہ سگریٹ کے چند پیکٹ دے گیا۔

کانپور اب بھی بہت دور تھا۔ ایک بار تو میں نے سوچا کیوں نہ کسی بڑے اسٹیشن سے میل گاڑی پکڑ لی جائے تاکہ دن بھر کی جھک جھک سے نجات مل جائے مگر رادھا اس بات پر آمادہ نہیں تھی مجبوراً مجھے اس ٹرین میں سفر جاری رکھنا پڑا۔

اب میرے لیے چوڑے جسم پر بوسکی کی قمیض اور سفید باریک سی دھوتی تھی کانوں میں راجکماروں کی مانند سفید ہیرے بھی پڑے ہوئے تھے اس سج دھج میں بلا کی قدامت تھی اور یہ جسم میرے لیے بالکل نیا تھا۔ میں جو کلین شیو رہنے کا عادی تھا۔ اب میرے چہرے پر ٹھاکروں کی مانند بڑی بڑی مونچھیں اگی ہوئی تھیں۔

فروری کی درمیانی تاریخیں تھیں موسم اتنا خوشگوار تھا کہ خود بخود طبیعت میں امنگیں پیدا ہو رہی تھیں نہ جانے کیوں اب میں اپنی سابقہ زندگی سے دور سا ہو گیا تھا اور

پوری طرح رادھا کی طرف راغب نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے رادھا میری جنم جنم کی ساتھی ہے اور یہ حالت ناشتے کے بعد سے شروع ہو گئی تھی۔

دھیرے دھیرے میں سفر سے لطف اندوز ہونے کے لیے رادھا کو چھیڑنے لگا۔ رادھا نئی بیاہی دلہنوں کی طرح حجاب سے کبھی مسکرا دیتی کبھی گرم نگاہوں سے دیکھ لیتی گاہے بگاہے پیار کی ایسی میٹھی نظر میرے چہرے پر ڈالتی کہ مجھے خود پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔ اس کے باوجود میں اپنی سیٹ سے چمٹا ہی رہا۔

''اس سوٹ کیس کا کیا کرنا ہے۔'' رادھا سے اس پراسرار سوٹ کیس کے بارے میں پوچھا جو اب تک بالائی برتھ پر رکھا تھا۔ ایک منٹ تک رادھا نے جواب نہ دیا۔ مگر جب میں نے دوبارہ پوچھا تو وہ بولی۔

''اسے اپنے سوٹ کیس میں رکھ لو ناتھ۔'' اس کی آواز میں بلا کی خود سپردگی موجود تھی۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کر دی اور تازہ اخبار دیکھنے لگا جو اسٹیشن سے خریدا تھا۔

پچھلے دوپہر سے پہلے ایک ایک کر کے تمام مسافر اتر گئے اور ہم لوگ ایک بار پھر تنہا رہ گئے۔ ہمارا سفر تو شام تک تھا اور یہ مصیبت بہر حال گزارنی ہی تھی۔ تنہائی ملی تو میں نے پہلی بار پیار سے رادھا کا ہاتھ تھاما۔ اس نے روٹھے ہوئے انداز میں میری آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ ''بابو جی'' ابھی سے وعدہ خلافی شروع کر دی۔

شرمندہ ہو کر میں نے رادھا کی کلائی چھوڑ دی۔ مگر وہ اپنی سیٹ سے اٹھ چکی تھی۔ ہم دونوں قریب والی ایک لمبی برتھ پر ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھ گئے اس طرح مجھے کافی سرور آ رہا تھا۔ رادھا کے جسم کی گرمی نہایت لطیف تھی۔

''ایک بات بتاؤ گی۔'' میں نے اس کی ٹھوڑی کو اٹھا کر کہا۔ شرم سے رادھا کی آنکھیں بند ہو گئیں وہ اس وقت بلا کی حسین لگ رہی تھی۔ مگر میں اپنے وعدے پر قائم تھا۔

''تم مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو۔ اور میں اپنے بارے میں بھی تا کہ میں اپنے ذہنی خلفشار سے بھی بچ جاؤں اور تمہارے لیے کار آمد آدمی ثابت ہو سکوں۔''

''آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی بابو جی میں بھی یہی بات کہنے والی تھی۔''

میں خاموش ہی رہا میری توجہ دیکھ کر ذرا توقف کے بعد رادھا نے کہا۔

''بہت دن پہلے کی بات ہے یوں سمجھ لو جگ بیت گئے نرائن پور اس سے کانپور سے بیس میل دور ایک بڑا سا شہر تھا۔ یہ پنڈت رام نرائن کی ریاست تھی اور اس ریاست میں دو قومیں آباد تھیں پنڈت اور ٹھاکر چونکہ پنڈت کی حکومت تھی اس لیے ریاست کے ٹھاکر ان سے دبے رہتے تھے۔ ریاست میں کبھی دنگا فساد نہیں ہوا تھا۔

ہم نے جس جنم میں اس ریاست میں آنکھ کھولی اس سمے تمہارے پتا کشن لال گدی پر براجمان تھے تم ان کے اکلوتے بیٹے اور ریاست کے راجکمار تھے میں نے بھی تمہاری ریاست کے ایک زمیندار پنڈت رام دیال کے گھر میں آنکھ کھولی تھی ان کے چار بیٹے تھے اور میں اکلوتی بیٹی۔ بڑے لاڈ پیار سے میری پرورش ہوئی ریاست میں ہمارا بڑا اسمان تھا راجہ سے ہماری رشتے داری ہوتی تھی اس کارن ہمیں ایک جاگیر ملی ہوئی تھی۔

پتا بوڑھے ہو گئے تھے اور جاگیر کی دیکھ بھال بھائیوں نے شروع کر دی تھی۔ اب میں بھی سیانی ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں ہندو رسم و رواج کے مطابق لڑکیوں کی شادی باہر ہوا کرتی تھی۔ ہندوؤں میں اب بھی یہی طریقہ رائج ہے۔ یہ لوگ ذرا سی بھی رشتے داری نکل آنے کی صورت میں بیٹی نہیں دیتے۔

لیکن بابو جی۔ میرے ساتھ قسمت نے ایک عجیب مذاق کیا۔ ایک دن جب ریاست میں زبردست میلہ لگا ہوا تھا اور میں سہیلیوں کے ساتھ کھیل تماشے دیکھتی پھر رہی تھی ایک جگہ دور سے آئے ہوئے بہادروں کا دنگل ہو رہا تھا۔ یہ دنگل کشتی کا دنگل نہیں تھا بلکہ ہتھیاروں سے جنگ لڑنے کا دنگل تھا اور اسی دن پہلی بار میں نے تمہیں

دیکھا یعنی راجکمار گوتم بابو کو۔ انہوں نے ایک ایک کر کے تمام یودھاؤں کو شکست دے دی اور بس اسی دن وہ میرا من بھی جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔

میں آخر تک تماشہ دیکھتی رہی اور جب راجکمار وجے پا کر محلوں کی طرف جانے لگا تو میں نے انہیں راستے میں روک کر بدھائی دی۔ میری نگاہیں ان کے چوڑے چکلے سینے اور لمبے بازوؤں پر تھیں ان کے لمبے بال اور بڑی بڑی آنکھیں میرا من ہی لے گئیں۔ میری کلپنائیں راجکمار سے پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ وہ میرے بالکل قریب آ کر بولے۔

"سچ بتا رادھا کیا یہ سچ ہے کہ تو نے مجھے بدھائی دی ہے اور یہ جو تیری نظریں......"

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "مہاراج نظروں کی بات چھوڑو ذرا میرے من سے پوچھو۔" اتنا کہہ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ لاج کے مارے اور کوئی شبد منہ سے نہ نکل سکا۔ میری سکھیاں ذرا سی دور تھیں میں پھر ان میں جا ملی مگر راج کمار بہت دیر تک وہیں کھڑے میری طرف دیکھتے رہے۔ ہماری حویلی راج محل کے قریب تھی۔

اس دن کے بعد میں اکثر راجکمار سے ملنے محل جانے لگی۔ میرے وہاں جانے میں کسی کو اعتراض نہیں تھا۔ ہماری قرابت داری پہلے ہی تھی پھر ہم بھی جاگیردار تھے اور پڑوسی بھی۔

محل میں کئی بار ایسا ہوا کہ راجکمار مجھے تنہائی میں مل گئے ایک شام اُف کتنی رنگین تھی وہ شام دن بھر برکھا ہوتی رہی تھی یوں لگتا تھا جیسے کسی دکھیارے کے آنسو ہیں جو تھمتے ہی نہیں مگر شام سے پہلے تھم گئی۔ موسم بہت سہانا ہو گیا تھا۔ میرے من میں راجکمار کی یاد کروٹیں لینے لگی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں اسی وقت ان سے ملنے راج محل چلی گئی اتفاق کی بات وہ بھی اپنے محل کے باہر مل گئے۔ اس دن میں نے پیلا بسنتی جوڑا پہنا ہوا تھا اور اس لباس میں میرا شریر سرسوں کے پھول کی مانند لگ رہا تھا۔

اس شام پہلی بار میرے ہونٹوں نے امرت رس چکھا تھا اور بس اس رات کے بعد راجکمار کے پریم میں

حق

ایک شخص سڑک پر چلتے ہوئے اپنی چھڑی گھما رہا تھا۔ اتفاقاً اس کی چھڑی ایک راہ گیر کی ناک پر لگ گئی اور خون نکل آیا۔ چھڑی والے نے زخمی راہ گیر کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر کہا۔

"مجھے سڑک پر چھڑی گھمانے کا پورا حق حاصل ہے۔"

"یقیناً" زخمی راہ گیر نے ناک سہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ کو چھڑی گھمانے کا پورا حق حاصل ہے مگر ساتھ ہی آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جہاں آپ کی چھڑی ختم ہوتی ہے، وہاں کسی دوسرے کی ناک تو شروع نہیں ہوتی۔

دیوانی ہو گئی ہمارا پریم زیادہ دیر تک بستی والوں کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ریاست کا ہمارے بعد سب سے بڑا زمیندار ایک ٹھاکر پرتاب سنگھ تھا۔ پرتاب سنگھ کی حویلی بھی ہمارے قریب میں تھی اس کی بہنیں میری سکھیاں تھیں اور اکثر ہماری حویلی میں آتی جاتی رہتی تھیں مگر جب سے میں نے راجکمار کو دیکھا تھا میرا من کہیں نہیں لگتا تھا میں جب بھی موقعہ ملتا راج محل نکل جاتی۔

ایک رات جب میں اپنی حویلی کی طرف جا رہی تھی تو پرتاب سنگھ راستے میں مل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"ارے رادھا۔ اتنی رات گئے کہاں سے آ رہی ہے؟" میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ لپک کر میرے سامنے آ گیا۔ اس طرح میرا راستہ رُک گیا۔ میں نے ناراض ہو کر کہا۔

"دیکھ پرتاب۔ میرے راستے سے ہٹ جا۔"

ورنہ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"ورنہ کیا۔ راجکمار سے کہہ کر کولہو میں پلوا دے گی۔"

اس کی باتوں پر غصہ تو مجھے بہت آیا تھا مگر میں نے ضبط سے کام لیا اور خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"پرتاب بھیا۔ مجھے جانے دو ماتا جی انتظار کر رہی

ہوں گی۔"

"اچھا جی ہم بھیا ہو گئے۔" وہ جل بھن کر بولا "اور وہ راج کمار تیرا کون ہے اس کے پاس رات رات بھر رہے تو تیری ماتا جی ناراض نہیں ہوتیں اور ہمارے ذرا روکنے سے ناراض ہو جائیں گی۔"

وہ یہ کہتا ہوا میرے بالکل قریب آ گیا تھا اس کی آنکھوں میں شیطان ناچ رہا تھا اور میں دل ہی دل میں سہمی جا رہی تھی۔

اتفاق سے کچھ دور آہٹ ہوئی تو پرتاب سنگھ چلا گیا ورنہ اس دن رام جانے وہ پاپی کیا کر گزرتا۔

میں نے یہ بات کسی سے نہیں کہی۔ میں نے سوچا اگر کہوں گی تو میری بدنامی ہو گی ہاں اب میں بہت احتیاط کرنے لگی تھی میں زیادہ دیر تک راج محل میں بھی نہیں رکتی تھی کئی بار راجکمار نے مجھ سے شکایت کی مگر میں ہنس کر ٹال گئی تھی۔

پرتاب سنگھ میرے پیچھے پڑ گیا تھا نہ معلوم کیسے وہ سمجھ لیتا تھا کہ آج میں راج کمار سے ملنے جاؤں گی کئی بار میں نے راجکمار کو پرتاب سنگھ کی حرکتوں کے بارے میں بتایا۔ وہ بہت ناراض ہوا کہ یہ بات پہلے کیوں نہ بتائی پھر ہم بہت دیر تک اس مصیبت سے بچنے کے لیے تدبیریں سوچتے رہے لیکن بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ راجکمار اپنے رشتے کی بات اس لیے نہیں کر سکتا تھا کہ ہماری اس سے رشتہ داری تھی ایسی صورت میں شادی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ میں نے اپنے پریمی سے صاف شبدوں میں کہہ دیا تھا۔

"میں جان دے دوں گی مگر اپنے شریر کو کسی غیر کا ہاتھ نہیں لگنے دوں گی۔"

مگر تقدیر کی خرابی میرے ارادوں کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ ایک ماہ بعد میرا لگن طے ہو گیا اتفاق سے میرا ہونے والا پتی لگن کے سمے وطن واپس آ گیا ابھی تک ہمارے خاندان والوں نے بر نہیں دیکھا تھا اس لیے دولہا کو لگن کے سمے ریاست میں طلب کیا گیا مگر قاعدے کے مطابق وہ ہمارے گھر نہیں ٹھہر سکتا تھا اس لیے پرتاب سنگھ نے دولہا والوں کو اپنی حویلی میں ٹھہرایا۔ پرتاب سنگھ کی ان لوگوں سے جان پہچان تھی۔

میں نے رو رو کر اپنی جان ہلکان کر لی تھی۔ میرا شریر پیلا پڑ گیا تھا۔ مگر گھر والوں نے اس بات کو عام لڑکیوں کا دکھ سمجھا۔ ادھر راجکمار غم سے دوہرا ہو گیا تھا وہ اپنی زبان سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا مگر اپنے سامنے اپنی ریاست سے میری ڈولی اٹھتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہہ دیا تھا۔

"میں ضرور کوئی تدبیر کروں گا۔" بس اسی بات سے میری ہمت بندھی تھی۔ لگن کا سمے آ گیا تھا۔ دولہا والے کافی دور سے آئے تھے وہ لوگ دوپہر کو آ کر پرتاب سنگھ کی حویلی میں ٹھہر گئے۔ شام کو سب لوگ اکٹھے ہو گئے اور بڑی دھوم دھام سے لگن ہو گئی۔ قائدے کی رو سے ایک رات کے لیے میری رخصتی کر دی گئی۔ دولہا والوں نے پرتاب سنگھ کی حویلی کو ہی میری سہاگ رات کے لیے مناسب سمجھا۔ یہ کافی بڑی حویلی تھی۔ اس میں ایک کمرہ میرے لیے سجا دیا گیا۔ رات کو بہت دیر تک پرتاپ سنگھ کی بہنیں اور گاؤں کی اور دوسری لڑکیاں مجھے چھیڑتی رہیں میری آنکھ کا آنسو بند نہ ہوتا تھا۔ بات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ اب میں راجکمار کی طرف سے بھی مایوس ہو گئی تھی۔ اب ہو بھی کیا سکتا تھا میں پرائی ہو گئی تھی اور آج رات کے بعد میں اس قابل ہی کہاں رہوں گی کہ راجکمار کو منہ دکھا سکوں۔ میں نے اپنے من میں سوچا پھر میں نے ایک بھیانک فیصلہ کر لیا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ صبح کو گھر جا کر خودکشی کر لوں گی۔ اگر اس وقت میں دلہن بنا کر کمرے میں بند نہ کر دی گئی ہوتی تو اسی سمے خودکشی کر لیتی۔

میرا پتی واقعی بہت سندر تھا۔ میں نے لگن کے سمے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی اس وقت مجھے آنسو بہانے سے فرصت ہی کہاں تھی بس ایک دو منٹ کو تھک کر چپ ہو گئی تھی۔

باہر ولایت میں رہ کر پتی کو شراب پینے کی عادت پڑ گئی تھی اور یہاں جب پرتاپ سنگھ سے ان کی ملاقات

ہوئی تو وہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ انہیں ایک بہترین ساتھی مل گیا ہے۔ پرتاب سنگھ ان سے چار ہاتھ لمبا نکلا۔ یہ دونوں حجلہ عروسی کے برابر والے کمرے میں بیٹھ کر شراب پی رہے تھے۔ دولہا نے یہ کمرہ اسی لیے چنا تھا کہ بارات والوں کو اس کی برائی کا پتہ نہ چل سکے۔ پھر اس نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ وہاں سے چپ چاپ دلہن کے پاس چلا جاؤں گا۔ تمام دن اور آدھی رات تک بیٹھے بیٹھے میرا شریر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ مجبوراً ذرا دیر کے لیے میں مسہری پر لیٹ گئی زیورات بھاری، کپڑوں اور پھولوں کی وجہ سے میں بہت تھک گئی تھی لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

نہ معلوم کس وقت میری آنکھ کھلی مگر اتنا معلوم تھا کہ رات کافی بیت چکی ہے کمرے میں گھپ اندھیرا ہے اور کوئی میرے شریر پر جھکا ہوا ہے میں نے سوچا پتی دیو کو اب موقعہ ملا ہے اور وہ میری دنیا برباد کرنے آ گئے ہیں۔ جب میں بالکل ہی بے بس ہوگئی تو روہانسی ہو کر بولی۔

”بھگوان کے لیے میری دو باتیں سن لو۔ میں تمہارے سامنے اپنے پاپ کا اقرار کرتی ہوں حالانکہ میرا شریر گنگا کی طرح پوتر ہے مگر میری آتما گندی ہو چکی ہے۔ اب میں ایک آتما دو آدمیوں کو کیسے دے سکتی ہوں۔ میں راجکمار گوتم سے محبت کرتی ہوں اس کا پریم میری نس نس میں رچ بس چکا ہے میں اس کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی۔

میں چاہتی تو یہ شریر بھی گندہ ہو جاتا مگر ہم نے پریم کیا ہے سچا پریم ہمارے پیار میں گندگی نہیں تھی۔ راجکمار نے بھی میرے شریر کو چھونے کی کوشش نہیں کی مگر اپنی آتما کی طرح میں اس شریر کو بھی ان کی امانت سمجھتی ہوں کیا تم اس بات پر بھی مجھے سویکار کر لو گے؟“ یہ میرا آخری ہتھیار تھا۔ اس نے اس نے پھر سے کمرے میں روشنی کر دی اور میں اپنے دولہا کو دیکھ کر چیخ مار کر بیہوش ہوگئی۔ یہ پرتاپ سنگھ تھا۔

جب میں ہوش میں آئی تو اس پاکھنڈی۔ نر بڑے گھمنڈ سے کہا۔

”دیکھا رادھا رانی۔ ہم نہ کہتے تھے ہم سے بچ کر کہاں جاؤ گی۔ جاؤ اپنے راجکمار کو بلا لاؤ اور مجھے سولی پر چڑھا دو یا اپنے شرابی پتی سے شکایت کر دو جو برابر والے کمرے میں بے سدھ پڑا ہے۔“

میرے اوپر قیامت گزر گئی تھی۔ شاید پتی دیو کو بھی اپنی غلطی کا علم ہو گیا تھا وہ صبح ہی ناشتہ کئے بغیر چلا گیا اس کے چلے جانے سے ریاست میں بڑا چرچا ہوا اس کے ساتھی بھی فوراً ہی روانہ ہو گئے تھے۔

تیسرے دن ہمارے گھر میں کہرام مچ گیا اس دن اطلاع آئی تھی کہ پتی دیو نے گنگا میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔

رونا پیٹنا رات تک ہوتا رہا اور جب سب لوگ تھک ہار کر سو گئے۔ تو میں نے اسی رات کو زہر کا پیالہ پی لیا۔

رادھا اپنی داستان سنا کر رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ تم لوگ مر گئے اور پھر اب زندہ ہو۔“

”یہ سب کچھ ممکن ہے بابو جی۔“ رادھا نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

”اب تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہو۔ وہ بھی بتا دو۔“ میں نے دوسرا پہلو اختیار کیا۔

”ان باتوں کا جواب آنے والا وقت دے گا۔“ پراسرار انداز میں رادھا نے کہا۔ گاڑی پھر رکنے کے لیے آہستہ ہو رہی تھی اس لیے میں نے بھی اسے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی گاڑی ایک جنکشن پر رکی پہلی بار بڑا اسٹیشن دیکھ کر مجھے قدرے مسرت ہوئی۔ پلیٹ فارم پر اتر کر میں نے بک اسٹال کا رُخ کیا اور چند کتابیں اور میگزین خرید لایا۔

ٹرین یہاں جم کر رہ گئی تھی اب دوپہر ہو چکی تھی اس لیے ہم نے کھانے سے فراغت پائی تا کہ کوئی پریشانی

نہ ہو۔ ڈبے میں اب کافی رش ہوگیا تھا تاہم یہ بڑی بوگی تھی اس لیے ہمارے قریب کوئی نہیں تھا۔ ہم آزادی سے، بات چیت کر سکتے تھے لیکن اس وقت باتوں سے زیادہ مطالعے میں لطف آ رہا تھا۔ رادھا کے لیے میں ہندی کا رسالہ لے آیا تھا وہ اس میں لگ گئی تھی۔

ٹرین اس جنکشن سے چلی تو واقعی پسنجر ٹرین بن گئی ہر اسٹیشن پر آنے جانے والوں کی بھیڑ لگی رہی اس لیے کانپور تک میں رادھا سے کوئی بات نہ کر سکا۔ ہم لوگ ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر رہ گئے۔

کانپور ابھی دور تھا کہ ایک بار پھر ڈبے میں ہم تنہا رہ گئے اور ذرا دیر بعد میں نے بدلی ہوئی رادھا کو دیکھا اب وہ تمام لباس اور زیورات اتار کر مغربی طرز کا لباس زیب تن کر چکی تھی۔ پہلی بار میں نے اس کے ماڈرن بال دیکھ کر انتہائی حیرت کا مظاہرہ کیا یہ اس کا تیسرا روپ تھا۔

کانپور اسٹیشن پر ٹرین رات کو نو بجے لگی چونکہ دو گھنٹے لیٹ ہوگئی تھی۔ قلیوں سے سامان اتروا کر ہم باہر آئے۔ رادھا اسٹیشن کے باہر غور سے کچھ تلاش کر رہی تھی۔ جب ہم ٹکٹ گیٹ سے باہر آئے تو ایک لمبا پل پار کر کے اس طرف آ گئے جہاں رکشے اور ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ میں اب رادھا کے اختیار میں تھا۔ اس لیے اپنی طرف سے میں نے کوئی پہل نہیں کی دو منٹ گذرے تھے کہ ایک لمبی سی سیاہ رنگ کی شیور لیٹ ہمارے قریب آ کر رکی۔

بوڑھا ڈرائیور باہر آیا اور "رادھا بٹیا" کہہ کر ہماری طرف بڑھا اسے دیکھ کر رادھا کے چہرے پر رونق آ گئی تھی اس نے آگے بڑھ کر کہا۔

"آ گئے بنواری چاچا۔"

"ہاں بٹیا۔ راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔" پھر میری طرف مڑ کر بولا۔ "بھلا کنور صاحب کی موجودگی میں ہماری بٹیا کو کیا کشٹ ہوسکتا ہے۔"

"گھر پر تو سب راضی خوشی ہیں۔" رادھا نے کار میں بیٹھ کر پوچھا۔ میں اس سے پہلے بیٹھ چکا تھا۔

"ہاں ہاں بیٹا۔ سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اس دن تمہارے پتاجی کہہ رہے تھے رادھا بس آنے والی ہے۔"

"اس کا تار تو آ گیا ہے فنی کون بس ختم ہوگیا۔"

"فنی کون" میں نے اور رادھا نے ایک ساتھ کہا بوڑھا ڈرائیور ذرا سا سٹپٹا گیا پھر بولا۔

"کمبخت یادداشت بہت خراب ہے بڑھاپا ہے نا۔ شاید یہی کہا تھا یا کچھ اور بھئی وہ تم لوگ شادی کے بعد کیا مناتے ہو۔" اب ہم سمجھے کہ یہ بڑے میاں ہنی مون کو فنی کون کہہ رہے تھے۔ ہم لوگ ان کی سادگی پر بے اختیار ہنس دیئے۔

کار بازاروں سے گزر رہی تھی اور بھیڑ ہونے کی وجہ سے رفتار بہت سست تھی۔ اسی دوران رادھا نے سرگوشی میں کہا۔ "دیکھو وہاں کسی سے زیادہ باتیں مت کرنا میں اپنے بارے میں بتاؤں۔ میں کچھ دن پہلے لندن سے تعلیم پا کر لوٹی ہوں اور ہماری شادی کو صرف دو ہفتے ہوئے ہیں۔ یہاں میرا میکہ اور تمہاری سسرال ہے۔ اس جنم میں تمہاری دو سالیاں اور دو سالے ہیں تم رامپور کے رہنے والے ہو۔ اور تمہارا نام گوتم بابو ہے تمہاری ساس کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"دونوں سالوں کی شادی ہو چکی ہے اور بڑی سالی شیلا کی منگنی طے پا چکی ہے۔"

میں نے تفصیلات ذہن نشین کر لیں اور پھر ہم لوگ خاموشی سے سفر طے کرتے رہے۔

شہر سے کچھ دور نکلتے ہی گومتی ندی کا خوبصورت اور لمبا پل آ گیا اس پل کو پار کرتے ہوئے میں نے گومتی کے کنارے مندر اور شمشان بنے ہوئے دیکھے اور بہت سے اشنان گھاٹ بھی تھے جہاں پختہ سیڑھیاں اور فرش بنے ہوئے تھے آبادی کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔ مگر دس پندرہ منٹ تک موٹر فراٹے بھرتی رہی۔ یہاں تک کہ بڑی بڑی کوٹھیوں کا علاقہ آ گیا۔ مگر اس طرف آبادی گھنی نہیں تھی۔ کوٹھیوں کے درمیان کافی قطعات خالی پڑے تھے۔ ان کوٹھیوں کے سامنے جنگلات کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا

تھا بہت سے کھیتوں میں مختلف فصلیں کھڑی تھیں ایک طرف پختہ اور نیم پختہ چھوٹے مکانات کا سلسلہ بھی تھا۔

رادھا کے گھر والوں سے ملاقات ہوئی تو دل خوش ہو گیا۔ سب ہی تعلیم یافتہ اور بلند اخلاق لوگ تھے۔ ہر شخص کھل مل کر باتیں کرنا چاہتا تھا اور اپنے اپنے طور پر خاطر مدارت کر رہے تھے۔ رادھا کی بہنیں رادھا کی طرح خوبصورت اور سلیقہ مند تھیں۔ وہ بڑے ادب و احترام سے ملیں مختصر یہ کہ اپنی مصنوعی سسرال کو دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

یہ کوٹھی جس میں رادھا کے والدین رہتے تھے اچھی خاصی قلعہ نما تھی۔ دس بارہ کمروں اور کئی وراندوں پر مشتمل ہونے کے علاوہ لان باغیچہ اور گیم کورٹ وغیرہ سبھی کچھ تھا۔

ہمیں کوٹھی کے ایک حصے میں دو کمرے جو سب سے الگ تھے دے دیئے گئے۔ دن میں ہم الگ رہتے تھے مگر ہم نے سونے کے لیے ایک کمرہ منتخب کر لیا تھا۔ لیکن پہلی ہی رات میرے سامنے رادھا کی ایک عجیب وغریب شخصیت ابھر کر آئی۔

سب کو خدا حافظ اور شب بخیر کہہ کر جب ہم اپنی خوابگاہ میں داخل ہوئے تو رادھا نے کہا۔

''بابوجی۔ اب ہمیں اپنا کام شروع کرنا ہے اس کی تفصیل سن لیجیے۔''

میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔''ضرور میں خود پوچھنے والا تھا۔''

''یہاں ہمیں کئی آدمیوں کا خون کرنا ہے۔'' نہایت اطمینان سے رادھا نے کہا۔

''تمہیں حیرت ہو رہی ہے حالانکہ یہ بالکل سچ ہے۔ دراصل پرتاپ سنگھ ٹھاکر کے رشتے دار سب کے سب یہیں رہتے ہیں۔ انہیں موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے میں نے ایک جدید طریقہ کار اپنانے کا فیصلہ کیا ہے۔'' ماڈرن لباس میں ملبوس رادھا اس وقت اینگلو انڈین لگ رہی تھی۔ اس نے ذرا سے توقف کے بعد کہا۔

''ہمارا شکار ایک آدمی ہوا کرے گا۔ اس شخص کو پھانس کر ایک خاص جگہ تک لانا میرا کام ہوگا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد میں جو کچھ کہوں آپ کو اس پر عمل کرنا ہے اس طرح ہم ان ظالموں کا کام تمام بھی کر سکیں گے اور قانون کے سنگین ہاتھوں سے بچ بھی جائیں گے۔''

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔'' میں نے کہا۔

''بہرحال میں تمہارے ساتھ ہوں جو کہو گی وہی کروں گا لیکن ایک درخواست ہے کہ مجھے جلدی چھٹی دے دینا۔''

''میں اس کا وعدہ کرتی ہوں۔ تمہارا شریر تمہارے کمرے میں محفوظ ہے بس جیسے ہی کام ختم ہوگا تمہیں مکت کر دیا جائے گا۔''

''اچھا تو پھر آج کیا کرنا ہے۔'' میں نے تیار ہو کر کہا۔

''آج تو صرف آرام کرنا ہے۔'' رادھا نے مسکرا کر کہا۔ ہم دونوں خواب گاہ میں چلے گئے یہاں پہلے سے دو مسہریوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ حسب وعدہ میں نے رادھا سے کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ ہم تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے اور پھر آہستہ آہستہ نیند کی وادیوں میں گم ہو گئے۔

دوسرے دن رادھا اور اس کی بہنیں مجھے کانپور گھمانے لے گئیں مگر ہم دوپہر تک لوٹ آئے۔ طعام سے فارغ ہو کر میں آرام کرنے اپنے کمرے میں چلا گیا مگر رادھا مجھ سے اجازت لے کر اپنے شکار کی تلاش میں نکل گئی۔

تیسرے پہر ہم نے چائے اپنے کمرے میں پی۔ اس کے بعد وہ مجھے آج کے شکار کی تفصیل بتانے لگی۔

''میرا آج کا شکار پرتاپ سنگھ کا پوتا انوپ ہے۔ حالانکہ یہ بوڑھا آدمی ہے اور پوتی پوتوں والا مگر میں نے اپنے جذبہ انتقام کو تسکین دینے کے لیے آج اس کا انتخاب کیا ہے۔''

''لیکن وہ رات کے وقت تنہا کھیتوں کی طرف کیسے آئے گا؟'' میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

رادھا بے اختیار مسکرا دی پھر بولی۔

"میں نے اس کی فطرت کا اندازہ کر لیا ہے اسے کیمیا بنانے کا شوق ہے۔ بڑھاپے میں اس کی عقل ماری گئی ہے۔ میں نے جب اس سے کہا کہ سادھو مہاراج ہمیشہ رات کو ملا کرتے ہیں۔ میں یہ کر سکتی ہوں کہ ان کھیتوں کے قریب تک انہیں لے آؤں پھر تم خود ان سے بات کر لینا مگر وہ ایک وقت میں صرف ایک آدمی سے بات کرتے ہیں اور اگر کوئی پاس کھڑا ہو تو ہرگز منہ نہیں کھولتے۔ ان کا استھان ایک جوہڑ کے کنارے ہے۔" بوڑھا یہ سن کر میری خوشامد کرنے لگا اور رات کو اکیلے آنے پر تیار ہو گیا۔ اس نے مجھے یہ ہدایت کر دی ہے کہ یہ بات کسی کو نہ بتاؤں کیونکہ اس کے بیٹے اور پوتے ان باتوں سے بہت ناخوش ہوتے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ کام بس بنا ہی سمجھو۔" میں نے مسکرا کر کہا اور جواباً رادھا بھی مسکرا دی۔

نصف رات گزری تھی کہ میں اور رادھا کھیتوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس طرف بالکل سناٹا تھا۔ چاند چھپ چکا تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں راستہ بمشکل نظر آ رہا تھا۔

مجھے کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر تنہا چھوڑ کر رادھا کچھ دیر کے لیے ایک طرف چلی گئی۔ یہ پگڈنڈی جوہڑ کے کنارے پر تھی۔ رادھا کا رُخ دوسری جانب ہوئی عمارتوں کی طرف تھا میں دس بارہ منٹ تک بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ میں اپنے کام کے لیے بالکل تیار تھا۔ جیب میں ایک سیاہ کپڑے کی پٹی موجود تھی جس کو شکار کی آنکھوں پر باندھنا تھا۔

چند منٹ گزرے تھے کہ میں نے ایک سایہ پگڈنڈی پر آتے ہوئے دیکھا یہ رادھا تھی۔ میں بعجلت قریب کے کھیت میں چلا گیا اور جب رادھا کے ساتھ چلتا ہوا ایک بوڑھا آدمی میرے قریب سے گزرنے لگا تو میں نے باہر نکل کر اسے پیچھے سے دبوچ لیا آن واحد میں جیب میں رکھی ہوئی پٹی اس شخص کی آنکھوں پر بندھ چکی تھی۔

ہلکے پھلکے بوڑھے پر قابو پانا کوئی مشکل نہیں تھا۔

رادھا میرے ساتھ تھی ہم جوہڑ کے کنارے آ کر کھڑے ہو گئے۔ بوڑھے آدمی کو بے بس کر کے کھڑا کر دیا گیا اسے حکم دیا گیا کہ بے حس و حرکت کھڑا رہے۔ پھر رادھا سکیم کے بقیہ حصے پر عمل کرنے کا انتظام کرنے لگی۔ اس نے مجھے بھی مختصراً بتا دیا تھا اور میں اس کا طریقہ کار سن کر دنگ رہ گیا تھا۔ واقعی یہ وہی بات تھی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

رادھا کے اشارے پر میں نے گرم پانی کی بوتل اٹھا لی اور ایک لمبے پھل کا چاقو نکال لیا۔

رادھا مجھے اشارہ کر کے بوڑھے کے عقب میں چلی گئی میں نے حسب پلان چاقو کا الٹا کند حصہ اس کے گلے سے لگا کر کہا۔

"اب تو اپنی موت کے لیے تیار ہو جا۔ اور لالچی بوڑھے کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ بھگوان دنیا بھر کی دولت تجھے ہی دے دے گا۔"

بوڑھا خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا اور اس کی سٹی گم ہو چکی تھی۔ ایک لمحے کو مجھے اس پر ترس بھی آیا مگر رادھا کی پراسرار شخصیت نے میرے جذبہ رحم کو فوراً ہی کافور کر دیا۔

چند ثانیوں کے بعد رادھا نے چینی کے پیالے میں اُبلتا ہوا پانی انڈیلا۔ اب اسکیم کا آخری حصہ شروع ہو رہا تھا۔ اچانک میری بدلی ہوئی آواز گونجی۔ "آخری وقت میں بھگوان کو یاد کر لے بڈھے کھوسٹ لے اب تیرا سمے آ پہنچا۔"

یہ کہہ کر جونہی چاقو کی الٹی دھار ذرا طاقت سے بوڑھے کے گلے پر پھیری گئی اور اسی وقت تھوڑا سا گرم پانی رادھا نے اس کے سینے پر ڈال دیا۔ بوڑھا فرط خوف سے تھرتھرایا اور پھر دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔

میں نے جھک کر اس کی نبضیں ٹٹولیں۔ مگر وہ تو زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔

ہم نے اطمینان کرنے کے بعد سامان کا جوں کا توں رکھا اور نہایت ہوشیاری سے بوڑھے کی لاش اٹھا کر کھیتوں میں ڈال آئے۔

دوسرے دن بوڑھے انوپ کی لاش ایک کسان نے کھیت میں دیکھی فوراً ہی اس کے بیٹوں کو اطلاع کر دی گئی۔ عام خیال یہ تھا کہ رات کے وقت انوپ کھیتوں کی طرف آیا ہوگا اور کسی جانور نے اسے ہلاک کر دیا ہوگا۔ مگر اس کے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر لوگوں نے کہا۔ ضرور انوپ سنگھ کو کسی زہریلے ناگ نے ڈس لیا ہے۔

بوڑھے کی موت کا اس کے خاندان پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ اسی دن شام کو انوپ سنگھ پھونک دیا گیا۔

تیسری رات ہمارا شکار انوپ سنگھ کا بیٹا سروپ سنگھ تھا۔ یہ ساٹھ کے پیٹے میں تھا مگر بازو اب بھی مضبوط تھے۔ اسے بھی رادھا نہ جانے کس بہانے سے جوہڑ تک لائی تھی اسے دبوچنے کے لیے مجھے کافی زور آزمائی کرنی پڑی تھی۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ رادھا کا فارمولا کس قدر کامیاب رہا ہے۔

واقعہ کی صبح جب سروپ کمار کی لاش کھیتوں میں پائی گئی تو لوگوں کے کان کھڑے ہوئے کچھ لوگوں نے کہا۔ ''یہ محض اتفاقی حادثات نہیں ہو سکتے ضرور اس میں کوئی راز ہے۔''

پولیس کو واقعہ کی اطلاع کی گئی۔ کچھ فاصلے پر تھانہ واقع تھا۔ پولیس دوپہر کو آئی اس وقت تک لاش اسی جگہ پڑی رہی تھی۔ کسی طرح اخباری رپورٹروں کو بھی اس کی اطلاع مل گئی اور اسی دن پریس کو یہ عجیب وغریب خبر دے دی گئی کہ مضافاتی علاقے میں ایک ایسی لاش پائی گئی ہے جس کے جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں ہے صرف سینے پر بٹنوں والا حصہ بھیگا ہوا ہے۔

پولیس کی ابتدائی کارروائی کے بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دی گئی۔ تیسرے دن اخبارات میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی شائع ہو گئی۔ جس میں کہا گیا تھا کہ موت حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ رپورٹ کی اشاعت کے بعد لوگوں نے یہی رائے زنی کی کہ سروپ سنگھ شاید گھر والوں سے بدظن ہو گیا تھا اور زیادہ غم کرنے کی وجہ سے اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

لیکن تیسرے دن بعد پھر ایک لاش منظر عام پر آئی۔ یہ سروپ سنگھ کا چھوٹا بھائی دلیپ تھا۔

پچاس سالہ دلیپ کی لاش بھی بالکل ایسی ہی حالت میں پائی گئی تھی۔ ابھی اس کی انکوائری ہی ہو رہی تھی کہ اس خاندان کا آخری بزرگ چالیس سالہ کلدیپ سنگھ بھی ایک دن کھیتوں میں مردہ پایا گیا۔ اس کی موت بھی حرکت قلب بند ہو جانے سے واقع ہوئی تھی۔

ایک ہی خاندان میں ایک ہی انداز میں چار اموات ہو چکی تھیں لیکن اخبارات میں تین کا تذکرہ چل رہا تھا انوپ کی موت پردہ راز میں جا پڑی تھی۔ حکومت کے ذمے داران بوکھلا گئے تھے۔ اخبارات نے پولیس اور انتظامیہ پر کافی کیچڑ اُچھالی تھی۔ اس لیے متعلقہ تھانے سے باقاعدہ ایک گارڈ اس علاقے میں تعینات کر دیا گیا۔

پولیس تعینات رہی مگر ایک ہفتے بعد پھر اسی خاندان کا ایک نوجوان سلطان سنگھ کھیتوں میں مردہ پایا گیا۔ سلطان سنگھ سروپ سنگھ کا واحد بیٹا تھا اس کی موت بھی حرکت قلب بند ہو جانے سے واقع ہوئی تھی اس کے جسم پر بھی کوئی زخم نہیں تھا اس کا گریبان بھی نم پایا گیا تھا۔

ایک ماہ کے اندر ایک خاندان کے بارہ افراد اسی طرح موت کے گھاٹ اُتارے جا چکے تھے۔ اب انوپ کے خاندان میں بیوہ عورتیں اور کنواری لڑکیاں رہ گئی

ابن سماک نامی ایک عالم بہت مشہور مقرر تھے۔
ایک روز انہوں نے اپنی کنیز سے دریافت کیا۔
''میری تقریر کیسی ہوتی ہے؟''
''بہت اچھی۔'' کنیز نے برجستہ کہا۔ پھر کچھ توقف سے بولی۔ ''مگر آپ کی تقریر میں ایک عیب ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ ایک ایک نکتہ بار بار دہراتے ہیں۔''
ابن سماک نے کہا۔ ''میں ایک ایک نکتہ بار بار اس لئے دہراتا ہوں کہ کم سمجھ والے لوگ بھی اُسے سمجھ لیں۔''
''آپ کی دلیل تو مناسب ہے'' کنیز بولی۔ ''مگر مصیبت یہ ہے کہ جب تک کم سمجھ لوگ آپ کی بات سمجھتے ہیں، سمجھدار لوگ اُکتا جاتے ہیں۔

تھیں۔ اس خاندان کی کسمپرسی پر پورا ملک افسوس کر رہا تھا۔ حکومت کی طرف سے نااہل پولیس والے ہٹا دیئے گئے تھے اور تھانوں میں نیا اسٹاف تعینات کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ تجربہ کار جاسوس بھی مقرر کر دیئے گئے تھے۔

عوامی حلقوں نے انوپ سنگھ کے خاندان کے ساتھ نہایت ہمدردی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہزاروں آدمی ان بیواؤں سے ملنے بھی گئے تھے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس خاندان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ان کا دشمن کون ہے۔ اب تک جتنے واقعات ہوئے تھے وہ صرف اسی خاندان تک محدود تھے اس علاقے میں دوسرے لوگ اب بھی خیریت سے تھے لیکن پورے علاقے میں خوف وہراس پھیلا ہوا تھا۔ اخبار والے دھڑا دھڑ اس خاندان کی بیواؤں کے انٹرویو چھاپ رہے تھے۔

ایک شام جب ہم چائے سے فارغ ہو کر تنہا بیٹھے تھے تو میں نے رادھا سے کہا۔

''ہمارا معاہدہ پورا ہو چکا ہے۔ تم اپنے دشمنوں کا صفایا کرنے میں کامیاب ہو گئی اب میرے لیے کیا حکم ہے۔''

''میں آپ کی بیحد احسان مند ہوں۔ جو آپ حکم دیں گے میرے لیے اس میں کوئی عذر یا تامل نہ ہوگا۔'' رادھا نے خلوص کے ساتھ کہا۔

دوسرے دن ہم پھر بائی ٹرین رامپور روانہ ہو گئے۔ رادھا کا شوہر اپنی دلہن کو گھر لے جا رہا تھا۔ ہمارے ساتھ وہ پراسرار صندوق بھی موجود تھا۔

سفر کی رات نہایت خوشگوار تھی۔ ہم فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے تھے اس لیے بوگی میں ہمارے علاوہ کوئی دوسرا مسافر نہیں تھا۔

آج رادھا بہترین لباس پہنے ہوئی تھی۔ جدید طرز میں کٹے ہوئے بال اور خوبصورت سینے کو نیم عریاں کرنے والا اسکرٹ پہنے ہوئے وہ جاپانی گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ اس وقت گیارہ بج رہے تھے اور مجھے نیند آ رہی تھی۔ یہی حال رادھا کا تھا۔

اچانک میں نے رادھا سے ایک بے تکا سوال کر دیا۔

''کیا ہم دوبارہ کبھی نہ مل سکیں گے؟''

اس نے شفیق نظروں سے میری طرف دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔

''میرا کام ختم ہو چکا ہے اب میں اپنے راجکمار کے پاس ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں مگر یہ سچ ہے کہ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔''

''صرف یاد رکھوں گی۔'' میں اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ رادھا اسی طرح بیٹھی رہی آج وہ جذبات سے بالکل عاری نظر آ رہی تھی۔ خشک باتوں سے تنگ آ کر میں نے سونے کا ارادہ ظاہر کیا۔

ایک بار پھر رادھا نے وہی پراسرار سگریٹ کا ڈبہ نکال کر ایک سگریٹ مجھے پیش کیا۔ رادھا کے معنی خیز اصرار پر مجھے پھر وہی سگریٹ پینی پڑی اور سگریٹ پیتے ہی میں ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔ لیکن میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

ایک بار پھر رادھا نے مجھے اسی بکس میں لاش کے قریب لٹا دیا۔ صندوق کا دروازہ بند کر کے قفل لگا دیا نہ معلوم کب تک میں اس میں پڑا رہا۔

صندوق پھر سے کھولا گیا۔ اور مجھے لاش کی طرح نکال کر برتھ پر ٹیک لگا کر بٹھا دیا گیا۔ اس بار پھر رادھا نے میرے منہ سے سگریٹ دبا دی اور ماچس جلا کر سگریٹ لگا دی۔ تین کش لے کر میں بے ہوش ہو گیا دوبارہ آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی اور کمپارٹمنٹ میں میرے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ رادھا اور اس کا سامان نجانے کہاں غائب تھا۔ ہاں میری اٹیچی موجود تھی اور جب میں نے گھر پہنچ کر اٹیچی کھولی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پوری اٹیچی کرنسی نوٹوں سے بھری پڑی تھی۔ اوپر ہی ایک پرچہ رکھا ہوا تھا۔ خط ہندی میں تحریر کیا ہوا تھا۔

''شریمان جی۔ میں آپ کی بیحد شکر گزار ہوں اپنے وعدے کے مطابق یہ حقیر سا نذرانہ حاضر ہے۔ آشا ہے آپ اسے سویکار کر لیں گے۔ میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ فقط آپ کی دوست رادھا۔''

میں نے جب سعیدہ کو یہ واقعہ سنایا تو اس نے سچ ماننے سے انکار کر دیا مگر اس بات پر وہ بھی الجھ کر رہ گئی

کہ اگر یہ سب کچھ غلط تھا تو میری اٹیچی کو نوٹوں سے کس نے بھر دیا تھا۔ مجھے پرچہ کس نے لکھا تھا اور میں ایک ماہ تک کہاں غائب رہا تھا۔ جبکہ کانپور والوں نے پہلے ہی سعیدہ کو مطلع کر دیا تھا کہ تمہارا شوہر یہاں نہیں پہنچا۔

واقعات اتنے پراسرار تھے کہ نہ کسی سے کہتے بنتی تھی اور نہ ہضم ہوتے تھے۔ تجسس اپنی انتہاء کو پہنچا تو میں نے ان واقعات کی اصلیت جاننے کا عزم کر لیا۔ سب سے پہلے میں نے گزشتہ ماہ کے اخبارات اکٹھے کیے اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تمام واقعات اور انٹرویو اخبارات میں موجود تھے۔

پھر ایک دن میں اور سعیدہ کانپور روانہ ہو گئے اس بار سعیدہ نے مجھے تنہا جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس کے علاوہ ہم نے یہ سفر ٹرین سے کیا تھا۔

اپنے خالہ زاد بھائی کے گھر پہنچا تو اس نے جاتے ہی شکایت کی۔ اس کی شکایت بے جا نہ تھی مگر میں نے دولہا دلہن سے معذرت کر لی اور شادی کا ایک خوبصورت تحفہ ان کی نذر کر دیا اس طرح گلو خلاصی ہو گئی۔

سعیدہ میرے ساتھ شہر کے مضافاتی علاقے میں جہاں اخبارات کی نشاندہی کے مطابق وہ پراسرار اموات ہوئی تھیں جانے پر بضد تھی۔ مگر یہ بات میں نے نہیں مانی اور دن میں تنہا اس علاقے میں پہنچ گیا۔

سب کچھ وہی تھا وہی راستے وہی کوٹھیاں وہی ایک طرف بنے ہوئے چھوٹے مکانات کا سلسلہ اور ان کے سامنے کھیتوں کا طویل حصہ انہی کھیتوں کے قریب ایک جوہڑ واقع تھا میں نے اس علاقے کے ایک بوڑھے سے ملاقات کی اور پھر میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔

رادھا کی کوٹھی اسی جگہ موجود تھی۔ میں نے اس کوٹھی میں ایک ماہ گزارا تھا اور جب میں نے اس کوٹھی پر جا کر ملازم کو پکارا تو بوڑھے ڈرائیور نے مجھے اجنبی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

''بابو جی کس سے ملنا ہے؟''

''رادھا دیوی رہتی ہیں۔ ان کی بہن شیلا دیوی......''

''رادھا بیٹی رہا کرتی تھیں۔ مگر اب ان کی شادی کو ڈیڑھ ماہ سے اوپر ہو گیا وہ تو کل لندن چلی گئیں اپنے دولہا کے ساتھ۔'' میں نے بمشکل تمام بوڑھے کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ شیلا سے ملا دے۔ ہماری یہ ملاقات اسی کمرے میں ہوئی جہاں میں ایک ماہ تک چین کی بنسی بجا چکا تھا۔ یہ وہی شیلا تھی میں نے اسے خوب پہچان لیا تھا۔ مگر وہ مجھے بالکل اجنبی سمجھ رہی تھی۔ میں نے شیلا کو رادھا کا کلاس فیلو کہہ کر تعارف کرایا تھا اس لیے وہ ملاقات پر آمادہ ہو گئی۔ باتوں کے دوران شیلا نے کہا۔

دیدی آٹھ سال سے لندن میں تھیں۔ تعلیم مکمل کر کے انہوں نے وہیں ایک ہندوستانی گوتم بابو سے شادی کر لی اور ابھی ایک ماہ دولہا کے ساتھ یہاں رہ کر گئیں ہیں۔ انہوں نے درسی تعلیم کے علاوہ پامسٹری اور مسمریزم وغیرہ بھی باقاعدہ سیکھی ہے۔ دیدی نے بتایا کہ انہیں اس علم کو حاصل کرنے میں پورے تین سال لگے تھے۔ اب وہ کچھ عرصے سے ہپناٹائز کے کمالات سیکھ رہی ہے۔ یہ ان کی ہابی ہے۔''

ویسے ہمارے دولہا بھائی بہت بڑے آدمی ہیں لندن میں ان کا بہت بڑا بزنس ہے۔ دیدی نے اپنے شوق کی وجہ سے یہ علوم سیکھے ہیں۔

آخر میں اس نے کہا۔ ''تعجب ہے کہ میں نے آپ کو کبھی دیدی کے ساتھ نہیں دیکھا۔ آٹھ سال پہلے انہوں نے کانپور ڈی اے کالج سے بی اے کیا تھا اس کے بعد لندن چلی گئیں۔''

''تم مجھے نہیں جانتی ہو شیلا دیوی لیکن میں تم سے اس اور رادھا اور تمہارے سارے خاندان سے واقف ہوں میں رادھا کا پرانا دوست ہوں۔''

شیلا کے چہرے پر اپنائیت بھری حیرت چھوڑ کر میں چلا آیا وہ دروازے تک مجھے رکنے کو کہنے آئی مگر اب میرے ذہن کی تمام گتھیاں سلجھ چکی تھیں۔ دراصل برسہا برس پہلے یہاں پر دو خاندانوں میں پرانی رنجش تھی اور رادھا نے اسی جذبے کو تسکین دینے کے لیے اپنے علوم سے کام لیا تھا اور میں اس کی شعبدہ بازی سے اس کا دست راست بن گیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ شخص ساری دنیا کے لیے محسن بننا چاہتا تھا اور ہر نابینا کو بصارت دینا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے اُس نے جو راستہ چنا وہ انتہائی ہولناک تھا اور کتنے ہی لوگوں کو وہ بصارت سے محروم کر چکا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے اپنی آنکھوں کی قربانی دی تھی اور پھر ہر شخص سے زبردستی ایسی ہی قربانی لینے پر تل گیا

خونی تجربہ

ایم اے راحت

وہ آنکھوں کے علاج میں انقلاب برپا کرنا چاہتا تھا لیکن تجربے کے لیے اُسے آنکھوں کی ضرورت بھی تھی

میں جانتا تھا کہ فیصلہ کیا ہوگا۔ میں نے جرم کیا تھا اور اس کا اعتراف بھی کرلیا تھا۔ کئی افراد قتل ہوئے تھے میرے ہاتھوں اور میں نے یہ بات عدالت کے سامنے تسلیم کی تھی۔ پھر کیا گنجائش رہ جاتی تھی کہ میرے ساتھ رعایت ہو۔ پتا نہیں عدالت اس سلسلے میں پس و پیش کیوں کر رہی تھی۔ بہرحال خون کا بدلہ خون ہوگا۔ ہاں زندگی کے کچھ لمحات باقی تھے۔ سانسیں پوری ہو رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔

لیکن۔ میں نہیں جانتا تھا۔ کوئی کچھ نہیں جانتا۔ قانون قدرت میں لچک نہیں۔ انسان آخری فیصلہ کرنے پر قادر نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ہے۔

جیل کی راتیں پرسکون تو نہیں ہوتیں۔ یہ تو اپنا خیال ہے جسے کوئی بھی نام دے دیا جائے۔ ایسی ہی بے سکون رات تھی کہ اچانک کان پھاڑ دینے والے دودھماکے ہوئے ایسے خوفناک دھماکے کہ جو اعصاب شل کر دیتے ہیں۔ پھر ایک شور۔ بے پناہ شور۔ جیل توڑ دی گئی تھی۔ قیدی بھاگ رہے تھے۔ گولیاں چل رہی تھیں۔ سائرن بج رہے تھے۔ قیدی ایک دوسرے کو نکل جانے کی ترغیب دے رہے تھے۔ بخدا میں خود فرار نہیں ہوا تھا۔ کسی نے میرا ہاتھ پکڑا تھا اور میں ٹھوکریں کھاتا دوڑ پڑا تھا۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا عالم سحر میں ہوا تھا۔ نہ جانے کیسے کیسے مراحل طے کیے تھے میں نے لیکن صرف اعضاء ساتھ دے رہے تھے۔ ذہن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

جس شخص نے میرا ہاتھ پکڑا تھا، میں نے ٹھیک سے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس وقت بھی اس پر غور نہیں کیا تھا جب وہ ایک گھر کی چار دیواری کود کر اندر داخل ہوا تھا اور اس وقت بھی ہم دونوں نے لباس تبدیل کر کے شریف شہریوں کا حلیہ اختیار کیا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر روشنی میں، میں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا اور میرا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ چہرے کے جھاڑ جھنکاڑ بتاتے تھے کہ وہ کافی عمر رسیدہ ہے لیکن اس کی آنکھوں کی جگہ دو گہرے گڑھے تھے۔

ناممکن۔ ناقابل یقین۔ اس کی اب تک کی حرکات آنکھوں والوں سے مختلف نہیں تھیں۔ جبکہ وہ میں متحیر رہ گیا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”اب سے تھوڑی دیر کے بعد شہر سے باہر جانے والے تمام راستے بند کر دیے جائیں گے تاکہ مفرور قیدی فرار نہ ہوسکیں۔ اس لئے فوراً ٹرین میں سوار ہو جانا چاہیے۔“ میں نے اس سے اختلاف نہیں کیا تھا اور چند لمحوں بعد ہمارا سفر جاری ہوگیا تھا۔

”میرے ساتھ چلنا پسند کرو گے؟“ بوڑھے نے پوچھا۔

”کہاں۔“

”میری بستی۔ خیال پور ہے اس کا نام؟“

”مجھے اعتراض نہیں ہے۔“

”کیا نام ہے تمہارا؟ ویسے ہم صرف نام کی حد تک آشنا ہوں گے۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

”نادر خان۔“ میں نے جواب دیا۔

”میرا نام شہباز ہے۔ بس شہباز ہے، نہ کچھ آگے نہ پیچھے۔“

''تم۔تم پیدائشی اندھے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ یہ سوال مجھ پر بری طرح مسلط تھا۔

''نہیں۔'' بوڑھے نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''چند سال پہلے میرے چہرے پر دو روشن آنکھیں تھیں۔''

''پھر؟''

''یہ آنکھیں دشمنی کا شکار ہو گئیں۔ میرے دشمن نے میری دونوں آنکھیں نکال لیں۔''

''اوہ۔کون تھا وہ؟''

''تھا نہیں۔تھی اور ہے۔'' بوڑھے کے لہجے میں بے پناہ نفرت تھی۔

''کیا دشمنی تھی اس سے؟''

''ابھی نہیں بتاؤں گا دوست، اس کے لئے کچھ انتظار کرو۔''

''اچھا تمہاری مرضی لیکن ایک بات پر مجھے حیرت ہے۔ وہ یہ کہ تم کسی طور پر اندھے نہیں معلوم ہوتے۔ تمہاری تمام حرکات آنکھوں والوں کی سی ہیں۔ جیل کی تاریک چار دیواری میں تم نے جس انداز میں راستہ تلاش کیا تھا وہ میرے لئے بڑی حیرت انگیز بات تھی۔''

''ہاں انسان جب بھی کسی حس سے محروم ہو جاتا ہے تو اس حس کی کمی دوسری چند خصوصیات پوری کر دیتی ہیں۔ میرا ذہن میری آنکھیں ہیں، میرے کان میری آنکھیں ہیں۔ میرے کان ضرورت سے زیادہ احساس ہیں۔ میں ہوا کی سرسراہٹ سے بہت سی باتوں کا پتہ چلا لیتا ہوں میں قدموں کی چاپ سے انسان کی پوری شخصیت پہچان لیتا ہوں اور بھی بہت سی خصوصیات ہیں جو تم پر آہستہ آہستہ کھل جائیں گی۔ انتظار کرو۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا اور پھر راستے بھر میں بوڑھے شہباز کی پراسرار شخصیت کا جائزہ لیتا رہا۔

میرے ذہن کی چولیں ہل گئی تھیں۔ ہر قدم پر یہ شخص نمودار ہوتا تھا۔ بہر حال وہ پہاڑی اسٹیشن۔ جس کا نام خیال پور تھا آ گیا۔ میں نے تو اس وقت تک اسٹیشن کا بورڈ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن بوڑھا شہباز اس وقت اونگھ رہا تھا اور اچانک وہ اونگھتے اونگھتے چونک پڑا۔ اس نے چہرہ اٹھا کر فضا میں کچھ سونگھا اور پھر مجھے ٹٹولنے لگا۔

''کیا تم سو رہے ہو نادر؟۔ اگر سو رہے ہو تو جاگو، ہماری منزل آ گئی ہے۔''

''میں جاگ رہا ہوں شہباز، لیکن تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ آنے والا اسٹیشن خیال پور ہے۔'' اور میری اس بات پر بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''یہ نہ پوچھو۔ یہ سب کچھ نہ پوچھو۔ اپنی زمین کی خوشبو رونگیں رونگیں میں بسی ہوتی ہے۔ بشرطیکہ تمہارے دل میں وطن کی سچی محبت ہو۔'' یہ ہوائیں مجھے میری سرزمین کی آمد کا پیغام دے رہی ہیں۔'' اس نے جواب دیا اور درحقیقت آنے والا اسٹیشن خیال پور ہی تھا۔

ہم دونوں ٹرین سے نیچے اتر گئے۔ بوڑھا اسی انداز میں آگے بڑھ رہا تھا کہ جیسے سارے راستے اس کے جانے پہچانے ہوں، میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ اسٹیشن سے نکل کر ہم بستی میں داخل ہو گئے۔ اچھی خاصی پکی آبادی تھی، جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ زندگی کی گہما گہمی ماند نہیں پڑی تھی۔ لوگ اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

بوڑھا شہباز چلتے چلتے رک جاتا اور پھر چلنے لگتا۔ ایک جگہ رک کر اس نے کہا۔

اپنے بائیں طرف دیکھو نادر، کیا تمہیں سرخ رنگ کا ایک مینار نظر آ رہا ہے؟''

''ہاں مینار موجود ہے۔'' میں نے بائیں سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

''اندازاً کتنے فاصلے پر ہو گا؟''

''تقریباً سو گز پر۔''

''ہوں۔'' بوڑھے نے گردن ہلائی اور پچیس تیس قدم چلنے کے بعد وہ دائیں سمت مڑ گیا۔ اس طرف ایک پتلی سی گلی تھی۔ گلی کافی پتلی معلوم ہوتی تھی۔ گلی کے آخری سرے پر بستی کا آخری مکان تھا اس کے بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا، جو حد نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ اور ہم کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر ہو لیے۔ بوڑھا شہباز خاموشی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ سورج ڈوب گیا تھا۔ اب کھیتوں میں تاریکی کی دبیز چادر پھیلتی جا رہی تھی۔ چلتے چلتے میں تنگ آ گیا۔ تب میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

''تم نے کہا تھا۔ یہی بستی تمہاری بستی ہے۔''

''ایں؟۔'' بوڑھا چونک پڑا۔ ''کیا کہا تم نے؟''

''میں کہہ رہا تھا کہ تم دیکھ نہیں سکتے۔ اپنے ذہن کی آنکھ سے دیکھو کہ سورج چھپ چکا ہے اور تاریکی پھیلتی جا رہی ہے اور ہم طویل و عریض کھیتوں کے درمیان چلے جا رہے ہیں۔ بستی کا آخری مکان بھی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے آخر ہم کہاں جا

رہے ہیں؟"

"اوہ۔ بس تھوڑی دوران کھیتوں کے اختتام پر جنگلات کا سلسلہ شروع ہوگا۔ بس وہیں ہماری قیام گاہ ہوگی۔"

"جنگلوں میں۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ میں کسی قدر تنہائی پسند بھی ہوں اور پھر ایک طویل عرصے تک میں اپنی قیام گاہ سے دور رہا ہوں۔ بہر حال اب ہمیں زیادہ نہیں چلنا پڑے گا۔"

کھیتوں کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے رات ہو چکی تھی۔ جنگلات کا سلسلہ گہری تاریکی میں لپٹ گیا تھا۔ مجھے تو تھوڑے فاصلے کی چیز بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن ساعت کی بینائی سے مرقع شہباز اس وقت حیرت انگیز ثابت ہو رہا تھا وہ اچھی خاصی رفتار سے چل رہا تھا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اور سچ مچ میں اس عمارت کو نہیں دیکھ سکا جس کے دروازے پر اس نے مجھے لا کھڑا کیا تھا۔ پتہ تو اس وقت چلا جب دروازے کھلنے کی آواز سنائی دی۔ ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے کسی پرانی عمارت کا طویل عرصہ سے بند دروازہ کھلا ہو۔ چوں چرکی آوازیں بلند ہوئیں اور پھر بوڑھے شہباز کی آواز سنائی دی۔

"کیا خوفزدہ ہو؟" بوڑھے کی بات مجھے بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ اس لئے میں نے اس کا جواب ہی نہیں دیا۔ اس نے چونک کر میرے ہاتھ کو ٹٹولا اور پھر اسے پکڑ کر بولا۔ "غیر معمولی طور پر خاموش ہو، کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں! تم بار بار احمقانہ گفتگو کرنے لگتے ہو۔ بھلا میں دنیا میں کسی چیز سے خوفزدہ ہو سکتا ہوں۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

"اوہ۔ مجھے افسوس ہے واقعی میں نے غلط جملے استعمال کیے ہیں۔ مگر تمہاری خاموشی کیا معنی رکھتی ہے؟"

"بس میں حیران ہوں۔ میں اس عمارت کو بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ اور شہباز نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"کافی تاریکی ہے شاید۔"

"ہاں۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میرا ہاتھ پکڑ کر چلتے رہو۔ آؤ۔" اس نے کہا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کیسی عمارت ہے۔ مجھے تو اس کے درو دیوار تک نہیں نظر آ رہے تھے۔ لیکن اندھا شہباز موڑ مڑ رہا تھا۔ ویسے کافی وسیع عمارت معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ اندر داخل ہونے کے بعد بھی کافی دیر تک چلنا پڑا تھا۔ پھر بوڑھا رکا اور اس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ میں ایک گہری سانس لے کر اس کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہو گیا

دعائے مسلم

یا اللہ مجھے غیبت حسد اور منافقت سے بچا۔
یا اللہ مجھے رزق حلال کمانے اور کھانے کی توفیق عطا فرما۔
یا اللہ مجھے اپنی مخلوق کے دکھ بانٹنے اور ان کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی توفیق عطا فرما۔
یا اللہ مجھے توفیق عطا فرما کہ میں اپنا کام نہایت محنت' خلوص اور دیانتداری سے کرتا رہوں اگر کوئی رہ جائے تو درگزر فرما تو دلوں کے حال جانتا ہے۔
یا اللہ مجھے غیبت' جھوٹ اور چغل خوری جیسی بری عادتوں سے بچا۔
یا اللہ مجھے بدخواہوں سے بچا اور اپنے سایہ رحمت عطا فرما۔
یا اللہ مجھے توفیق عطا فرما تیری مخلوق کیلئے راحت و مسکراہٹ کا باعث بنوں۔
یا اللہ عبادت میں ریاکاری سے بچا کیونکہ یہ عبادت کی قینچی ہے۔
یا اللہ مجھے عفوو درگزر' صلہ رحمی عطا فرما اور جن لوگوں نے مجھ سے کسی قسم کی زیادتی کی یا کرنا چاہتے ہیں میں تیری رضا کیلئے سب کو تہہ دل سے معاف کرتا ہوں جو لوگ میری خامیوں اور نقائص کی تلاش میں ہیں ان سے میری پردہ پوشی فرما کیونکہ میں کمزور اور ناتواں ہوں اور تیری رحمت بیکراں ہے ایسے لوگوں کو ہدایت دے۔
یا اللہ تو مجھے توفیق عطا فرما کہ میں کسی کا بھی نقصان نہ کروں اور اگر کوئی میرا نقصان کرے تو میں اسے معاف کر دوں بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ آمین۔

لیکن تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ کمرے میں سیلن کی بو بالکل نہیں محسوس ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کشادہ اور ہوادار ہے اور کسی طرف سے اس میں ہوا آتی ہے۔

"ٹھہرو" میں تمہارے لئے روشنی کر دوں۔ میں نے لفظ تمہارے لئے ٹھیک استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے میرے لئے روشنی اور تاریکی یکساں ہے۔ ہے نا؟" اس نے کہا۔ میں نے اس وقت بھی خاموشی مناسب سمجھی تھی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد کمرے میں ایک شمعدان روشن ہو گیا۔ پہلے ایک شمع جلی تھی اور اس کے بعد متعدد۔ خاصی روشنی ہو گئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ میں کمرے میں کی ہوئی آرائش دیکھ رہا تھا۔ چاروں طرف انتہائی پرانے طرز کا فرنیچر موجود تھا۔ فرش پر سرخ رنگ کا ایک دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف حسین مسہری بھی تھی۔ غرض ہر لحاظ سے اسے ایک قیمتی کمرہ کہا جاسکتا تھا۔ جس سے بوڑھے کے ذوق کا پتا چلتا تھا۔

"یہ عمارت تمہاری ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ آبائی پشتوں کی۔" اس نے جواب دیا۔

"لیکن کیا یہاں تمہارے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے۔"

"ہے۔" اس نے کہا۔

"کون ہے؟"

"میرے دو ملازم۔"

"اوہ۔ مگر عمارت تو ویرانے میں ہے۔ یہاں وہ لوگ کس طرح رہتے ہوں گے؟"

"وہ بھی میری طرح سکون پسند ہیں۔ اس لئے انہیں یہاں رہنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔" شہباز نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔

"یہ سکون کی جگہ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہم نہایت کامیابی سے یہاں تک آ پہنچے۔ اب یہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اول تو پولیس جیل سے مفرور قیدیوں کو تلاش کرتی یہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اور اگر پہنچ بھی گئی تو اسے اس ویران عمارت میں کچھ نہیں ملے گا۔ یہاں داخل ہونے والے باہر کے لوگ۔ یہاں کچھ نہیں تلاش کر سکتے۔"

"ہاں۔ یہ جگہ مجھے ایسی ہی لگتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم بھوکے ہو گے میں تمہارے لئے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ مجھے بے حد مسرت ہے کہ تم بے جگر انسان ہو اور خوفزدہ ہونے والوں میں سے نہیں ہو۔ یہاں تمہیں جو کچھ نظر آئے، اس سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہاں سب ہمارا اپنا ہے۔"

"ٹھیک ہے بڑے میاں، آپ میرے لئے پریشان نہ ہوں۔" میں نے جواب دیا اور پراسرار بوڑھا مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں آرام کرسی پر دراز ہو گیا اور درحقیقت میں یہاں خوفزدہ نہیں تھا۔ اور میری اس کیفیت کا جواز یہ ہے کہ میں نے طویل عرصہ موت کے تصور میں گزارا تھا۔ خوف کی بنیادی وجہ تکلیف، آزار یا موت ہوتی ہے۔ یعنی اس سلسلے میں موت آخری اسٹیج ہوتی ہے اور میں اس اسٹیج میں تھا۔ ایک جذباتی مقصد کے تحت میں نے موت اپنا لی تھی اور مجھے زندگی سے دلچسپی ہوتی تو اول تو میں اپنے باپ کی موت کا انتقام لینے کے لئے اتنا بھیانک کھیل ہی نہ کھیلتا۔ یا پھر انتقام لینے کے بعد وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ لیکن میں نے خوشی سے خود کو موت کے حوالے کر دیا تھا۔ گویا مجھے اب زندگی کی ضرورت نہیں تھی اور اب میں سپرمین بننے کی کوشش نہیں کروں گا۔ جب مجھے سزائے موت سنائی گئی تو میں نے موت کے بارے میں سوچا ضرور تھا لیکن وہی عزم، وہی استقلال قائم رہا تھا یعنی میں نے اپنی زندگی کی حدیں اپنے مقصد سے منسلک کر دی تھیں۔ اس لئے مجھے موت سے ڈر نہیں لگا تھا۔ نجانے اس بوڑھے کی باتوں نے کیوں اس قدر مجھے جلد متاثر کر لیا تھا اور اب زندگی کی طرف آ کر بھی میں پشیماں نہیں تھا۔ بلکہ اب تو مجھے زندگی سے دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ لیکن میں عام انسانوں سے زیادہ بے جگر تھا۔ میں اس ماحول سے قطعی خوفزدہ نہیں تھا۔ ہاں اس کے بارے میں سوچ ضرور رہا تھا اور اس سوچ کی وجہ قدرتی تھی۔

بوڑھا بے حد پراسرار تھا۔ وہ آنکھوں سے اندھا تھا مگر اس کی آنکھیں موجود ہوتیں اور صرف بینائی کھو جانے کی بات کرتا تو شاید ذہن تسلیم نہ کرتا۔ میں سوچتا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ لیکن آنکھوں کی جگہ دو غار اس کی سچائی کا ثبوت تھے۔ اور پھر اس کی بے پناہ صلاحیت جو شاید آنکھوں والوں کو بھی نصیب نہیں تھی۔ حیرت انگیز بات تھی۔ پھر اس عمارت کا ماحول، لیکن وہ مجھے یہاں لایا کیوں ہے؟ اور اب اس عمارت میں آ کر میں کیا کروں گا۔

نہ جانے ان سوچوں میں کس قدر وقت ہو گیا۔ پھر دروازے پر ہلکی سی آہٹ سن کر ہی میں چونکا تھا۔ دروازہ کھل رہا تھا اور پھر بوڑھے کے بجائے ایک اور شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی جو اس نے انتہائی تہذیب سے ایک میز پر رکھ دی اور پھر پانی وغیرہ رکھ کر سیدھا ہوا تو میں بری طرح چونک پڑا۔ آہ۔ اس کی بھی دونوں آنکھیں غائب تھیں اور ان کی جگہ دو گہرے غار تھے۔ سیاہ گہرے غار۔ میں ششدر رہ گیا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ کھانا لانے والے نے اپنے قریب میری موجودگی کو بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ پھر وہ نرم آواز میں بولا۔

"کھا کھا لیجئے جناب۔"

"اوہ۔ ہاں ٹھیک ہے۔ سنو، کیا تم اندھے ہو؟" میں نے پوچھا۔ لیکن وہ اسی طرح واپس مڑ گیا جیسے اندھا ہی نہ ہو بہرا بھی ہو اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں نے طویل سانس لے کر

شانے ہلائے اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جہنم میں جائے سب کچھ، خواہ یہ اندھوں کی نگری ہو یا بہروں کی۔ میں جیل سے باہر نکل آیا تھا اور اب زندگی میری اپنی ہے۔ بوڑھا شہباز بے شک مجھے جیل سے نکالنے میں میرا معاون ہے، میرا مددگار ہے لیکن اب اپنی زندگی میں، میں اس کا پابند تو نہیں ہوں۔ جب تک دل چاہے گا رہوں گا اور دل چاہے گا تو یہاں سے نکل جاؤں گا۔''

میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ بہت عمدہ کھانا تھا اور پھر میں برتن ایک طرف سرکا کر ملحقہ باتھ روم میں گیا۔ دانت وغیرہ صاف کئے۔ شیو کافی دن سے نہیں بنایا تھا، وہ بنایا۔

بہر حال اس وقت میں نے اس کمرے سے باہر نکلنا مناسب نہیں سمجھا۔ جاتا بھی کہاں؟ چنانچہ میں مسہری پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ عرصہ کے بعد احساس ہو رہا تھا کہ جیل کے بجائے گھر میں ہوں۔ اب وہ گھر کسی کا بھی ہو۔ زمین پر ٹاٹ بچھا کر سوتے ہوئے نجانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ آرام دہ مسہری عجیب سی لگی اور جیسے نیند تو تلی بیٹھی تھی۔ گہری نیند سو گیا اور دوسرے دن صبح کو ہی آنکھ کھلی۔

ناشتہ بوڑھے نے میرے ساتھ ہی کیا تھا اور ناشتے کے لئے ہم جس کمرے میں گئے وہ بھی باقاعدہ ڈرائنگ روم تھا۔ جس میں اخروٹ کی لکڑی کی منقش میز اور ایسی ہی کرسیوں کا سیٹ تھا۔ برتن بھی نہایت قیمتی تھے۔ بوڑھا خاصا صاحب حیثیت تھا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کہا۔

''شہباز۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہاں کے حالات دیکھ کر تمہاری شخصیت کو محسوس کر کے تجسس کسی قدر بڑھ گیا ہے کہ میں تمہارے بارے میں جاننے کے لئے بے چین ہو گیا ہوں۔ کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ ہم دونوں اپنا عہد توڑ دیں۔ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ اور میں تمہیں اپنے بارے میں۔'' میری بات سن کر بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اس کے بجائے کیوں نہ ہم کام کی باتیں کریں؟'' اس نے کہا۔

''لیکن میرا تجسس؟''

''تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟''

''نہیں۔ لیکن میں تمہارے اندھے ملازم کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''ایں۔ کیا جاننا چاہتے ہو اس کے بارے میں۔''

''کیا تمہارا دوسرا ملازم بھی اندھا ہے؟''

''ہاں۔''

''واقعی؟'' میں اچھل پڑا۔

''ہاں۔ میں غلط نہیں کہہ رہا۔''

''لیکن معاف کرنا، یہ اندھوں کی ٹیم تم نے کیوں جمع کی ہے؟''

''اسے میرا کمپلیکس سمجھ لو۔ میں خود اندھا ہوں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ بھی اندھے ہوں۔'' بوڑھے نے مسکرا کر جواب دیا۔

''لیکن تم خصوصی حسیات کے مالک ہو۔ کیا یہ ملازم بھی تمہاری طرح ہیں؟''

''ہاں۔ یہ پوری عمارت کی نگرانی کرتے ہیں۔ باورچی خانے میں کھانا پکاتے ہیں۔ کمروں کی صفائی کرتے ہیں۔ کوئی ایسا کام نہیں جو نہ کر سکیں۔''

''لیکن پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ اور تم کہہ چکے ہو کہ تم پیدائشی اندھے نہیں ہو۔''

''ہاں۔ میں نے غلط نہیں کہا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ آؤ میں تمہیں یہ عمارت دکھاؤں۔ ناشتہ کی میز سے بوڑھا اٹھ گیا۔ اس نے میرا یہ سوال بھی تشنہ چھوڑ دیا تھا۔ میں اس کے ساتھ اٹھ گیا اور پھر اس نے مجھے یہ کھنڈر نما عمارت دکھائی۔ درحقیقت تاحد نگاہ ویران جنگلوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس کھنڈر کی موجودگی بھی حیرت انگیز تھی۔ نہ جانے آبادی سے دور یہ عمارت کس لئے بنائی گئی تھی۔ بوڑھا مجھے ایک ایک جگہ کے بارے میں بتاتا رہا اور پھر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

''بیٹھو۔'' اس نے طویل سانس لے کر خود بھی بیٹھتے ہوئے کہا اور میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا اور بوڑھا کسی سوچ میں گم تھا۔ کافی دیر خاموشی سے گزر گئی۔

''میرا خیال ہے تم خصوصی طور پر مجھے اپنے بارے میں بتانا نہیں چاہتے۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تمہیں بہت جلد اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔ بہت جلد۔'' اس نے پرخیال انداز میں کہا اور میں خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اپنے بارے میں چھپانا چاہتا ہے۔ تو مجھے بھی اتنا کریدنا نہیں چاہیے میرا کیا ہے، جب دل چاہے گا یہاں سے چلا جاؤں گا۔ کسی کی مجال ہے کہ مجھے روک سکے۔ اس کے بعد میں نے اس بوڑھے سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بھی تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر اٹھتے ہوئے کہا۔

''اچھا تم آرام کرو۔ میں چلتا ہوں اور ہاں ذہن میں کسی وسوسے کو جگہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ساتھ رہ کر

تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"تم بالکل فکر مت کرو۔ میں نے دوبارہ زندگی قبول کر لی ہے اور اب میں اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کروں گا۔"

"یقیناً۔ یقیناً۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور پھر دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں اب یہاں سے کسی حد تک اکتاہٹ محسوس کرنے لگا تھا اور دوسرے انداز میں سوچ رہا تھا۔ کیوں نہ راہ فرار اختیار کی جائے۔ جو فاصلہ طے کر کے میں یہاں تک پہنچا تھا اس سے واپس بھی جا سکتا تھا۔ کون روکنے والا تھا۔ تھوڑی دیر اور سہی۔

اور پھر میں مسہری کی طرف بڑھ گیا۔ لیٹ گیا! اس کے علاوہ اور کام بھی کیا تھا۔ لیکن اب کیا کرنا چاہیے۔ یہاں سے کہاں جاؤں؟۔ کس طرح زندگی بسر کروں، ظاہر ہے پولیس میرا تعاقب کرے گی۔ میں قاتل تھا اور سزائے موت کا مجرم مہذب دنیا میں...... پتا نہیں میرے خلاف کیا کیا کارروائیاں ہو رہی ہوں۔ لیکن جب زندگی سے ہاتھ ہی دھو لیے تھے۔ جب اپنے آپ کو مردہ ہی تصور کر لیا تھا تو اب زندہ رہنے کے لئے خوف بے معنی تھا۔ آنکھ مچولی میں کوئی حرج نہیں تھا۔ زندہ بچ گیا تو ٹھیک ہے اور پولیس کی گولی دل میں اتر گئی تو بہر حال موت تو آنی ہے لیکن اب اس بوڑھے سے کچھ گھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اونہہ، اس بور ماحول میں زندہ رہنا ہی بے مقصد ہے۔ جب زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں تو پھر کیوں نہ چند سانسیں زندگی سے بھرپور ماحول میں گزاری جائیں۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ بہت جلد یہاں سے چلا جاؤں گا۔

دوپہر ہوئی اور پھر شام ہوگئی۔ رات کے کھانے پر بھی بوڑھا میرے ساتھ تھا۔ کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی اور مجھے کھانے کے بعد آرام کی تلقین کر کے چلا گیا۔ میں بھی بیزار کمرے میں واپس آ گیا۔ اب تو بالکل ہی دل اکتا گیا۔ میں نے سونے کی کوشش کی اور ذہن نیم غنودہ ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا جیسے اس کمرے میں میرے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ اس کا احساس گہرے گہرے سانسوں سے ہوا تھا اور سانسوں کی آواز اتنی تیز تھی جیسے خراٹے لیے جا رہے ہوں۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ شاید میری سماعت کا دھوکا ہے لیکن سانس اتنے تیز تھے کہ ذہن کی غنودگی دور ہو گئی۔ اور آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ لیکن شمع دان کی روشنی میں کوئی نظر نہیں آیا۔ پھر یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ پورے طور سے غور کیا تو احساس ہوا کہ مسہری کے نیچے سے تیز سانسوں کی آواز آ رہی ہے۔ میں اچھل کر نیچے کود آیا۔ یہ حیرت انگیز بات تھی۔ بھلا کون ہو سکتا تھا۔ بے ساختہ میں نیچے جھکا اور پھر اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ یقیناً کوئی موجود تھا۔ دو پاؤں سامنے ہی نظر آ رہے تھے۔ چونکہ شمع دان کی روشنی مسہری کے اس رخ پر نہیں آ رہی تھی اس لئے یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ یہ پاؤں بوڑھے شہباز کے ہیں یا اس کے نوکر کے۔ بہر حال میں نے کوئی تکلف نہیں کیا اور اطمینان سے دونوں پاؤں پکڑ لئے اور زور سے باہر گھسیٹ لیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ کمرے میں گونجی۔ چیخ کے ساتھ ہی میں نے گھبرا کر پاؤں چھوڑ دیئے اور اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

لیکن میں نے جس حالت سے اسے گھسیٹا تھا، اس سے وہ پوری طرح باہر آ گئی اور اپنے کمرے میں ایک حسین اور نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر میری آنکھیں متحیرانہ انداز میں پھیل گئیں۔ جو کچھ ہو رہا تھا نا قابل یقین تھا۔ کیونکہ اب تک میں نے صرف بوڑھے شہباز کو دیکھا تھا یا اس کے دونوں اندھے ملازموں کو۔ اب تک نہ تو کسی لڑکی کے بارے میں سنا تھا نہ ہی ایسے آثار نظر آتے تھے۔

وہ متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکا رہی تھی جیسے سونے سے جاگنے والے وقتی طور پر خالی الذہن ہوتے ہیں۔ اس کے چہرے کی تراشی عجیب سی تھی۔ عمر کا کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک نگاہ میں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک سادہ سی لڑکی ہے۔ لیکن بغور دیکھنے سے چہرے پر بے حد سفا کی نظر آتی تھی۔ ہونٹوں کی تراشی میں ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ اس کے بدن پر سیاہ چست پتلون اور سفید مردانہ قمیص تھی۔ بالوں کا اسٹائل کافی خوبصورت تھا اور اس کے پلکیں جھپکانے کا انداز۔

یوں محسوس ہوا جیسے وہ حواس کی دنیا میں واپس آ گئی ہو۔ اس نے دونوں کہنیاں زمین پر لٹکائیں اور بدن کو تھوڑا سا اٹھایا اور پھر ایک بے تعلق سی کراہ کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے زور سے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی اور میری طرف دیکھنے لگی۔

"کب آئے تم؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ جیسے برسوں کی شناسا ہو۔

"کیا مطلب؟ کون ہو تم؟" میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

"نیلم۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ لیکن آپ کون ہیں اور کہاں سے نازل ہوئیں ہیں؟"

"اس مسہری کے نیچے سے۔"

"سبحان اللہ۔ کیا ابھی ابھی پیدا ہوئیں ہیں؟"

''نہیں۔میری عمر تو بائیس سال ہے۔''

''تو اے بائیس سالہ حسینہ، اب اپنی شانِ نزول بھی بتا دے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟ پورے چار گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ وہ دونوں یقیناً تلاش کر رہے ہوں گے۔ بلکہ شاید مایوس بھی ہو چکے ہوں۔ بس میں چھپ آئی اور سیدھی اس مسہری کے نیچے آ گھسی۔ پتا نہیں کس وقت نیند آ گئی تمہارا انتظار کرتے کرتے۔''

''اوہ۔'' میں نے پریشانی سے گردن ہلائی، نہ جانے اس بھوت خانے میں کیا کیا تھا۔ اب اس لڑکی سے کیا کہا جائے اور یہ جو کچھ کہہ رہی ہے اسے کیا سمجھا جائے۔ پتا نہیں کون ہے؟ اور اس عمارت میں کہاں سے آ گئی؟ شہباز سے اس کا کیا تعلق ہے۔ بہت سے سوالات میرے ذہن میں مچل رہے تھے۔ چند ساعت میں اس کی شکل دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے کیوں اسے سہارا دینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ سہارا قبول کر لیا گیا۔ اس کا نازک ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ تب وہ اٹھ گئی اور شکریہ کہہ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''خدا کے لئے اب تو بتا دو کہ کون ہو تم؟''

''ارے تم یہ نہیں جانتے؟''

''جی نہیں۔''

''کہہ تو چکی ہوں کہ نیلم ہوں اور تمہیں اہم اطلاع دینے آئی تھی۔''

''اچھا تو فرمایئے۔ میں نے نچلا ہونٹ دانتوں میں بھینچ کر کہا۔

''بھاگ جاؤ فوراً۔ فوراً بھاگ جاؤ۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہوں گی۔''

''کیوں خیریت؟ یہاں میری موجودگی آپ کو گراں گزر رہی ہے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ''اور اگر تم نیلم ہو تو نیلم ہوتی کیا چیز ہے؟''

''بس بس' رہنے دو۔ میں سمجھ گئی تم میری بات کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے۔ بھگتو گے خود۔ میں نے دوستانہ طور پر تمہیں بتا دیا ہے۔ اور اس کے لئے میں تمہارا چار گھنٹے سے انتظار کر رہی تھی۔'' لڑکی کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت جھلک رہی تھی جیسے وہ صحیح الدماغ نہ ہو۔ میں غور سے اسے دیکھتا رہا اور پھر میں نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

''شہباز سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟''

''موت کا رشتہ ہے۔ مارے جاؤ گے تم کتے کی موت اور پھر یاد کرو گے کہ میں نے کیا کہا تھا۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہوں گی۔ ارے مجھے تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔ جیسے تمہارے لئے وقت ضائع کیا ہو۔'' وہ جھلائے ہوئے انداز میں بولی۔ پھر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے نہیں نہیں بیٹھو۔ تم تو مجھے بہت اچھی لڑکی محسوس ہوئی ہو۔'' میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور اس نے ایک جھٹکے سے شانے چھڑا لئے۔

''بولو۔ جاؤ گے یا نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''تم یہیں رہتی ہو؟''

''ہاں۔''

''تب تو مجھے یہاں یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں کہتی ہوں فضول باتیں مت کرو اور'' اچانک اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ دروازہ بہت زور سے کھلا تھا۔ سب سے آگے شہباز اور اس کے پیچھے دونوں ملازم اندر گھس آئے۔ تینوں کے چہروں پر خوفناک تاثرات تھے۔ شہباز منہ اٹھا کر کتے کی طرح سونگھنے لگا اور پھر غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

نقلی سپاہی

ذہنی آزمائش کے امتحان میں طلبہ کو ایک تصویر دی گئی جس میں ایک شخص کو پولیس کی وردی پہنے چند آدمیوں کے ساتھ کھڑا دکھایا گیا تھا۔ یہ پتہ کرنا تھا کہ وہ اصلی پولیس والا ہے یا نقلی۔ ایک لڑکے نے تصویر دیکھتے ہی کہا۔ ''یہ نقلی ہے۔'' ممتحن نے پوچھا۔ ''کیسے؟'' لڑکے نے کہا سر اگر یہ اصلی ہوتا تو اس کا ہاتھ کبھی اپنی جیب میں نہ ہوتا۔''

نقل مندی

کہتے ہیں ہٹلر نے اپنی کئی نقلیں تیار کر رکھی تھیں یعنی ہو بہو ہٹلر سے ملتے جلتے ہم شکل افراد اکٹھے کر رکھے تھے۔ ایک جرمن افسر کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ اصل ہٹلر سے ہمکلام ہے یا نقلی سے تو اس نے کہا۔ ''سر! آج میں نے ایک ہزار یہودی قتل کیے۔'' تو ہٹلر نے بے ساختہ کہا۔ ''شاباش!'' تو جرمن افسر بولا۔ ''آپ اصلی ہٹلر نہیں ہیں کیونکہ صرف ایک ہزار یہودیوں کو قتل کرنے پر ہٹلر شاباش نہیں دے سکتا۔''

ڈاکٹر یونس بٹ کی کتاب عکس بر عکس سے اقتباسات

"ہوں۔ تو تم یہاں موجود ہو؟"

"مم۔ میں تو ابھی آئی تھی؟" لڑکی نے خوفزدہ لہجے میں کہا اور اس کی آنکھوں سے خوف ٹپکنے لگا۔

"چلو اسے یہاں سے لے جاؤ۔" بوڑھے نے کہا اور دونوں ملازمین نے آگے بڑھ کر لڑکی کے بازو پکڑے اور اسے خاصی بیدردی سے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ لڑکی نے منہ سے آواز نہیں نکالی تھی۔ شہباز کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی طاری تھی۔ چند ساعت وہ سوچتا رہا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیا بکواس کر رہی تھی یہ بے وقوف لڑکی۔" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"جو کچھ بھی کہہ رہی تھی اس سے تمہیں سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ تم نے مجھے یہاں کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔" میں نے بگڑتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نادر تم بہت بے صبرے انسان معلوم ہوتے ہو۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ لیکن نہ جانے کیوں تمہیں اس سلسلے میں اتنی جلدی ہے۔ بہرحال اس کے بارے میں سنو۔ وہ میری بیٹی ہے نیلم۔ اس کا دماغ الٹ چکا ہے۔ مکمل طور پر پاگل ہے۔ اس کی کسی بات کا بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ اب بتاؤ، وہ کیا کہہ رہی تھی تم سے؟"

"بس میرا خیال ہے کوئی کھل کر بات نہیں کی تھی۔ کہہ رہی تھی یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا اور یوں محسوس ہوا جیسے بوڑھے نے اطمینان کی سانس لی ہو۔ پھر وہ غمزدہ انداز میں بولا۔

"میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ بچی ہے۔ اس کی ماں اس کی پیدائش کے وقت ہی مر گئی تھی اور اس کے بعد میں نے ہی اسے پرورش کیا۔ بڑی حساس ہے۔ ذرا ذرا سی بات کو دل پر چپکا لیتی ہے۔ اور یہی بات اس کے ذہنی انتشار کا باعث بنی۔ اب وہ صحیح الدماغ نہیں ہے۔ اس کی غیر موجودگی سے ہم بڑے پریشان ہو گئے تھے۔ بہرحال شکر ہے تمہارے کمرے میں مل گئی ہے اور ہمیں اس کی تلاش میں جنگلوں کا رخ نہیں کرنا پڑا۔ میرا خیال ہے تمہیں نیند آ رہی ہوگی۔ آرام کرو۔ احمق لڑکی نے تمہیں پریشان کیا۔ بوڑھا اٹھنے لگا مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک دیا۔

"بیٹھو شہباز، مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی۔ تم مجھے اس لڑکی کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔"

"صبح کو سہی نادر، میں خود بھی تھکن محسوس کر رہا ہوں۔" شہباز نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تمہاری مرضی۔ ویسے میں محسوس کر رہا ہوں شہباز، کہ تم مجھ سے بہت سی باتیں چھپا رہے ہو۔ اور مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتے۔ بہرحال تم میرے محسن ہو۔ تم نے مجھے جیل سے فرار ہونے میں مدد دی ہے۔ میں تمہیں کسی سلسلے میں مجبور نہیں کر سکتا۔ اگر تم اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ بلکہ سچ کہو اگر تمہیں میری یہاں موجودگی ناگوار گزر رہی ہے تو میں یہاں سے چلا جاؤں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دوست کی حیثیت سے یاد رکھیں گے۔"

"غلط فہمی کا شکار نہ ہو نادر خان، ایک رات کی مہلت اور دے دو۔ کل صبح تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ کوئی بھی بات تم سے پوشیدہ نہیں رہے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ بس اب مجھے اجازت۔" وہ مزید کچھ کہے بغیر اٹھ گیا۔ اور تیز تیز قدموں سے نکل گیا۔ میرا ذہن الجھنوں کا شکار ہو گیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد کافی دیر تک سوچتا رہا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر مسہری پر آ گرا۔ لعنت ہے اس پاگل خانے پر۔ بوڑھا شہباز بتائے یا نہ بتائے۔ میں کل یہ کھنڈر چھوڑ دوں گا۔ بعد میں جس انداز کی بھی زندگی گزارنی پڑے۔ اور یہ فیصلہ کرنے کے بعد خاصی سکون کی نیند آئی تھی۔ ساری رات شاید کروٹ بھی نہ بدلی۔

دوسری صبح آنکھ کھلی تو ذہن پر بڑا خوشگوار تاثر تھا۔ بدن ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔ انگڑائی لینے کی کوشش کی تو پتا چلا دونوں پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ بلکہ بدن پر جگہ جگہ ایسی بندشیں ہیں جو بظاہر محسوس نہیں ہوتیں لیکن ہلنے جلنے کی کوشش کی جائے تو اس کو ناکام بنا سکتی ہیں۔

میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ کسی نے باندھ دیا تھا مجھے اور کیوں؟ میں نے گردن گھمانے کی کوشش کی۔ لیکن اس میں رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی تھیں کہ گردن نہ ہلائی جا سکے۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا اور صاف اندازہ ہو گیا کہ میں اس کمرے میں نہیں ہوں جس میں پچھلی رات سویا تھا لیکن میں یہاں کیسے آ گیا اور کون سی جگہ ہے؟ مجھے یہاں لانے والا کون ہے؟ عجیب بے بسی سی محسوس ہونے لگی تھی اور پھر اسی وقت شہباز کی کریہہ آواز کانوں میں گونجی۔

"کیا محسوس کر رہے ہو؟"

"میں چونک پڑا لیکن گردن گھما کر شہباز کو نہیں دیکھ سکا تھا اور اسی وقت شہباز کا چہرہ میرے چہرے کے مقابل آ گیا۔

اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔"

"کیا تمہیں اپنے بدن میں ایک خصوصی توانائی محسوس ہو رہی ہے۔" اس نے پھر پوچھا۔

"یہ۔ یہ سب کیا ہے؟" میں نے غصیلے انداز میں کہا۔"

"میری بات کا جواب دو۔"

"بکواس مت کرو۔ مجھے بتاؤ تم نے مجھے کیوں باندھا ہے؟" میں نے غراتے ہوئے پوچھا۔

"اوہ۔ تم بضد تھے نا کہ تمہیں سارے حالات سے آگاہ کر دیا جائے۔" بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم نے مجھے باندھ کیوں دیا ہے؟ اور۔ اور مجھے میرے کمرے سے کیسے نکالا گیا؟"

"بے ہوش کر کے۔ بہر حال تمہیں آنا ہی تھا۔"

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"اسی عمارت کا تہہ خانہ۔ لیکن میں نے اس میں ترمیمیں کروائی ہیں۔ یہ میری لیبارٹری ہے۔"

"لیبارٹری؟" میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں لیبارٹری۔" بوڑھے نے گہری سانس لی۔ "بہت کم لوگ ڈاکٹر شہباز کو جانتے ہیں۔"

"ڈاکٹر شہباز۔" میں نے تعجب سے کہا۔

"ہاں ڈاکٹر شہباز۔ آنکھوں کا ماہر۔ میں نے متعدد بیماریوں کے علاج دریافت کئے ہیں لیکن بہت سے لوگوں کو میرے طریق کار سے اختلاف تھا۔ میری لیبارٹری پر کئی بار چھاپے مارے اور مجھے کبھی سکون سے کام نہیں کرنے دیا گیا۔"

"مگر تم نے۔ تم نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا ہے؟"

"یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ میرے بارے میں پوری تفصیل تو سن لو۔ یہ تو تمہاری سب سے بڑی خواہش تھی۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ میں نے آنکھوں کی متعدد بیماریوں کے علاج دریافت کیے اور انہیں عام کر دیا۔ یہ جو آنکھیں بدلنے کے آپریشن عام ہو گئے ہیں۔ یقین کرو ان کا بنیادی تصور میں نے ہی دیا تھا۔ لیکن ہر تعمیر کے لئے پہلے قربانیاں دینی ہوتی ہیں۔ آنکھوں کے موثر علاج کے لئے مجھے انسانی آنکھیں چاہیے ہوتی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی بیماریوں کے لئے میں نے مردہ انسانوں کی آنکھیں خریدنا شروع کر دیں۔ عام طور پر لاوارث مرنے والوں کی آنکھیں مل جایا کرتی تھیں لیکن موت کے بعد بینائی پر جو جھلی چڑھ جاتی تھی وہ میرے اس منصوبے کے لئے ناکارہ تھی۔ جس پر میں نے سوچا تھا۔ اس پر عمل کرنے کے لئے زندہ انسانوں کی آنکھوں کی ضرورت تھی۔ میں نے بے اندازہ دولت خرچ کر کے بھی انسانی آنکھیں حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ دوسری طرف میں اپنے تجربے کے لئے پاگل تھا اور اسی جنون کے عالم میں نے ایک زندہ انسان کی آنکھیں نکال لیں لیکن عجیب قانون ہے، عجیب لوگ ہیں۔ میری کوششوں سے بے شمار ایسے انسانوں کی آنکھوں کی روشنی واپس آ گئی جو بالکل اندھے ہو چکے تھے۔ مجھے کچھ ملا نہیں لیکن میں نے انہی کے فائدے کے لئے صرف ایک انسان کی آنکھیں ضائع کر دیں تو دنیا میری دشمن ہو گئی اور میری زندگی دوبھر کر دی گئی۔ بالآخر مجھے اس دنیا کو خیر باد کہنا پڑا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کے بعد میں لوگوں کی فلاح کے لئے یہ کام کرنا بند کر دیتا۔ میں کوئی قلاش انسان نہیں ہوں۔ ساری زندگی عیش و عشرت سے بسر کر سکتا ہوں۔ لیکن تم جانو شوق کا نشہ اتنا ہلکا نہیں ہوتا کہ آسانی سے زائل ہو جائے۔ میں اپنے تجربات کو اس حد تک وسعت دینا چاہتا تھا کہ میں کسی ایسے انسان کو بینائی دے سکوں۔ جو پیدائشی طور پر اندھا ہو۔ اس کی آنکھوں کی شریانیں تک نہ ہوں۔ جس طرح پلاسٹک کے دوسرے اعضاء بنا لیے گئے ہیں۔ جن میں ہاتھ پاؤں یہاں تک کہ نازک ترین اعضاء جن میں دل، گردے، پھیپھڑے وغیرہ شامل ہیں اور انسانی زندگی کے تار قائم رکھنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ اسی طرح میں مصنوعی آنکھیں بنانا چاہتا تھا۔ تاکہ ہم ان آنکھوں کے محتاج نہ رہیں جو عطیہ کے طور پر دی جاتی ہیں۔ تم غور کرو کہ کیسی اچھی بات ہے کہ دنیا میں کوئی انسان بینائی سے محروم نہ رہے لیکن یہ دنیا والے کسی اچھے کام کی اس وقت تو تعریف کر دیتے ہیں۔ جب وہ ہو چکے۔ اگر اس کی تکمیل کے مراحل میں ان کی مرضی کے خلاف کچھ ہو تو اسے قطعی نہیں برداشت کرتے۔ ہم لوگ بہت سے مسائل میں اس لئے مایوس ہو جاتے ہیں کہ ہمیں تعاون نہیں ملتا لیکن میرا نظریہ مختلف ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ٹھیک ہے۔ دنیا سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے جو کرنا ہے کر ڈالو۔ چنانچہ میں نے آبادیوں کی گھما گھمی سے دور ان کھنڈرات کا انتخاب کیا اور یہاں اپنی تجربہ گاہ قائم کی مجھے زیادہ معاونوں کی ضرورت بھی نہ تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے طور پر کام شروع کر دیا۔ میرے ساتھ میری بچی نیلم بھی تھی۔ یہی میری معاون اور یہی میری اسسٹنٹ، جو بھی سمجھو۔ میں نے اپنا کام شروع کر دیا لیکن مسئلہ وہی تھا انسانی آنکھوں کی ضرورت۔

میں نے ایسے انسانوں کا انتخاب کیا جو دنیا کی سرد مہری سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ معاشی مسائل نے انہیں خودکشی کی منزل تک لا پھینکا تھا۔ وہ مر جانا چاہتے تھے۔ تب میں نے ان سے سودا کیا۔ میں نے ان سے ان کی آنکھیں خرید لیں بھاری رقم کے عوض۔ اس دولت نے ان کے بچوں کے لئے اچھے مستقبل مہیا کر دیے اور میں نے ان

کی زندگی بھی نہ برباد ہونے دی۔ میں نے انہیں اپنے پاس بلالیا اور اب وہ دونوں میرے معاون ہیں۔ تم سمجھ گئے ہو گے اور اس کے بعد مسٹر نادر، اس کے بعد میں نے اپنی آنکھیں بھی تجربے کی نذر کر دیں۔ میں اپنے کام میں اس سے زیادہ مخلص نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے بتاؤ فلاح انسانیت کے لئے اس سے بڑی قربانی اور کیا دی جا سکتی ہے کہ میں نے اپنی کائنات تاریک کر لی۔ اب بھی لوگ میرے خلوص پر شک کریں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس کے لئے مجھے کسی چیز کی ضرورت پیش آئے تو میں وقت ضائع نہ کروں۔ سوائے اس کے کہ جائز ذریعوں کی تلاش میں وقت ضائع نہ کروں اور یہی ہوا تھا۔ میں نے شہر جا کر ایک انسان کو قتل کر دیا تھا اور پھر اس کی آنکھیں نکال لی تھیں۔ لیکن اس جرم میں پکڑا گیا۔ دنیا کو تو میں نے اصلیت کی ہوا نہ لگنے دی۔ ہاں مجھے سزائے موت ضرور سنا دی گئی۔ نکلنا تو تھا ہی میں نے سوچا کوئی ساتھی بھی مل جائے سو میں نے تمہارا انتخاب کیا۔ اور تمہیں یہاں لے آیا۔ اب دیکھو نا میرے دو دو کام ہو گئے۔ ایک ساتھی بھی مل گیا اور اپنے تجربے کے لئے دو آنکھیں بھی۔

''کیا مطلب؟'' میں پھر اچھل پڑا۔

''انسانیت کی فلاح کے لئے میرے دوست۔''

''کیا بکواس ہے یہ؟'' میرے بدن میں خوف کی لہریں دوڑ گئیں۔

''تھوڑی سی فراخ دلی سے کام لو۔ غور تو کرو۔ اگر تمہاری آنکھیں میرے تجربے کا آخری دور پورا کر سکیں تو اس سے سینکڑوں ایسے لوگوں کو روشنی مل جائے گی جنہوں نے کبھی دنیا نہیں دیکھی۔ کائنات کی سب سے انمول شے بینائی۔ جس سے وہ محروم ہیں۔ تمہاری آنکھیں ان کے درد کا درمان بن جائیں تو اس سے بڑی نیکی اور کیا ہو سکتی ہے۔''

''نہیں۔ نہیں۔ میں تمہاری بات نہیں مان سکتا۔''

''کیوں۔ آخر کیوں؟ تم تو سزائے موت کے مجرم تھے۔ تم تو موت اپنا چکے تھے۔ پھر اگر میں تمہاری زندگی میں تھوڑا سا خلا پیدا کر رہا ہوں تو تم اس قدر منحرف کیوں ہو؟ خود کو اس تجربے کے لئے وقف کر دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر کامیاب ہو گیا تو تعاون کرنے والوں میں تمہارا نام کبھی نظر انداز نہیں کروں گا۔ تم بھی محسن انسانیت کہلاؤ گے۔''

''لیکن آنکھوں کے بغیر زندگی کا تصور بے حد بھیانک ہے۔''

''تم ہمیشہ اندھے نہیں رہو گے میرے دوست تمہاری بینائی واپس مل جائے گی۔ تم نے دیکھا کہ میں خود بھی اس کیفیت میں ہوں۔ ہمارا تجربہ ہماری آنکھوں کے ان دو گڑھوں کو دو خوبصورت اور روشن آنکھوں سے پُر کر دے گا۔''

بوڑھے کی آواز میری سماعت پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں متحیر بھی تھا۔ بھلا یہ اندھا بوڑھا تجربات کیسے کر رہا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں۔ بھی داؤ پر لگا دی ہیں۔ کیسی انوکھی بات ہے۔''

''تم نے اب تک ایک دلیر انسان ہونے کا ثبوت دیا ہے نادر۔ میں چاہتا ہوں تم اب بھی اسی انداز سے پیش آؤ اور خوشی خوشی اپنی آنکھوں کا عطیہ پیش کر دو۔ تم یہاں رہو گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم تینوں کو سب سے پہلے آنکھیں واپس کروں گا۔''

میں اس کی بات پر غور کرنے لگا۔ یہ سب کچھ بے حد عجیب تھا۔ آنکھیں کھونے کا تصور بڑا اذیت ناک تھا۔ بھلا آنکھوں کے بغیر زندگی کو بھی زندگی کہا جا سکتا ہے۔ بوڑھا پاگل کیا ضروری ہے کہ اپنے تجربات میں کامیاب رہے۔ وہ دونوں بے چارے اندھے جو زندگی گزار رہے تھے وہ افسوس ناک تھی۔ نہ جانے انہیں کب تک انتظار کرنا پڑے اور بوڑھا کامیاب ہو یا نہ ہو۔''

''تم نے کیا سوچا ہے؟'' بوڑھے کی آواز ابھری۔

''کیا تم مجھے سوچنے کا موقع دو گے۔''

''فیصلے لمحوں میں کئے جانے چاہئیں۔ ان کے لئے وقت درکار نہیں ہوتا۔''

''لیکن یہ فیصلہ'' میں نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

''نادر خان۔'' میں نے تمہیں جس انداز میں پایا تھا اس کے لئے میں نے سوچا تھا کہ تم جیسا دلیر انسان زندگی کی پروا نہیں کرے گا۔ کیوں نہ تم خود کو مردہ ہی تصور کرو۔''

''تب میں تمہیں رائے دیتا ہوں میرے دوست کہ پہلے مجھے ختم کر دو اور اس کے بعد میری آنکھیں نکال لو۔''

''نہیں۔ تم اس قدر مایوس نہ ہو۔ ایک وعدہ تم سے کرتا ہوں کہ جب تم دنیا دیکھنا چاہو گے، دیکھ سکو گے۔ وقتی طور پر سہی۔ مصنوعی طور پر سہی۔''

''میں نہیں سمجھا۔'' میں نے کہا۔

''سمجھنے کی کوشش کرو بھی نہیں۔''

''لیکن تم مجھے تھوڑا سا وقت تو دو۔ تم نے مجھے باندھ کیوں دیا ہے؟''

''نہیں نادر۔ میں اپنی سانسوں کے بارے میں بھی کیا کہہ سکتا ہوں۔ موت کا تو کوئی تعین نہیں ہوتا۔ جب بھی آ جائے۔ پھر ہم انتظار میں کیوں وقت ضائع کریں۔ جو کام کرنا ہے جلد از جلد کر لیا جائے۔''

’’بکواس مت کرو۔ مجھے کھول دو۔‘‘

’’ہرگز نہیں دوست، ہرگز نہیں۔ تم اس خوبصورت موقع کو ضائع کرنے کا مشورہ دے رہے ہو۔ میری زندگی میں یہ آپریشن بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بہتر تھا کہ تم رضاکارانہ طور پر خود کو اس کے لئے پیش کر دیتے لیکن تم اتنے فراخدل نہیں ہو، جتنا میں سمجھتا تھا۔ مجھے اجازت دو کہ میں اپنا کام شروع کروں۔ اس کا چہرہ میرے سامنے سے ہٹ گیا۔

میں بری طرح بدحواس ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ تو توقع کے بالکل خلاف تھا۔ ظاہر ہے میں بزدل انسان نہیں تھا۔ میں نے موت کو گلے لگا لیا تھا لیکن اس وقت جب زندگی سے محبت ہوئی تو یہ تکلیف دہ دور شروع ہو گیا۔ آنکھوں کے بغیر تو کچھ نہیں۔ اندھا رہ کر زندہ رہنے سے کیا فائدہ۔ اور اب جبکہ یہ بوڑھا خبیث اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے بدترین لمحات سے آشنا کرنے والا تھا تو میں ہر قیمت پر اس سے بچاؤ چاہتا تھا۔ میں نے اپنے بدن کے گرد کسی ہوئی بندشوں کو توڑنے کے لئے جدوجہد کی لیکن خبیث اور طاقتور بوڑھے نے جس طرح مجھے باندھا تھا، اس سے نکلنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ نہ جانے میرے بدن کے کون کون سے حصوں پر زخم آئے لیکن میں اس وقت تک جدوجہد کرتا رہا جب تک سکت رہی۔ پھر میرا ذہن جواب دینے لگا۔ بوڑھا کمبخت نہ جانے کون سے کاموں میں مصروف تھا۔

پھر نیم غنودگی کی کیفیت میں ہی میں نے اپنے بازو میں انجکشن کی چبھن محسوس کی۔ ہلکی سی ہی میرے منہ سے نکلی اور اس کے بعد کی کیفیت عجیب تھی۔ پتا نہیں جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا۔ آوازیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ لیکن ذہن ان کے بارے میں سوچنے سے قاصر تھا۔ ہاں البتہ جب مکمل طور پر ہوش آیا تو رات ہو چکی تھی۔

رات۔ یہ کیسی رات تھی۔ میں نے سوچا پھر بوڑھا شہباز یاد آ گیا اور میں نے اپنے ہاتھوں میں اینٹھن محسوس کی۔ ایک بار پھر میں نے بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ لیکن بندشیں تو اب میرے گرد نہیں تھیں۔ سر بھی ہلا سکتا تھا۔ ہاتھ پاؤں بھی ہلا سکتا تھا۔ شاید رات کا آخری پہر ہے ورنہ اس قدر گھور تاریکی...... میں نے پلکیں جھپکانے کی کوشش کی اور اچانک میری گھگی بندھ گئی۔

’’آہ۔ یہ کیا ہے۔ میری پلکیں آنکھوں کے ان ڈیلوں کو محسوس تو نہیں کر رہی تھیں جن میں بینائی ہوتی ہے۔ دہشت زدہ ہو کر میں نے دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو ٹٹولا اور آنکھوں کے

> سلمان: جوس والے سے۔ ’’جلدی سے جوس کا ایک گلاس بنا دو میرا جھگڑا ہونے والا ہے۔‘‘ جوس کا گلاس پی کر سلمان نے پھر کہا۔ ’’ایک اور گلاس بنا دو میرا جھگڑا ہونے والا ہے۔‘‘ ایک بار پھر سلمان نے جوس والے سے کہا۔ ’’ایک گلاس اور جوس بنا دو میرا جھگڑا ہونے والا ہے۔‘‘ جوس والا تنگ آ کر بولا۔
>
> ’’آخر کس سے جھگڑا ہونے والا ہے؟‘‘
>
> سلمان: ’’تم سے۔‘‘
>
> جوس والا: ’’کیوں؟‘‘
>
> سلمان: ’’کیونکہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

گڑھوں میں خون کی چپچپاہٹ میری انگلیوں سے ٹکرائی اور پھر میرے حلق سے جو آواز نکلی، وہ بڑی دہشت ناک تھی۔

’’نہیں نہیں۔ یہ۔ یہ کیا کیا تو نے کتے۔ شہباز۔ شہباز کتے۔ میں تجھے جان سے مار دوں گا۔ آہ میری آنکھیں۔ میری آنکھیں۔‘‘

میرے دماغ میں شعلے بھڑک چلے تھے۔ میں طوفان کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا۔ جو چیز میرے سامنے آئی میں اسے نیست و نابود کرنے پر تل گیا۔ شیشے ٹوٹنے کی آوازیں میز کرسیوں کا شور اور پھر میں سامنے کی دیوار سے ٹکرایا۔ اور اسے ٹٹول ٹٹول کر دروازے تک پہنچ گیا۔ میرے بدن میں اس وقت بے پناہ قوت تھی۔ میں نے دروازے کو جھنجھوڑ ڈالا اور پھر بدن کی ٹکروں نے دروازہ توڑ دیا۔

’’شہباز۔ شہباز۔ تو کہاں ہے؟ میرے سامنے آ کتے۔ تو نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میری آنکھیں مجھے واپس دے دے۔ میں کہتا ہوں میری آنکھیں مجھے واپس دے دے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ میں تجھے ایسی موت ماروں گا کہ تو سوچ بھی نہ سکے گا۔‘‘ دفعتاً میں نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی اور اوندھے منہ نیچے گر گیا۔ میرا سر زور سے کسی پتھر سے ٹکرایا اور ذہن پھر تاریکیوں میں کھو گیا۔ نجانے کب تک، نہ جانے کب تک۔ لیکن زندگی تھی تو ہوش بھی آ گیا اور ذہن جاگا تو کسی کے گفتگو کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اس طرف کان لگا دیئے۔

آہ۔ یہ اس ذلیل بوڑھے کی آواز تھی، کسی سے کہہ رہا تھا۔

’’نہیں۔ اسے پائپ سے خوراک دو، ابھی وہ ہوش میں نہیں آنا چاہیے۔ ابھی اس کا ہوش میں آنا کسی بھی حالت میں

ٹھیک نہیں۔“

”بہت بہتر جناب۔“ دوسرے شخص کی آواز سنائی دی اور پھر کوئی مجھے نزدیک آتا محسوس ہوا۔ میرے دانت ایک دوسرے پر بھنچ گئے۔ میں نے اس کے قدموں کی چاپ کو محسوس کیا اور جونہی آنے والا میرے قریب آیا میری دونوں ٹانگیں پوری قوت سے اس کے منہ پر پڑیں اور وہ ایک بے ساختہ چیخ کے ساتھ شاید دوسری طرف الٹ گیا۔

میں پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔ درحقیقت آنکھوں کے خالی حلقوں میں کوئی تکلیف نہیں محسوس ہو رہی تھیں۔ بوڑھے کتے نے میری آنکھیں نکال کر کوئی ایسی دوا ان حلقوں میں لگا دی تھی جس سے تکلیف کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بدن میں توانائی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ تب ہی میں نے بوڑھے شہباز کی آواز سنی۔

”اوہ۔ کیا ہوا، کیا تم ٹھیک ہو؟“

”نہیں جناب۔ شاید وہ ہوش میں آ گیا ہے۔“

”اوہ۔ شہباز نے مخصوص انداز میں منہ اٹھا کر فضا میں سونگھنے کی کوشش کی اور پھر اس نے مجھے آواز دی۔

”نادر خان۔ کیا کیا ہے تم نے؟“

”میرے نزدیک آ کتے۔ دھوکے باز۔ کیا تو مجھے اس لئے جیل سے نکال کر لایا تھا۔ دیکھ سن، میری آنکھیں مجھے واپس کر دے۔ ورنہ میں تجھے کتے کی موت مار دوں گا۔ میں دونوں ہاتھ خلا میں نچاتے ہوئے کہا۔ تب اچانک میرے ہاتھ کسی کے جسم سے ٹکرائے اور میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ یہ بوڑھا شہباز ہی تھا۔

”کتے۔ کتے۔ میں نے اس کی گردن ٹٹولی اور اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ تب بوڑھے شہباز کے چوڑے ہاتھ میری کلائیوں پر آ جمے اور اس نے نہایت اطمینان سے اپنی گردن سے میری گرفت چھڑا لی۔

”نادر خان۔ میں آخری بار کہہ رہا ہوں، ہوش میں آ جاؤ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ ایک خوبصورت مستقبل کے لئے تم تھوڑے سے عرصے کے لئے تاریکی برداشت کر لو۔“

”میں۔ میں تجھے مار ڈالوں گا۔“ میں نے دانت بھینچ کر اس کا لباس کھینچا۔

”اچھا تو مار ڈالو“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ اور میں اپنی جدوجہد کرنے لگا لیکن جیل کی موٹی سلاخوں کو موم کی طرح توڑ دینے والا زمین میں ایک فٹ گہرے گڑھے ہوئے آہنی جنگلے کو اکھاڑ پھینکنے والا میرے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرے دونوں بازو پکڑ لئے اور دوسرا ہاتھ میری کمر میں ڈال کر مجھے اٹھایا اور کندھے پر ڈال لیا اور پھر نہایت اطمینان سے بستر پر لا پٹخا۔

”اگر تم شرافت سے باز نہ آئے تو اب تمہارے ساتھ برا سلوک کیا جائے گا۔ تمہاری آنکھوں کے گڑھوں میں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ یہ میں جانتا ہوں اور اب بہتر یہی ہے کہ تم مجھ سے تعاون کرو اور اگر تم نے تعاون نہ کیا تو پھر یہی ہو گا کہ میں تمہیں کسی بھری پری بستی میں چھوڑ آؤں گا۔ اور پھر تم ایک اندھے کی حیثیت سے بھیک مانگنے کے سوا کچھ نہیں کر سکو گے۔“

بوڑھے نے اس طرح میری جدوجہد کو ناکام بنا دیا تھا، اس سے یہ احساس تو یقین پا گیا تھا کہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ چنانچہ میرا دل چاہا کہ بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑوں کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کر رہا تھا لیکن یہ بہرحال شان مردانگی کے خلاف تھا۔ چنانچہ دل مسوس کر رہ گیا۔ چند ساعت خاموشی رہی۔ پھر شہباز کی آواز سنائی دی۔

”اگر تم نے فیصلہ اثبات میں کیا ہے تو مجھے بتا دو اور اگر تم اب بھی کوئی غلط حرکت کرنا چاہتے ہو تو ظاہر ہے تمہاری جدوجہد تمہیں آنکھیں واپس نہیں دے سکے گی۔ سوائے اس کے کہ میں تمہیں عدم تعاون کرنے والوں میں شمار کروں گا۔“ پھر دروازے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ سب باہر چلے گئے تھے۔

کئی دن مزید گزر گئے۔ اب یہاں رہنا میں نے اپنی عادت بنا لی تھی۔ چہل قدمی بھی کر لیتا تھا۔ لیکن اس ویرانے سے باہر جانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ آنکھیں کھونے کے تقریباً ایک ماہ بعد کی بات ہے کہ ایک شام میں عمارت کے ایک حصے میں ایک ابھرے ہوئے پتھر پر بیٹھا تھا۔ خاموش اور سوچ میں گم۔ میری زندگی میں جو ویرانے در آئے تھے ان سے بغاوت تو اس زندگی میں ممکن نہیں تھی۔ موت چونکہ میرا مقدر بن چکی تھی اور میں تقدیر کے خلاف زندگی کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ اس لئے مجھے اس دوڑ کی سزا مل رہی تھی۔ دفعتاً مجھے اپنی پشت پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں چونک پڑا۔ ہو گا کوئی۔ میں نے بے پروائی سے سوچا اور پھر مجھے اپنے قریب وہی نسوانی آواز سنائی دی۔ جو میں پہلے بھی سن چکا تھا۔

”ارے تم یہیں موجود ہو؟“ اس نے کہا اور پھر وہ شاید میرے لئے سامنے آ گئی۔ دوسرے لمحے اس کے حلق سے ایک بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

"نہیں۔ نہیں آہ، نہیں۔" وہ شاید میرے لئے رو پڑی تھی۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ آہ! یہ کیا ہو گیا۔" اس نے میرے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر میرا رخ اپنی جانب کر لیا اور پھر بے اختیار مجھے سینے سے بھینچ لیا۔ بڑی بے اختیارانہ کیفیت تھی۔ اس کے انداز میں، میں نے بھی تعرض نہ کیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رونے کے درمیان وہ کہتی جا رہی تھی۔ "کہا تھا میں نے تم سے بھاگ جاؤ۔ لیکن نہ سنی تم نے۔ پاگل سمجھا تھا نا۔ دوسروں کی مانند، کیوں نہیں گئے بتاؤ۔ کیوں نہیں چلے گئے یہاں سے؟" وہ روتی رہی۔

درحقیقت میرے ذہن میں اب اس کی باتیں آ رہی تھیں۔ بلاشبہ اس نے مجھ سے چلے جانے کے لئے کہا تھا۔ لیکن شہباز نے اسے پاگل قرار دے دیا تھا اور اس وقت میں نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، اس نے شاید میرا چہرہ اپنے چہرے کے مقابل کیا۔ مجھے دیکھتی رہی اور پھر غمزدہ لہجے میں بولی۔

"آہ۔ کس قدر بدنما کر دیا تمہارا چہرہ۔ کیسی حسین آنکھیں تھیں۔ لیکن اب کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔ بتاؤ اب تمہارے لئے کیا کروں؟"

"شکریہ نیلم۔ تمہاری ہمدردی نے مجھے کافی سکون بخشا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"نہیں۔ لیکن میرا سکون ختم ہو گیا ہے۔ پپا نے جو کچھ کیا ہے اور جو کچھ کرتے رہے ہیں وہ مجھے سب ناپسند تھا لیکن انہوں نے یہ جو کیا اس پر۔ اس پر میں انہیں معاف نہیں کر سکتی۔" اس نے مسلسل روتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اس بارے میں کچھ معلوم ہے نیلم؟"

"کس بارے میں۔؟"

"جو کچھ تمہارے پپا کرتے ہیں۔"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔"

"کیا تم نے کبھی ان سے اس بات پر اختلاف کیا ہے؟"

"ہاں۔ میں سخت احتجاج کرتی رہی ہوں۔"

"ظاہر ہے شہباز نے تمہاری بات قبول نہیں کی ہوگی۔"

"ہاں پپا بہت سنگدل ہیں۔ لیکن انہوں۔ نے تمہارے ساتھ جو کیا ہے۔ اس پر میں انہیں معاف نہیں کروں گی۔" وہ پھر رونے لگی اور میرے ذہن میں ایک نئے خیال نے جنم لیا۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس لڑکی کو آلہ کار بنایا جائے اور اس سے شہباز کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں۔ میں شہباز سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کم بخت نے میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ بے حد بھیانک تھا۔ میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن اب اگر یہ لڑکی مجھ سے تعاون پر آمادہ ہو جائے تو شاید اس بوڑھے خبیث کے خلاف کچھ کر سکوں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ متاثر ہے ورنہ کس کے لئے آنکھوں میں آنسو کہاں آتے ہیں؟

"نیلم۔ تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے نا؟"

"ہاں۔ میں تم سے متاثر ہوں۔ ان سارے دنوں میں مسلسل کوشش کرتی رہی کہ کسی طرح اگر مجھے قید سے رہائی مل جائے تو میں تم سے ملاقات کروں لیکن مشکل ہو گیا تھا۔ آج بڑی مشکل سے ملازم کو دھوکا دے کر بھاگی ہوں۔ اسے پتا بھی نہیں چل سکا۔ کھانا دینے کے بعد اس نے میرے قید خانے کا دروازہ حسب معمول بند کر دیا۔ یہ معلوم کئے بغیر کہ میں چپ چاپ دروازے سے باہر نکل آئی ہوں۔ اس کے بعد تمہیں تلاش کرتی رہی اور بڑی دیر سے تلاش کر رہی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔" اس نے پھر ایک سسکی لی اور میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تو کیا تمہیں قید رکھا جاتا ہے۔؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ مجھے پپا کے کام سے اختلاف ہے۔ میں نے ان سے کھل کر کہہ دیا تھا کہ میں یہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ اس پر انہوں نے مجھے پاگل قرار دے کر قید کر دیا۔"

"اوہ۔ تو شہباز بے حد سنگدل ہے۔" میں نے کہا۔

"تم پپا کے چنگل میں کیسے پھنس گئے تھے؟" اس نے پوچھا اور میں نے کہا مختصراً اپنی کہانی سنا دی۔

"اوہ۔ تو پپا اتنے دن تک جو غائب رہے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حکومت کی قید میں تھے لیکن ان کے بارے میں لوگوں کو معلومات نہیں ہو سکی ہونگی کہ وہ کون ہیں ورنہ اس حادثے کی نوعیت بدلی ہوئی ہوتی۔"

"لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔ شہباز نے اپنی آنکھیں کیوں گنوا دیں۔"

"پپا بے حد جذباتی انسان ہیں۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ وہ اپنے کام میں مخلص ہیں لیکن ان کی یہ جذباتیت شدت پسندی کی حدود میں داخل ہو گئی ہے۔ تم غور کرو کہ اگر وہ اپنے

تجربے میں کامیاب ہیں تو دنیا کو کیا مل جائے گا۔ کیا ساری دنیا سے اندھوں کا وجود نہیں ختم ہو جائے گا۔ وہ لوگ جو کائنات میں رہ کر حسین کائنات کی دید سے محروم ہیں، کیا وہ خود کو ایک نئی دنیا میں نہیں محسوس کریں گے۔ اس کے بعد ان کے دلوں میں پپا کی کیا حیثیت ہوگی، کیا احترام ہوگا۔ اس کا اندازہ تم خود کر سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے مجھے اعتراف ہے لیکن بات ان کی آنکھوں کی تھی۔"

جب انہیں کوئی نہ ملا تو انہوں نے خود اپنی آنکھیں اپنے تجربے کی نذر کر دیں۔ یہ ان کے اس جذبے کی انتہا ہے کیا تم اس کا اعتراف نہیں کرو گے؟"

"میں اسے دیوانگی قرار دیتا ہوں۔"

"نہیں ڈیئر۔ تم اسے دیوانگی نہیں کہہ سکتے۔ دنیا کے ہر بڑے آدمی کو دیوانہ ہی قرار دیا گیا ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ پپا کا مقصد کیا ہے۔ بے نور دنیا کو روشنی دینے کے لئے انہوں نے اپنی دنیا تاریک کر لی ہے۔ یہ جذبے انہی دیوانوں کے ہوتے ہیں، جنہوں نے دنیا کو لاتعداد سہولتیں فراہم کیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہر جذبے کی تکمیل کے لئے بعض اوقات مجرمانہ حیثیت اختیار کرنا پڑتی ہے۔ میں تمہیں ایسی بے شمار مثالیں دے سکتی ہوں۔"

"میں تم سے متفق نہیں ہوں نیلم۔ بے شک کسی نیک جذبے کی تکمیل کے لئے کام کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ جو خوشی سے اس کام کے لئے آمادہ نہیں ہوتے انہیں کیوں مجبور کیا جاتا ہے، میں جو کچھ بھی تھا، جیسی بھی زندگی گزار رہا تھا۔ کم از کم اس دنیا سے شناسائی تو تھی۔ کم از کم اپنی زندگی تو جی رہا تھا۔ میری دنیا تاریک کر کے اس دیوانے وحشی نے میرے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔ کاش میں اس سے انتقام لے سکتا۔" نیلم خاموش رہی۔ اور اس کے بعد اس نے کہا۔

"میں خود بھی تمہارے لئے غمزدہ ہوں۔ تم تھوڑا سا توقف کرو۔ میں دیکھوں گی کہ میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں۔ ویسے میں ایک بات کہے بغیر نہ رہ سکوں گی۔ پپا اپنے جذبات میں صادق ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے عالم جنون میں غلط راستے اختیار کر لئے ہیں۔ دعا کرو کہ پپا اپنے تجربے میں کامیاب ہو جائیں اور دنیا ان کی یہ برتری تسلیم کر لے۔ آج کچھ چراغ گل ہوئے ہیں لیکن آنے والی کل لاکھوں چراغ روشن کر دے گی اور اس کے بعد لوگ پپا کے مجسمے بنائیں گے۔ ان کی پوجا کریں گے۔ انہیں دنیا کا عظیم محقق قرار دیں گے۔ شہرت کے حصول، نیک نامی کی طلب ہر دل میں ہوتی ہے۔ ہر انسان اپنے لئے ایک منفرد مقام چاہتا ہے۔ لیکن صرف اپنے آپ کے لئے سب کچھ کر لینا۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی دنیا کو کچھ دے جائے تو اس کے بارے میں سوچو بیشک تمہیں ذہنی اذیت سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ میں خود بھی تمہارے لئے غمزدہ ہوں لیکن ایک دن پپا کی برتری ضرور تسلیم کی جائے گی اور اس وقت ان کی تمام مجرمانہ کارروائیوں کو نیک نیتی سمجھا جائے گا۔ اس دنیا کا یہی اصول ہے۔ لوگ لینا پسند کرتے ہیں کوئی دینا نہیں چاہتے۔ سب اپنے لئے جی رہے ہیں۔ دوسروں کے لئے جینے کی باتیں صرف کتابوں اور اخبارات کے لئے محدود ہیں۔"

"تم مجھے جاہلانہ انداز میں قائل کرنے کی کوشش مت کرو۔ میرا کیا قصور تھا، جیسے بھی جیتا یا مر جاتا لیکن میری زندگی اس طرح تاریک نہ ہوتی۔ میں اب اندھوں کی طرح اس دنیا میں بھٹکتا رہوں گا۔ آہ، اس سے تو موت ہی بہتر تھی۔ میری آواز گلوگیر ہوگئی۔ اس کے بعد مجھے نیلم کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور پھر وہ شاید چلی گئی میں اندھوں کی طرح ٹٹولتا ہوا ایک مسہری پر آ بیٹھا۔ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ان حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا جو جیل میں بسر ہو رہے تھے۔ قید پوری ہو جاتی، زندگی ختم ہو جاتی تو زیادہ بہتر تھا۔ سزائے موت دی جاتی مجھے۔ میں نے خود بھی تو کچھ انسانوں کو زندگی سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن وہ ایک الگ جذبہ تھا۔ موت آ جاتی تو کم از کم زندگی کی یہ تاریکیاں تو چھٹ جاتیں۔ غور کیا تو اندازہ ہوا کہ ایک طرح سے اس شخص کا کہنا درست ہی ہے۔ سزائے موت کا قیدی تھا میں۔ جیل نہ ٹوٹتی اور وہ مجھے لے کر فرار نہ ہوتا تو ظاہر ہے موت میرا استقبال کرتی۔ وہ موت بہتر تھی یا یہ تاریک زندگی، کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا میں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ زندگی بہرحال جو فیصلے کرتی ہے وہ تقدیر کے فیصلے ہی ہوتے ہیں۔ تقدیر میں یہ تاریک زندگی لکھی تھی تو اب کیا جا سکتا ہے، اسے اپنانا ہی پڑے گا۔ چنانچہ تن بہ تقدیر ہو گیا۔ میری آنکھیں نکال لی گئی تھیں لیکن میری بقیہ زندگی کو سنبھالنے کے دعوے کیے گئے تھے۔ پتا نہیں ان دعوؤں میں کیا حقیقت ہے۔ اسی دن اس کم بخت سے ملاقات ہوئی۔ چہکتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہیلو۔ کیسے حال ہیں تمہارے؟"

"تم نے جو احسان مجھ پر کیا ہے بس اس کی اذیت کا شکار ہوں۔"

غشی

تین دوست کھڑے باتیں کررہے تھے ایک نے کہا۔
''یارو عجیب اتفاق ہے میری بیوی نے ایک ناول پڑھا جس کا نام تھا ''دو فرشتے'' اور پرسوں اس نے دو بچوں کو جنم دیا ہے۔''
دوسرے نے چونک کر کہا۔ ''اور یہی کچھ میرے گھر ہوا ہے۔ میری بیوی نے ایک ناول پڑھا۔ ''تین تو پچی'' اور میرے ہاں اکٹھے تین بچے پیدا ہوئے۔''
تیسرا دوست غش کھا کر گر پڑا۔ اسے بصد مشکل ہوش میں لا کر غشی کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے کہا۔
''پرسوں میری بیوی نے جو کتاب پڑھ رہی تھی اس کا نام ہے ''علی بابا چالیس چور۔''

''بار بار ایک جملہ دہراتے ہوئے مجھے خود بھی افسوس ہوتا ہے۔ تم اس وقت کا انتظار کیوں نہیں کرتے جب ہم اس دنیا کے سامنے آئیں گے۔ اپنی ان کوششوں کا اعلان کریں گے اور اس وقت اگر ہم دنیا کو یہ بھی بتائیں گے کہ ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے جیل میں بغاوت کرا کر جیل توڑی تھی اور وہاں سے نکل بھاگے تھے۔ تو لوگ ہمارے اس اقدام کو جائز قرار دیں گے۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتے میرے دوست کہ یہ دنیا بہت خود غرض ہے۔ اور اس سے کچھ لو تو یوں سمجھ لو کہ تمہیں کچھ نہیں دے گی لیکن اگر اس کے سامنے کچھ پیش کر دو تو یہ تمہارے قدموں کی دھول بننا پسند کرے گی۔ میں دکھی انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے اس تجربے کے بارے میں تمہیں تفصیل بتا چکا ہوں۔ دراصل میں کوشش کر رہا ہوں کہ ہر قسم کے نابینا انسانوں کو بینائی دوں۔ انہیں زندگی کے اندھیروں سے باہر نکال لوں۔ میری اس ایجاد سے پیدائشی اندھے بھی درست ہو سکتے ہیں اور تم خود سوچو کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ دنیا ہماری پوجا کرے گی۔ وہ جنہوں نے اس دنیا میں آنے کے بعد اس دنیا کا ایک رنگ بھی نہیں دیکھا، اپنی آنکھوں سے اس کائنات کو دیکھیں گے تو سرشار ہو جائیں گے۔ تمہاری تھوڑی سی تکلیف کتنے لوگوں کو زندگی کی لطافتوں سے ہمکنار کرے گی۔ اگر تو اسی جذبے کو اپنے سینے میں بسا لو تو امر ہو جاؤ گے۔'' میں ڈاکٹر شہباز کی باتیں سنتا رہا۔ ان باتوں میں بڑی مٹھاس تھی۔ بڑی سچائی تھی۔ لیکن اس بڑی سچائی کو میں کیسے نظر انداز کرتا جو میری اپنی دنیا میں تاریکی بن کر پھیل گئی تھی۔
ڈاکٹر شہباز نے کہا۔
''تمہاری آنکھوں کو میں نے استعمال کر لیا ہے لیکن بدنصیبی ہے میری کہ میں تھوڑا سا پیچھے رہ گیا ہوں۔ بہت تھوڑا سا۔ بس آخری تجربہ رہ گیا میرا۔ آخری تجربہ اور اس کے بعد میں دعوے سے کہتا ہوں کہ میں اپنے اس تجربے کی تکمیل کر لوں گا۔ اور میرے دوست ایک بات کا وعدہ میں تم سے کرتا ہوں کہ سب سے پہلی بینائی میں تمہیں دوں گا۔ سمجھے تمہاری آنکھیں اس طرح ہو جائیں گی جیسے نوزائیدہ بچہ پہلی بار اس دنیا کو دیکھتا ہے۔ اور اس کے بعد تم مجھ سے اپنی تمام نفرت بھول جاؤ گے۔ بس تھوڑا سا موقع مجھے اور دے دو۔ بہت تھوڑا سا۔ میں خاموشی سے ڈاکٹر شہباز کی باتیں سنتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔
''تو اس کیلئے تم کسی اور انسان کو روشنی سے محروم کرو گے؟''
''میرے اس نیک جذبوں کے جواب میں اتنا تلخ جملہ مت استعمال کرو۔ بہرحال مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ تم میرے بارے میں کس انداز سے سوچ رہے ہو۔ ہاں ایک اور انسان کو تاریکیوں کی ضرورت ہے تاکہ اس کے بعد تاریکیوں کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ میں تم سے صرف ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ خاموشی اور سکون سے یہاں زندگی بسر کرنا۔ یہاں سے نکلنے کی ہر کوشش بے مقصد ثابت ہوگی۔ میں نے آنکھوں سے محروم ہونے کے بعد اس دنیا کو زیادہ قریب سے پہچانا ہے اور تم نے دیکھا کہ میں لاکھوں بیناؤں سے زیادہ بہتر ہوں۔ میرا تجربہ مکمل ہو جائے اس کے بعد تم سب کا قرض واپس کر دوں گا۔ میں جا رہا ہوں لیکن اس امید کے ساتھ کہ تم مجھ سے تعاون کرو گے۔'' میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ڈاکٹر شہباز چلا گیا۔ اور وقت گزرنے لگا۔
میں نے دنیا کے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا۔ نہ جانے کیا کیا، اس دوران مجھے یہ احساس بھی ہوا تھا کہ زندگی بڑی بے وقعت شے ہے۔ معاف کر دینے میں جو لذت ہے وہ انتقام لینے میں نہیں لیکن انسان دیر سے سوچنے کا عادی ہوتا ہے۔
کسی کے قدموں کی چاپ سن کر میں چونک پڑا۔ ''کون ہے؟'' میں نے پکارا۔
''میں۔'' آواز نیلم کی تھی۔
''اوہ نیلم۔ کہاں تھیں تم؟''
''مجھے یاد کر رہے تھے؟''

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں۔ اپنی اس بے نور زندگی میں تمہاری روشنی کا تصور کر لیتا ہوں تو۔" میری آواز رندھ گئی۔

"آؤ۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"آؤ چہل قدمی کرتے ہیں۔" وہ آگے بڑھتی ہوئی بولی اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ دیر تک وہ مجھے سہارا دیئے سیر کراتی رہی پھر ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ "کافی پیو گے؟" اس نے پوچھا۔

"پلا دو۔" میں نے کہا اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔ کئی منٹ کے بعد وہ کافی کی سوندھی سوندھی خوشبو کے ساتھ واپس آ گئی۔ اس نے ایک پیالی میرے سامنے رکھ دی۔ ہم دونوں خاموشی سے کافی پیتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔

"تم نے دنیا میں کسی کو چاہا ہے؟"

"میں نے؟"

"ہاں۔"

"زندگی نے مجھے۔ مجھے۔" میری زبان لڑکھڑا گئی۔ سر میں چکر سا آ گیا تھا۔

"خاموش کیوں ہو گئے؟"

"نہ جانے کیا۔ نہ جانے کیا۔" میں نے کہا لیکن زبان ساتھ نہ دے سکی۔ ہوش و حواس گم ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے بعد۔ اس کے بعد کوئی احساس نہ رہا، کچھ یاد نہ رہا۔ پھر نہ جانے کیا کیا ہوتا رہا۔ نہ جانے کیا کیا۔ میں ایک سحر کے سے عالم میں ڈوبا رہا۔ کبھی ہوش آتا تو عجیب سا محسوس ہوتا لیکن پھر بے ہوشی۔ مکمل بے ہوشی۔

پھر ایک دن، کسی نے مجھے آواز دی۔ حواس جاگ رہے تھے۔ اعصاب قابو میں تھے۔

"کون ہے؟"

"میں نیلم ہوں۔"

"نیلم......"

"ہاں۔" اس نے جواب دیا اور میں اپنی کیفیت کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر پیشانی پر ایک دباؤ کا احساس ہوا اور میرے دونوں ہاتھ اس دباؤ کو ٹٹولنے لگے۔

"یہ کیا ہے نیلم؟"

"اسے نہ چھیڑو۔ آج میں تمہاری پٹی کھولنے جا رہی ہوں۔"

"پٹی؟"

"ہاں۔ میرے لئے دعا کرو یہ میری زندگی کی پہلی کوشش ہے۔"

"میں کچھ سمجھ نہیں سکا نیلم۔"

"میں نے۔ میں نے تمہیں تمہاری آنکھیں واپس کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے آپریشن کر کے تمہاری آنکھیں دوبارہ تمہارے حلقوں میں فٹ کر دی ہیں۔ آہ کاش۔ آہ کاش، مجھے کامیابی حاصل ہو جائے۔"

"نیلم۔" میں نے بھنچی بھنچی آواز میں کہا۔

"ہاں میرے ساتھی میرے دوست نادر، شاید میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ مجھ سے تمہاری یہ بے بسی نہیں دیکھی گئی۔ میں آئی سرجن کی بیٹی ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے پاپا کے ساتھ کام کیا ہے۔ ایسے آپریشن میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ میں نے ان سے اختلاف کیا تو انہوں نے مجھ پر پابندی لگا دی اور میں ان کے کام سے الگ ہٹ گئی۔ لیکن تمہارے لئے۔ تمہارے لئے۔"

"نیلم۔"

"دعا کرو نادر میری کوشش کامیاب ہو جائے۔ دعا کرو۔" اس نے مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا اور پھر میری پٹی کھولنے لگی۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ بری طرح۔ پٹی کھل گئی۔ اور پھر میں نے پلکیں جھپکائیں۔ بے نور خلا میں آنکھیں واپس آ گئی تھیں۔ اور پھر نیلم کا چہرہ۔ ہاں میری دنیا پھر روشن ہو گئی تھی۔ میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔

"نہیں۔ خدا کے لئے جذباتی مت بنو۔ وہ دونوں یہاں موجود ہیں۔" نیلم نے خوفزدگی سے کہا۔

"نیلم۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔" میں نے مسرت کے لہجے میں کہا اور وہ مسکرا دی۔

"میرے دوست، میرے محبوب، اسے میری محبت کا تحفہ سمجھو۔" اس نے کہا اور میں نے اسے بے اختیار سینے سے بھینچ لیا۔ نیلم بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

"پپا ابھی واپس نہیں آئے! انہیں دو آنکھوں کی تلاش ہے۔ میں نے تمہاری آنکھیں ان کی تجربہ گاہ سے چرائی تھیں۔ ان کی جگہ میں نے دو ناکارہ آنکھیں محلول میں ڈبو دی تھیں۔ اس لئے وہ آخری تجربہ مکمل نہ کر سکے۔ میں نے انہیں دھوکا دیا تھا نادر۔"

"اب کیا ہو گا؟"

"کچھ نہیں تمہارے لئے میں سب کچھ چھوڑ دوں گی۔

سب کچھ، سنو نادر، پپا اگر آ بھی جائیں تو تم خود کو اندھا ظاہر کرو گے۔ اسی طرح عمل کرو گے جس طرح کرتے رہو۔ پھر ہم۔ پھر ہم موقع پا کر یہاں سے نکل جائیں گے۔ یہاں سے نکل جائیں گے۔ ہم۔"

نیلم میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ اتفاق سے اس دن ڈاکٹر شہباز واپس آ گیا۔ وہ افسردہ اور ملول تھا۔ رات کے کھانے پر وہ مجھ سے ملا۔

"میں ناکام رہا ہوں۔ کوئی نہیں مل سکا مجھے آہ، کوئی نہیں مل سکا۔ بس دو آنکھوں کی ضرورت ہے صرف دو آنکھوں کی اور اس کے بعد۔ اس کے بعد۔ مگر کیا کروں۔ میں کیا کروں۔ یہ دنیا بہت خودغرض ہے۔ وسیع تر انسانی قدرت کے لئے کوئی خود کو پیش نہیں کرتا۔ لیکن۔ لیکن۔" وہ خاموش ہو گیا۔

دوسری صبح نیلم نے کہا۔ پپا شاید پھر کسی کی تلاش میں جانے والے ہیں۔ نادر ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا۔ ہم یہاں سے نکل چلیں گے نادر۔ بولو، کیا تم مجھے اپنی زندگی میں قبول کر لو گے؟"

"تمہارے سوا اب اس کائنات میں میرا کوئی نہیں ہے نیلم، میری باقی زندگی تمہاری ہے۔"

"پپا کو میرے چلے جانے کا بہت دکھ ہوگا۔"

"ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا نیلم۔"

"میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ بس پپا کے جانے کا انتظار ہے۔" ہم دونوں پروگرام بناتے رہے۔ میری دنیا پھر سے جگمگا اٹھی تھی۔ گو باہر کی دنیا میرے لئے خطرناک تھی لیکن نیلم جیسی شریک زندگی کے ساتھ کسی گمنام گوشے میں بسر کرنا مشکل نہ ہوگا۔

میں بوڑھے شہباز کے جانے کا انتظار کرتا رہا۔ اسے میں نے ایک بار بھی شبہ نہ ہونے دیا کہ میری آنکھیں مجھے واپس مل چکی ہیں۔ اس دن نیلم کچھ مصروف تھی اس لئے پھر میری اس سے ملاقات نہ ہوئی رات کو بھی وہ نہیں آئی تھی۔ میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ جب وہ ناشتے پر بھی نہ ملی میں خود اس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ وہ کمرے میں موجود تھی۔ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔

"خیریت نیلم۔ کچھ بیمار۔" میری آواز حلق میں اٹک گئی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہاں میری منحوس آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تھا۔ وہ ناقابل یقین تھا۔ آہ۔ نیلم کے خوبصورت چہرے پر آنکھوں کی جگہ دو غار نظر آ رہے تھے۔ دو غار۔ ڈاکٹر شہباز نے اسے بھی اپنے جنون کی نذر کر دیا تھا۔

"ڈاکٹر۔ ڈاکٹر کتے۔ پاگل۔ دیوانے تو نے مردود۔ تو نے میری نیلم کو بھی نہ چھوڑا۔ تو نے جنونی کتے۔ میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔" میں پاگلوں کی طرح چیختا ہوا باہر نکل آیا۔ لوہے کی ایک وزنی راڈ مجھے مل گئی۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور لیبارٹری میں گھس گیا۔ ڈاکٹر شہباز وہاں موجود تھے۔

"کون ہے۔؟ کون چیخ رہا ہے؟"

"تو نے نیلم کی آنکھیں نکال لیں ڈاکٹر۔ تو نے۔" میں نے لوہے کی راڈ پوری قوت سے اس کے سر پر دے ماری۔ خون کا فوارہ بلند ہو گیا۔ "تو نے کتے۔ تو نے اسے۔" مجھ پر جنون سوار تھا۔ لوہے کی راڈ سے میں نے اس کا بھیجہ باہر نکال دیا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے مجھے پکڑنا چاہا۔ لیکن مجھے نہ سنبھال سکے۔ وہ دونوں بھی بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ مجھ پر خون سوار تھا۔ پھر میں نے راڈ پھینک دی۔

نیلم دروازے میں کھڑی تھی۔

"نیلم۔ نیلم۔ تم اندھی ہو گئیں نیلم۔ آہ۔ میں تو تمہیں تمہاری آنکھیں بھی نہیں دے سکتا۔"

"تم نے۔ تم نے پپا کو مار ڈالا نادر؟"

"ہاں نیلم۔ میں نے یہ کیا ہے۔ میں اس کی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔ نیلم، میری زندگی میری روح۔ کاش۔ کاش۔" میں رو پڑا۔

نیلم کھڑی رہی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"پپا کا مشن عظیم تھا نادر۔ لیکن وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے جنونی ہو گئے تھے۔ یہ ہونا تھا۔ یہ ضرور ہونا تھا۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔ جاؤ نادر۔ تمہاری دنیا تمہیں مبارک۔"

"تمہارے بغیر نیلم۔ تمہارے بغیر۔"

"نہیں نادر۔ تم میرے اندھے وجود کو کہاں گھسیٹتے پھرو گے۔ پہلے دوسری بات تھی۔ جاؤ پلیز۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ پپا کی موت کا ماتم کروں یا۔ یا۔" وہ سسک پڑی۔

"نہیں نیلم۔ میں تمہارے بغیر جینا نہیں چاہتا۔ اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو میں۔ میں ہاں نیلم میں سزائے موت کا مجرم ہوں۔ میں خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ میں اکیلا نہیں جی سکتا۔ جیوں گا تو تمہارے ساتھ ورنہ موت سے بہتر اور کوئی شے نہیں ہے میرے لئے۔ آؤ نیلم مجھے زندگی کی طرف لے چلو۔ آؤ ہم اپنے لئے ایک دنیا تلاش کریں۔"

میں نے نیلم کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ آہستہ قدموں سے میرے ساتھ چل پڑی۔

☆......☆......☆

اُن دونوں کی محبت نہایت پاکیزہ تھی لیکن زمانہ تو ایسے پریمیوں کا سدا سے دشمن رہا ہے۔ لڑکی کے بھائیوں نے بغیر کچھ دیکھے بھالے نام نہاد غیرت کے جوش میں آکر لڑکے کو قتل تو کر دیا تھا لیکن پھر جو اُن کو خمیازہ بھگتنا پڑا اُس کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

انتقام کا جنگل

ایم اے راحت

اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لیے اُس نے اپنے دین وایمان کی بھی قربانی دے دی تھی

ساون پوری کے زمیندار کے جڑواں بیٹے تھے۔ دونوں ہمشکل تو نہیں تھے لیکن دونوں کے نقوش بے حد خوبصورت تھے۔ شمیل خان اپنی جگہ ایک حسین نوجوان تھا تو شازل خان بھی اس سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ حالانکہ دونوں کی عمریں ایک تھیں لیکن شازل خان شمیل خان سے کوئی بائیس منٹ بڑا تھا اور اپنے آپ کو بڑا ہی سمجھتا تھا۔ باپ کی موت کے بعد ساری ذمہ داریاں اس نے اپنے کندھوں پر لے لی تھیں۔ لیکن اس کائنات میں شاید بھائی سے زیادہ کسی اور سے محبت نہیں کرتا تھا وہ۔ سنگانی بدستور اس کے پیچھے پڑا رہتا تھا۔

سنگانی ایک ہندو جوگی تھا جس نے مرگھٹ کے پاس اپنی جھونپڑی بنا رکھی تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ دیوالی کے دن مٹھ اڑایا کرتا ہے' اس کے علاوہ ہر طرح کے جادو ٹونے بھی کرتا ہے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے لوگ اس کے پاس گاڑیوں میں آیا کرتے تھے۔ بہت سے لوگ اس کے چیلے بھی بننا چاہتے تھے' لیکن سنگانی ہمیشہ شازل کے پیچھے ہی پڑا رہتا تھا۔

''ارے مسلمان چھوکرے...... کیا دین دھرم کے چکر میں پڑا ہوا ہے تو...... مجھے گرو بنا لے بھگوان کی سوگند سب کچھ سمجھا دوں گا۔ دین دھرم بیکار باتیں ہیں بیٹا تو ذرا سوچ سنسار تیرے چرنوں میں آ جائے اور تو مہان ہو جائے تو یہ دنیا والے تیرے پیر چاٹیں گے۔''

''آپ مجھے ایک بات بتایئے سادھو جی مہاراج! آپ خود اتنے مہان کیوں نہیں ہو گئے؟'' شازل مسکرا کر کہتا۔

''دیکھ بیٹا...... یہ جادو منتروں کی دنیا ہے' کرم چکر ویر اور دھرماتمی کی باتیں ہیں۔ سنسار میں ہر منش کو سب کچھ نہیں مل جاتا...... کچھ ایسے ہوتے ہیں جو پانے والی چیزوں کو کھوتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں پانے کی آرزو رہ جاتی ہے' تو مجھ سے جادو منتر سیکھ لے' یہ تھوڑی کہوں گا کہ تجھ سے گوماتا کا پجاری بن جا...... اپنے ہی دھرم پر رہ' پر جیسا میں بتاؤں ویسا کرنا۔ پھر دیکھنا کیا تماشہ ہوتا ہے؟''

سنگانی کو ایک ایسا جادو آتا تھا جسے وہ خود پر نہیں کر سکتا تھا بس جادو منتر کے پھیر ہوتے ہیں' اسے کسی مسلمان لڑکے کی تلاش تھی جس کا دھرم خراب کر کے وہ اسے چیلا بنا لے اور پھر اس کے ذریعے دنیا پر حکمرانی کرے۔ لیکن شازل اس کے پھیر میں نہیں آتا تھا۔

ادھر شمیل خان جوانی میں مست اپنی دنیا الگ بسائے ہوئے تھا اور اس کی دنیا ماریہ تھا۔ تین غیور بھائیوں کی بہن جو اس پر ہر طرح سے نگاہ رکھا کرتے تھے اور ساون پوری میں ان کا بھی بڑا نام تھا مگر ماریہ شمیل خان کی محبت میں سرشار تھی اور ساون پوری کے کھیتوں کھلیانوں اور باغوں میں ان کی پاکیزہ ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ پاکیزگی ان کے ہاں اوّل حیثیت رکھتی تھی لیکن ایک نوجوان لڑکی ساری ساری رات اگر کسی نوجوان لڑکے کے ساتھ کھیتوں اور کھلیانوں میں وقت گزارے تو اسے پاکیزہ سمجھنے والے نیم دیوانے ہی ہو سکتے ہیں۔

جب شہباز خان کو یہ خبر ملی تو اس نے اپنے باقی بھائیوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ گلریز' شہباز اور مہروز تینوں کے تینوں سر جوڑ کر

بیٹھ گئے اور آخر یہ فیصلہ کیا کہ شمیل خان کو راستے سے ہی ہٹا دیا جائے۔ کسی اپنے کو نقصان پہنچانا تو بڑا ہی مشکل کام ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک بادلوں بھری رات جب شمیل خان ماریہ کے ساتھ بیٹھا ہوا اس سے باتیں کر رہا تھا تو تینوں بھائی اس کی تاک میں تھے اور اپنے طور پر بہت سے فیصلے کر کے آئے تھے۔ ماریہ اور شمیل خان باتیں کرتے رہے اور پھر جب بارش کا پہلا قطرہ آسمان سے زمین تک پہنچا تو ماریہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''بس اب میں چلتی ہوں شمیل' بارش تیز ہوگئی تو گھر پہنچنا مشکل ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے بارش کی وجہ سے بھیا جاگ بھی اٹھیں۔''

شمیل خان نے اسے خدا حافظ کہا اور ماریہ وہاں سے چل پڑی۔ شمیل خان دیر تک اسے جاتے دیکھتا رہا جب وہ تاریکی میں گم ہوگئی تو وہ واپس پلٹا لیکن دوسرے لمحے اس پر ٹارچوں کی روشنیاں مرکوز ہوگئیں اور شمیل خان دھک سے رہ گیا۔ اس کے بعد جنگل میں ایک خونی کھیل کا آغاز ہوگیا۔ شمیل خان جان بچانے کے لیے دوڑ رہا تھا اور شہباز خان' مہروز اور گلریز اس پر کلہاڑیوں سے وار کر رہے تھے۔ پہلے شمیل خان کی ایک ٹانگ کٹی تو وہ زمین پر گر پڑا اور اس کے بعد اس پر کلہاڑیوں کی بارش ہو گئی۔ ہڈیوں تک کا قیمہ بنا ڈالا تھا تینوں بپھرے ہوئے جوانوں نے اور جب شمیل خان کے بدن کے ٹکڑے دور دور تک بکھر گئے تو انہیں اپنی وحشت خیزی روکنے کا خیال آیا اور وہ رک گئے۔

''کتا...... بھول گیا تھا کہ کسی کی غیرت پر ہاتھ ڈالنا کتنا خطرناک ہوتا ہے؟''

''اب ہوش سے کام لو اور اسے یہیں کسی درخت کی جڑ میں دفن کر دو۔''

بمشکل تمام ایک ایک ٹکڑا سمیٹا گیا اور جگہ جگہ درختوں کی جڑوں میں گڑھے کھود کر اسے دفن کر دیا گیا۔ اس جنگل کے بے شمار درخت شمیل کی قبر بن گئے تھے۔

تینوں بھائی واپس لوٹے تو ماریہ نے انہیں چھپ کر دیکھا۔ گھر پہنچی تو تینوں بھائیوں کو غائب پایا تھا اور اس کے بعد دہشت زدہ سی اسی انتظار میں بیٹھ گئی تھی کہ وہ کب واپس آتے ہیں اور جب وہ واپس آئے تو خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ماریہ نے بمشکل تمام اپنی اس چیخ کو روکا تھا۔ بھائیوں نے کپڑوں کا کیا کیا اور کلہاڑیاں کہاں چھپائی ہیں کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ لیکن یہ پتہ ضرور چل گیا کہ شمیل غائب ہو چکا ہے۔ بستی کا ہر فرد اسے تلاش کر رہا تھا اور ماریہ کو بھائیوں کے خون آلود کلہاڑے اور خون میں ڈوبے کپڑے یاد آ رہے تھے۔ آخر میں اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''نہیں شمیل نہیں...... اگر تم نے جرم کیا ہے تو تم تنہا نہیں ہو۔''

☆......☆......☆

آج بھی بادلوں بھری رات تھی۔ ساون پوری در حقیقت ساون بستی تھی۔ عموماً یہاں بارشیں ہوتی رہا کرتی تھیں۔ موسم کے لحاظ سے بے مثال جگہ تھی اور اسی مناسبت سے اس کے آس پاس کے علاقے اتنے ہی سرسبز و شاداب تھے۔ شہباز خاں کی کوٹھی کے دروازے سے ماریہ باہر نکلی تو کوٹھی کا پہرے دار شاکے خان چونک پڑا۔ دو تین بار اس نے اس طرح ماریہ کو گھر سے نکل کر جنگل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا جو یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ملازموں کو مالک کے خلاف کچھ کہتے ہوئے بڑا سوچنا سمجھنا پڑتا ہے۔ ابھی تک اس نے شہباز خان وغیرہ کو کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اپنے دوسرے ساتھی پہرے دار کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن آج وہ ماریہ کا پیچھا کر کے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر وہ جاتی کہاں ہے۔

جنگل یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ماریہ جنگل ہی کی جانب جا رہی تھی اور پھر درختوں کے درمیان پہنچ کر وہ غائب ہو گئی۔ چوکیدار شاکے خان ایک درخت کے سائے میں کھڑے ہو کر اسے تلاش کرنے لگا لیکن ماریہ اسے نظر نہیں آئی۔ البتہ اچانک ہی اسے اپنے قرب و جوار میں سرسراہٹیں سی محسوس ہوئیں اور اس نے چونک کر پلٹنا چاہا لیکن عین اسی وقت درخت کی ایک موٹی شاخ اس کے گرد لپٹ گئی۔ شاکے خان حیرت زدہ سا اس شاخ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے شاخ اوپر اٹھتی چلی گئی اور شاکے خان فضا میں لٹک گیا۔ اس کے حلق سے بمشکل نکلا۔

''کک...... کون ہے...... کون ہے...... چھوڑو...... چھوڑو......'' اچانک ہی درخت کی شاخ اپنی جگہ سے سمٹ گئی اور شاکے خان نیچے گر گیا۔ وہ وحشت زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پھر ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

''کون ہے...... سامنے آؤ...... سامنے آ کر بات کرو۔''

لیکن جواب میں کوئی آواز نہ سنائی دی۔ اب وہ بری طرح خوفزدہ ہو گیا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پھرتی سے ایک جانب دوڑ لگا دی۔ لیکن اچانک ہی ایک طرف سے درخت کی دو شاخیں آگے بڑھیں اور اس کی دونوں بغلوں سے لپٹ گئیں۔ اس کے بعد سامنے سے دو شاخیں اس کی طرف آئیں اور اس کی دونوں ٹانگوں سے چمٹ گئیں۔ ان شاخوں نے اسے کسی ایسے انسان کی طرح اسے اپنی گرفت میں لے لیا جو انتہائی طاقتور ہو۔ شاکے

خان نے خوفزدہ نگاہوں سے سامنے موجود درخت کی جڑوں کو دیکھا اور اس کا دل دہشت سے بند ہونے لگا۔ درختوں کی شاخوں کے سنگم پر ایک انتہائی ہولناک اور بھیانک چہرہ نمودار ہوا جس کی آنکھیں خوفناک انگارے برسا رہی تھیں۔ اس چہرے کو دیکھ کر کوئی بھی زندہ انسان زندگی سے محروم ہوسکتا تھا۔

لیکن شاکے خان نے اپنے طاقتور وجود سے کام لیتے ہوئے درخت کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ پھر اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن درخت کی ایک شاخ سیدھی ہوکر اس کے حلق میں داخل ہوگئی اور اس طرح داخل ہوئی کہ حلق میں گھس کر گردن سے باہر نکل گئی۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد درختوں نے اس کی زندگی چھین لی تھی۔ جب اس کی جان نکل گئی تو درخت کی شاخیں آہستہ آہستہ سمٹ گئیں اور شاکے خان کا مردہ وجود زمین پر گر چکا تھا۔

پھر ساون پوری والوں کو اس کی لاش دستیاب ہوئی اور چاروں طرف ہاہاکار مچ گئی تھی کہ جنگل میں کوئی وحشی درندہ آ گیا ہے۔ ساون پوری کے نوجوان اس درندے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ دن تک کچھ نہ ہوا لیکن ایک رات پھر ماریہ کو جنگل کی جانب جاتے ہوئے دیکھا گیا۔ شاکے خان کی جگہ دوسرا پہرے دار پہرے پر تھا۔ یہ ذرا سمجھدار آدمی تھا اس نے خود جانے کے بجائے جلدی سے اندر جا کر گلریز خان اور مہروز خان کو اطلاع دی۔ شہباز خان شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔

بہرحال یہ سن کر دونوں بھائی دنگ رہ گئے تھے۔ چنانچہ وہ تیار ہوکر چوکیدار کی رہنمائی میں جنگل کی جانب چل پڑے۔ ماریہ جنگل میں جا کر غائب ہوگئی تھی اور تینوں افراد پاگلوں کی طرح اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماریہ جنگل میں کہاں غائب ہوگئی۔ لیکن ابھی وہ تینوں کے تینوں جنگل میں بھٹک ہی رہے تھے کہ اچانک ہی جنگل کے درخت جنبش میں آ گئے۔ شاخیں سرسراہٹوں کے ساتھ انہیں تلاش کرتی ہوئی ان تک پہنچ گئیں۔ مہروز خان کی ٹانگ ایک شاخ کی گرفت میں آئی تو وہ دھڑ سے زمین پر گر پڑا اور شاخ نے اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ شاخ اسے درخت کے تنے کی طرف لے جا رہی تھی پھر درخت کے تنے میں ایک انتہائی ہیبت ناک چہرہ نمودار ہوا جس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ شاخ نے اسے جھٹکے کے ساتھ اس تنے کے اندر پھینک دیا اور تنے کا منہ بند ہوگیا۔ مہروز تنے کے اندر غائب ہوگیا تھا۔ یہی کیفیت گلریز اور نئے چوکیدار کی ہوئی تھی۔ درختوں نے انہیں اپنی شاخوں میں سمیٹ لیا اور دوسری صبح ان کی بھیانک لاشیں بھی اسی شکل میں دستیاب ہوئیں۔

☆......☆......☆

ساون پور خالی ہونا شروع ہوگیا تھا۔ کسی بھی کوشش میں کامیابی نہیں حاصل ہو رہی تھی۔ لوگ ایسے درندوں کی تلاش میں

دنیا بھر میں سالِ نو کی تقریبات

دنیا کے مختلف ممالک میں سالِ نو کی تقریب منانے کے لیے بڑے انوکھے اور دلچسپ طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔

☆ جاپان میں 108 گھنٹیاں بجا کر 108 گناہ معاف کرائے جاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ گھنٹیوں کی آوازیں سننے سے انسانی جسم میں 108 پراگندہ خیالات کا جڑ سے خاتمہ ہوجاتا ہے۔ کیوٹو کے شیئن مندر میں 74 ٹن وزنی ایک بڑا گھنٹہ لٹکا ہوا ہے۔ جاپانی لوگ اس گھنٹے کو بڑا متبرک خیال کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ نئے سال کے موقع پر اس کی آواز سنیں۔

☆ رومانیہ میں نئے سال کی آمد پر نوجوان اپنے دیہی علاقوں میں جا کر ڈرم بجاتے ہیں۔ اپنے بیل اور گایوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیاں بجاتے ہیں اور ہوا میں کوڑے لہراتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ اس طرح کرنے سے ان کی فصلیں اچھی ہوں گی اور ان کے ملک میں خوشی اور خوشحالی آئے گی۔

☆ میکسیکو کے لوگ خالی میدانوں کی طرف نکل جاتے ہیں اور ہوا میں فائر کر کے نئے سال کا استقبال کرتے ہیں۔ اس طرح وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ آنے والے سال میں وہ اپنی اور اپنے وطن کی حفاظت کریں گے۔

☆ ناروے کے لوگ نئے سال کی آمد کے موقع پر ایک خصوصی ڈش تیار کرتے ہیں جس کا نام ''لیوٹ فسک'' ہے۔ اس میں تازہ مٹر، گوشت، سرسوں اور اُبلے ہوئے آلو ہوتے ہیں۔ بعض لوگ خشک کاڈ مچھلی کی ڈش تیار کرا کے کھاتے ہیں۔

☆ سپین کے لوگ نئے سال کی آمد کے موقع پر انگور کے 12 دانے پاس رکھ لیتے تھے اور رات کو 12 بجتے ہی وہ انگور اس طرح کھاتے ہیں کہ گھنٹے کی ہر ٹک ٹک پر ایک دانہ منہ میں ڈالتے جاتے ہیں۔ اس طرح 12 ٹک ٹک پر 12 انگور کھا کر نئے سال کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

☆ سکاٹ لینڈ کے بچے نئے سال سے پہلے والی شام کو اپنے گلی کوچوں میں گھومتے ہیں اور تمام گھروں سے جئی کے آٹے سے تیار کردہ کیک جمع کرتے ہیں۔ سکاٹ باشندے اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ کوئی سیاہ بالوں والا مہمان اس رات ان کی دہلیز پار کرے چاہے وہ کسی بھی مذہب یا نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ اس طرح ان کے گھروں میں سال بھر برکت ہوگی۔

تھے۔ جو اس طرح انسانوں کو خاک میں ملا دیا کرتے ہیں لیکن پھر ایک بزرگ شخص نے ایک انکشاف کیا اس نے کہا۔

''ایک بات بتاؤ وہ چوکیدار جو پہلی بار ہلاک ہوا تھا۔ کیا اس کا تعلق شہباز خان کے گھرانے سے نہیں تھا اور کیا اب جو تین افراد مارے گئے ہیں ان میں سے دو شہباز خان کے بھائی نہیں تھے۔''

شہباز خان خود بھی سکتے میں تھا۔ گھر ہی خالی ہو گیا تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہونا چاہیے۔ وہ ہر طرح کی کارروائیاں کر چکا تھا۔ پولیس کے اعلیٰ ترین افسران ہر طرح کھوج لگاتے پھر رہے تھے۔ لیکن بھلا پتہ کیسے چل سکتا تھا۔ کسی کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ خوفناک جنگل میں نظر آنے والے درخت رات کی تاریکیوں میں بھیانک شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ ان میں انسانی چہرے نمودار ہوتے ہیں لیکن اس قدر بھیانک کہ انسان کا پتہ پانی ہو جائے۔

شہباز خان کو اپنے بھائیوں کی موت کا دلی رنج تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر وہ کون ہے جس نے اس کی دنیا تاریک کر دی ہے۔ اصل میں بھول جانے والے بھول جاتے ہیں کہ وہ جو دوسروں کی دنیا تاریک کر دیتے ہیں ان کے آنگن میں بھی تاریکیاں اتر سکتی ہیں۔ اس تمام کہانی کے پیچھے ایک نام تھا اور نام شازل خان۔ شمیل خان کا بائیس منٹ بڑا بھائی۔ آج شہباز خان کا گھرانہ تاریک ہو رہا تھا لیکن گزری ہوئی کل انہوں نے شمیل خان کے جسم کے جس طرح ٹکڑے ٹکڑے کئے تھے وہ انہیں یاد بھی نہیں رہے تھے۔

شازل خان اپنے بھائی کی گمشدگی سے سخت دلبرداشتہ ہو گیا۔ بیمار ہو کر پلنگ سے لگ گیا۔ کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی تھی بھائی کو تلاش کرنے کی۔ پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرتا تھا بھائی کے بغیر اس کی دنیا تاریک ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس کائنات میں دل نہیں لگتا تھا۔ بس بھٹکتا ہی رہتا تھا اور اسی طرح بھٹکتا ہوا ایک دن وہ پھر شمشان گھاٹ کی جانب جا نکلا۔ سنگانی کی مڑھیا جوں کی توں تھی اور سنگانی اسی طرح بھبوت ملے اس کے سامنے آ گیا تھا۔

''کہا تھا نا تجھ سے سنسار میں جو شکتی مان ہوتے ہیں انہیں ہی جینے کا حق ہوتا ہے' مار دیا سسروں نے تیرے بھائی کو...... مار دیا حرام کے جنوں نے اسے...... اپنی بہن کو روک نہ پائے اس کا جیون لے لیا۔'' شازل چونک پڑا تھا۔

''کیا کہہ رہے ہو سنگانی مہاراج......؟''

''ارے ہاں رے۔ جا درختوں کی جڑوں میں جا کر ٹکڑے نکال اس کے۔''

''میرے بھائی کے۔''

''تو اور کیا...... مار دیا اسے شہباز خان کے گھر والوں نے...... کیونکہ وہ اس کی بہن سے پریم کرتا تھا۔''

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو سنگانی؟''

''ہاں رے سچ کہہ رہا ہوں۔ پر ایک بات کہوں تجھ سے' جیون میں منش غلطیوں پر غلطیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ جوش میں بھر کر شہباز خان کے گھر جائے گا یا تو خود مارا جائے گا یا اگر انہیں مار بھی دیا تو پھانسی چڑھ جائے گا یہ تو کوئی بدلہ نہ ہوا۔ بدلہ تو ایسا ہو کہ سنسار والے یاد کرتے رہ جائیں۔''

''سنگانی میری مدد کرو۔''

''جا رے پہلے کب منع کیا ہے تجھے پاگل...... چل آ جا میں تجھے تیرے بھائی کی کھوپڑی نکال کر دکھا دیتا ہوں۔''

اور سنگانی رات کی تاریکیوں میں اسے لے کر جنگل میں داخل ہو گیا۔ وہ درختوں کی جڑوں کو دیکھتا پھر رہا تھا۔ پھر ایک درخت کی جڑ کے پاس رک کر اس نے زمین کی کھدائی شروع کر دی اور درحقیقت وہاں سے ایک انسانی کھوپڑی نمودار ہو گئی جو اب سوکھ چکی تھی اور اس کے نقش ختم ہو گئے تھے۔

''یہ دیکھ میرے ہاتھ کے پار دیکھ۔'' جادوگر سنگانی نے اپنا ہاتھ سامنے کر دیا اب کھوپڑی اس کے ہاتھ کے نیچے تھی اور اس کا ہاتھ شازل اور کھوپڑی کے درمیان تھا۔ تب شازل نے شمیل کا چہرہ دیکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اس کے حلق سے سسکیاں نکلنے لگیں۔

''نا رے نا...... نا...... رونے سے من کا کرودھ ڈھل جاتا ہے۔ ہردے میں نرمی آ جاتی ہے۔ ارے آنکھیں تو وہ ہیں جو شعلے برسائیں۔ رو کر کیوں اپنی شکتی کھو رہا ہے۔ چل دفن کر دے اس کھوپڑی کو اسی جگہ ان درختوں کی ساری جڑوں میں تیرے بھائی کے بدن کے ٹکڑے دفن ہیں۔ ان تین سورماؤں نے اکیلے کو کلہاڑیوں سے کاٹ کر یہ کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ پر تو ان درختوں کی جڑوں کو ہی ان کا انت بنا دے۔''

''کیسے؟'' شازل کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

''یہ میں تجھے بتاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے سنگانی مہاراج آج سے میں آپ کو اپنا گرو تسلیم کرتا ہوں۔'' شازل نے کہا۔

☆......☆......☆

شہباز اپنے بھرے پرے گھر سے محروم ہو گیا تھا۔ دونوں

بھائیوں کی یاد اس کے دل میں تڑپ بن گئی تھی شادی وغیرہ تو نہیں کی تھی کسی نے ابھی تک۔ بہن الگ نیم مردہ حالت میں گھر کے ایک گوشے میں پڑی رہا کرتی تھی۔ شمیل کی موت کے بعد دنیا سے رابطے ہی توڑ دیئے تھے بھائی بھی اس سے ناراض تھے اور پھر یہ ایک معمول بن گیا تھا۔

اس دن بھی شہباز رات کی تاریکیوں میں کھڑا خلاؤں میں گھور رہا تھا کہ اس نے ماریہ کو بڑے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ نئے چوکیدار کو ساری صورتحال کا علم تھا اب کسی کی مجال نہیں تھی کہ ماریہ کے پیچھے ایک قدم چلے۔ لیکن شہباز خان کو تجسس پیدا ہوا۔ یہ ماریہ آخر جاتی کہاں ہے۔ وہ مسلح ہو کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ ماریہ جنگل میں داخل ہو گئی تھی اور پھر بہت سے درختوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے شہباز خان ایک درخت تک پہنچا۔ ماریہ اس کے سامنے دوسرے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑی ہوئی تھی۔

شہباز خان یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ماریہ یہاں کیا کرنے آئی ہے کہ اچانک ہی اسے ایک ہلکی سرسراہٹ کا احساس ہوا اور دفعتہً ہی درختوں کی شاخیں اس کے جسم کے گرد لپٹ گئیں۔ شہباز خان نے چونک کر ان شاخوں کو دیکھا اور پھر اپنے آپ کو ان سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ ماریہ اب اس کی جانب متوجہ تھی۔ دفعتہً ہی وہ آگے بڑھی اور اس نے درختوں کی شاخوں کو ہاتھوں سے پکڑ کر ہٹاتے ہوئے کہا۔

"نہیں شازل بھائی نہیں۔ اس خاندان کا آخری چراغ بھی بجھانے کی کوشش مت کرو۔ اسے جلتا رہنے دو تا کہ یہ اپنے احساس کی آگ میں ہمیشہ جلتا جھلستا رہے۔" درختوں کی شاخیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ شہباز خان کے منہ سے نکلا۔

"شازل۔"

"ہاں۔ شمیل کا بڑا بھائی...... جس نے اپنا ایمان دھرم اپنے انتقام کی خاطر آگ میں جھونک دیا اور سادھو سنگانی سے جادو سیکھ کر اپنے بھائی کا انتقام تمہارے دونوں بھائیوں سے لیا۔ شہباز خان کم از کم تمہیں محبت کی پاکیزگی کا تو احساس کر لینا چاہیے تھا۔ خدا کی قسم ہم دونوں گنہگار نہیں تھے۔ ہمارے لباس بھی ایک دوسرے تک کو نہ چھوئے تھے۔ مگر تم نے اپنی طاقت کی آگ میں میرے شمیل کو جھونک دیا۔ جتنے درختوں کی جڑوں میں تم نے اس کے ٹکڑے دفن کیے ہیں ان میں سے ہر درخت انتقام بن چکا ہے۔ گلریز، مہروز اور تمہارے دوسرے چوکیداروں کو انہی درختوں نے انتقام کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ جنگل انتقام کا جنگل ہے۔

سمجھ رہے ہو نا تم۔ ہماری پاکیزہ محبت کو تم نے گناہ کی نگاہ سے دیکھا اور تم تینوں نے مل کر شمیل کے ساتھ وہ انسانیت سوز سلوک کیا جو کسی طور مناسب نہیں تھا۔ آہ...... کاش تم ہم دونوں کی محبت کا راستہ نہ روکتے۔"

"ماریہ......! تو نے اپنے دونوں بھائیوں کی موت اپنی آنکھوں سے دیکھی...... تیرے دل میں بہن کی تڑپ بھی نہ پیدا ہوئی۔ تو اگر چاہتی تو انہیں مرنے سے روک سکتی تھی۔"

"مجھے مرنے سے کس نے روکا بڑے بھیا۔ بتاؤ میرے بھائی مجھے مرنے سے کس نے روکا۔ میں تو اسی دن مر گئی تھی جب تم اپنی خون آلود کلہاڑیاں لہراتے ہوئے میرے شمیل کے خون میں ڈوبے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تھے اور اس کے بعد جب میں نے شمیل کو تلاش کیا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ تو تمہارے ظلم کا شکار ہو چکا ہے۔ وعدہ کیا تھا ہم نے بڑے بھیا کہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں جئیں گے' میں نے تو وہیں خودکشی کر لی تھی۔ یہ تو میری روح تھی جو تمہارے سامنے چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ بھیا تم نے شمیل کو مار دیا۔ میں اس کے پاس پہنچ گئی۔ روک سکے تم ہمارا راستہ' اور جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے تم سے اپنا انتقام نہیں لیا۔ مگر شازل...... وہ تمہیں کیسے چھوڑ سکتا تھا یہ سب اسی نے کیا ہے۔ بھیا کاش تم ایسا نہ کرتے۔ خاندان ہی ختم ہو گیا۔ یہ درخت تمہیں بھی اپنی آغوش میں لے کر زندگی سے محروم کرنے کے خواہش مند ہیں لیکن تمہیں زندہ رہنا چاہیے...... عبرت کا نشان بن کر۔ ہو سکتا ہے کبھی کوئی ایسی ضرورت کسی محبت کرنے والے کو پیش آ جائے اور اس وقت تم اپنے لٹے ہوئے قافلے کے واقعات بیان کر سکو اور کسی کو عقل آ جائے...... جاؤ بڑے بھیا اپنی تنہائیوں کا ماتم کرو۔ کسی کے ساتھ ایسا ظلم کرنا اچھی بات نہیں ہوتی جو تم نے کیا...... دیکھو ہم دونوں تو پھر یکجا ہیں۔ تم ہمارا کیا بگاڑ سکے...... شمیل' شمیل ادھر آؤ۔"

اور ایک درخت کے تنے کے عقب سے ایک چمکدار ہیولا باہر نکل آیا۔ یہ شمیل تھا جو فضا میں تیرتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ قریب آ کر اس نے ماریہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ شہباز خان کو دیکھا اور کہا۔

"ٹھیک کہتی ہو ماریہ۔ اسے دنیا کے لیے عبرت کا نشان بن کر رہنا چاہیے...... آؤ چلیں۔" دونوں چند قدم چلے اور اس کے بعد فضا میں تحلیل ہو گئے۔

وضعدار

ایم اے راحت

وہ چیختے ہوئے بھاگنے لگی' لیکن غلط سمت جا رہی تھی۔ ادھر کوئی دروازہ نہیں تھا' جب تک وہ پلٹ کر دروازے کی طرف جاتی نقاب پوش اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے پیچھے سے اس کی چوٹی پکڑ لی اگر وہ سامنے کے رخ ہوتی تو دوسری بار اس پر تیزاب پھینکا جا سکتا تھا' لیکن چہرہ دوسری طرف تھا۔ اس نے چہرے کو اپنی طرف کرنے کے لیے ماہ نور کی چوٹی پکڑ کر ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا تو ماہ نور نے خود کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو سنبھالا' چہرہ سامنے آیا تو بوتل والا ہاتھ بلند ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی بوتل ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی' نقاب پوش مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا' نجانے کیا ہوا تھا اس کی گردن میں ایک زنجیر آکر پھنس گئی تھی' وہ زنجیر جو دونوں ہاتھوں کے درمیان ہتھکڑیوں سے رابطہ کئے ہوئے تھی۔

ایک معاشرتی کہانی' عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے

شاہد علی بے حد سخت گیر تھے' عامر جانتا تھا' لیکن وہ ایسا کوئی عمل کریں گے اسے امید نہیں تھی۔ بہت بڑا کاروبار تھا ان کا کروڑوں کی جائداد تھی' سب کچھ عامر ہی کا تھا لیکن' اچانک یہ سب کچھ اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ امجد حسین ایڈووکیٹ نے شاہد علی کا وصیت نامہ اسے دکھایا تھا اور اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔ وصیت نامے کی رو سے اگر عامر ماہ نور سے شادی نہیں کرتا تو اسے تمام دولت سے ہاتھ دھونے پڑتے اور ایک معمولی وظیفے پر گذارا کرنا پڑتا۔

ماہ نور شاہد علی کے منیجر اختیار حسین کی بیٹی تھی۔ اختیار حسین شاہد علی کے منیجر کے علاوہ گہرے دوست بھی تھے۔ ماہ نور کی ماں اس کی پیدائش کے وقت مرگئی تھی اور شاہد علی نے اس کی لاش پر کھڑے ہو کر اس سے وعدہ کیا تھا۔

''آپ سکون سے عدم کی راہ اختیار کریں بھابھی۔ یہ بچی اب میری ہے۔ میں اسے اپنی اولاد کی طرح پرورش کروں گا اور اسے اپنے عامر کی بہو بناؤں گا۔''

دونوں جوان ہو گئے تھے۔ تعلیم مکمل کر چکے تھے۔ عامر نے سرکشی کرتے ہوئے باپ سے کہہ دیا تھا کہ وہ ماہ نور سے شادی نہیں کرے گا۔ لیکن شاہد علی نے اسے جواب دیا تھا کہ اگر اس نے ماہ نور سے شادی نہ کی تو اسے سنگین نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ انہوں نے اپنے مرحوم دوست اور بہن جیسی بھابھی کو بیوی کی موت کے بعد زبان دی ہے۔ اختیار حسین بھی اس دنیا سے جا چکے تھے۔

عامر حتی الامکان گریز کرتا رہا اور پھر اچانک شاہد علی کا انتقال ہو گیا۔ باپ کی موت نے اسے متاثر کیا تھا' لیکن اس نے سوچا تھا کہ اب اسے ماہ نور سے شادی نہیں کرنی پڑے گی لیکن باپ کے چالیسویں کے بعد امجد حسین نے وصیت نامے کا بم بلاسٹ کر دیا تھا اور عامر بدحواس ہو گیا تھا۔ کوئی تدبیر ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ ماہ نور سے اسے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ لیکن۔

آخر کار اس نے ماہ نور سے شادی پر آمادگی ظاہر کر دی۔ بھرا پرا خاندان تھا ماں باپ بے شک دونوں میں سے کسی کے نہیں تھے لیکن رشتے داروں کی بھرمار تھی۔ حجلہ عروسی میں البتہ ایک ڈرامے کا آغاز ہو گیا۔

''تم جانتی ہو ماہ نور...... میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''پھر تم نے شادی کا اقرار کیوں کیا۔''

''کیا کرتی۔ میرا کوئی ہے۔''

''اب کیا ہوگا۔''

''میں یہ بھی نہیں جانتی۔''

''میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔''

''کیا۔''

''ہم دونوں دنیا کی نظر میں میاں بیوی رہیں لیکن ایسا کوئی رابطہ ہمارے درمیان نہ ہو۔ بعد میں اگر تم چاہو گی تو میں تمہیں طلاق دیدوں گا اور اتنا کچھ دوں گا کہ تم اپنی مرضی کی پرسکون زندگی گزار سکو گی۔''

''وہ تو میں نہیں چاہوں گی لیکن میں آپ کے راستے میں بھی نہیں آؤں گی۔'' ماہ نور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اسے علم تھا کہ عامر نے صرف باپ کی دولت کے لیے اس سے شادی کی ہے لیکن عامر یہ انداز اختیار کرے گا اسے یہ امید نہیں تھی لیکن عامر کے گریز نے اس کی انا کو ٹھیس پہنچائی تھی' اس لیے اس نے عامر کی شرط قبول کر لی اور دونوں کے درمیان یہ سمجھوتہ ہو گیا۔

اس دن کے بعد سے وہ اپنے وعدے پر قائم رہی لیکن انسان تھی۔ تعلیم یافتہ تھی۔ عامر کا سلوک اس کے ساتھ بہت اچھا تھا لیکن ایک تحریر کی حیثیت سے میں ہمیشہ اس سے دور رہتا۔ وہ

اس کھوج میں لگ گئی کہ آخر عامر کے اس گریز کی وجہ کیا ہے۔

ایک دن عامر نے کہا۔ ''تیاری کرلو ماہ نور ہم شمالی علاقوں میں چل رہے ہیں۔''

''کیوں ......'' ماہ نور کی آواز میں خود بخود طنز پیدا ہوگیا۔

''آنٹی کہہ رہی تھیں کہ ہمیں ہنی مون منانے کے لیے کہیں باہر جانا چاہیے' آؤٹ آف کنٹری تو خیر ممکن ہی نہیں ہے' بس کچھ دنوں کے لیے یہیں کہیں پہاڑی علاقوں میں چلے جاتے ہیں' کبھی یہ بات کہہ رہے ہیں۔''

''ان سب کا ہماری زندگی سے کیا تعلق ہے۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

''مگر تمہیں کیا اعتراض ہے۔''

''کمال کی بات کرتے ہو' لوگوں کو دکھانے کے لیے ہمیں ہنسنا بولنا پڑتا ہے' ایک بیوی کی ایکٹنگ کرنی پڑتی ہے' میں کوئی اداکارہ تو نہیں ہوں۔''

''تمہیں بھی ذرا سا ذہنی سکون ملے گا۔ ہم خاصے عرصے باہر رہیں گے۔''

وہ خاموش ہوگئی اور عامر اسے ایک خوب صورت پہاڑی علاقے میں لے آیا' رشتے داروں سے پیچھا چھوٹ گیا تھا۔ اب اسے اداکاری کرنے کی ضرورت نہیں تھی' لیکن یہاں آ کر تو وہ بالکل ہی تنہا ہوگئی تھی' وہاں کم از کم یہ تو تھا کہ دل گھبراتا تو اپنی ہم عمر لڑکیوں میں جا کر بیٹھ جاتی' کبھی کسی بچے کو گود میں کھلانے لگتی' لیکن یہاں کوئی بھی نہیں تھا' ایک اجنبی شخص جو نہ شوہر تھا نہ ساتھی' رفتہ رفتہ اس کے اندر بغاوت جنم لینے لگی' پہلے تو اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنے آپ کو سنبھالے گی اور حالات سے سمجھوتہ کرے گی' لیکن کب تک' ایک دن' ایک سال' دو سال' دس سال کیا کوئی اتنا بڑا سمجھوتہ کرسکتا ہے' اس نے کہا۔

''ایک بات بتاؤ عامر کوئی عورت ایسی ہو جو شوہر کے لیے صرف دور سے دیکھنے کی چیز ہو تو کیا اس کا شوہر اسے برداشت کرسکے گا اور کتنے عرصے تک کرسکے گا۔''

اس وقت تک عامر کی نگاہوں میں ایک عجیب سا احساس پیدا ہوگیا' حسن و شباب کا جیتا جاگتا مجسمہ اس کے سامنے تھا۔ نجانے کیوں اس کے انداز میں ایک حسرت سی پیدا ہوگئی' اس نے سر جھکا کر کہا۔

''میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں' جب تم سو جاتی ہو تو میں تمہیں گھنٹوں حسرت سے دیکھتا ہوں' تم ہنستی بولتی ہو تو دل میں اترتی چلی جاتی ہو۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی تو ماہ نور نے کہا۔

''آپ مجھے میرے سوال کا جواب دیجیے۔''

''بس ہماری عزت اسی میں ہے کہ ہم اس رشتے کو دنیا والوں کے سامنے قائم رکھیں' اس وصیت کے مطابق تمام دولت جائداد ہماری ہے اور اس میں ہم دونوں کا بھلا ہے۔''

''کمال کرتے ہو عامر' کیا دولت ہی تمام عمر کی زندگی ہوتی ہے۔''

''تم مجھے چھوڑنا چاہتی ہو کیا۔'' عامر انتہائی نرم لہجے میں بولا۔

''ابھی فیصلہ نہیں کیا ہے' لیکن کہہ نہیں سکتی کہ آنے والے وقت میں کیا ہوگا۔''

''ایسا نہ کرنا' میری بدنامی ہوگی۔''

''آپ دولت کے بل پر بدنامی کا جواب دے سکتے ہیں' کسی ایسی عورت سے شادی کر سکتے ہیں جو صرف دولت چاہتی ہے۔''

''نہیں' میں کسی اور عورت کو اپنے قریب تک آنے نہیں دینا چاہتا' وہ قابل اعتبار نہیں ہو گی' مگر تم' تم قابل اعتبار ہو۔''

''نہیں عامر' ماحول انسان کو کچھ سے کچھ بنا

دیتا ہے' آخر کب تک میں اپنے آپ سے لڑتی رہوں گی۔''

''دیکھو' میری بات سنجیدگی سے سنو' اگر تم نے کوئی غلط فیصلہ کرلیا تو میں تباہ ہو جاؤں گا' میں دولت کے بغیر نہیں جی سکتا۔''

''مگر میں کب تک یہ اداکاری کرتی رہوں گی' واپس جاؤں گی تو پھر انہی رشتے داروں کا سامنا ہوگا۔''

''ہم کسی سے نہیں ملیں گے' صرف نوکر چاکر ہوں گے۔''

''میں نوکروں کے بغیر گزارہ کرسکتی ہوں' خود پکاؤں گی کھاؤں گی' کھلاؤں گی۔ آپ کی خدمت کروں گی' مگر میں نہیں چاہتی کہ ہمارے درمیان کوئی تیسرا آجائے' سمجھ رہے ہونا۔''

''میری بات سنو' تمہیں اس بات کا تو اندازہ ہوگا کہ کوٹھی میں دوست احباب آتے رہتے ہیں' بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ممبران بھی آتے ہیں' ملازموں کی موجودگی بھی ضروری ہوتی ہے۔''

''آپ اس کوٹھی میں رہا کریں' شہر سے باہر ہمارا شاندار کاٹیج ہے' میں وہاں تنہا رہوں گی' آپ دن میں اپنے تمام کاروبار میں مصروف رہا کریں' شام کو کاٹیج آجایا کریں۔''

''میں تمہاری یہ بات مان لیتا ہوں۔'' عامر نے گردن جھکا کر کہا۔

وہ جانتا تھا کہ عورت اگر بپھر جائے تو کیا سے کیا بن جاتی ہے' ماہ نور کو اپنا بنائے رکھنے کا یہی ایک راستہ تھا کہ اس کی ہر بات تسلیم کرلی جائے چنانچہ اس نے اسے کاٹیج میں منتقل کردیا' رشتے دار تو ہوتے ہی طرح طرح کی باتیں بنانے کے لیے ہیں' جتنے منہ اتنی باتیں' کسی نے کہا کہ باپ تو ایک ملازم تھا بیٹی مالک بن گئی۔ دولت ہاتھ آنے سے مزاج بدل گئے' لیکن عامر نے سب کی باتیں مسترد کردیں' اس نے کہا کہ وہ اس کی بیوی ہے جہاں وہ خوش ہے وہاں عامر بھی خوش ہے' اس کے بعد دوسرے مسائل شروع ہوئے۔ خاندان کی بوڑھی عورتوں نے تقاضے شروع کردیے کہ آخر اولاد کیوں نہیں ہو رہی لیکن عامر نے اس کا جواب بھی خود ہی دیا۔

''اولاد بھی ہو جائے گی کونسی مصیبت آگئی ہے' مجھے خود اولاد کی خواہش نہیں ہے' جب ضروری ہوگا باپ بن جاؤں گا۔''

رفتہ رفتہ ماہ نور کا مزاج بالکل ہی بدلتا چلا گیا' وہ ہر وقت چڑچڑی سی رہنے لگی' بات بات پر جھنجھلا جاتی عامر سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی' رہ رہ کر تقاضہ کرتی تھی کہ مجھے آزاد کردو' میں اس طرح کی زندگی نہیں چاہتی' کوٹھی کار بینک بیلنس کی کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے' صرف ایک زندگی کا ساتھی چاہیے' عامر اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔

''میرے ساتھ تعاون کرو' اگر تم نے مجھ سے الگ ہونے کا فیصلہ کرلیا تو میں اپنی زندگی ختم کردوں گا یا پھر تمہیں ختم کردوں گا۔''

''مرنے سے ڈرتی نہیں ہوں میں' اس زندگی سے موت بہتر ہے' سنیں مجھے ماردیں ورنہ میں کہیں بھاگ جاؤں گی۔''

یہ آخری فقرہ عامر کے دماغ میں پتھر کی طرح لگا وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ کسی دن وہ مجبور ہو کر بھاگ سکتی ہے' کمبخت بلا کی حسین تھی' کوئی بھی اس اپنانے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ کیا کروں اور کیا نہ کروں' کیا ایسی صورت نہیں ہوسکتی کہ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ جائیں اور کسی کے ساتھ نہ جاسکے۔ ٹانگیں ٹوٹ جانے سے کیا ہوتا ہے' اس کا حسن تو سلامت رہے گا' اس میں کشش تو باقی رہے گی' کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس کا چہرہ بگاڑ دیا جائے' اب وہ دن رات یہی فیصلے کرتا رہتا اس کی مٹھیاں سوچتے سوچتے بھنچ جاتیں۔

اس نے باپ کی وصیت کے مطابق شادی کر لی تھی‘ وصیت میں لکھا تھا کہ جب تک وہ شادی نہ کرے اسے دولت اور جائداد نہیں ملے گی‘ شادی کے سلسلے میں یہ شرائط تھیں کہ وہ صرف دولت اور جائداد حاصل کرنے کے لیے عارضی طور پر شادی نہیں کرے گا اور شادی کے بعد کبھی ماہ نور کو طلاق نہیں دے گا۔ ہاں ماہ نور اگر خود سے علیحدہ ہونا چاہے تو اسے صرف مہر کی رقم ملے گی‘ یہ باتیں عامر کے خلاف بھی جاتی تھیں اور ماہ نور کے خلاف بھی۔ ماہ نور کا کچھ نہ بگڑتا‘ وہ حسین وجمیل تھی اس کا کچھ نہ بگڑتا‘ وصیت میں یہ نہیں لکھا تھا کہ اگر ماہ نور مر جائے یا کسی حادثے کا شکار ہوجائے یا کہیں گم ہو جائے تو ایسی صورت میں عامر جائداد سے محروم ہو جائے گا یا نہیں‘ یہ بات نہیں لکھی ہوئی تھی اس لیے ایسی صورت میں عامر کا کوئی قصور نہ ہوتا اور وہ بدستور اپنی جائداد کا مالک ہوتا‘ لیکن اس کے سوچنے سے ماہ نور مر تو نہیں سکتی تھی‘ نہ کسی حادثے کا شکار ہو جاتی اور نہ کوئی اسے بھگا کر لے جاتا وہ تو خود اپنی مرضی سے طلاق لے کر شادی کرتی۔

تب دوست احباب اور خاندان والے اس بات کے منتظر رہتے کہ وہ دوسری شادی کرے گا‘ نہیں کرے گا تو اولاد کہاں سے ہوگی اور اس کے بعد اتنی جائداد کا وارث کون ہوگا۔ دنیاوی جھمیلے ایسے تھے کہ وہ ہر طرح سے گرفت میں آ تا‘ مطمئن کرنے کی بس یہی ایک صورت رہ جاتی‘ نور اس سے تعاون کرے اور اس کی شریک حیات رہے‘ اسے اپنے ساتھ باندھے رکھنے کی یہی صورت نظر آئی کہ اس کی صورت کہ کوئی اس کی طرف مائل نہ ہو وہ کسی اور کو اپنے حسن سے نبھا نہ سکے‘ لوگ اسے دیکھ کر حقارت سے منہ پھیر لیں‘ وہ لگتی تھی اور اس نے فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا‘ جس طرح بھی ممکن

اندازِ فکر

☆ تم اپنی جگہ عمل کیے جاؤ اور میں اپنی جگہ عمل کر رہا ہوں۔

☆ جنہوں نے لوگوں پر ظلم کیے ہیں۔ ان کو مرنے پر عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کس جگہ ان کو لوٹ کر جانا ہے۔

☆ جو بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہے تو ان کو مقام عزت میں جگہ دیں گے۔

☆ جلدی سے توبہ کرلو جبکہ کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو تمہاری توبہ قبول ہوگی۔

☆ جب تمہیں سلام کے ذریعے سے دعا دی جائے تو تم اس کے جواب میں بہتر دعا دو۔ یا وہی کلمہ کہہ دو۔

☆ جب جہاد فرض کر دیا گیا ہے تو ایک فریق انسانوں سے ایسے ڈرنے لگا جیسے اللہ سے ڈرنا ہوتا ہے۔

☆ جہنم ان کے لئے ہے جو نافرمانبردار ہیں۔

☆ سچ کو جھوٹ کے ساتھ مخلوط نہ کرو، اور جان بوجھ کر حق بات کو نہ چھپاؤ۔

☆ بڑا ہی برکت والا ہے۔ وہ اللہ جس نے آسمانوں پر برج اور اس میں ایک چراغ روشن کیا۔

☆ جو چوری کرے بلاشبہ اس کے ہاتھ کاٹ دو تا کہ اوروں کو بھی عبرت ہو۔

☆ جس دن کافروں کے چہرے آگ میں الٹیں، پلٹیں گے، وہ کہیں گے کہ اے کاش! ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی۔

☆ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

☆ شاید کہ تم برا مانو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے لئے اچھی ہو اور شاید کہ تم محبت کرو کسی چیز سے حالانکہ وہ تمہارے لئے مضر ہو تم نہیں جانتے اور اللہ جانتا ہے۔

☆ ہماری چیزوں کی ناشکری نہ کرو اور شکر ادا کرتے رہو۔

☆ جب تک خدا کی راہ میں وہ چیزیں خرچ نہیں کرو گے۔ جو تم کو عزیز اور پیاری ہیں نیکی نہ پاؤ گے۔

ہو ماہ نور کا چہرہ تیزاب کے ذریعے بگاڑ دیا جائے اور جو کام کل ہونا ہے آج ہو جائے تو بہتر ہے۔ رات کی تاریکی پھیل چکی تھی' ماہ نور کاٹیج کے برآمدے میں کھڑی تاریکی میں نگاہیں دوڑا رہی تھی' عام طور سے یہ ہوتا تھا کہ تاریکی ہونے سے پہلے عامر واپس آ جاتا تھا۔

یہ کاٹیج ایک انتہائی خوب صورت لیکن دور دراز علاقے میں تھا' یہ علاقہ شہر سے دور بے شک تھا' لیکن حسن و جمال میں اپنی مثال آپ تھا۔ بہت بڑے بڑے لوگوں نے یہاں پر کاٹیج بنا لیے تھے' ایک خوب صورت جنگل جیسا علاقہ تھا' کافی دور کچے پکے مکانات تھے' کاٹیج ان مکانات سے کافی فاصلے پر تھا اور ماہ نور اس کاٹیج میں تنہا رہتی تھی' وہ نڈر اور بہادر لڑکی تھی اور پھر حالات نے اسے جو بیزاری کا انداز بخشا تھا وہ اسے اور بہادر بنائے ہوئے تھا' وہاں تنہا رہ کر وہ اپنا کھانا وغیرہ خود ہی پکاتی تھی' بہر حال اب آٹھ بجنے والے تھے' لیکن عامر ابھی تک نہیں پہنچا تھا' اس کی نگاہیں دور دور تک عامر کی کار کی روشنی کا انتظار کر رہی تھیں' لیکن روشنی دور دور تک نہیں تھی۔

وہ واپس اندر آ گئی اور کچن میں پہنچ گئی' گھر کے کام کاج ہی اس کی زندگی کا مقصد بن چکے تھے' کھانا پکانا برتن دھونا' کپڑے دھونا' گھر کی صفائی کرنا' چھوٹے سے باغیچے کی دیکھ بھال کرنا اس نے اپنے آپ کو بہت زیادہ مصروف کر رکھا تھا' سالن کی ہانڈی اتار کے اس نے چولہے پر توا چڑھا دیا اور پھر روٹیاں تیار کرنے لگی' اس کی آنکھیں عامر کا انتظار کر رہی تھیں' کچھ بھی تھا شوہر تو تھا' وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ بھی اس کا دشمن بن کر اندر آ سکتا ہے' روٹیاں بھی تیار ہو گئیں اور اس نے چولہے کو بجھا دیا۔

اب کیا کروں' اسی وقت پورے کاٹیج میں اندھیرا چھا گیا' وہ سمجھی کہ بجلی چلی گئی ہے' لیکن پھر اس کی نگاہیں کچن کی کھڑکی سے باہر بہت دور مکانوں کی طرف اٹھ گئیں جہاں کھڑکیاں اور دروازے روشن نظر آ رہے تھے' یہ کیا ہوا' بجلی کی لائن ایک ہی تھی' ہو سکتا ہے ہمارے مین سوئچ میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہو' وہ اندھیرے میں راستہ ٹٹولتی ہوئی کچن سے نکل کر اپنی خوابگاہ کی طرف جانے لگی' موم بتیاں خواب گاہ میں ہوتی تھیں' کچن سے نکلتے ہوئے تاریکی میں کسی چیز سے ٹکرا گئی اور اس کے ہوش اڑ گئے' اس کے حلق سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

''کک...... کک...... کون' کون۔'' لیکن اس کی بات ختم ہوتے ہی کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا وہ لڑکھڑائی اور پیچھے کی طرف گرتے گرتے بچی' پیچھے دیوار تھی اس لیے وہ رک گئی' موٹے سخت اور کھردرے ہاتھ منہ کو اس طرح دبوچے ہوئے تھے کہ سانس رک گئی تھی' کوئی قد آور شخص تھا جو اسے دبوچے ہوئے تھا' ماہ نور کے پورے بدن میں تھرتھری دوڑ گئی' تبھی ایک غرائی ہوئی آواز ابھری۔

''خبردار' آواز نہ نکلے ورنہ گلا گھونٹ کر مار ڈالوں گا۔''

وہ اس چوڑی کلائی کو اپنے منہ پر سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگی اور اسے ایک عجیب سا اندازہ ہوا' چوڑے ہاتھ میں لوہے کی ہتھکڑی پڑی ہوئی تھی' کوئی مجرم جو جیل سے بھاگا ہوا ہے۔ آواز دوبارہ ابھری۔

''اور کون ہے تمہارے ساتھ یہاں۔''

اس کے منہ سے آواز نہیں نکل پائی' بمشکل تمام وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''مم...... میں میں یہاں تنہا ہوں' میرا شوہر آنے والا ہے۔''

''تمہارے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ ہے۔''

''نہیں کوئی ہتھیار نہیں ہے۔''

''بکواس کرتی ہو' اتنے تنہا گھر میں بغیر ہتھیار کے رہ سکتی ہو' مجھے ہتھیار چاہیے۔''

’’آپ آپ یقین کریں میرے پاس ہتھیار نہیں ہے۔‘‘

’’تمہارے شوہر کے پاس ریوالور ہوگا۔‘‘

’’نہیں، ہم لوگ یہاں کچھ بھی نہیں رکھتے، ہماری کوٹھی شہر میں ہے، کچھ بھی نہیں ہے یہاں پر۔‘‘

’’سنو، میں تمہیں ایک بات بتاؤں، میں چور نہیں ہوں، تمہیں قتل نہیں کروں گا، بس تھوڑی دیر کے لیے یہاں پناہ چاہتا ہوں، بھوکا بھی ہوں، سمجھ رہی ہو نا تم۔‘‘

’’ہاں ہاں میں تمہیں کھانا کھلاؤں گی۔‘‘

’’بکواس مت کرو، تمہارا شوہر آنے والا ہے۔ میں یہاں نہیں رکوں گا، میرے ساتھ کچن میں چلو، کھانے کا سامان لے کر چلا جاؤں گا۔‘‘

’’میں کمرے سے موم بتی لے آؤں۔‘‘

’’نہیں میں نے مین سوئچ آف کر دیا ہے، لیکن روشنی ہونے کے بعد اگر تم شور مچاؤ گی تو تمہاری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی، یہ میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔‘‘

’’میں وعدہ کرتی ہوں، تم جیسا کہو گے میں ویسا ہی کروں گی۔‘‘

وہ اس کا بازو پکڑ کر اندھیرے میں کھینچتا ہوا ادھر لے گیا اور تھوڑی دیر کے بعد روشنی ہو گئی۔ روشنی ہوتے ہی وہ ماہ نور کو کھینچتا ہوا کمرے کے اندر آیا اور دروازے کو بند کر دیا، کھڑکیاں اندر سے بند تھیں، ماہ نور نے اب پہلی بار اسے دیکھا، اس کے دونوں ہاتھوں کی کلائیوں میں ہتھکڑی تھی اور تقریباً ڈیڑھ فٹ کی زنجیر سے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے، پہلے تو ماہ نور کا یہ خیال تھا کہ وہ کوئی بھیانک چہرے والا مجرم ہوگا، لیکن وہ اس کے خیال سے بالکل مختلف تھا، بہت ہی شاندار جسم کا مالک، لمبا تڑنگا قد، حسین تو نہیں تھا لیکن چہرے پر مردانگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ماہ نور نے اسے حیرت سے دیکھا تو وہ بولا۔

اندازِ فکر

☆ جس چیز کی حقیقت حال تم کو معلوم نہیں ہے اس کی درخواست نہ کرو۔

☆ بے شک! اللہ ہر چیز کامیاب کرنے والا ہے اور ہر چیز پر اس کا ضابطہ ہے۔

☆ اللہ کی راہ میں اپنی عمدہ چیزوں میں سے خرچ کرو۔

☆ لوگوں کو دنیا کی مرغوب چیزوں کے ساتھ دل بستگی بھی معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ تو دنیا کی زندگی کے چند روزہ فائدے ہیں۔ ہمیشہ کا ٹھکانہ تو اللہ کے ہاں۔

☆ صریح گھاٹا اسی میں ہے کہ اللہ کے سوائے ان چیزوں کو اپنی حاجت روائی کے لئے بلاتا ہے جو ان کو نقصان ہی پہنچا سکتی ہیں اور نہ نفع۔ ایسا کارساز بھی برا ہے اور ایسا رفیق بھی برا۔

☆ اللہ کے سوائے ان چیزوں کو اپنی حاجت روائی کے لئے کیوں بلاتا ہے جو نہ تم کو نقصان ہی پہنچا سکتی ہیں اور نہ ہی فائدہ۔ ایسا کارساز بھی برا ہے ایسا رفیق بھی برا۔

☆ جو تمہاری حاجت سے زائد ہو اللہ کی راہ میں اتنا ہی خرچ کرو۔

☆ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں۔

☆ ہم موت کے وقت آدمی کو جتا دیں گے کہ یہی وہ حالت ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔

☆ زانی کے حال پر کسی طرح کا ترس دامن گیر نہ ہونا چاہئے اور نیز ان کو سزا دیتے وقت۔

☆ جو خوشحالی اور تنگ دستی دونوں حالات میں غصہ کو روکتے اور لوگوں کے قصوروں سے درگزر کرتے ہیں وہ متقی ہیں۔ جو ان حالتوں میں اللہ کی راہ میں خرچ بھی کرتے ہوں۔

☆ اور کوئی بھی چیز خرچ کرو۔ اللہ کے پاس اس کا حساب ہے۔

☆☆☆

''چلو کچن چلو جلدی' مجھے شدید بھوک ہے۔''
وہ پلٹ کر جانے لگی تو وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا' ماہ نور نے روٹیوں کا برتن اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔
''وہ سالن کی ہانڈی ہے' مگر سالن کیسے لے جاؤ گے۔''
اس نے ایک نگاہ ماہ نور پر ڈالی پھر روٹیاں جھپٹ لیں' ہانڈی کا ڈھکن کھول کر ایک طرف پھینکتے ہوئے اسی ہانڈی میں سے روٹیاں ڈبو ڈبو کر بڑے بڑے لقمے منہ میں بھرنے لگا' سالن گرم تھا اور لقمے کافی بڑے بڑے تھے' مگر پھر بھی وہ اسے کھا رہا تھا جیسے واقعی کئی دن کو بھوکا ہو اور ماہ نور ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار کسی مرد کو دیکھا ہے' مرد انسان لیکن درندہ کتنا پیارا لگ رہا ہے وہ اس مردانگی سے کھانا کھاتے ہوئے' وہ جلدی جلدی کھانا کھائے جا رہا تھا اور اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی تو ماہ نور سرگوشی کے انداز میں بولی۔
''شاید میرا شوہر آ گیا ہے۔''
اس نے چونک کر کچن کے دروازے کی طرف دیکھا' پھر پلٹ کر پچھلے دروازے کی طرف گیا' اسے کھولا' روٹیوں کو ایک ہاتھ میں لیا اور دوسرے ہاتھ سے سالن کی ہانڈی اٹھالی' ماہ نور نے کہا۔
''شاید تم بھاگنا چاہتے ہو' مجھ پر بھروسہ کرو' کاٹیج میں کئی کمرے ہیں' میں تمہیں چھپا دوں گی اپنے شوہر کو تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' لیکن وہ بھروسہ کرنا نہیں جانتا تھا' سالن کی ہانڈی اور روٹیاں اٹھائے ہوئے وہ پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا' ماہ نور اس کے پیچھے پیچھے دروازے تک آئی اس نے آواز دی۔
''سنو باہر تمہارے لیے خطرہ ہے' کہیں بھی جاؤ گے پکڑے جاؤ گے مجھ پر بھروسہ کر لو۔''
لیکن وہ نہ رکا اور پھر رات کی تاریکی میں گم ہو گیا' وہ خالی خالی نظروں سے اندھیرے کو تکتی رہی اس کا وہاں سے ہٹنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا' دل کی دھڑکن ایک عجیب سا رنگ اختیار کرتی جا رہی تھی' باہر والے دروازے پر پھر دستک سنائی دی' پہلے تو اسے یوں لگا جیسے جانے والا واپس آ گیا ہو' لیکن پھر فوراً ہی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا' دستک اسی بیرونی دروازے سے سنائی دے رہی تھی' اس نے ایک موہوم سی امید پر کچن کے دروازے کو کھلا رکھا اور وہاں سے چلتے ہوئے مختلف کمروں سے گزرتے ہوئے بیرونی دروازے کے پاس پہنچی اور پھر بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔
''اتنی دیر کیوں لگا دی آپ نے عامر اور آپ نے گاڑی کا ہارن بھی نہیں بجایا۔'' دروازہ کھلتے ہی وہ ایک دم سے گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ ایک شخص سیاہ نقاب میں تھا' جسم پر بھی سیاہ لباس تھا' اس کے ایک ہاتھ میں بوتل دبی ہوئی تھی' وہ کمرے کے اندر آ گیا' ماہ نور نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔
''کون ہو تم کیا چاہتے ہو۔''
آنے والا جیسے گونگا تھا' اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا' تب ماہ نور نے بوتل کی طرف دیکھا' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے' اس خیال کے تحت وہ اچھک کر ایک طرف چلی گئی لیکن شاید یہ اس کی تقدیر ہی تھی کہ وہ عین وقت پر اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی' بوتل سے کوئی سیال مادہ اس پر پھینکنے کی کوشش کی گئی تھی' سیال مادہ کھڑکی کے پردے پر آ گرا اور پردے کا اتنا حصہ جلتا چلا گیا۔ یقینی طور پر بوتل میں تیزاب تھا۔ ماہ نور نے چیخ کر کہا۔
''کون ہو تم کون ہو' بچاؤ بچاؤ مجھے بچاؤ۔

یہ مجھے مار ڈالے گا۔''

وہ چیختے ہوئے بھاگنے لگی' لیکن غلط سمت جا رہی تھی۔ ادھر کوئی دروازہ نہیں تھا' جب تک وہ پلٹ کر دروازے کی طرف جاتی نقاب پوش اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے پیچھے سے اس کی چوٹی پکڑ لی اگر وہ سامنے کے رخ ہوتی تو دوسری بار اس پر تیزاب پھینکا جا سکتا تھا' لیکن چہرہ دوسری طرف تھا۔ اس نے چہرے کو اپنی طرف کرنے کے لیے ماہ نور کی چوٹی پکڑ کر ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا تو ماہ نور نے خود کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو سنبھالا' چہرہ سامنے آیا تو بوتل والا ہاتھ بلند ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی بوتل ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر اگر پڑی' نقاب پوش مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا' نجانے کیا ہوا تھا اس کی گردن میں ایک زنجیر آ کر پھنس گئی تھی' وہ زنجیر جو دونوں ہاتھوں کے درمیان ہتھکڑیوں سے رابطہ کئے ہوئے تھی۔

ماہ نور نے آنے والے کو دیکھا تو ساری دہشت بھول کر خوشی سے کھل گئی' مفرور شخص نے پیچھے سے آ کر نقاب پوش کے گلے میں اپنے ہاتھوں کی زنجیر پھنسا دی تھی اور نقاب پوش آہنی پھندے سے نکلنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا مفرور کے حلق سے غرائی ہوئی آواز نکلی۔

''کتے' بزدل' اکیلی عورت پر حملہ کرتا ہے' مرد ہے تو میرے ہاتھ سے نکل کر دکھا۔''

ادھر نقاب پوش دونوں ہاتھوں کا زور لگا کر اپنی گردن کو زنجیر سے نجات دلانے کی کوشش کر رہا تھا' ساتھ ہی اسے پیچھے کی طرف ڈھکیل رہا تھا۔ دونوں زور آزمائی میں مصروف تھے' تو مفرور نے کہا۔

''میں جیل کی آہنی سلاخیں توڑ کر آیا ہوں' تیری گردن توڑنے میں دیر نہیں لگے گی۔''

ماہ نور تو ایک عجیب نشے کی سی کیفیت میں تھی' لمبا چوڑا شخص واقعی زبردست تھا' نقاب پوش اس کی گرفت میں تڑپ رہا تھا' مچل رہا تھا' اپنی مردانگی کا زور نکال کر نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دفعتاً اس کے حلق سے آواز نکلی۔

''ماہ نور' ماہ نور مجھے بچاؤ۔ میں مر جاؤں گا ماہ نور مجھے بچاؤ۔''

یہ آواز سن کر وہ حیرت زدہ رہ گئی' اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا' اس کا شوہر اس کا محافظ نقاب پہن کر اسے مارنے آیا تھا' اس کی آواز دوبارہ ابھری۔

''چھوڑ دو اسے چھوڑ دو یہ میرے شوہر ہیں۔''

اس بار ہتھکڑی والے نے حیرت زدہ ہو کر ماہ نور کو دیکھا اور پھر نقاب پوش کو پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''واہ تمہارا شوہر مرد ہے کہ عورت' نقاب پہن کر گھر میں داخل ہوتا ہے۔'' مفرور نے زنجیر کا پھندہ اس کی گردن سے نکال دیا اور عامر نڈھال سا ہو کر صوفے پر گر پڑا' اسی وقت مفرور نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا تم مجھے بتاؤ گی نہیں یہ کون ہے' تم اسے شوہر کہہ رہی ہو' مگر یہ تو تمہاری جان لینا چاہتا تھا۔''

ماہ نور کے دل میں نفرت کا طوفان امڈ آیا' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''تم نے اپنے بدنما چہرے پر نقاب چڑھائی ہوئی ہے عامر' یہ نقاب تو اتار دو اور ذرا یہ بتاؤ کہ تم یہ نیا کھیل کھیلنے کیوں آتے تھے' تیزاب سے میرا چہرہ کیوں بگاڑنا چاہتے تھے۔''

عامر نے کوئی جواب نہیں دیا' لیکن اسی وقت مفرور کی غرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''نقاب اتارو۔'' عامر نے خوفزدہ ہو کر جلدی سے نقاب اتار دی اور ماہ نور نفرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''عامر' تم اتنا بڑا جرم کرنے نکلو گے مجھے

امید نہیں تھی‘ تم تو بہت ہی بزدل مجرم ہو۔‘‘

’’مجرم کبھی بزدل نہیں ہوتا جس کی مثال میں ہوں‘ میں نے جو جرم کیا ڈنکے کی چوٹ پر کیا۔‘‘ ماہ نور نے ایک بار پھر نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا‘ اب اس کی نظروں کا زاویہ بدل چکا تھا‘ وہ مفرور اس کا محسن اور عامر اس کا دشمن‘ اس نے حقارت سے عامر کو دیکھا پھر بولی۔

’’تم میری زندگی بھر کے ساتھی ہو نا عامر۔ میرے قانونی محافظ ہو۔ تم نے قرآنی آیات کے زیر سایہ مجھ سے زندگی بھر کا ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں۔ مجھ سے نکاح کیا ہے تم نے عامر‘ مجھے نہ چھوڑنے کے لیے گڑگڑاتے رہے ہو اور اس کے بعد تمہاری یہ حرکت۔ اس کی وجہ مجھے بتاؤ گے عامر۔‘‘

’’تم جانتی ہو۔ تم میری بہت بڑی کمزوری ہو۔ مجھے ہر وقت خدشہ رہتا ہے کہ تم مجھے چھوڑ دو گی میں تمہیں بدصورت کر کے اس قابل نہیں چھوڑنا چاہتا تھا کہ کوئی دوسرا تم پر توجہ دے سکے۔‘‘

’’خوب‘ تم بے حد قابل نفرت ہو عامر تم نے دولت کے حصول کے لیے مجھ سے شادی کی اور اپنا غلام بنائے رکھنے کے لیے میرا چہرہ بگاڑنا چاہتے تھے۔ زیادہ ہو گیا عامر...... مجھے طلاق دے دو۔ مجھے اب تمہارے سائے سے بھی نفرت ہے۔‘‘

’’نہیں ماہ نور میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ تم میرے لیے زندگی ہو۔ میں بے کسی کی موت نہیں مرنا چاہتا۔‘‘

’’مجھے تمہاری زندگی موت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اب۔‘‘ ماہ نور نے کہا۔ اس دوران مفرور خاموشی سے کھڑا دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

’’بھول جاؤ اس بات کو ماہ نور‘ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔‘‘

یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اچانک ہی عامر کی نگاہیں مفرور اجنبی کی جانب اٹھیں‘ ایسا لگا جیسے اس نے اسے پہلی بار دیکھا ہو وہ چونک کر بولا۔

’’یہ کون ہے اور اور......اور۔‘‘

’’خادم کو جملہ معترضہ کہتے ہیں‘ اگر اجازت ہو تو چلا جاؤں۔‘‘ اس کے الفاظ سے یوں لگا جیسے وہ اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی ہو‘ لیکن ماہ نور کو نجانے کیا ہوا اس نے آگے بڑھ کر اجنبی کا بازو پکڑ لیا اور بولی۔

’’میں تمہیں نہیں جانے دوں گی‘ کیا تم مجھے اس شخص کے رحم و کرم پر چھوڑ جاؤ گے جس سے اگر ذرا سی بھول نہ ہوتی تو اس وقت نجانے میرا کیا حال ہوتا‘ میں آج تمہاری وجہ سے بچ گئی‘ ورنہ میرا زندہ رہنا مشکل تھا‘ اس کے بعد میں ساری دنیا میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتی تمہارے سوا‘ سمجھ رہے ہو نا‘ مجھے تمہاری ضرورت ہے اور تم عامر‘ تم یہ سمجھ لو کہ میں اس چھت کے نیچے اس وقت تک ہوں جب تک یہ اجنبی محافظ میرے پاس ہے۔ اگر یہ چلا گیا تو میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔‘‘

عامر کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہو گئے‘ وہ اس اجنبی کے ساتھ یہاں رہنا چاہتی ہے‘ یہ بات عامر کے لیے ناقابل برداشت تھی اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی بیوی نے کسی اور کا اعتماد حاصل کر لیا ہے‘ ایک لمحے کے اندر اس نے فیصلہ کیا کہ اس وقت ماہ نور کی بات مان لی جائے‘ کوئی اور ترکیب سوچنی ہو گی کہ یہ کانٹا ان کے درمیان سے نکل جائے‘ پھر اس نے اس مفرور پر غور کیا صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ یہ جیل سے بھاگا ہوا کوئی قیدی ہے‘ اس قیدی کو دوبارہ جیل میں پہنچایا جا سکتا ہے‘ تبھی اس نے سوال کیا۔

’’تم مجھ سے اپنا تعارف نہیں کراؤ گے‘ تمہارے ہاتھوں میں پڑی ہوئی ہتھکڑیوں سے

اندازہ ہوتا ہے کہ تم جیل سے فرار ہو کر آئے ہو۔''

''ہاں میں پچھلی رات سے مفرور ہوں' سلاخیں توڑ کر جیل سے نکلا ہوں اور دن بھر پریشان رہا ہوں' صبح سویرے ایک دھوبی گھاٹ کی طرف نکل گیا تھا جہاں سے میں نے یہ کپڑے چرا کر پہنے لیکن جیل کی یہ قمیص نہیں اتار سکتا تھا کیونکہ دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے' بہت مشکل کا شکار رہا ہوں میں کل دن بھر اور جب بھوک اور پیاس سے حالت خراب ہو گئی تو مجھے یہ کاٹیج نظر آیا اور میں یہاں آ گیا۔''

''کیا جرم کیا ہے تم نے۔''

''اتنا بڑا جرم کہ مجھے پھانسی کی سزا ہو سکتی ہے۔''

''آرام سے بیٹھو اور مجھے اپنے متعلق بتاؤ۔''

''کیوں تم میرے لیے کیا حیثیت رکھتے ہو۔''

''سنو۔'' ماہ نور نے اس گفتگو میں مداخلت کی۔ ''میں تمہارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ کیونکہ اس وقت تم نے میری زندگی' میرا چہرہ بچایا ہے۔''

''مجھ پر اگر مہربانی کرنا چاہتی ہو تو میرے لیے وہ کام کرو' مجھے اس ہتھکڑی سے نجات دلا دو اور کچھ رقم ادھار دے دو' میں تمہیں بتاؤں کہ میں چور یا بدمعاش نہیں ہوں' میں شریف آدمی ہوں اور وعدے کا پابند ہوں' جو رقم لے جاؤں گا اپنے حالات درست ہوتے ہی واپس کر دوں گا۔''

''ہونہہ شریف آدمی جملوں میں نہیں جاتے اور اگر وہ واقعی شریف ہوتے ہیں تو ان کے اندر جیل سے فرار کی ہمت نہیں ہوتی۔''

''میری بات سنو' یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر توجہ نہ دو' میں تمہیں جان بھی دے دوں تو کبھی واپس نہیں مانگوں گی۔''

اندازِ فکر

☆ بے شک اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے۔

☆ جو پرہیزگار ہیں ان کا حساب اللہ کے پاس ہے۔

☆ اسے بھی نیک کام کا حساب ملے گا جس نے دوسروں کو نیکی کا راستہ بتایا ہو۔

☆ قیامت کے دن اس نیک کام کے اجر میں سے اس کو بھی حصہ ملے گا جو نیک بات کی سفارش کرے گا۔

☆ جان بوجھ کر حق بات کو نہ چھپاؤ اور تم اس بات کو اچھی طرح جانتے ہو۔

☆ آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق خرد برد نہ کرو اور جان بوجھ کر ناحق ہضم کر جاؤ۔

☆ لوگو! اب بھی ہم نے تم کو پیدا کیا ہے اور تم قیامت کے دن دوبارہ پیدا کرنے کو حق کیوں نہیں سمجھتے جس کا کہ ہم نے وعدہ کیا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں کوئی سند نازل نہیں کی جن کو تم پکارتے ہو۔

☆ تمہارے حق میں یہ بہتر ہے کہ تنگ دست کو اصل قرضہ ہی بخش دو۔

☆ لوگوں سے ڈرنے کی بہ نسبت اللہ کا زیادہ حق ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔

☆ احکام اللہ کو ہنسی کھیل نہ سمجھو۔ اور منظور یہ ہے کہ تم ان احکام سے نصیحت حاصل کرو۔

☆ اللہ اور رسولؐ کا حکم مانو، عجب نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے۔

☆ اور میں حکم دیا گیا ہوں کہ قرآن پڑھ کر سناؤں۔ پس جو ہدایت پا گیا اس کا فائدہ اس کے نفس کو ہی پہنچے گا۔

☆ اگر روز آخرت کا یقین رکھتے ہو تو اللہ کے حکم کی تعمیل کرو۔

☆ پس چاہئے کہ ہمارے حکم بھی مانیں اور ہم پر ایمان لائیں تاکہ سیدھے راستے پر لگ جائیں۔

عامر کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا' اسے احساس ہوا کہ اس کی بیوی کس بے حیائی سے یہ باتیں کر رہی ہے۔ ''تم کیا کہہ رہی ہو میرے سامنے جانتی ہو۔'' عامر بولا۔

''جانے دو جانے دو عامر' یہ مہربان میرے لیے کیا ہے یہ تم نہیں سمجھو گے' مجھے بتاؤ اپنا نام بتاؤ مجھے۔''

تب مفرور نے آگے بڑھ کر ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''انسان کو کہانیاں سننے اور سنانے کا کتنا شوق ہوتا ہے۔ چلو ٹھیک ہے تمہاری کہانی مجھے کسی حد تک معلوم ہو گئی اب میری کہانی سنو' میرا نام شاہ میر ہے' میں ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں' چھوٹا سا تھا تو میرے باپ کا انتقال ہو گیا' ماں کہیں بھی ہو ماں ہوتی ہے' دنیا کی ہر ماں کی طرح اپنی اولاد کو چاہتی ہے' میری ماں بھی ماں تھی' بڑی قربانیاں دیں اس نے میرے لیے' جوانی میں بیوہ ہوئی لیکن دوسری شادی نہیں کی میری وجہ سے' محنت مزدوری کر کے مجھے پڑھایا لکھایا' میرے والد کا ایک دوست تھا جسے میں چچا کہتا تھا' چچا نے میری والدہ کی مالی طور پر مدد کرنا چاہی' لیکن والدہ نے انکار کر دیا۔ وہ بہت غیرت مند تھی کسی کا احسان نہیں لینا چاہتی تھی۔ ساتھ ہی وہ بہت دور اندیش بھی تھی۔ اس نے اچھا ہی کیا کہ چاچا کی مدد قبول نہیں کی کیونکہ بعد میں اس نے شادی کا پیغام بھیجا تھا اور جب میری ماں نے یہ پیغام ٹھکرایا تو وہ ہمارا دشمن بن گیا' میرا میٹرک کا رزلٹ نکلا اور میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوا تو یہ خوشخبری سنانے میں اپنے گھر کی جانب دوڑا وہاں میں نے اپنی والدہ کی چیخ پکار سنی' میرا وہ چاچا اس کی خواب گاہ میں گھس آیا تھا اور میری ماں سے دست درازی کر رہا تھا' تب میں نے وہی کیا جو ایک غیرت مند ماں کے غیرت مند بیٹے کو کرنا چاہیے تھا' میں نے اسے مار دیا' جان سے مار دیا میں نے اسے' میری غیرت کو تسکین مل گئی اور میں قانون کی گرفت میں پھنس کر عدالت تک پہنچ گیا' میری ماں مجھے بچانے کے لیے وکیلوں اور بیرسٹوں کی دہلیز پر سر پٹخنے لگی' میرے دشمن کے جوان بیٹوں نے میرے خلاف مقدمے کو بہت ہی مضبوط کر دیا' جھوٹے گواہ پیدا کر دیے اور یہ ثابت کر دیا کہ وہ چاچا بہت شریف اور نیک دل انسان تھا وہ میری ماں کی مالی امداد کرتا تھا۔ کبھی اس نے میری ماں کو بری نیت سے نہیں دیکھا' انہوں نے مجھ پر الزام لگایا کہ اب چچا میری ماں کے لیے پیسے لے کر آیا تو میں نے اس کی جیب سے وہ رقم حاصل کرنے کے لیے جان بوجھ کر اسے قتل کر دیا اور میری ماں مجھے بچانے کے لیے چچا پر الزام لگا رہی ہے۔''

شاہ میر خاموش ہو گیا اس نے گہری گہری سانس لینا شروع کر دیں جیسے سخت اذیت سے گزر رہا ہو تو ماہ نور نے ہمدردی سے کہا۔

''آؤ تم جیل سے فرار ہو کر اپنی ماں کے پاس جانا چاہتے ہو۔''

''نہیں۔'' وہ بڑے کرب سے بولا۔

''میری ماں اب اس دنیا میں نہیں ہیں' میرے وکیل سے بات کرتے ہوئے جب انہیں یہ علم ہوا کہ مجھے صرف سزائے موت ہو گی تو ان کے دل کی حرکت بند ہو گئی۔''

''آہ میرے ہمدرد' میرے محسن' میرے محسن' مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے تمہارے غم کو تازہ کر دیا ہے۔''

''خدا کرے میرا یہ غم ہمیشہ تازہ کرے اور کوئی بھی تنہائی میں کسی عورت پر حملہ کرنے آئے تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا اور آج بھی یہ شخص اسی قابل ہے کہ میں اسے اس کے ہم منصب یعنی اس بدبخت چچا کے پاس بھیج دوں اور میں اس کے لیے تمہاری اجازت چاہتا ہوں۔''

''نہیں نہیں ایسا نہ کرنا۔'' پھر ماہ نور نے

عامر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''عامر اس کی ہتھکڑی کھول دو۔''
''یہ کھل نہیں سکتی کاٹی جاسکتی ہے' لیکن یہ ایک مفرور قیدی ہے' ہمیں قانون کا احترام کرنا چاہیے۔'' عامر ذلالت سے بولا۔
''تو کیا تم اسے قانون کے حوالے کرنا چاہتے ہو۔''
''مم...... میری بات سن لو۔'' چالاک عامر نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔ ''ہم اسے قانون کے ذریعے رہائی دلائیں گے اور کسی اچھے سے بیرسٹر کے ذریعے اسے بے گناہ ثابت کریں گے۔''
''سمجھتی ہوں عامر' سمجھتی ہوں تمہیں' سمجھ رہے ہونا' میں جانتی ہوں تم کیا کرو گے' یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔''
''سنو مجھ پر بھروسہ کرو' تم جو چاہو گی میں وہی کروں گا۔''
''اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں چھوڑ کر نہ جاؤں تو اس کی ہتھکڑی کاٹ دو۔''
''میں...... میں کوشش کرتا ہوں' کہیں سے آری لانی ہوگی مجھے۔'' عامر کھڑا ہو کر بولا لیکن اس سے پہلے شاہ میر کھڑا ہو گیا۔
''بیوقوف آدمی' کیا تم مجھے اتنا احمق سمجھتے ہو کہ تم باہر جاؤ اور تمہارے پیچھے پولیس والوں کے انتظار میں بیٹھا رہوں۔''
ماہ نور نے بھی کہا۔ ''میں بھی اب اس شخص پر بھروسہ نہیں کرسکتی شاہ میر۔''
''نہیں ایسا نہیں ہوگا' میں جو کچھ کر چکا ہوں اس کے بعد ایسا اور کوئی عمل نہیں کرنا چاہتا جس کی بناء پر تم مجھ سے دور ہو جاؤ۔''
ماہ نور ایک لمحے کے لیے سوچ میں ڈوب گئی' اس نے شاہ میر کی طرف دیکھا اور اچانک اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر شاہ میر ہتھکڑی سے آزاد ہو گیا تو یہاں سے چلا جائے گا

اندازِ فکر

☆ تو حکمت کے ساتھ ان سے ایسی تدابیر سے بحث کر جو خوبی سے بھری ہوں۔
☆ قادر مطلق زبردست حکمت والا ہے۔
☆ خاموشی لازم پکڑ، مگر حق بات کہہ۔
☆ کوئی چیز بھی خرچ کرو اللہ اس کو جانتا ہے۔
☆ جب تک اللہ کی راہ میں وہ چیزیں خرچ نہیں کرو گے جو تمہیں عزیز و پیاری ہیں ہرگز نیکی کے درجہ کو نہ پہنچو گے۔
☆ نیک کام میں خرچ کئے ہوئے روپے کو احسان جتا جتا کر ضائع نہ کرو۔
☆ اللہ کی راہ میں اس قدر خرچ کرو جو تمہاری حاجت سے زائد ہو۔
☆ ہم نے جو مال تم کو دے رکھا ہے اس میں سے راہ اللہ میں بھی خرچ کرتے رہو تا کہ برکت پاؤ۔
☆ جو راہ اللہ میں نہ خرچ کر کے نعمت کی ناشکری کرتے ہیں وہ ظالم ہیں اور اپنا ہی نقصان کرتے ہیں، پس اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں وہ متقی اور پرہیزگار ہیں۔
☆ ہم نے نفس اور مال جنت کے بدلے میں خرید لئے ہیں۔
☆ انسان اپنی بری خصلتوں کی بنا پر ہی دوزخ میں جلایا جائے گا۔
☆ جو اپنی خطاؤں سے باز نہ آئیں وہی ظالم ہیں۔
☆ اگر دشمن صلح کر لینے کی خواہش ظاہر کرے تو تم بھی صلح کر لو۔
☆ متقی وہ لوگ ہیں جو خوش حالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔
☆ جو اللہ کو خوشی قرضہ دے اللہ اس کے قرض کو اس کے لئے کئی گنا بڑھا دے گا۔

اور اس کے بعد یہ منحوس شخص جو اس کی زندگی پر شیطان کی طرح قابض ہو گیا تھا' پوری طرح آزاد ہو جائے گا چنانچہ اس نے کہا۔
''تم یہاں بیٹھو میں باہر جا کر ایسی چیز تلاش کر سکتی ہوں جس سے ہتھکڑی کٹ جائے۔''
''مگر اس وقت تم ایسی کوئی چیز کہاں سے لاؤ گی اور پھر میں تمہیں تنہا اتنی رات کو باہر جاتے نہیں دیکھنا چاہتا۔'' شاہ میر نے کہا اور نجانے کیوں ماہ نور کے دل کو ایک ٹھنڈک کا سا احساس ہوا وہ بولی۔
''لیکن م ساری رات ہتھکڑی میں بندھے بیٹھے رہو گے۔
''مجبوری ہے' میں تمہارے لیے یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔''
''تب ٹھیک ہے' اس نامہربان شخص کو اس کمرے میں بند کر دیتے ہیں تاکہ یہ یہاں سے باہر نہ نکل سکے۔''
''کک ...... کیا کیا کہہ رہی ہو تم کیا کہہ رہی ہو۔'' عامر اچھل کر بولا۔
''مجبوری ہے عامر' مجبوری ہے' تمہیں یہاں قیدی رہنا پڑے گا۔'' ماہ نور نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔
''عورت ہو نا آخر' ایک سیدھی سادی گائے کی مانند تھیں' کتنے احسان کیے ہیں میرے باپ نے تم پر اور تمہارے باپ پر اور آج تم میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہی ہو۔''
''ہاں عامر' کسی کو بھی اتنا بے بس مت سمجھ لینا کہ وہ سر اٹھانے پر مجبور ہو جائے اور پھر میں آپ پر کوئی ظلم نہیں کروں گی' آپ کی بھوک پیاس کا خیال رکھا جائے گا۔''
''یعنی تم سچ مچ مجھے یہاں قید کر دو گی اور وہاں ایک جرائم پیشہ شخص کے ساتھ کھاؤ گی پیو گی۔''
''اس کا خیال رکھنا شاہ میر' میری طرف سے اجازت ہے' اگر یہ کوئی حرکت کرے تو تم اس کے ہاتھ پاؤں توڑ سکتے ہو۔'' یہ کہہ کر ماہ نور باہر نکل گئی' تب شاہ میر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
''تم اپنی بیوی کے اتنے محتاج کیوں ہو' کس بات سے ڈرتے ہو۔''
''بکواس مت کرو یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔''
''اور تیزاب سے بیوی کا حسین چہرہ بگاڑنے والا چہرہ بھی ذاتی معاملہ ہوگا کیوں۔''
''تمہیں اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''
''کوئی بات نہیں میں تمہاری بیوی سے پوچھ لوں گا۔'' شاہ میر عامر کی کمزوری کو سمجھتا جا رہا تھا۔
''ہمارے معاملات میں نہ پڑنا' ہتھکڑی سے آزاد ہوتے ہی یہاں سے چلے جانا۔'' عامر نے نفرت سے کہا۔
''نہیں میرے دوست' ایسی بات نہیں ہے مجھے چھپنے کے لیے کوئی ایسی جگہ چاہیے جہاں چھپانے والے میرے سامنے مجبور ہوں' اگر تمہاری کمزوریاں میرے ہاتھ میں آ گئیں تو میں ایک نامعلوم مدت کے لیے یہاں پناہ لے لوں گا۔''
عامر پریشانی سے اسے دیکھنے لگا' یہ نیا تازیانہ تھا اس کا خیال تھا کہ ہتھکڑی سے آزاد ہوتے ہی یہ شخص یہاں سے چلا جائے گا' لیکن وہ تو پکڑا گیا تھا' اسی وقت ماہ نور کھانے کی ٹرے لے کر آ گئی' اسے دیکھتے ہی عامر نے غرا کر کہا۔
''تم میری بیوی ہو ماہ نور اور ایک دوسرے شخص کے لیے یہ سب کچھ کر رہی ہو' وہ کہتا ہے کہ ہماری کوئی کمزوری اس کے ہاتھ آ جائے تو وہ یہیں رہ جائے گا۔''

''کیا۔'' ماہ نور خوشی سے چیخی' اس کے اندر جو سچ چھپا ہوا تھا وہ بے اختیار زبان پر آ گیا' وہ سنبھل کر بولی۔
''میں سمجھی نہیں۔''
''یہ شخص چاہتا ہے کہ ہم پولیس والوں کو اس کے بارے میں اطلاع نہ دیں' اسے قانون کے حوالے نہ کریں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اس کے آگے مجبور ہوں اور ہمیشہ اس کے دباؤ میں رہیں۔'' تب ماہ نور ایک دم ہنس پڑی پھر بولی۔
''تم نے دیکھا شاہ میر' میں نے اپنے شوہر کو پرانا رکھا ہوا سالن دیا ہے' تم میری پکی ہوئی ہانڈی لے گئے تھے نا' کچھ اور کھاؤ گے یا پیٹ بھر چکے ہو۔''
شاہ میر نے چونک کر کہا۔ ''ارے میں تو بھول ہی گیا وہ ہانڈی میں نے کاٹیج کے باہر ہی چھوڑ دی ہے' بس خوفزدہ ہو کر واپس آ گیا تھا' میں وہ ہانڈی لاتا ہوں۔'' وہ باہر جانے لگا تو ماہ نور نے کہا۔
''میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی اور اس نے کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔
عامر غصے سے پاگل ہو رہا تھا' لیکن پھر اس نے دوبارہ اپنی مصلحت پسند فطرت کو آواز دی' اگر بیوی ہاتھ سے نکل گئی تو بہت کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا' لیکن وہ کھانے کو ہاتھ نہ لگا سکا اور بہت دیر تک انتظار کرتا رہا' اس کے بارے میں سوچتا رہا' بڑی بے چینی تھی اس کے اندر' جیسے جیسے دیر ہو رہی تھی وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ شاہ میر کو اپنی آپ بیتی نہ سنا رہی ہو' اگر ایسا کر رہی ہے تو بہت حماقت کر رہی ہے' کسی کو راز دار نہیں بنایا جا سکتا' اس نے دروازے کی طرف دیکھا جس کی دوسری طرف ماہ نور کا بیڈ روم تھا' وہ اس دروازے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اگر کان لگا کر سننے لگا' لیکن ساتھ والی خواب گاہ میں گہری خاموشی تھی' اس نے کئی بار ماہ نور کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہ ملا' پتا نہیں وہ کہاں ہے۔
اس نے دروازے کے پاس سے ہٹ کر اوپر روشندان کی طرف دیکھا' اس دیوار سے ایک میز لگی ہوئی تھی' اس نے ایک کرسی اٹھائی اسے میز کے اوپر رکھا اور پھر وہ اس کرسی پر چڑھ کر ماہ نور کی خواب گاہ میں جھانکنے لگا۔ ادھر گہری خاموشی تھی' اس نے ایک دوبار آواز بھی دی' لیکن کوئی جواب نہیں ملا' کیا مزے کی بات تھی' اسے تقدیر کا کھیل کہتے ہیں۔ جو ایک مفرور قیدی تھا ہتھکڑی میں تھا وہ آزاد تھا اور جسے آزاد ہونا چاہیے وہ کمرے میں قید ہو کر رہ گیا تھا' اچانک ڈرائنگ روم سے گانے کی آواز سنائی دی۔ ریکارڈ پلیئر سے ایک پرسرور نغمہ ابھر رہا تھا اور اس نغمے کی دھن ذرا دوسری ہی تھی' عامر پر شدید جنون طاری ہونے لگا' پھر تھوڑی دیر کے بعد اسے ماہ نور کے قہقہے کی آواز سنائی دی اور وہ چونک گیا۔
اس نے کتنے ہی عرصے کے بعد ماہ نور کے قہقہے کی آواز سنی تھی۔ وہ لپک کر دروازے کے پاس آیا اور پیٹنے لگا۔
''دروازہ کھولو' دروازہ کھولو۔'' وہ چیخا۔ ہنسی تھم گئی' گانے کی آواز بھی رک گئی' پھر دروازے کی دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔
''کیا بات ہے' کیوں شور مچا رہے ہو۔''
''دروازہ کھولو' میری بات سنو۔''
''ابھی دروازہ نہیں کھلے گا' تم کھانا کھا چکے ہو تو آرام سے سو جاؤ۔''
''کیا بکواس کر رہی ہو' تم میری بیوی ہو۔''
''بکواس تم کر رہے ہو عامر' جس عورت پر بھروسہ نہیں کر سکتے' اسے بیوی بنا کر کیوں رکھا ہوا

ہے' سو جاؤ اور اگر نہیں سو سکتے تو جاگتے رہو۔''
''میری بات تو سن لو' میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' لیکن جواب میں ماہ نور کی کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ چنانچہ اس نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا اور کچھ لمحوں کے بعد ماہ نور کی آواز سنائی دی۔
''میں آخری بار کہہ رہی ہوں' اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو میں شاہ میر کے ساتھ چلی جاؤں گی۔''
اس کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور وہ دروازے کو پیٹنے کی جرات نہ کر سکا' عورت کو بے لگام ہونے کا موقع مل رہا ہو تو اس کی بات مان کر ہی اسے لگام دی جا سکتی ہے' حالانکہ وہ ماہ نور کو بچپن سے جانتا تھا ایک شرمیلی سی اور سیدھی سادی لڑکی جس نے شاید عامر کے علاوہ کبھی کسی سے بات بھی نہ کی ہو' وہ غیر مردوں سے ہمیشہ گھبراتی تھی' عامر دروازے کے پاس سے ہٹ گیا البتہ اسے اس بات کا یقین تھا کہ ماہ نور بدکردار نہیں ہے۔ وہ جس رویے کا اظہار کر رہی ہے وہ ایک طویل جھلاہٹ کا نتیجہ تھا' حالات سے مجبور ہو کر ایک عورت اگر اپنے شوہر کا گریبان پکڑ لے تو وہ الگ بات ہے' لیکن کسی مرد کا ہاتھ وہ اپنے گریبان تک کبھی نہیں پہنچنے دے گی۔
وقت گزرتا رہا' پھر اچانک اسے ماہ نور کی خواب گاہ سے رونے کی آواز سنائی دی اور وہ فوراً ہی میز پر چڑھ کر کرسی پر کھڑے ہو کر روشندان کی طرف دیکھنے لگا' وہ بستر پر اوندھے منہ پڑی رو رہی تھی پھر اسے ماہ نور کی آواز سنائی دی۔
''شاہ میر خدا کے لیے میرے کمرے سے چلے جاؤ' میں عورت ہوں اور عورت کو بدنام ہونے میں کچھ وقت نہیں لگتا۔''
''نہیں ماہ نور' تم کمزور نہیں ہو' تم نے مجھے جو کچھ بتایا ہے اس کے پیش نظر کوئی بھی عورت کہیں بھی بہک سکتی تھی' لیکن تم عظیم ہو' میں تمہاری قدر کرتا ہوں۔''
عامر غصے سے بولا۔ ''اس کے کمرے سے باہر نکل آؤ کمینے وہاں کھڑے باتیں کیوں بنا رہے ہو۔'' پھر اس نے شاہ میر کو دیکھا جو ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں سے روشندان نظر آ رہا تھا' اس نے کہا۔
''ظالم آدمی تم نے اس بیچاری کو شادی کے نام پر قید کر رکھا ہے' اوپر سے اس کا چہرہ بگاڑ رہے تھے' میرا دل چاہتا ہے کہ میں ایک جرم اور کر لوں اور تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔''
''ایسا نہ کہو شاہ میر' کیا تم دونوں کے لڑنے سے میری تقدیر بدل جائے گی۔''
''ہاں بدل سکتی ہے۔ تم اس سے طلاق لے لو۔''
''تو بکواس کر رہا ہے کتے' میری بیوی کو بہکا رہا ہے۔'' عامر غصے سے دہاڑا تو ماہ نور بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور غرا کر بولی۔
''میں ضرور طلاق لوں گی' تم میرا تماشا دیکھ رہے ہونا' اگر میں بہک گئی تو نجانے کیا سے کیا ہو سکتا ہے۔''
''اگر اس شخص نے تمہیں سبز باغ دکھائے ہیں ماہ نور تو بھول جاؤ' یہ قاتل ہے اور ایک دن اسے ضرور پھانسی کی سزا ہو جائے گی۔''
''میں تو کچھ اور ہی سوچ رہی ہوں عامر۔ اگر تم مجھے اپنی بیوی بنائے رکھنا چاہتے ہو تو اسے میرا مطلب ہے شاہ میر کو قانون کی نظروں سے چھپا کر رکھنا ہوگا ہمیں۔''
''کب تک آخر کب تک۔''
''اب تم آرام کرو اس کا فیصلہ ہم صبح کریں گے۔'' ماہ نور نے کہا اور اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی۔
بقیہ رات گزرنے میں وقت ہی کتنا رہ گیا

تھا' عامر تڑپتا کلستا رہا' ہر چند اس کا اپنی بیوی سے کوئی ازدواجی رشتہ قائم نہیں ہو سکا تھا' لیکن وہ ایک غیر مرد کے ساتھ تنہا اپنی خواب گاہ میں ہو' یہ بات بھی عامر سے برداشت نہیں ہو رہی تھی' رات بھر وہ سوچوں میں ڈوبا رہا تھا اور پھر صبح کی روشنی نمودار ہوگئی' پھر دروازہ کھلا اور ماہ نور ناشتہ لیے اس کے کمرے میں داخل ہوگئی' اس وقت اس کے چہرے میں نرمی نظر آ رہی تھی۔

''میرا تمہارا بچپن کا ساتھ ہے عامر' لیکن ذرا غور کرو جو کچھ ہوا ہے اس پر غور کرو' کیا تم نے میرے ساتھ اچھا کیا ہے' میں اگر چاہتی تو نجانے کیا کر سکتی تھی' لیکن میں نے کبھی تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔'' عامر پرخیال نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا' پھر بولا۔

''آخر تم کیا چاہتی ہو۔''

''بس میں چاہتی ہوں' میں چاہتی ہوں کہ میں بھی ایک ایسی زندگی بسر کروں جو شوہر اور بیوی کے درمیان ہوتی ہے' وہ جیسا بھی ہے تم سے بہت اچھا ہے' میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

عامر کا چہرہ پیلا پڑ گیا' چند لمحات سوچتے رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ''دیکھو میں نے کبھی تم سے عشق نہیں کیا اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ تم میری بیوی صرف اس لیے بنی ہو کہ میرے باپ نے ایک ناجائز شرط لگا دی تھی' اس کی وجہ سے مجھے تم سے شادی کرنا پڑی۔ لیکن مجھے اس بات کا جواب دو کہ اگر تم مجھ سے علیحدہ ہوگئیں تو اس دولت اور جائداد کا کیا ہوگا۔''

''اس کا حل ہے عامر۔''

''کیا......''

''تم خاموشی سے مجھے طلاق دیدو۔ ہم اس بات کو عام نہیں کریں گے۔ میں خاموشی سے قانونی اور مذہبی تقاضے پورے کروں گی اور شاہ میر سے شادی کرلوں گی۔''

اندازِ فکر

☆ جن کے دلوں میں اللہ کا خوف ہے وہی نصیحت پر عمل کرتے ہیں۔

☆ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تم بے فائدہ پیدا کئے گئے ہو؟ اور تم پر کچھ فرض نہیں ہے۔

☆ بدلہ لینے سے پہلے یہ ضرور خیال کرلیا کرو کہ تم اپنے اللہ کے نزدیک کتنے قصوروار ہو؟

☆ جو نیک بندے ہیں وہ خیرات کرتے ہیں اور اس کا پھل پاتے ہیں۔

☆ خیرات کر کے کسی پر احسان نہ جتاؤ۔

☆ تم ہماری یاد میں لگے رہو کہ ہمارے ہاں بھی تمہارا ذکر خیر ہوتا رہے۔

☆ جو خوبی سے بھری ہوں ایسی تدابیر کے ساتھ بحث کر۔

☆ پرہیزگاروں کو وہی خوبی سے جانتا ہے۔

☆ اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے عورتوں اور مردوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

☆ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے اس کے قدم بقدم نہ چلو۔

☆ اگر دشمن صلح کرلینے کی خواہش ظاہر کرے تو تم بھی صلح کرلو۔

☆ جب تمہیں سلام کے ذریعہ سے دعا دی جائے تو اس کے جواب میں بہتر دعا دو یا وہی کلمہ جواب میں کہہ دو۔

☆ آدمی بہتری کی دعا سے کبھی نہیں اکتاتا اور جب تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی لمبی دعائیں کرتا ہے۔

☆ جب کوئی ہم سے دعا کرے تو ہم بھی دعا کرنے والے کی دعا سنتے ہیں اور مناسب ہوتا ہے تو قبول بھی کرلیتے ہیں۔

☆ اہل ایمان کے دل اللہ کی یاد سے سکون پاتے ہیں۔ خبردار رہو کہ دلوں کا چین اللہ کے ذکر ہی میں ہے۔

عامر کے چہرے پر کچھ لمحوں کے لیے سوچ کی پرچھائیاں رقصاں رہیں پھر وہ بولا۔

''ٹھیک ہے' مگر میری شرط یہ ہے طلاق تحریری نہیں زبانی دوں گا اور زبانی طلاق تم جانتی ہو' ہو جایا کرتی ہے' دوسری شرط یہ ہے کہ تمہارا اور شاہ میر کا نکاح نامہ میری تحویل میں رہے گا' تم میری مرضی کے خلاف کبھی کسی اور کو اپنا شریک حیات ثابت نہیں کر سکو گی۔''

''یہ بھی مجھے منظور ہے۔''

''تم ایک ہفتے میں صرف چوبیس گھنٹے کے لیے اس کاٹیج میں آ کر رہو گی' باقی دن میرے ساتھ شہر میں رہا کرو گی۔''

''نہیں یہ بہت کم وقت ہے۔'' ماہ نور نے کہا۔

''میں احتیاطاً ایسا کر رہا ہوں' میں نہیں چاہتا کہ دنیا والوں کو اس بات کا اندازہ ہو' میری بدنامی ہو گی' تمہاری بھی ہو گی اور وہ پکڑا جائے گا۔''

''میں ہر پابندی قبول کر لوں گی لیکن صرف ایک شرط پر کہ آپ صحیح معنوں میں شاہ میر کو پناہ دیں گے اگر وہ کبھی قانون کی گرفت میں آ گیا تو میری اور آپ کی دشمنی ہو جائے گی اور میں اس راز کو راز نہیں رکھوں گی اور دنیا والوں کو ساری صورت حال بتا دوں گی۔''

''یہ تمہاری بے جا شرط ہے' اگر شاہ میر کبھی اپنی حماقت کی وجہ سے قانون کی گرفت میں آ گیا تو میں کیا کر سکوں گا۔''

''اس کا خیال میں خود رکھوں گی اور اسی شرط پر سب کچھ ہو گا۔''

''چلو ٹھیک ہے' مجھے منظور ہے۔'' عامر نے کہا اور اس کے بعد ان اوزاروں کا بندوبست کیا گیا جس سے ہتھکڑی کاٹی جا سکتی تھی' لیکن ہتھکڑی کاٹنے سے پہلے عامر نے کہا۔

''میں ان شاہ میر کی ان ہتھکڑیوں کے ساتھ کچھ تصویریں اتارنا چاہتا ہوں تاکہ یہ ریکارڈ رہے۔''

''تصویریں کیوں اتارنا چاہتے ہو۔''

''اس لیے کہ انسان مسرت بھرے لمحات میں گزری ہوئی مصیبتوں کو بھول جاتا ہے' میں چاہتا ہوں شاہ میر ہتھکڑی کو یاد رکھے۔'' وہ مختلف زاویوں سے اس کی تصاویر اتارنے لگا' شاہ میر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جو کچھ بھی ہے' لیکن میری حقیقت کبھی نہیں بھلائی جا سکے گی۔''

''اور تم جانتے ہو شاہ میر کہ ہم تینوں اس معاہدے کے پابند ہیں' کسی بھی وقت کسی کا بھی ذہن بھٹک سکتا ہے۔''

''میں جانتا ہوں میری زندگی تم دونوں کے رحم و کرم پر ہے۔ چنانچہ میں ایک اچھا انسان رہوں گا' تاکہ زندگی بچ سکے۔''

''ٹھیک ہے ماہ نو. جو کچھ ہو رہا ہے تم جانتی ہو کس طرح سے ہو گا۔''

''ہاں میں جانتی ہوں میں ایک ایسی دلہن بننے والی ہوں جس کے دولہا کے سر پر سہرا نہیں بلکہ گلے میں پھانسی کا پھندا نظر آ تا رہے گا۔''

''بہت ہی دکھ بھری کہانی ہے ماہ نور' تم میرے باپ کی آرزو کے مطابق میری شریک حیات بن کر میری زندگی میں آئیں' لیکن میں خود کو تمہارا اہل ثابت نہیں کر سکا' تم میری شریک حیات ہی نہیں بلکہ بچپن کی ساتھی بھی ہو اور یہ حقیقت ہے کہ شاید میری زندگی کی سب سے قیمتی چیز۔''

عامر نے اسے تین بار طلاق دے دی اور ماہ نور زار و قطار رونے لگی' وہ جانتی تھی کہ طلاق عورت کو ایک کھوٹا سکہ بنا دیتی ہے۔ طلاق شدہ عورت کا کوئی مول نہیں ہوتا' لیکن کیا کرتی کوئی اور وقت ہوتا تو ماہ نور اتنی جلدی کسی دوسرے مرد کو اپنا جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ نہ کرتی' لیکن

حالات ایسے تھے کہ وہ ایک لمحے کے لیے اندر سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ پھر وہ عدت کے دن گزارنے لگی اور اس دوران شاہ میری اپنا حلیہ بدلنے لگا' اس نے بہت کچھ تبدیل کر لیا تھا اور اتنا بدل گیا تھا کہ دور سے پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔

اس دوران ایک دو بار پولیس والے کاٹیج میں آئے بھی تھے' لیکن شاہ میر نے جو حلیہ بدلا تھا وہ بہت شاندار تھا اور ویسے بھی ماہ نور نے وہاں شاہ میر کے چھپنے کا معقول بندوبست کر لیا تھا۔ غرضیکہ اس طرح وقت گزرتا رہا' عامر معاہدے کے مطابق ان سے پوری طرح تعاون کر رہا تھا' لیکن اندر جو بے چینی تھی وہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی' کاش ماہ نور من مار کر اس کے ساتھ گزارہ کر لیتی' آخر کار عدت کے دن پورے ہو گئے اور دوسرا نکاح پڑھانے کا وقت آ گیا۔ یہ کام بھی عامر ہی کو کرنا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ کوئی قاضی رازدار نہیں بن سکتا' آخر ایک دن اس نے ایک قاضی سے بات کی اور آخر کار ماہ نور دوسری بار سہاگن بن گئی۔

اس کی زندگی میں بہار آ گئی تھی' عامر نے طے کیا تھا کہ وہ کاٹیج میں صرف چوبیں گھنٹے کے لیے ہفتے میں ایک بار آئے گی کیونکہ سہاگ کی نئی نئی مسرت تھی' اس لیے اس کے التجا کرنے پر عامر تین چار دن تک وہاں ٹھہر گیا۔ اس وقت بڑی عجیب و غریب پوزیشن تھی' خود ماہ نور کو بھی عجیب محسوس ہو رہا تھا' پھر ایک دن اچانک رشتے کی دو عورتیں اپنے شوہروں اور دو بچوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئیں' انہوں نے کہا کہ بیٹا کئی دن سے تمہاری خیریت نہیں معلوم ہوئی تھی' ہم خیریت معلوم کرنے کے لیے آ گئے تھے۔ عامر نے گھور کر ماہ نور کو دیکھا تو ماہ نور نے ناگواری سے کہا۔

''کمال کرتی ہیں آپ لوگ' ہم چار دن شہر نہ پہنچے تو مر گئے ہوں گے کیا۔''

ایک بوڑھی عورت نے کہا۔ ''اے بیٹی' مریں تمہارے دشمن' کیا خیریت پوچھنا بھی گناہ ہے۔''

''خیریت پوچھنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہمیشہ سر پر سوار رہا کریں' ہمیں شہر میں تنہائی میں بالکل سکون نہیں ملتا۔ جب دیکھو کوئی رشتے دار کوئی دولت کوئی کاروباری کچھ تو تنہائی کا موقع دیں۔''

''ارے ہاں عامر تمہارا وہ دوست کہاں ہے جو اس کاٹیج میں رہتا ہے۔'' عامر نے ہچکچاتے ہوئے دوسرے کمرے کی طرف دیکھا' پھر کہا۔

''چچا جان وہ تنہائی پسند ہے' کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتا۔''

''چلو ہمارا کیا ہے' ایک آدھ دن رکتے ہیں' پھر واپس چلتے ہیں۔''

''وہ اصل میں چچی جان میرا شہر جانا بہت ضروری ہے۔''

اسی وقت ماہ نور نے کہا۔ ''ذرا میری ایک بات سنیں عامر۔'' عامر اس کے پیچھے چلتا ہوا دروازے سے باہر نکل آیا تو ماہ نور بولی۔

''یہ لوگ یہاں آ گئے ہیں' آپ ایک دن کے لیے اور رک جائیں تو کیا ہرج ہے۔''

''یہ تمہاری حماقت کی وجہ سے آئے ہیں۔'' عامر نے غصے سے کہا۔

''اگر ہم چار دن یہاں نہ رکتے تو۔''

''میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ بہت سے مسئلے پیدا ہو جائیں گے۔''

''نہیں ہمیں ابھی یہاں سے چلنا ہو گا۔ آج میں تمہارے کہنے پر رک جاؤں گا تو تمہارے اور شاہ میر کے درمیان اشاروں میں بات چیت ہو گی' یہ بوڑھیاں بہت تیز طرار ہیں' چوری پکڑ لیں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ واپس جانے پر مجبور ہو

گئی' اپنے کمرے میں آئی اور شاہ میر کے پاس بیٹھ کر رونے لگی' کھل کر رو بھی نہیں سکتی تھی' دوسرے کمرے میں لوگ بیٹھے ہوئے تھے' اس نے کہا۔

''تقدیر میرا سخت امتحان لے رہی ہے شاہ میر کیا کروں مجبوری ہے۔''

شاہ میر نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''کاش اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایسی جگہ ہوتی جہاں میں آزادی کے ساتھ تمہارے ساتھ رہ سکتا۔ میرے جرم نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا' میں بھی ایک مجبور اور کمزور انسان کی طرح چھ دنوں تک تمہارا انتظار کروں گا۔''

دیر تک وہ ایک دوسرے سے محبت بھری باتیں کرتے رہے' پھر عامر کی آواز سنائی دی۔

''جلدی کرو ہمیں جانا ہے۔''

وہ بچھڑ گئے' ماہ نور اس کی بیوی نہیں رہی تھی اب' لیکن چھ دنوں تک اس کے اختیار میں تھی۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جنہیں تیرنا نہیں آتا' وہ دوسرے کو ڈوبتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہا' چھ دن کی جدائی کے بعد ساتویں دن ان کی زندگی میں بہار آجاتی تھی' یہ ایک طرح سے بہتر ہی ہوتا ہے' تاکہ یکسانیت نہ پیدا ہو' پھر محبت کا ثمر ملنے کا وقت آ گیا' شاہ میر نے جب یہ خوشخبری سنی تو خوش ہو کر کہا۔

''ہمیں اپنی محبت کا انعام ملنے والا ہے۔ کیا ہوتی ہیں وقت کی کہانیاں' پہلے میں پھانسی کے تختے پر پہنچ رہا تھا' تقدیر نے مجھے تمہاری آغوش میں پہنچا دیا اور اب میں باپ بننے والا ہوں' جب یہ بات عامر کو معلوم ہوئی تو اس نے شاہ میر سے کہا۔

''کیوں اتنا خوش ہو رہے ہو۔''

''کیا باپ بن کر خوش نہیں ہوتی۔''

''ٹھیک ہے' لیکن دنیا کی نظر میں تم کیا ہو' ایک مفرور مجرم ایک قاتل۔''

''معاہدے کی رو سے تمہیں یہ بات زبان پر نہیں لانی چاہیے۔ تم نے مجھے پناہ دینے اور ہمیشہ حفاظت کرنے کا وعدہ کیا ہے۔''

''میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ لیکن مجھے عجیب سا لگ رہا ہے' کیا تم کسی کے سامنے خود کو بچے کا باپ کہہ سکتے ہو۔ معاہدے کے مطابق میں آج بھی ماہ نور کا شوہر اور اس کے بچے کا باپ تم محض میرے دوست ہو جو اس کاٹیج میں رہتے ہو۔''

شاہ میر سے کوئی جواب نہ بن پڑا' لیکن ماہ نور نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور پریشان لہجے میں بولی۔ ''آہ میں نے معاہدہ کرتے وقت اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔''

''کیسا معاہدہ' میں تمہارا شوہر ہوں اور تمہارے بچے کا باپ۔'' شاہ میر بولا تو عامر نے چمک کر کہا۔

''نکاح نامہ میری تحویل میں ہے اور دنیا والے کچھ نہیں جانتے' اس کے علاوہ ماہ نور تم اپنے وعدے کے لیے پابند ہوں اور اس کے مطابق تمہارے بچے کا برتھ سرٹیفکیٹ میرے نام سے بنے گا' میرے خاندان میں اس بچے کی پیدائش کی خوشیاں منائی جائیں گی اگرچہ مجھے کسی بچے سے دلچسپی نہیں ہے' لیکن ان حالات کا کیا کیا جاسکتا ہے۔''

شاہ میر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ تقدیر اس سے بڑا بھیانک مذاق کر رہی تھی۔ پہلے ماہ نور کو بیوی بنایا' لیکن اب اس کی بیوی دوسرے کے نام سے پہچانی جا رہی ہے' اپنا بچہ بھی دوسرے سے منسوب ہونے والا تھا' وہ کبھی اسے باپ نہ کہتا جبکہ وہ اس کا اپنا باپ تھا' کاش میں قاتل نہ ہوتا تو ماہ نور بھی میرے نام سے ہوتی اور بچہ بھی میرے نام سے پہچانا جاتا' دنیا میں نام سے تو سب رشتے ہیں' یہ ایک بہت بڑی سچائی تھی' مگر میں تو ایک مفرور قاتل کے نام سے پہچانا جاتا

ہوں۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا اور یہی ہوا۔ آخر کار ماہ نور ایک بچے کی ماں بن گئی اور عامر کے گھر میں خوشیوں کا طوفان آ گیا۔
عامر، ماہ نور اور شاہ میر کو جلانے کے لیے بڑی خوشیاں منا رہا تھا، رشتے داروں کا ہجوم تھا، ناچ گانے کی محفل جمی ہوئی تھی، لیکن ماہ نور خوشی اور غم کے ملے جلے تاثرات سے دوچار تھی، بہت ہی خوب صورت بیٹے کو جنم دیا تھا اس نے اور وہ بیٹا ہر رشتے دار کی گود میں جا رہا تھا، سب اسے چوم رہے تھے، تحفے دے رہے تھے، لیکن اسے یہ غم ستا رہا تھا کہ جو باپ ہے وہ بیچارہ کال کوٹھڑی میں اکیلا پڑا ہو گا، پھر وہ رشتے داروں کی بھیڑ سے نکل کر ایک کمرے میں گئی۔ عامر کو بلایا اور بولی۔
"ایسے موقع پر میں شاہ میر کو نہیں بھول سکتی، ساری خوشیاں اسی کی ہیں۔"
"تو میں کیا کروں۔"
"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی طرح وہ چھپ کر یا بھیس بدل کر آ جائے اور اس خوشی میں شریک ہو سکے۔"
"پاگل ہو گئی ہو تم، وہ یہاں آئے اور کسی طرح پولیس والوں کی نظروں میں چھپنے لگے، ہاں اگر تم اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچانا چاہتی ہو تو بے شک بلا لو۔" وہ خاموش ہو گئی، پھر چند لمحات کے بعد بولی۔ "تم اس کی ایک بات تو رکھ لو۔"
"کونسی بات۔"
"اس کی خواہش ہے کہ اس کے بیٹے کا نام اس کے نام پر رکھا جائے۔ میں نے اس کے لیے ایک نام بھی سوچ لیا ہے۔"
"ہرگز نہیں، یہ بچہ میرے نام سے منسوب ہے، میں اس کا نام اپنے نام کی مناسبت سے رکھوں گا۔" ماہ نور خاموش ہو گئی، بہرحال عامر نے یہاں بھی خوشیاں منائیں وہ ایک بیٹے کا

اندازِ فکر

☆ آنکھیں اندھی نہیں بلکہ وہ دل جو سینے میں ہیں اندھے ہیں۔

☆ اے محمدؐ! اگر تم کہیں کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے آس پاس سے ہٹ جاتے۔

☆ اس پر اللہ کی لعنت ہو جو اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے اور ان کے دلوں میں شبہے ڈال کر ان میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

☆ مومنین کے دل نیک ہوتے ہیں۔ ان سے اگر غلطی ہو جائے تو فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔

☆ نصیحت تو وہی لوگ پکڑتے ہیں جن کے دل میں اللہ کا خوف ہے۔

☆ جو صاحب دل ہے اس کے لئے قرآن کی نصیحت کافی ہے۔

☆ ہے جو کوئی اللہ کی خوش دلی کے ساتھ قرض دے کہ اللہ اس کے لئے کئی گنا بڑھا دے۔

☆ یہ لوگ صداقت سے گزر جاتے ہیں۔ ان کے دل تو ہیں لیکن سمجھ سے کام نہیں لیتے۔

☆ تمہارا سوتا ہوا دل اور دماغ بے دار ہو جائے کیا اتنی قابلیت بھی تم میں نہیں۔

☆ اللہ ظالموں کو اسی حد تک مہلت دے رہا ہے جس دن کہ مارے خوف کے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔

☆ اس دن سے پہلے پہلے جس دن کہ موت آ کھڑی ہو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو۔

☆ نیک بات کی سفارش کا اجر قیامت کے دن یقیناً ملے گا۔

☆ اللہ کی راہ میں ناکارہ چیز کے دینے کا ارادہ تک بھی نہ کرنا کہ اس میں سے خرچ کرنے لگو حالانکہ وہی چیز ہم تم کو دینا چاہیں تو تم اس کو کبھی خوشی سے نہ لو گے۔

☆☆☆

باپ بن گیا ہے' دنیا والوں کے سامنے بھرم رہ گیا' لیکن وہ سرپھرا قاتل اگر ضد پر اتر آیا تو اس کی خاطر پھانسی کے پھندے تک پہنچ جانا منظور کر لے گا' ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے اور بھی بہت سے بچے ہوں گے میں کیوں کسی کے بچوں کا باپ بنتا رہوں' میرا بھرم رکھنے کے لیے یہ ایک ہی کافی ہے' اب اسے شاہ میر کانٹے کی طرح چبھنے لگا تھا' اگر وہ اس دنیا میں نہ رہے تو ماہ نور ایک بیوہ کی حیثیت سے ہی سہی عامر ہی کے رحم و کرم پر ہو جائے گی' کرنا چاہیے کچھ کرنا چاہیے۔

اسی طرح شاہ میر بھی بے چین تھا اور اپنی شدید کمزوری کا احساس اس پر شدید طاری ہو گیا تھا۔ پھر جب چھ دن کے بعد ماہ نور اس کے پاس آئی تو وہ ناراض تھا' اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''تم نے مجھ سے شادی کی تھی۔''

''کیا تم مجھے اپنی بیوی بنا کر پچھتا رہے ہو شاہ میر۔''

''آہ میرا کیا ہے' تم نے میری اور اپنی ساری کمزوریاں اس کے ہاتھوں میں دے دی ہیں۔''

''تو بتاؤ کیا کرتی' میں نے اس وقت اولاد کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔''

''سنو ماہ نور' سنو اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے' ہمارا بچہ ابھی کچھ سمجھتا نہیں' جب وہ بولنے اور سمجھنے لگے گا تو مجھے کبھی باپ نہیں کہے گا' اس سے پہلے ہم اسے دور لے جائیں گے۔''

''مگر شاہ میر' قانون کی گرفت سے کیسے بچو گے۔''

''آہ تم مجھے اور بزدل نہ بناؤ۔''

''تم کیا چاہتے ہو۔''

''سنو اگر عامر ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سو جائے تو تم زیادہ سے زیادہ اس کی بیوہ کہلاؤ گی' دولت مند بیوہ وہ کانٹا ہمارے راستے سے نکل گیا ہے۔''

''تت' تمہارا دماغ چل گیا ہے کیا۔'' وہ سہم کر بولی۔ ''تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے غیرت میں آ کر قتل کیا تھا' تم کوئی عادی مجرم نہیں ہو' میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ عامر کو بھی قتل کرنے کے بارے میں نہ سوچنا' نہ میں تمہارا ساتھ دوں گی اور نہ تمہاری حمایت کروں گی۔''

''کیا تمہارے دل میں ابھی تک عامر کے لیے جگہ ہے۔'' وہ بیچارگی سے بولا۔

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو' مجھے الزام نہ دو' عامر کی وجہ سے تم یہاں محفوظ ہو' فرض کرو عامر کے دن پورے ہو جاتے ہیں وہ مر جاتا ہے' تب اس کے تمام رشتے دار پوچھیں گے کہ تم اس کاٹیج میں کیوں رہتے ہو' فرض کرو اگر تم اس کے دوست کی حیثیت سے یہاں رہتے بھی ہو تو وہ پوچھیں گے کہ میں تمہارے پاس یہاں کیوں آئی ہوں' ابھی تو عامر ایک پردہ ہے' تم اس پردے کو چاک کر دینا چاہتے ہو۔''

شاہ میر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا' کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس' اس نے بچے پر جھک کر اسے چومتے ہوئے کہا۔

''یہ ہفتے میں صرف ایک دن کے لیے میرا ہوتا ہے' ابھی یہ نادان ہے جب رشتوں کو سمجھے گا تو میرے پاس آئے گا بھی نہیں' میں بھی اسے بیٹا نہیں کہہ سکوں گا' زیادہ سے زیادہ یہ مجھے انکل کہنا شروع کر دے گا۔''

''جتنا سوچتے جاؤ گے' الجھتے جاؤ گے' ہم آئندہ اولاد نہیں پیدا کریں گے' اس طرح تمہیں صرف ایک بچے کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہوگا اور تم اس کے عادی ہو جاؤ گے۔''

''ہاں ٹھیک کہتے ہو۔''

رات کے وقت عامر اپنے کمرے میں رہتا تھا' بچہ بھی اسی کے پاس رہنے لگا' جب وہ ایک سال کا ہوا تو ماہ نور نے اسے ہفتے میں ایک دن آیا کے پاس چھوڑ دینا شروع کر دیا' شہر کی کوٹھی

میں اور بھی رشتے دار تھے' وہ بھی بچے کی دیکھ بھال کرتے تھے' اس طرح شاہ میر کا بیٹا جس کا نام عامر نے اپنے نام کے ساتھ ظاہر رکھا تھا اپنے باپ سے دور ہو گیا۔ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے' ایسا ہی ایک نیا کھیل عامر کے ساتھ ہوا' عامر کا ایک بچپن کا دوست جس کا نام مرزا محفوظ تھا اور جو طویل عرصے سے ملک سے باہر تھا واپس آیا' اس سے زیادہ رازدار عامر کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ عامر کی پوری ہسٹری اس نے پڑھی اور بولا۔

''کیسی باتیں کرتے ہو عامر' تم اٹھارہ برس کی عمر تک بالکل نارمل تھے' پھر تمہیں چیچک نکل آئی اور یہ مرض بڑا موذی ہوتا ہے' یہ انسان کے اندر کوئی عیب چھوڑ ہو جاتا ہے جو تمہارے ساتھ ہوا' اس میں ہارمونز کی کمی ہو جاتی ہے' تمہارا علاج بالکل ممکن ہے اور ڈاکٹر مرزا محفوظ نے اس کا علاج شروع کر دیا اور عامر خوشی سے دیوانہ ہو گیا' اس کی کھوئی ہوئی زندگی واپس آ گئی تھی' وہ ماہ نور کے بارے میں سوچ رہا تھا' ماہ نور اس کے بچپن کی ساتھی تھی اور اسے بے حد پسند کرتا تھا وہ' لیکن اب صورت حال اتنی مختلف ہو گئی تھی وہ اپنے بارے میں تجربے کے لیے سوچنے لگا۔

جس وقت وہ گھر پہنچا رات کے دو بج رہے تھے' دروازہ کھولنے والی ایک نوجوان ملازمہ تھی اس گھر میں بڑا پاکیزہ سا ماحول تھا' اس لیے کسی کو کسی قسم کا اندیشہ نہیں تھا' ملازمہ کو دیکھ کر عامر کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی' وہ دروازے سے پیچھے ہٹی تو عامر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور ملازمہ چونک پڑی۔

''سنو' مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے' دروازہ بند کر کے میرے کمرے میں آ جانا۔''

''صاحب جی' کیا کہہ رہے ہیں آپ۔''

''سوچ لو تمہیں آنا ہو گا۔ ورنہ تم اس نوکری پر نہیں رہ سکو گی۔'' یہ کہہ کر عامر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ملازمہ دنگ رہ گئی تھی' اس کوٹھی میں آج تک ایسا کوئی کام نہیں ہوا تھا جس پر کسی کو کوئی تردد ہو' پھر وہ وہاں سے ہٹ کر ماہ نور کی خواب گاہ کے پاس پہنچی' دروازے پر دستک دی تو دروازہ کھل گیا' ماہ نور کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔

''کیا مصیبت آ گئی۔''

''بیگم صاب' کچھ کہنا ہے مجھے آپ سے۔''

''ہاں بولو۔''

''صاب آج بہت بری طرح سے بدلے ہوئے ہیں' مم میں میں ڈر رہی ہوں۔'' ملازمہ نے ساری بات ماہ نور کو بتا دیں اور ماہ نور کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''میں نہیں ماننے والی مگر خیر تم ان کے کمرے میں جاؤ' میں تمہارے پیچھے پیچھے آتی ہوں۔'' ملازمہ ہچکچانے لگی تو ماہ نور نے اسے ڈانٹ دیا۔

''جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ کرو' سمجھیں وہی کرو۔'' بمشکل ملازمہ اس کے لیے تیار ہوئی تھی پھر خود کو پوری طرح سنبھال کر وہ عامر کے کمرے کی طرف چل پڑی دروازے تک پہنچی تھی کہ اسے ملازمہ کی چیخ سنائی دی۔ وہ دوڑتی ہوئی عامر کے کمرے سے نکلی تھی اور عامر شیطانی انداز میں اس کے پیچھے لپک رہا تھا۔ ماہ نور کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ ملازمہ بھاگ گئی تھی۔ عامر نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ اچھا ہوا تم آ گئیں۔ حق بحقدار رسید۔ میں آج بھی دنیا کی نظروں میں ہوں۔''

''تمہارا شوہر ہوں' تمہارے ساتھ کوئی بھی سلوک کر سکتا ہوں' میرے خلاف کوئی کچھ نہیں کر سکے گا' بس نصیبوں کی بات ہے۔ بچپن سے تمہیں چاہتا ہوں لیکن بس نجانے کیا ہو گیا تھا

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ چیچک کی وجہ سے میں بہت سی مردانہ صلاحیتوں سے محروم ہو گیا تھا' لیکن اب میں ٹھیک ہوں ماہ نور یہ الگ بات ہے کہ تقدیر نے مجھے تم سے علیحدہ کر دیا۔''

ماہ نور گم صم سی اس کا منہ تکتی رہی تو وہ بولا۔

''خیر کوئی بات نہیں' میں آج بھی تمہارا مخلص دوست ہوں' میں تمہارے مرضی کے خلاف تمہارا ہاتھ نہیں پکڑوں گا' جاؤ اپنے کمرے میں جا کر آرام سے سو جاؤ۔'' ماہ نور کچھ نہ بول سکی' کمرے میں آ کر خاموش بیٹھی رہی' اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو اس سے پہلے کہ وہ ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھاتی دوسری طرف سے عامر نے فون کا رسیور اٹھا لیا' ماہ نور نے بھی ریسیور اٹھا لیا تھا۔

''کیا مسٹر عامر موجود ہیں۔''

''ہاں ہاں میں بول رہا ہوں۔'' عامر کی آواز سنائی دی۔

''میں علاقے کا ایس ایچ او ہوں' یہاں آپ کے کاٹیج میں آگ لگ گئی ہے' فائر بریگیڈ والے آگ بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''ارے یہ کیسے ہو گیا۔'' عامر نے حیرانی کا مظاہرہ کیا لیکن دوسری طرف سے فون بند ہو گیا تھا لیکن ماہ نور فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر دوڑتی ہوئی خواب گاہ سے باہر آ گئی۔ اس نے عامر کے کمرے کے دروازے کو زور زور سے پیٹا تو دروازہ کھل گیا۔

''عامر آگ کیسے لگ گئی۔''

''مم...... مجھے کیا معلوم۔''

''جیسے تمہیں نہیں معلوم۔''

''آ ہ چلو جلدی چلو۔''

جب وہ کاٹیج پہنچے تو وہ جل کر خاک ہو چکا تھا' ماہ نور پاگلوں کی طرح شاہ میر کو تلاش کرنے لگی' لیکن وہ نہیں ملا' پولیس موجود تھی اور اس نے عامر سے طرح طرح کے سوالات کئے' لیکن کوئی جواب نہیں ملا' عامر صورت حال کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے رہا تھا۔ اس نے اپنے دوست کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تھا کہ وہ پتا نہیں کہاں چلا گیا' الغرض یہ کہ یہ سب کچھ ہو گیا تھا۔ جب دوسرے معاملات طے ہو گئے تو عامر اس کرائے کے قاتل سے ملا تو اس نے بتایا کہ اس نے عامر کے حکم کے مطابق حملہ کیا تھا' اندر موجود آدمی ہمارے چار آدمیوں کا ڈٹ کا مقابلہ کرتا رہا' مجبوراً اس پر گولی چلانا پڑی' لیکن وہ ہماری دسترس سے نکل گیا' اس کے بعد پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا تو میں نے پیٹرول چھڑک کر کاٹیج کو آگ لگا دی۔

بڑا غلط ہو گیا' بڑا غلط ہو گیا' نجانے کیا کیا کاروائیاں ہوتی رہیں' ماہ نور سخت پریشان تھی' طرح طرح سے شاہ میر کو تلاش کیا گیا' لیکن اس کا کہیں پتا نہ چلا' ماہ نور کی آنکھوں میں غم کے تاثرات منجمد ہو گئے تھے۔ تقریباً دو ماہ گزر گئے جب اچانک ایک دن شاہ میر کا خط اسے ملا۔

''سمجھ میں نہیں آتا ماہ نور آپ کو کس نام سے مخاطب کروں' میں زندہ ہوں مجھ پر حملہ کیا گیا تھا' وہ لوگ مجھے قتل کر دینا چاہتے تھے۔ جب میں وہاں سے فرار ہوا تو مجھ پر گولی چلا دی گئی' میں وہاں سے بھاگا زخمی ہو گیا تھا' سخت پریشان رہا ان دنوں' جلے ہوئے کاٹیج میں واپس پہنچ گیا' میں اپنے طور پر بھی کاروائی کر رہا ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ یہ سب کچھ کس نے کیا ہے' خیر اللہ مالک ہے۔ میں بہت جلد اس کاٹیج کو درست کرا کر دوبارہ وہاں منتقل ہو جاؤں گا' سمجھ رہی ہو نا تم' مجھے میرا بیٹا بہت یاد آتا ہے۔''

یہ خط جب عامر نے پڑھا تو وہ بولا۔

''ٹھیک ہے وہ یہی کر سکتا تھا' یہی کر سکتا تھا وہ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کام ڈاکوؤں ہی کا ہے' بلکہ اب تو ایک اور بات میری سمجھ میں آ رہی ہے کہ شاہ میر نے جس شخص کو قتل کیا تھا اس کے

جوان بیٹے بھی تھے، ممکن ہے انہیں شاہ میر کی یہاں موجودگی کی خبر مل گئی ہو، خیر وہ شوق سے وہاں آ کر پناہ لے مجھے اس سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔''

کاٹیج پھر مکمل ہو گیا، لیکن شاہ میر وہاں نظر نہیں آیا، یہ لوگ اس کی تلاش میں ناکام ہو گئے تھے، عامر نے کہا۔

''میں تمہیں اب بھی پیشکش کرتا ہوں کہ اگر اس کا خیال دل سے نکل جائے تو تم مجھ سے نکاح پڑھوا سکتی ہو۔''

''کیا سمجھتے ہیں آپ مجھے، میں بار بار شوہر بدلتی رہوں گی۔''

''سوچ لو میں شادیاں کر سکتا ہوں۔''

''آپ کر لیں، میں نے کیا بگاڑنا ہے آپ کا۔''

''نہیں میں کسی اور کی طرف مائل نہیں ہو سکتا۔''

''چھوڑیئے ان باتوں کو۔'' پھر اس کے بعد زندگی گزرتی رہی، ماہ نور کی حالت عجیب تھی، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شاہ میر آتے آتے کہاں رہ گیا ہے، پھر وقت گزرتا رہا، سال دو سال یہاں تک کہ پانچ سال گزر گئے، عامر اس سے مستقل یہی کہتا رہا کہ وہ اپنی ضد سے باز آ جائے۔

''نہیں میں شاہ میر کی واپسی کا انتظار کروں گی۔''

''جب انتظار کرتے کرتے تھک جاؤ تو مجھے بتا دینا۔'' عامر بھی دھن کا پکا تھا، وہ اکثر کاٹیج آتا رہتا تھا، اس کا بیٹا بھی اب بڑا ہوتا جا رہا تھا جو کہ اس کا نہیں تھا اور یہ بات صرف وہی جانتا تھا۔

ماہ نور بھی یہاں آتی تھی اور شاہ میر کو یاد کرتی رہتی تھی، وہ آج بھی شاہ میر کے لیے آنسو بہاتی تھی، ادھر شاہ میر ایسے غائب ہوا تھا جیسے موت نے اسے نگل لیا ہو، نجانے کیوں عامر کو اکثر محسوس ہوتا تھا کہ کسی نہ کسی وقت شاہ میر آئے گا اور اس کی گردن دبوچ کر اسے ہلاک کر دے گا۔ یوں وقت گزرتا رہا اور تقریباً پندرہ برس گزر گئے۔ شاہ میر کا کوئی پتا نہیں تھا اور عامر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک دن اس نے کہا۔

''ہماری طلاق کو اٹھارہ برس گزر چکے ہیں، تم میرا کھاتی ہو اور پہنتی ہو، میری چھت کے نیچے رہتی ہو، لیکن زندگی شاہ میر کے لیے گزار رہی ہو۔''

''ہاں، میں اس کے لیے زندگی گزار رہی ہوں۔'' ماہ نور نے مسکراتے ہوئے کہا اور عامر اس کی مسکراہٹ پر چونک پڑا، یہ مسکراہٹ کچھ اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ماہ نور ایک بار پھر سے زندہ ہو گئی ہو اور وہ خوش ہو، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ ماہ نور کی خوشی کا کیا راز ہے، وہ چھپ چھپ کر اس کی نگرانی کرتا تھا لیکن کوئی خاص بات بھی نظر نہیں آئی تھی، ادھر اس کا بیٹا بھی خوب بڑا ہو گیا تھا، پھر ایک دن وہ اس کرائے کے قاتل کے اڈے پر پہنچا تو اسے پتا چلا کہ قاتل کو کچھ عرصے پہلے قتل کر دیا گیا ہے۔

''ارے ایسا کیسے ہوا۔'' عامر نے پوچھا اور نجانے کیوں اس کے دل میں ایک انوکھا خوف سرایت کر گیا۔ وہ ذہنی طور پر سخت مضطرب رہنے لگا اور پھر ایک ذہنی دیوانگی کا شکار ہو کر اس نے سوچا کہ ماہ نور پر سختی کرنی چاہیے، وہ کسی طرح قابو میں نہیں آئے گی، بہت ضدی عورت ہے، اسے شبہ ہوا کہ شاہ میر شاید واپس آ گیا ہے۔

ماہ نور کا بدلا ہوا انداز ضرور بتاتا تھا لیکن اب وہ کہاں چھپا ہوا ہے، چنانچہ وہ ماہ نور پر کڑی نظر رکھنے لگا کہ وہ کہاں جاتی ہے، کس سے ملتی ہے کس طرح وقت گزارتی ہے، یہ ساری چیزیں اسے پریشان کیے ہوئے تھیں، لیکن ماہ نور اپنی کوٹھی سے کم نکلتی تھی، پہلے بھی اس کا ملنے والا کوئی

نہیں تھا اب بھی کوئی نہیں تھا وہ شاپنگ کی غرض سے جاتی تھی اور واپس آجاتی تھی' ایسے وقت میں بھی ڈرائیور یا کوئی ملازم ساتھ ہوتا تھا اور کالج میں تو ہمیشہ عامر ہی اس کے ساتھ ہوجاتا تھا اور ساتھ ہی واپس آجاتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد آخر کار عامر نے یہ خیال اپنے دماغ سے نکال دیا کہ شاہ میر واپس آگیا ہے' سترہ برس کا عرصہ کم نہیں ہوتا' وہ کہیں مٹی میں مل چکا ہوگا۔

ادھر ماہ نور کی طبیعت میں سب کچھ واپس آگیا تھا جو اس کی ابتدائی زندگی کا حصہ تھا۔ سنگھار شوخ لباس ایسا تھا کہ وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت لگنے لگی تھی' ایک دن عامر نے جھنجھلا کر سوچا کہ بہت شرافت دکھای دی ہے' اب سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا۔ اس بار جب وہ ماہ نور کے ساتھ کالج جائے گا تو اسے مجبور کرے گا کہ وہ اس کے ساتھ تعلقات استوار کرے۔ وہ اس طرح اسے مجبور کرنے کے طریقے سوچنے لگا اس نے سوچا کہ وہ ماہ نور کو دھمکی دے گا کہ وہ وصیت نامہ لکھ رہا ہے اور وہ وصیت نامہ ماہ نور کے بیٹے کے خلاف ہوگا' وکیل صاحب کو تاکید کی جائے گی کہ وہ وصیت نامہ اس کی موت کے بعد پڑھ کر سنایا جائے' اس میں عامر کا اعتراف ہوگا کہ وہ اس کا بیٹا نہیں ہے بلکہ اس کی بے حیائی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے' وہ یہ شرط پیش کرے گا کہ اگر ماہ نور اس کی بن جائے تو وہ اس کے بیٹے کے حق میں وصیت نامہ لکھے گا' یہ تمام باتیں وہ دن رات سوچتا رہتا تھا اور اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔

پھر وہ ہفتے کا دن تھا جب عامر مسکراتا ہوا ماہ نور کی خواب گاہ میں داخل ہوا تاکہ اس کے ساتھ کالج کی طرف جانے کے لیے نکلے' اس کی خواب گاہ خالی تھی' ماہ نور نظر نہیں آرہی تھی' بستر پر پڑا ہوا لباس بتا رہا تھا کہ وہ ابھی لباس تبدیل کرنے والی ہے' باتھ روم کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ اسی وقت وہاں سے آوازیں سنائی دیں' رہ رہ کر ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے ماہ نور کو ابکائی آرہی ہو' وہ فوراً ہی اس کی خواب گاہ سے نکل آیا' اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر وہ جیسے انگاروں پر لوٹنے لگا۔ تھوڑی دیر تک غور کرنے کے بعد اس نے ریسیور اٹھا کر لیڈی ڈاکٹر کے نمبر ڈائل کیے جو اس کی شناسا تھی اور تھوڑی دیر کے بعد رابطہ قائم ہوگیا' دوسری طرف سے لیڈی ڈاکٹر کی آواز سنائی دی۔

''جی میں حمیدہ بول رہی ہوں۔''

''ڈاکٹر' کل شام میری وائف کی طبیعت خراب ہوگئی تھی' آپ کو بلایا گیا تھا' میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اسے کوئی اہم بیماری تو نہیں ہے۔''

''ارے عامر صاحب' آپ اپنے گھر سے کتنے ناواقف ہیں' مگر ٹھیک ہے آپ بھی تو کاروباری آدمی ہیں' جناب عالی آپ دوبارہ باپ بننے والے ہیں۔ میری طرف سے مبارک باد قبول کریں۔''

عامر پتھرا کر رہ گیا تھا' بمشکل تمام اس نے فون بند کیا اس کے پورے بدن میں شدید تھرتھری دوڑ رہی تھی' بدن انگارہ ہو رہا تھا' وہ انتہائی بے چینی سے ٹہلنے لگا' یہ سب کچھ کیا ہے' یہ سب کچھ کیا ہے۔ سارے وسوسے جاگ گئے تھے' اس کے حلق سے غرائی ہوئی آواز نکلی۔

''میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں ماہ نور' تو بے غیرت بے حیاء یا بدکردار نہیں ہے' تو گناہ کی طرف مائل نہیں ہوسکتی' اس کا مطلب ہے کہ شاہ میر واپس آگیا ہے اور میں' میں اپنی ساری زندگی میں ایک ناکام حیثیت کا مالک رہا ہوں لیکن قصور میرا ابھی تو نہیں تھا' وقت نے تقدیر نے ایک حادثے کے تحت زندگی میں ناکامی پیدا کر دی تھی' کیا میں اس ناکامی کا ڈھول پیٹتا رہتا' کیا کرتا شرم وحیا بھی انسانی فطرت کا حصہ ہوتی ہے'

منع کیا تھا میں نے اپنے باپ کو کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا' لیکن میری اس محرومی کے ساتھ ساتھ ہی میرے باپ نے مجھے اپنی دولت سے بھی محروم کر دینے کی دھمکی دی۔ اس کے بعد تو میرے لیے موت کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔ میں نے بحالت مجبوری ایک اور زندگی کو تباہ کرنے کا کام لے لیا' ماہ نور کو میرے ساتھ یہ نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اب اب کیا کروں' اس نے ماضی پر نگاہ دوڑائی تو اسے احساس ہوا کہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ مختلف کام ہوئے ہیں' مثلاً یہ کہ کرائے کے اس قاتل کی موت کی مدت بھی اتنی ہی ہے' جتنی مدت ماہ نور کے انداز میں تبدیلی ہونے کی' اوہ میرے خدا' میں حالات کو کیوں نہیں سمجھا' کچھ ہوا ہے ضرور ہوا ہے' وہ انہی سوچوں میں گم رہا' پھر اسے ایک شدید جھنجلاہٹ کا احساس ہوا' اس کا مطلب ہے کہ ماہ نور اور شاہ میر میری دولت پر عیش کرتے رہیں' میں بالکل ہی بے غیرت اور بیوقوف آدمی ہوں' ماہ نور اس کے بچے پیدا کرتی رہے اور میں ان بچوں کا باپ بنتا رہوں' انہی سوچوں میں تھا کہ ماہ نور شوخ رنگ کا لباس پہن کر مسکراتی ہوئی آ گئی۔

عامر اس وقت بھی اپنے غصے کو برداشت کیا تھا۔ چپ چاپ اس کے ساتھ باہر آ کر کار میں بیٹھ گیا اور پھر کار کاٹیج کی طرف چل پڑی' عامر مصلحتاً خاموش تھا' کوٹھی میں اس بات کا جھگڑا کرتا تو بات بڑھ جاتی وہ ماہ نور کے ماں بننے پر کھل کر اعتراض بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ دنیا والوں کے سامنے وہی اس کا شوہر تھا چنانچہ اپنی زبان سے کیا کہتا' لیکن کاٹیج کے اندر داخل ہوتے ہی اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔

''ماہ نور۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''ہاں' خیریت' کیا ہو گیا تمہیں۔''

''ماہ نور کب تک مکاریاں کرتی رہو گی تم' تم کیا سمجھتی ہو' میں ایک بزنس مین ہوں اور کامیابی سے اپنے بزنس کو چلا رہا ہوں تو کیا میں اتنا بیوقوف ہو سکتا ہوں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا عامر۔''

''آج تک تم شاہ میر کی موجودگی کے متعلق مجھ سے چھپاتی رہی ہو' بولو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔''

''نہیں بالکل نہیں' میں یہی سوچ رہی تھی کہ اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا چاہیے' جبکہ ڈاکٹر حمیدہ نے اس بات کی تصدیق کی ہے' میں آپ کے بتانے کے لیے حوصلہ کر رہی تھی' مگر مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔''

''بکواس مت کرو وہ کہاں ہے' تم نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے۔''

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے جو تمہیں نہیں بتایا جا سکتا۔''

''بتانا ہو گا تمہیں بتانا ہو گا' میں نے بہت صبر کیا ہے' بہت انتظار کیا ہے اور یہ انتظار اس لیے کیا ہے کہ ایک نہ ایک دن میں تمہیں حاصل کر لوں گا' لیکن تم نے مجھے زبردست دھوکہ دیا ہے ماہ نور اور اگر تم نہیں بتاؤ گی تو میں ردعمل کا اظہار کروں گا۔''

''وہ کیا۔'' ماہ نور بدستور مسکرا کر بولی۔

اس کی مسکراہٹ میں شہد گھلا ہوا تھا۔

''میں تمہیں آئندہ اس کاٹیج میں نہیں آنے دوں گا۔ تمہیں کوٹھی سے بھی نکلنے نہیں دوں گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا کہ تم ملنے والوں کو بتا دو گی اور ان کے سامنے طلاق مانگو گی' میں تمہیں طلاق بھی دے دوں گا اور تمہارے بیٹے کو بھی چھوڑ دوں گا' پھر دیکھوں گا کہ تمہارا قاتل شوہر تمہارے بچے کا مستقبل کیسے بنائے گا۔''

''سنیں کیا آپ اپنے معاہدے پر قائم رہے تھے' آپ نے شاہ میر پر قاتلانہ حملہ کرایا تھا۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' عامر بولا۔

''نہیں عامر' میں جھوٹ نہیں بولتی لیکن تم جھوٹ بول رہے ہو' جس غنڈے کو تم نے یہاں بھیجا تھا' شاہ میر نے اسے اور اس کے آدمیوں کو اچھی طرح پہچان لیا تھا اور یہ تو آپ کو پتا چل چکا ہوگا کہ آپ کا وہ کرائے کا قاتل مارا گیا ہے' کس نے مارا ہے یہ بھی آپ اچھی طرح جانتے ہیں عامر...... اس کے دوسرے ساتھی خوفزدہ ہو گئے تھے' شاہ میر نے ان میں سے ایک ساتھی کو اپنے شکنجے میں لے کر اس سے وعدہ کیا کہ اگر وہ سچ سچ بتائے گا تو اسے زندہ چھوڑ دیا جائے گا' اس نے سچ بتا دیا۔''

''م...... میں' میں...... میں تمہیں جھوٹا نظر آرہا ہوں اور تم اس غنڈے ان بدمعاشوں کی باتوں کو سچ سمجھ رہی ہو۔''

''سچ کیا ہے' یہ شاہ میر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' اس پر قاتلانہ حملہ کرایا گیا اور حملہ کرنے والے چور یا ڈاکو نہیں تھے جو صرف اسے قتل کرنے آئے تھے اور جب وہ ناکام ہوئے تو انہوں نے کاٹیج کو جلا دیا اور شاہ میر کی پناہ گاہ کو ختم کر دیا' آپ نے یہ پورا منصوبہ بنایا تھا' اپنی دانست میں آپ نے شاہ میر کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔''

''وہ کتنے عرصے سے یہاں آرہا ہے' میرا مطلب ہے دوبارہ۔'' عامر نے اسے گھور کر کہا۔

''ایک سال ہو چکا ہے۔'' ماہ نور لاپرواہی سے بولی۔

''پورے سولہ برس تک وہ تم سے دور رہا' اس نے تمہاری کوئی خبر نہیں لی' میں نے شرافت سے تمہیں اپنی چھت کے نیچے رکھا' تم اس کو تسلیم نہیں کرتیں۔''

''اس نے مجھے خط لکھا تھا کہ وہ دس دن کے بعد مجھے آکر ملے گا' لیکن وہ نہیں آسکا' نصیب بگڑتے ہیں تو سب کچھ بگڑ جاتا ہے' وہ خرکاروں کے جال میں پھنس گیا تھا' ان لوگوں نے اسے بیگار کیمپ میں پہنچا دیا اور وہ تقریباً پندرہ برس تک قیدی کی حیثیت سے کام کرتا رہا' کئی بار اس نے فرار ہونے کے منصوبے بنائے لیکن ناکام رہا' کیا سمجھے عامر وہ واپس آ گیا ہے۔ معاہدے کے مطابق آج بھی ہم اسی طرح زندگی گزار سکتے ہیں۔''

''ہرگز نہیں' اب میں تمہارے کسی بچے کا باپ نہیں بنوں گا' اگر تم چاہتی ہو کہ تمہارے بیٹے کا مقدر سنور جائے اور وہ میری دولت کا مالک بن جائے تو شاہ میر کو چھوڑ دو' دو ہی راستے ہیں تم میری بات مان لو گی تو میں ہمیشہ کے لیے شاہ میر کی چھپ کر رہنے کے لیے یہ کاٹیج دے دوں گا' لیکن تم ادھر کبھی نہیں آؤ گی' لیکن تم ادھر کبھی نہیں آؤ گی' دوسرا راستہ یہ ہے کہ شاہ میر کو قانون کے حوالے کر دیا جائے۔''

''تو آپ کیا سمجھتے ہیں میں آپ کو چھوڑ دوں گی اور خاموش تماشائی بن کر دیکھتی رہوں گی' آپ صرف میری وجہ سے اس وقت تک زندہ سلامت ہیں عامر صاحب' ورنہ شاہ میر آپ کے کرائے کے قاتل کو قتل کرنے کے بعد آپ کو بھی ختم کر دینا چاہتا تھا' میں نے اسے روکا ہے' وہ خاموش ہو گیا ہے' سمجھ رہے ہیں آپ' اس وقت بھی وہ شاید کاٹیج ہی میں موجود ہو۔''

ماہ نور کے الفاظ پر ایک لمحے کے لیے عامر لرز گیا تھا' اس نے کہا۔ ''کیا وہ موجود ہے۔''

''میں نہیں جانتی' لیکن اس کے لیے کوئی راستہ بند نہیں ہے' وہ کبھی یہاں کاٹیج میں آجاتے ہیں اور کبھی ہماری کوٹھی میں۔''

''کک...... کیا...... کیا وہ کوٹھی میں بھی آتا ہے۔''

''سیدھا راستہ ہے' میرے بیڈ روم کا دروازہ پائیں باغ میں کھلتا ہے' وہاں آنے جانے میں اس طرح آسانی ہو جاتی ہے۔''

ی بک تشکیل۔ پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

''گویا ہر شخص چوکیدار وغیرہ نے اسے بھی نہیں دیکھا۔''

''وہ بہت محتاط ہے کسی نے اسے نہیں دیکھا ہے۔''

''ماہ نور...... ماہ نور تم آخر کیا ہو' کیا ہو تم' تمہیں نہ اپنی عزت کا خیال ہے نہ میری۔''

''نہیں مجھے اچھی طرح سے خیال ہے۔''

''تم نے مجھے بارود کے ڈھیر پر بٹھا دیا ہے ماہ نور' کسی وقت بھی دھماکہ ہو سکتا ہے میری عزت کی دھجیاں اڑ سکتی ہیں' لیکن سنو' آج بھی میں تمہیں اپنا کر رہوں گا' تمہیں شاہ میر کو چھوڑنا ہی پڑے گا اگر اپنے بیٹے کا مستقبل سنوارنا چاہتی ہو تو۔'' عامر نے ماہ نور کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور وہ ایک جھٹکے سے خود کو چھڑاتی ہوئی بولی۔

''یہ مت بھولو کہ شاہ میر کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتا ہے' جب پہلی بار تم تیزاب سے میرا چہرہ بگاڑنے آئے تھے تو شاہ میر نے مجھے بتایا تھا' ایسا نہ ہو اس بار وہ تمہیں ظالم کے روپ میں دیکھے اور ہمیشہ کے لیے تمہارا قصہ ختم کر دے۔''

عامر کے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔ اس نے سوچا کہ کہہ تو وہ ٹھیک رہی ہے' وہ قاتل بدمعاش اچانک وہاں پہنچ سکتا ہے' ایک لمحے تک سوچتے رہنے کے بعد اس نے رخ بدلا اور تیزی سے پلٹ کر کاٹیج سے باہر جانے لگا تو ماہ نور نے اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے کہا۔

''رک جاؤ کہاں جا رہے ہو۔''

''جہنم میں جا رہا ہوں' تم رنگ رلیاں مناتی رہو۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل آیا اور کار کے اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا' ماہ نور تذبذب کے عالم میں خاموش کھڑی اسے دیکھتی رہی' ایک طرف دماغ کہہ رہا تھا کہ عامر انتقاماً پولیس والوں کو شاہ میر کے خلاف رپورٹ دے سکتا ہے' دوسری طرف دل کہہ رہا تھا کہ وہ یہیں رکے اور شاہ میر آئے تو اسے سب کچھ بتا دے تاکہ شاہ میر بھی محتاط ہو جائے۔

اس کے سوچنے تک عامر نے کار اسٹارٹ کی اور پھر تیزی سے اسے چلاتا ہوا کاٹیج سے باہر نکل گیا' وہ شدید غصے کے عالم میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب یہ کھیل ختم ہو جانا چاہیے' کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ انہی سوچوں میں گم تھا' کاٹیج سے آگے کا راستہ ویران تھا اور بہت کم ٹریفک اس پر ہوتا تھا' کار ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ اچانک اسے اپنی گردن پر لوہے کی ٹھنڈک محسوس ہوئی اور پھر آواز سنائی دی۔

''اسے ریوالور کہتے ہیں۔'' عامر کا پورا بدن تھرتھری کا شکار ہو گیا' اس نے شاہ میر کی آواز پہچان لی تھی' کار کی رفتار سست ہوئی تو شاہ میر نے کہا۔ ''گاڑی نہ روکنا اسے سست رفتاری سے چلاتے رہو۔''

''کک...... کیا شاہ میر تم' تم کہاں غائب رہے' میں تمہارے لیے بہت پریشان تھا۔''

جواب میں شاہ میر کا مدہم سا قہقہہ سنائی دیا۔ پھر وہ بولا۔ ''واقعی تمہاری پریشانی میرے علم میں ہے' اس وقت بھی میں کاٹیج کے دروازے پر کھڑا تمہاری باتیں سن رہا تھا' لیکن مجبوری ہے عامر مجبور ہے' ہم میں سے کسی ایک کو ختم ہو جانا چاہیے میں نہیں چاہتا کہ ماہ نور چکی کے دو پاٹوں کی طرح پستی رہے۔''

''تت تمہارا' تمہارا کیا مطلب ہے تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔''

''ہاں مجبوری ہے' مجبوری ہے میرے دوست' میں ماہ نور کو مشکل میں گرفتار نہیں دیکھ سکتا۔''

''میری بات سنو' تم جو کہو گے میں مانتا رہوں گا اپنے اس ارادے سے باز آ جاؤ اور ہاں سنو' میں اپنی ساری دولت تمہارے بیٹے کے نام لکھ دوں گا۔''

’’نہیں عامر‘ زخمی سانپ کو زندگی دینا اپنی موت کے مترادف ہے اور ویسے بھی میرے بیٹے کا مسئلہ کوئی ہی نہیں ہے کیونکہ تمہاری موت کے بعد طاہر ہی تمام دولت اور جائداد کا مالک ہوگا کیونکہ دنیا اسے تمہارا بیٹا سمجھتی ہے‘ میں نے اپنے بیٹے کو بیٹا کہہ کر بھی گلے نہیں لگایا‘ لیکن بس کبھی نہ کبھی کھیل ختم ہونا ہی تھا‘ چلو گاڑی روکو۔‘‘

’’م...... میری...... میری بات سنو۔‘‘

’’گاڑی روکو۔‘‘ شاہ میر کی آواز میں ایسی غراہٹ تھی کہ عامر نے گاڑی روک دی۔

’’میری بات سنو‘ میری بات سنو ہم اس کا کوئی اور حل نکال لیں گے‘ کوئی اور حل نکال لیں گے ہم اس کا۔‘‘

’’حل میرے پاس ہے‘ تمہیں نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ شاہ میر نے کہا اور اس کے بعد اس نے عامر کو گولی مار دی۔ عامر کی موت کے بڑے چرچے ہوئے طرح طرح کی کہانیاں سنائی گئیں‘ خود ماہ نور بھی شدید غم کا شکار رہی‘ اس نے بیوگی کا سوگ بھی منایا‘ لیکن سب سے زیادہ متاثر طاہر تھا‘ وہ اپنے باپ کی موت پر صدمے سے چور تھا‘ شاہ میر اور ماہ نور اسے سمجھاتے رہتے تھے‘ لیکن اس بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ جس کا وہ ماتم کر رہا ہے اس سے اس کا خونی رشتہ نہیں ہے‘ لیکن پھر بھی اس پر بہت زیادہ اثر تھا۔ باپ کی موت کے بعد اس کے منہ سے کسی نے کوئی آواز نہیں سنی تھی‘ حالانکہ ماہ نور اسے بہت زیادہ پیار کرتی تھی‘ کافی دن اسی طرح گزر گئے‘ عامر کا چالیسواں ہوگیا اور اس طرح وقت کچھ اور گزر گیا۔ معمولات زندگی پھر سے جاری ہو گئے ابھی تک کوئی صحیح فیصلہ نہیں ہو پایا تھا کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے۔ ماہ نور شاہ میر سے کاٹیج ہی میں ملاقات کرتی تھی‘ ایک دن وہ کاٹیج میں شاہ میر کے ساتھ اس کے سینے سے سر لگائے ہوئے بیٹھی تھی کہ اچانک ہی اس نے دروازے پر آہٹ سنی‘ اندر داخل ہونے والا طاہر تھا‘ جس کے ہاتھ میں ریوالور نظر آ رہا تھا دونوں دنگ رہ گئے‘ طاہر زہریلے لہجے میں بولا۔

’’ہاں مما‘ میں نے پچھلی بار ڈیڈی کی ڈائری پڑھی تھی جہاں ہر ورق پر صرف ایک ہی جملہ لکھا ہوا تھا کہ وہ کسی شاہ میر نامی قاتل سے خوفزدہ ہیں‘ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ ماہ نور میری ہو کر بھی میری نہیں ہے‘ ایک بدمعاش سے دل لگا بیٹھی ہے اور کاٹیج میں وہ دونوں رنگ رلیاں مناتے ہیں۔‘‘

’’کیا بکواس کر رہے ہو طاہر پتا نہیں تمہاری ڈیڈی نے کیا الٹی سیدھی باتیں لکھی ہیں‘ میری بات سنو۔‘‘

’’ایک منٹ‘ ایک منٹ مما میں پوری طرح سمجھ گیا ہوں کہ جس شخص سے ڈیڈی خوفزدہ تھے وہ یہی ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے باپ کے دشمن سے بدلہ لینا تو میرا فرض بنتا ہے اور پھر ڈیڈی نے جو کچھ لکھا اس کا ثبوت آپ لوگ ابھی دے رہے ہیں‘ میں ایک غیرت مند باپ کا غیرت مند بیٹا ہوں۔‘‘

’’سنو طاہر جو کچھ میں کہہ رہا ہوں میری بات سنو بیٹے تم۔‘‘

’’خبردار مجھے بیٹا نہ کہنا اگر تمہاری ماں کے کمرے میں کوئی غیر شخص آتا تو کیا تم اسے برداشت کر لیتے میں ایک غیرت مند باپ کا بیٹا ہوں سمجھے۔‘‘ یہ کہتے ہی طاہر نے شاہ میر پر گولیاں برسا دیں۔ ماہ نور ایک دلخراش چیخ کے ساتھ شاہ میر کے سامنے آئی تو تین گولیاں اس کے سینے پر بھی لگیں اور کچھ لمحوں کے بعد دو لاشیں کاٹیج کے کمرے میں پڑی ہوئی تھیں اور طاہر نفرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

آخری بازی

ایم اے راحت

ان دو برسوں میں ڈیڈی کو ان کے دوست میرے بارے میں کیا رپورٹیں بھیجتے رہے تھے، اس کا مجھے علم نہیں تھا لیکن یہ رپورٹیں میرے خلاف تھیں۔ تب بھی ڈیڈی نے اپنے خطوط میں کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ بڑی پابندی سے میرے جملہ اخراجات روانہ کرتے رہے تھے۔ غالباً وہ اس انتظار میں تھے کہ فائنل نتیجہ سامنے آئے تب کوئی حتمی قدم اٹھائیں۔ مگر قسمت کی مہربانی سے انہیں یہ موقع نہیں مل سکا اور اپنی واپسی پر مجھے یہ ہی بتایا گیا کہ دونوں بہنوں کو تھوڑا سا حصہ دینے کے بعد میں پوری جائیداد و کاروبار کا مالک ہوں۔ مجھے درآمد، برآمد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ایک معاشرتی کہانی، عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے

زندگی کا بیشتر وقت امریکہ جیسے ملک میں گزارا تھا۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے رابطہ رہا تھا۔ تعلیم کے علاوہ دوسرے مشاغل میں بھی دلچسپی لیتا رہا تھا۔ اصل میں ماضی کے تلخ نقوش ذہن پر چسپاں تھے۔ جنہیں میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ والد صاحب مرحوم نے ماں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا۔ وہ انتہائی تکلیف دہ تھا۔ بس کبھی کبھی کچھ رشتے بالکل بے دست و پا کر دیتے ہیں۔ میرے اور ڈیڈی کے درمیان تعلقات کچھ خوشگوار نہیں تھے اور اس کی وجہ ماں کے ساتھ ڈیڈی کا سلوک تھا۔ میری والدہ مرحومہ جنہیں ڈیڈی نے پندرہ سولہ سال کی رفاقت کے بعد طلاق دے دی تھی۔ ہمیں گھر کے حالات کا بھرپور اندازہ تھا۔

ڈیڈی، ممی سے ہمیشہ لڑتے رہتے تھے اور آخر کار انہوں نے ممی کو طلاق ہی نہیں دی بلکہ ہمیں بھی ان سے چھین لیا۔ ممی ایک غریب گھر کی بیٹی تھیں۔ اس لیے ڈیڈی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں۔ بعد میں ہمیں کبھی ممی سے نہیں ملنے دیا گیا اور وہ دو تین سال میں انتقال کر گئیں۔ میری دونوں بہنوں کی شادی کر دی گئی تھی اور مجھے امریکہ بھیج دیا گیا تھا۔

امریکہ میں، میں نے اپنی پسند کی زندگی گزاری اور پھر اس وقت میری واپسی ہوئی جب مجھے ڈیڈی کے انتقال کی خبر ملی۔ وطن واپس آکر میں نے ڈیڈی کی تمام جائداد اور کاروبار کی صورت حال سنبھال لی۔ بہرحال زندگی اسی طرح سادگی سے گزر رہی تھی کہ ایک نام نہاد شخص ڈان زان مغل، مجھ سے ملا۔ میرے ملازم نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا تھا اور اس کا کارڈ مجھے پیش کیا تھا۔ عجیب سا نام تھا۔ بہرحال میں ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ وہ ایک نوجوان آدمی تھا۔ جو اچھے خاصے سوٹ میں ملبوس کافی اسمارٹ نظر آرہا تھا۔

"جی! فرمائیے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

"سر! میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ اصل میں ہمارے ملک میں کسی صاحب فن کی قدر نہیں ہوتی۔ میں بھی محدود سا آدمی ہوں۔ ریڈیو، ٹی وی یا اسٹیج سے اپنی پبلسٹی نہیں کروا سکتا۔ اس لیے آپ جیسے قدر دانوں کے در دولت پر خود حاضری دے دیتا ہوں۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں اور کیا کام کرتے ہیں آپ۔"

"سر! میں تاش کا فن جانتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو اپنا فن دکھاؤں۔"

اب یہ بالکل اتفاق ہے کہ میں امریکہ میں رہ کر بھی وہاں تلاش کے کھیل سے بہت متاثر تھا۔ مجھے اس سے دلچسپی محسوس ہوئی تو میں نے اس سے اپنا فن دکھانے کے لیے کہا۔

تب اس نے تاش کی ایک بالکل نئی گڈی نکال کر کھولتے ہوئے میرے معائنے کے لیے پیش کی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ کوئی ایسی بات یا خفیہ علامت نظر نہیں آئی۔ جس سے امریکہ کے قمار خانوں میں واسطہ پڑ چکا تھا۔ میں نے اسے گڈی واپس دے دی۔ اس نے ماہرانہ چابکدستی سے گڈی کو کئی بار پھینٹا اور پھر کئی دلچسپ و حیرت انگیز کرتب دکھائے۔ مثلاً دل میں سوچا ہوا پتہ بتانا، یا بار بار ایک پتہ کھینچنے پر مجبور کرنا۔ یعنی میں تاش کی پھیلی ہوئی گڈی میں سے کہیں سے کوئی بھی پتہ نکالتا۔ ہر مرتبہ وہ ہی پتہ ہاتھ میں آتا۔ جو میں پہلے کھینچ چکا تھا۔ یا تاش کا کوئی بھی پتہ اپنے ہاتھ سے غائب کر کے میری جیب سے برامد کرنا پتوں کا سائز چھوٹا یا بڑا کرنا وغیرہ وغیرہ۔

"یہ بتاؤ۔" میں نے اس کی فن کاری سے متاثر ہوتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں کوئی ایسا کرتب آتا ہے کہ اگر کوئی فلش کھیلنے بیٹھے تو ہر بار

جیت کر ہی اٹھے۔ باوجود اس کے کہ دوسرے کھلاڑیوں میں بھی کوئی ماہر پتے باز یا شارپر ہو۔‘‘

اگرچہ مجھے بھی اس فن میں بہت کچھ آتا تھا۔ مگر میں اس کا تجربہ اور قابلیت دیکھنا چاہتا تھا۔

’’ایسے کئی کرتب مجھے آتے ہیں سر۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’مگر انہیں صرف بتانے یا دکھانے سے ہی نہیں سیکھا جا سکتا۔ جب تک بار بار کی مشق اور مسلسل ریاضت سے مہارت اور ہاتھ کی صفائی نہ آ جائے اور یہ خاصا دیر طلب کام ہے لیکن اس لائن سے پرانی وابستگی اور اس میدان میں تازہ ترین معلومات کی بنا پر میں یہ جانتا ہوں سر! کہ آج کل شہر کی ہائی سوسائٹی کلبوں‘ خفیہ قمار خانوں اور خالص پرائیویٹ نشستوں میں جو طریقہ بہت استعمال کیا جا رہا ہے۔ وہ خفیہ نشانات کا ہے۔ جنہیں بادی النظر میں ہرگز نہیں دیکھا جا سکتا خواہ آپ خوردبین سے ہی ایک ایک پتے کا جائزہ کیوں نہ لیں۔‘‘

’’تو پھر پتے باز انہیں کس طرح دیکھتا ہے۔‘‘ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

’’آپ میز سے جیت کر اٹھنا چاہتے ہوں تو ایک چشمہ آپ کی نذر کر سکتا ہوں۔‘‘

’’کس قیمت پر۔‘‘

’’اس کی قیمت تو کوئی کیا ادا کر سکتا ہے۔ مگر میں صرف اس کے بنانے پر خرچ ہونے والی رقم اور معلومات سا منافع لیا کرتا ہوں۔‘‘

’’کیا لیتے ہو۔‘‘

’’صرف دس ہزار روپے۔‘‘

’’چیک یا کیش۔؟‘‘

’’برا نہ مانیں تو صرف کیش۔‘‘

’’تم چشمہ نکالو۔‘‘ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ’’میں ابھی رقم لے کر آتا ہوں۔‘‘

چشمہ دیکھنے میں بہت خوب صورت اور جدید ڈیزائن کا تھا۔ مجھے پسند آیا۔ اس نے مجھے بریف کیس سے تاش کی ایک دوسری گڈی نکال کر دکھائی۔ بظاہر اس پر کسی طرح کا کوئی نشان نہیں تھا۔ مگر چشمہ لگا کر دیکھا تو ہر پتے کی پشت پر نیلے رنگ کے مختلف نشانات واضح ہو گئے۔ اس نے مجھے بتایا کہ کس نشان سے کون سا پتہ مراد ہوتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ حال ہی میں امریکہ سے واپس آیا ہوں اور مجھے فلش سے خاصی دلچسپی ہے۔ نیز یہ کہ کیا وہ مجھے شہر کے خفیہ کلبوں اور خفیہ اڈوں کا پتا بتا سکتا ہے جہاں یہ کھیل کھیلا جاتا ہو اور اونچی بازیاں لگتی ہوں۔ اور وہ مجھے مختلف شہروں کے اڈوں کے بارے میں بتانے لگا۔

☆☆

میرے مرحوم ڈیڈی احمد شاہ درانی‘ شہر کے بہت بڑے امپورٹر‘ اور ایکسپورٹر تھے۔ پندرہ سالہ ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد جسے سن شعور کو پہنچنے کے بعد میں نے ہمیشہ تلخ ہی دیکھا‘ معلوم نہیں وہ اس سے پہلے کیسی تھی۔ ممی کو طلاق دینے کے بعد ڈیڈی نے ہمیں یوں چھین لیا کہ بعد میں ان سے ملنے اور ایک نظر دیکھنے کی بھی اجازت نہیں دی اور پھر ممی کا انتقال ہو گیا اور ہماری تعلیم و تربیت ڈیڈی کی زیر نگرانی ان کی پسند و ناپسند کے مطابق ہونے لگی۔ نازیہ باجی مجھ سے تین سال بڑی تھیں اور سعدیہ چار سال چھوٹی تھی۔ دولت مند گھرانوں میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ انہیں عموماً بی اے یا بی ایس سی کے بعد گھر بٹھا جاتا ہے۔ جس کے بعد ان کی شادی کر دی جاتی ہے اور یہ ہی میری دونوں بہنوں کے ساتھ بھی ہوا۔

مجھے بچپن ہی سے فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی اور میری آرزو تھی کہ میں بڑا ہو کر کوئی نامور مصور یا کوئی مشہور اداکار کوئی ہر دل عزیز موسیقار بنوں مگر ڈیڈی مجھے پہلے ایم بی اے اور پھر امریکہ پلٹ ماہر سرجن بنانا چاہتے تھے۔ کچھ اس اختلاف اور کچھ انہوں نے ممی سے جو سلوک کیا تھا۔ اس

کے باعث میرے اور ان کے درمیان ہمیشہ ایک کشمکش سی رہی۔ اتنا تو بہر حال میں بھی سمجھتا تھا کہ میں جو کچھ بننا چاہتا ہوں اس کے لیے بھی مناسب تعلیم ضروری ہے۔ اس لیے ایف ایس سی تک اس کشمکش کا انداز کچھ ایسا ہی رہا کہ میں ان سے چھپ کر فلمیں دیکھتا تھا۔ گانے سنتا اور سیکھتا تھا اور پینٹنگ سے' ڈرائینگ کی کاپیوں پر کاپیاں بھرتا جاتا تھا لیکن اس کے ساتھ تعلیم پر بھی مناسب توجہ دیتا تھا۔ جس کا عملاً جو نتیجہ نکلا وہ یہی تھا کہ تھرڈ کلاس سے لے کر ایف ایس سی تک میں کلاس میں کبھی سیکنڈ اور کبھی تھرڈ پوزیشن لیتا رہا۔ میٹرک میں نے سیکنڈ ڈویژن میں کیا اور ایف ایس سی' میں بھی یہ ہی رزلٹ رہا۔

اصل کشمکش بلکہ ایک طرح سے سرد جنگ کا آغاز اس کے بعد ہوا ڈیڈی نے فیصلہ دے دیا کہ مجھے میڈیکل میں داخلہ لینا ہے میں نے کچھ زیادہ مخالفت نہیں کی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ فرسٹ ڈویژن والوں کو ہی بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ سیکنڈ ڈویژن کی باری کہاں آئے گی لیکن مجھے بے حد تعجب بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ جب مجھے نجانے کس طرح میڈیکل میں داخلہ مل گیا۔ غصے کے باوجود انکار کی مجال نہ تھی۔

مگر میں نے بھی سوچ لیا کہ اب آئندہ کسی بھی امتحان میں پاس ہونے والے پر لعنت ہے۔ ڈیڈی نے مجھے ہاسٹل میں داخل کروا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں پڑھائی کا ماحول ہونے کی وجہ سے بہتر نتائج برآمد ہوں گے اور وہ ہوئے بھی۔ یعنی اس کے باوجود کہ میں سارا سال فلم بینی اور آوارہ گردی کرتا رہتا تھا۔ اکثر کلاس میں غیر حاضر رہتا تھا۔ امتحان میں جوابات کی جگہ فلمی گانے اور کارٹون بنا کر آتا۔ مگر ڈیڈی نجانے کون سی جادو کی چھڑی گھماتے تھے کہ ہر سال کامیاب طلباء کی فہرست میں سب سے نیچے سہی لیکن ہوتا ضرور تھا۔ یہ صورت حال ایم بی بی ایس کے آخری سال تک رہی اور اس میں بھی میں اسی پوزیشن کے ساتھ پاس ہو گیا۔

اب' امریکہ جا کر سرجن بننے کا مرحلہ آیا۔ ڈیڈی نے تمام انتظامات مکمل کر لیے وہاں ان کے کچھ دوست تھے۔ انہیں میرا خیال رکھنے کے بارے میں لکھ دیا گیا۔ مجھے بھی ان کے پتے دیتے ہوئے ہدایات کر دی گئی کہ میں ان لوگوں سے برابر ملتا رہوں پھر عین روانگی کے دن ڈیڈی نے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا اور بالکل تنہائی میں سنجیدگی سے بولے۔

''برخوردار! میں تمہارے تمام معمولات اور خیالات کو جانتا ہوں۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے مستقبل کی بہتری کون سی راہ اختیار کرنے میں ہے۔ ابھی تک تم نے صرف ایف ایس سی تک پڑھا ہے۔ میڈیکل کے سال اول سے لے کر فائنل تک امتحان میں بلاشبہ تم بیٹھے ہو۔ مگر اسے پاس میں نے کیا ہے۔ تم سے آج تک اس لیے نہیں کہا کہ اس ملک میں سب کچھ ملتا ہے۔ جب یہاں کے لیڈر جو سیاست کی الف بے سے واقف نہیں اور پھر بھی عوام کی جان و مال سے کھیلتے ہیں تو ایک ڈاکٹر کا دائرہ کار تو اتنا وسیع بھی نہیں ہوتا لیکن اب تم امریکہ جا رہے ہو۔ اگرچہ وہاں بھی بہت کچھ چلتا ہے۔ مگر وہاں ڈگری بغیر محنت کے نہیں مل سکتی۔ اس لیے اب تمہیں جان توڑ کر محنت کرنا پڑے گی۔ بشرطیکہ تمہیں میری لاکھوں کی جائداد اور کاروبار سے کوئی دلچسپی ہو۔ کیونکہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر تم وہاں سے ڈگری لے کر واپس نہیں آئے تو میں تمہیں اپنی جملہ وراثت سے عاق کر دوں گا۔ بس مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔ اب تم جا سکتے ہو۔''

میں ڈیڈی کی دھمکی سے بہت زیادہ خوف زدہ ہو گیا تھا کہ میں نے امریکہ پہنچنے کے بعد سچ مچ ایمانداری سے پڑھنے کی کوشش کی مگر جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اب تعلیم میں دلچسپی لینا میرے

بس کی بات نہیں رہی۔ چنانچہ میں نے ڈیڈی کی مقرر کردہ سزا سے بچنے کا کوئی طریقہ سوچنے کی کوشش کی اور آخر کار اسی نتیجے پر پہنچا کہ یہاں مجھے اپنے شوق کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بہترین مواقع حاصل ہیں۔

اگر میں ان میں سے کسی ایک شوق' مثلاً اداکاری' میں کامیاب ہوگیا تو پھر مجھے ڈیڈی کی دولت کی بھی پرواہ نہیں ہوگی۔ چنانچہ میں نے ایک طرف تو ہالی وڈ کے چکر لگانا شروع کردیے اور دوسری طرف قسمت کے سہارے دولت کمانے کے لیے قمار خانوں کا رخ کیا۔ مگر جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ خواب دیکھنا اور چیز ہے اور اس کی تعبیر حاصل کرنا قطعی مختلف شے ہے۔ دو سال ٹھوکریں کھانے کے بعد صرف اتنا ہوسکا کہ قمار خانوں میں اپنے سٹار پردوستوں کی مہربانی سے مختلف نوعیت کی بازیوں کے کچھ خاص خاص گر ہاتھ میں آگئے اور اسٹوڈیوز کے چکروں نے ایک تجربہ کار میک اپ مین کا ہم نوالہ' ہم پیالہ بنادیا۔ جس نے ازراہ دوست نوازی اس فن کے کئی سربستہ راز مجھے سکھادیے۔ قریب تھا کہ میں ان دونوں فنون سے ذاتی فائدہ اٹھانے کا آغاز کرتا کہ ڈیڈی کے اچانک انتقال کا کیبل موصول ہوا اور میں بلاتامل پاکستان واپس آگیا۔

ان دو برسوں میں ڈیڈی کو ان کے دوست میرے بارے میں کیا رپورٹیں بھیجتے رہے تھے' اس کا مجھے علم نہیں تھا لیکن یہ رپورٹیں میرے خلاف تھیں۔ تب بھی ڈیڈی نے اپنے خطوط میں کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ بڑی پابندی سے میرے جملہ اخراجات روانہ کرتے رہے تھے۔ غالباً وہ اس انتظار میں تھے کہ فائنل نتیجہ سامنے آئے تب کوئی حتمی قدم اٹھائیں۔ مگر قسمت کی مہربانی سے انہیں یہ موقع نہیں مل سکا اور اپنی واپسی پر مجھے یہ ہی بتایا گیا کہ دونوں بہنوں کو تھوڑا سا حصہ دینے کے بعد میں پوری جائیداد و کاروبار کا مالک ہوں۔ مجھے درآمد' برآمد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اس لیے' میں میں نے ڈیڈی کا جملہ بزنس مع اس کی گڈول کے ایک پارٹی کے ہاتھ فروخت کردیا۔ اس سے بھی ایک وافر رقم ہاتھ لگی اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اب بظاہر باپ کی کمائی ہوئی دولت سے عیش کرنے کے علاوہ میری کوئی مصروفیت یا کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔

ڈان زان مغل سے میری دلچسپی ملاقات کو تقریباً ایک ہفتہ گزارا تھا۔ ایک شام میں شہر کے ایک معروف کلب میں بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ مجھے اپنے پیچھے ایک قریبی میز سے ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔

میں اس وقت محض حسن اتفاق سے اکیلا تھا۔ ہائی سوسائٹی میں یہ خبر پورے زور وشور سے پھیل گئی تھی کہ ایک لکھ پتی کا اکلوتا بیٹا حال ہی میں اس کی جائیداد کا وارث بنا ہے اور خیر سے کنوارہ ہے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کئی خوب صورت لڑکیوں نے یا تو خود میرا گھر دیکھ لیا تھا۔ یا انہیں دکھایا گیا تھا۔

جلد ہی مجھے ان کی گفتگو سے اندازہ ہوگیا کہ وہ کسی بڑی رقم کے نقصان کا ماتم کررہے ہیں۔ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے منگیتر ہیں۔ لڑکا غریب ہے۔ لڑکی امیر باپ کی بیٹی ہے۔ دفعتاً میں نے لڑکی کو سسکیوں کے ساتھ روتے سنا۔ وہ شام کا ابتدائی وقت تھا کلب کا ریفریشمنٹ ہال تقریباً خالی نظر آرہا تھا۔ اب مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ یوں بھی اپنی کافی ختم کرچکا تھا۔ اس لیے اٹھا اور بڑی بے تکلفی سے ان کی میز پر جاکر بیٹھ گیا۔ لڑکی نے جلدی سے اپنے آنسو خشک کرلیے میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ نقش ونگار کے اعتبار سے شاید اتنی خوب صورت نہ ہو مگر چہرے کے مجموعی تاثر بڑا کشش انگیز تھا۔ وہ دونوں میری اس مداخلت پر حیران تھے۔ میں نے

اپنا تعارف کرایا تو ان کی ناگواری کے تاثرات قدرے کم ہو گئے۔ پھر جب میں نے انہیں بتایا کہ میں قریب کی میز پر بیٹھا۔ نادانستہ ان کی نجی گفتگو سننے کا مرتکب ہوا ہوں اور محض بر بنائے خلوص و انسانیت یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا میں کسی بھی طرح ان کے کچھ کام آ سکتا ہوں۔ میری ان باتوں سے وہ دونوں بہت متاثر ہوئے میرا شکریہ ادا کیا اور میرے اصرار پر اپنی کہانی کچھ یوں بیان کی۔

''میرا نام جاوید عزیز ہے۔'' نوجوان نے کہا۔ وہ بھی خاصا پرکشش لڑکا تھا۔ ''اور یہ میری منگیتر نوشابہ ہیں۔ ایک بڑے باپ کی اکلوتی بیٹی ان سے کچھ دور کی رشتے داری بھی ہوتی ہے۔ میرا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا رہا ہے۔ پہلی جماعت سے ہی نمایاں پوزیشن لے کر کامیاب ہوتا رہا ہوں۔ بی کام میں فرسٹ آیا اس سے آگے تعلیم جاری رکھنے کی استطاعت نہیں تھی۔

خیام انکل میرا مطلب ہے۔ نوشابہ کے ابو میری امی سے ملنے آئے دونوں میں کچھ باتیں ہوئیں اور پھر ایک ہفتے بعد ہماری منگنی ہو گئی۔ انکل نے مجھ سے کہا۔

''برخوردار! ملازمت میں کچھ نہیں رکھا۔ بزنس کرو، بزنس وہ خود بھی بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ پھر انہوں نے مجھے کچھ رقم نقد دی کوئی مناسب کاروبار کرنے کے لیے میں بہت خوش تھا۔ میرے ذہن میں بے شمار منصوبے خوابوں کی مانند آ رہے تھے لیکن پھر میرا ایک دوست آ گیا۔ میں نے اس سے بھی مشورہ کیا کہ کون سا کام زیادہ بہتر اور جلد منافع بخش ہو سکتا ہے۔ وہ بولا۔

''آج کل تو اتنی رقم میں ان سگریٹ کی دکان بھی نہیں کھل سکتی۔ کاروبار کوئی بھی ہو۔ دکان کے لیے اچھا محل وقوع سب سے زیادہ اہم ہے اور ایسی دوکان کی صرف پگڑی ہی پچاس ہزار سے لے کر ڈیڑھ ہزار تک ہے۔ میرے پاس رقم ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ میں نے کچھ مایوسی سے پوچھا۔ پھر میں کیا کروں۔ اس نے کہا۔

''اپنے انکل سے اور روپیہ مانگو۔ کم از کم دو لاکھ مگر یہ میرے لیے بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا۔ کوئی اور ترکیب بتاؤ۔ اس نے جواب دیا کہ پھر تو بس ایک ہی ترکیب ہے۔ میں ایک ایسی جگہ جانتا ہوں۔ جہاں بڑے پیمانے پر فلش ہوتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں بازیاں لگتی ہیں۔ تم ایک رات میں کروڑ پتی بھی بن سکتے ہو۔ میں نے کہا، مجھے فلش نہیں آتا۔ آج تک کبھی کھیلا ہی نہیں۔ وہ ہنسا کہ یہ کوئی مشکل بات نہیں میں تمہیں چند منٹ میں سب کچھ سکھا دوں گا۔ میں اس کی باتوں میں آ گیا۔

دوسرے دن وہ ایک کار لے کر آ گیا۔ کچھ دور جا کر اس نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور کہا۔ ''احتیاط خود تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اگر کبھی کوئی پوچھے تو دیانت داری سے کہہ سکتے ہو کہ مجھے کچھ نہیں معلوم' وہ مجھے نہ معلوم کسی علاقے کی ایک شاندار عمارت میں لے گیا۔ جس میں بے شمار کمرے تھے اور ہر کمرے میں کچھ نہ کچھ ہو رہا تھا۔ اب زیادہ تفصیل میں کیا جاؤں۔ مختصر یہ کہ میں نے بازی لگائی شروع میں کافی جیتا۔ تقریباً پچاس ہزار، مگر پھر جو قسمت نے پلٹا کھایا تو سب کچھ ہار گیا۔ پورا ایک لاکھ میرا دوست مجھے تسلی دینے لگا۔ میں جان سے بیزار تھا۔ خودکشی کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک بوتل دی کہ اسے پی لو۔ طبیعت سنبھل جائے گی۔ معلوم نہیں، وہ کیا شے تھی۔ اسے پینے کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ آنکھ کھلی تو اپنے گھر کے قریب ایک سنسان گلی میں پڑا ہوا تھا۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ نوشابہ نے اسے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔

''تمہیں یہ شبہ تو نہیں ہوا کہ وہ لوگ پتے

بازی کر رہے ہیں۔'' میں نے جاوید سے پوچھا۔
''شبہ نہیں مجھے یقین ہے کہ انہوں نے مجھے دھوکے سے لوٹا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔
''جو آدمی تمہارے ساتھ کھیل رہے تھے۔'' میں نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔''ان میں سے کوئی چشمہ تو نہیں پہنے ہوئے تھا۔''
''ہاں ایک آدمی نے پہن رکھا تھا۔'' جاوید نے کچھ چونک کر جواب دیا۔
میں نے اسے پتوں پر کچھ خفیہ نشانات کے بارے میں بتایا۔ اس نے جواب دیا کہ اس نے فراڈ کی تصدیق کے لیے ایک استعمال شدہ تاش کی گڈی چھپا کر جیب میں رکھ لی تھی لیکن گھر پہنچ کر اسے بہت غور سے دیکھنے پر بھی کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ گڈی اتفاق سے اس وقت بھی اس کی جیب میں تھی۔ اس نے نکال کر مجھے دکھائی۔ میں نے اسے دیکھے بغیر جیب میں رکھ لیا۔
میں اسے چشمے کے راز کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس گڈی پر خفیہ نشانات ضرور موجود ہوں گے۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ میں ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کل مجھ سے نوشابہ کے ساتھ اس جگہ ملاقات کرے تو میں اسے اپنی سوچی ہوئی تجویز سے آگاہ کروں گا اور مجھے پوری امید ہے کہ میں صرف اس کا نقصان ہی نہیں بلکہ کچھ منافع بھی دلوانے کی کوشش کروں گا۔
دوسرے دن وہ مجھ سے پہلے ہی کلب میں میرے منتظر تھے۔ میں نے گھر پہنچ کر پروفیسر زان مغل کا دیا ہوا چشمہ لگا کر دیکھا تو تصدیق ہوگئی کہ میرا اندازہ درست تھا۔ تاش کی گڈی کے ہر پتے پر خفیہ نشانات موجود تھے۔ ایسی صورت میں ظاہر تھا کہ میرا لائحہ عمل کیا ہو سکتا تھا۔
چنانچہ میں نے کہا۔
''دیکھو میاں جاوید! ہر چند کہ میں کوئی ماہر کھلاڑی نہیں ہوں۔ مگر فلش کے کچھ خاص گر جانتا

غزل

طارق حسن طارقؔ

جو شاعری میں بہت کامیاب ہے پیارے
اُسی کا اِن دنوں خانہ خراب ہے پیارے

وہی زمانے میں عزت مآب ہے پیارے
کہ مال جس کے یہاں بے حساب ہے پیارے

جو تم بنے ہوئے رشکِ شباب ہو پیارے
مجھے خبر ہے کہاں کا خضاب ہے پیارے

یہ اور بات کہ کانٹوں سے ہاتھ ہے زخمی
یہ کم نہیں مرے گھر میں گلاب ہے پیارے

ہمارے سارے اثاثے کی ٹوہ میں ہو تم
ہماری جب سے طبیعت خراب ہے پیارے!

میں اس کے گھر جو چلا جاتا ہوں تو کیا ناصح
تلاشِ رزق تو کارِ ثواب ہے پیارے!

ہے ڈر مجھے ترے والد نہ مسترد کردیں
میں ایک چراغ ہوں تُو آفتاب ہے پیارے

سبب بتادوں میں دنیا کی بے حجابی کا
تمہارا حُسن ، تمہارا شباب ہے پیارے

خدا کے واسطے طارقؔ نہ اس سے تنہا مل
لگے گا عیب ، زمانہ خراب ہے پیارے

ہوں مجھے تم دونوں سے ہمدردی ہے اور ظالم سماج یا فلک کج رفتار کو دو محبت کرنے والوں کے درمیان دیوار بنتے نہیں دیکھ سکتا۔ میرے لیے لاکھ دو لاکھ کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ تمہیں یوں بھی دے سکتا ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ محبت کرنے والے بڑے غیرت مند ہوتے ہیں۔ تم لوگ اس انداز میں میرا احسانمند ہونا منظور نہیں کرو گے۔ پھر میں ان لوگوں کو بھی کچھ سبق دینا چاہتا ہوں۔ جو سادہ لوح معصوم لوگوں کو اس سنگدلی سے ٹھگتے ہیں۔

اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے اس دوست سے میرا تعارف کرادو جو تمہیں اس پوشیدہ عمارت میں لے گیا تھا۔ میں خود ان لوگوں کے ساتھ فلش کھیلوں گا اور مجھے یقین ہے کہ چند گھنٹوں میں ایک لاکھ کے تین لاکھ بنا لوں گا۔ اس میں سے ایک لاکھ تمہیں دے دوں گا۔ پھر یہ کوئی احسان نہیں ہوگا۔ کیوں کہ تمہارے ذریعے میں خود بھی ایک رات میں ایک لاکھ کما لوں گا۔ بولو کیا کہتے ہو۔ میری تجویز قبول ہے۔''

نوشابہ کا چہرہ تو میری بات سنتے ہی چمکنے لگا تھا۔ مگر جاوید نے جواب دینے سے پہلے کچھ دیر سر کو جھکا کر سوچا پھر بولا۔ ''اس میں شک نہیں ہے کہ آپ کی تجویز بہت خوب ہے لیکن پہلی بات تو یہ کہ وہ لوگ آپ کے اندازے سے کہیں زیادہ چالاک ہیں اور چار سو بیس ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری خاطر آپ اتنی بڑی رقم داؤ پر لگا دیں۔ دوسری بات یہ کہ میرا دوست! اس دن کے بعد سے پھر نظر نہیں آیا ہے۔''

''تم میری رقم کے لیے فکر مند نہ ہو۔ میں بزنس مین ہوں اور کوئی تجربہ کار بزنس مین سوچے سمجھے بغیر رسک نہیں لیتا۔'' میں نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ ''رہا تمہارے اس دوست کا معاملہ تو تم اس کے مصروف ٹھکانوں پر اسے تلاش کرو۔ مجھے امید ہے کہ وہ نہ صرف مل جائے گا۔ بلکہ ایک اور شکار پھانسنے کے لالچ میں اس آڑے پر مجھے بھی لے جانے کے لیے بخوشی آمادہ ہو جائے گا۔ چاہو تو تم دونوں بھی ساتھ چل سکتے ہو۔''

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جاوید تین دن کے بعد مجھے ملا اور بتایا کہ اگلی شام کے لیے پروگرام طے پا گیا ہے۔ دوسرے دن شام کو وہ مجھے ایک اور کلب لے گیا۔ جہاں ایک نوجوان سے میرا تعارف کرایا۔ جس کا نام دلاور تھا۔ وہ مجھے شکل ہی سے کوئی چھٹا ہوا بدمعاش اور عادی جرائم پیشہ نظر آ رہا تھا لیکن اپنی ناگواری کو چھپاتے ہوئے میں اس سے بڑے پرتپاک انداز میں ملا۔ میرے پاس اپنی کار تھی۔ مگر طے یہ ہی ہوا کہ ہم ان کے معمول کے مطابق اس کار میں چلیں گے۔ جو ہمیں لیجانے کے لیے بھیجی جائے گی۔ اس لیے میں اپنی کار لاک لگا کر کلب ہی میں چھوڑ دوں۔

دوسری شرط یہ بھی تھی کہ کچھ راستہ طے کرنے کے بعد ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے گی۔ تقریباً نو بجے تک ہم کلب میں کافی پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ پھر دلاور نے کار کے پہنچنے کی اطلاع دی۔ میں' جاوید' اور نوشابہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ دلاور اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا اور ہم کلب سے روانہ ہوئے۔ پندرہ منٹ کے سفر کے بعد دلاور نے کار رکوائی۔ اتر کر خود اپنے ہاتھوں سے ہم تینوں کی آنکھوں پر پٹی باندھی۔

کار پھر چلی اور میرے اندازے کے مطابق نصف گھنٹے کے لگ بھگ چلتی رہی۔ معلوم نہیں وہ حقیقت میں کوئی فاصلہ طے کر رہے تھے یا ہمیں طویل فاصلے کا تاثر دے رہے تھے اور سڑکوں پر یونہی گھوم پھر رہے تھے۔

بہر حال تقریباً دس بجے کار ایک عمارت کے سامنے رکی۔ ہماری پٹیاں کھول دی گئیں۔ میں نے دیکھا کہ ایک تین منزلہ کچھ کچھ قلعہ نما سی

عمارت ہے جو باہر سے بڑی مضبوط معلوم ہو رہی تھی۔ ارد گرد کم و بیش اندھیرا تھا۔ صرف بلندی پر چند سرچ لائٹیں روشن تھیں۔ ایک طرف بڑا سا پارکنگ ایریا تھا۔ جس میں میرے اندازے کے مطابق پچاس سے زیادہ کاریں کھڑی تھیں۔ ہم عمارت کے صدر دروازے میں داخل ہوئے۔ جس کے باہر دو مسلح گارڈ موجود تھے۔ ہم تیسری منزل پر پہنچے دونوں اطراف بہت سے دروازے نظر آ رہے تھے۔ جن میں سے بیشتر بند اور نیم واہ تھے۔

ان کے اندر سے مختلف باتیں کرنے ہنسی مذاق اور قہقہے لگانے اور گانے کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ ڈرائیور کار ہی میں رہ گیا تھا۔ دلاور ہمیں ساتھ لیے جس کمرے میں داخل ہوا۔ اس میں چھ سات میزوں کے گرد چار یا چار سے زیادہ افراد بیٹھے تھے۔ دو چار میزیں خالی بھی تھیں۔ دلاور نے کمرے کے نگران کو میرے بارے میں بتایا۔ جس نے ایک خالی میز کی جانب اشارہ کیا اور ابھی ہم وہاں بیٹھے ہی تھے کہ تین آدمی نہ جانے کہاں سے نکل کر ہمارے سامنے آ بیٹھے۔ جن میں سے ایک نے میری طرح چشمہ لگایا ہوا تھا۔

دلاور نے ان کا فرداً فرداً تعارف کرایا۔ ان کے نام اور تعارف کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ نام بھی فرضی تھے اور دلاور نے ان کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا۔ وہ سب کچھ بھی جھوٹ تھا۔ تعارف کے بعد ہم سب اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے۔ میں دانستہ اس چشمے والے کے قریب بیٹھا۔ اس کے بعد جاوید اور نوشابہ تھے اور ان کے بعد دو اور مد مقابل' پہچان کے لیے میں انہیں نمبر ایک اور نمبر دو لکھوں گا۔

یہاں امریکہ کے قمار خانوں کی طرح ٹوکن منی کا رواج نہیں تھا۔ ہر کھلاڑی اصل کرنسی نوٹ سامنے رکھ کر بیٹھتا تھا۔ میں نے اپنے بریف کیس میں سے پچاس ہزار کے نوٹ نکالے اور جھک کر بریف کیس نیچے رکھا تھا اور ارادتاً کرسی کو اس طرح حرکت دی کہ وہ الٹ کر پیچھے گرنے لگی۔ پھر میں نے جیسے گرنے سے بچنے کے لیے ہوا میں ہاتھ لہرائے اور میرا داہنا ہاتھ ٹھیک چشمہ والے کے چہرے پر لگا۔ دوسرے ہی لمحے چشمہ اس کی ناک سے اچھل کر تیر کی طرح پچھلی دیوار سے ٹکرایا اور اس کے دونوں شیشے چور چور ہو گئے۔

میں بھی لڑھک کر نیچے گر چکا تھا۔ جاوید نے جلدی سے مجھے اٹھنے میں مدد دی۔ میں نے انتہائی شرمندہ لہجے میں چشمے والے سے معذرت چاہی۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ تیز نظروں سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ ہم دوبارہ اپنی کرسیوں پر بیٹھے۔ تاش کی ایک قیمتی نئی گڈی کھولی گئی۔ ان تینوں کے انداز سے کچھ ہچکچاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ مگر ظاہر تھا کہ وہ کوئی معقول بہانہ پیش نہیں کر سکتے تھے۔

چنانچہ کھیل شروع ہوا۔ مجھے اپنے چشمے کی مدد سے تاش کے ہر پتے پر لکھے ہوئے نشانات نظر آ رہے تھے۔ انہیں دیکھنا بھی کچھ ایسا مشکل نہ تھا۔ جس وقت پتے فرداً فرداً ہر ایک کو دیے جا رہے تھے۔

اسی وقت تین میں سے دو پتوں کے نشانات تو نظر آ ہی جاتے تھے۔ پھر جب کھلاڑی انہیں اٹھاتا تھا تو باقی رہ جانے والا پتہ بھی نگاہ میں آ جاتا تھا۔ مگر ایک دو بازیوں کے بعد ہی مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ پتوں پر جو خفیہ نشانات ڈالے گئے ہیں۔ وہ بالکل غلط ہیں۔ مثلاً اپنے خفیہ نشان کے مطابق اگر کسی پتے کے حکم کا اکا ہونا چاہیے تھا تو حقیقت میں وہ حکم کی دگی ثابت ہوتا تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ یہ ہی ہونا چاہیے تھا کہ میں وہ دونوں بازیاں ہار گیا۔

میں نے سوچا کہ جو نشانات میں دیکھ رہا ہوں ممکن ہے وہ اس لیے دھوکہ دینے کے لیے

الے گئے ہوں کہ اگر کسی پر یہ راز فاش ہو جائے۔ تب بھی وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور حقیقت میں پتوں کی پہچان کے لیے کسی اور جگہ نشانات موجود ہوں۔ چنانچہ میں نے پتوں کو بڑے غور سے دیکھنا شروع کیا مگر کسی بھی جگہ کوئی اور نشان تلاش کرنے سے قاصر رہا۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ ان کے آدمی کا چشمہ تو میں توڑ چکا ہوں۔ تب پھر وہ لوگ کیسے جیت رہے ہیں۔

کوئی ایک بازی تو میرے ہاتھ میں آتی۔ یقیناً یہ لوگ یا تو پتے لگا رہے ہیں یا پھر چشمے والے کے پاس اضافی پتے موجود ہیں۔ اب تک ہر بازی وہی جیتا تھا وہ حسب ضرورت انہیں استعمال کر رہا تھا۔

میری مسلسل ہار پر جاوید برابر میری ہمت افزائی کر رہا تھا۔ مگر میں نے نوشابہ کو دیکھا۔ وہ خالی افسردہ نظر آ رہی تھی۔ ایک دو مرتبہ مجھے یہ بھی شبہ ہوا جیسے وہ مجھے مزید کھیلنے سے منع کر رہی ہو۔ مگر واضح طور پر کچھ کہنے سے مجبور ہو۔ اب میں نے اپنے امریکہ کے تجربے کا سہارا لیا۔ اس کے بعد جیسے کھیل کا پانسہ پلٹ گیا۔ میں نے لگاتار چار بازیاں جیت کر اپنا تمام نقصان پورا کر لیا۔

نوشابہ کے چہرے پر چمک آ گئی۔ باقی لوگ جاوید سمیت اپنی کرسیوں پر پہلو بدلنے لگے۔ اگلی دو بازیاں بھی میرے حق میں آئیں اور اب میں تقریباً چالیس ہزار روپے جیت چکا تھا۔ چشمے کے بیکار ثابت ہونے پر میری تمام تر توجہ اپنے تینوں مخالفوں پر جمی ہوئی تھی۔ میں ان کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا تھا۔ ایک بازی چل رہی تھی۔ میرے پاس تین بادشاہ تھے اور میں مطمئن تھا کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی اس سے بڑے پتے موجود نہیں ہیں۔

چنانچہ میں ہر چال پانچ ہزار کی چل رہا تھا۔ کچھ چالوں کے بعد نمبر ایک نمبر دو دونوں نے اپنے پتے پھینک دیے۔ اب میں اور وہ چشمے والا میدان میں رہ گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ جب میں چال چل رہا تھا تو اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے دو پتے تبدیل کر لیے اور ایک دم سے دس ہزار کی چال چلی۔ میں نے فوراً اس کے پتوں پر ہاتھ مارا اور انہیں جھپٹ لیا۔

"یہ کیا حرکت ہے۔" وہ بگڑ کر بولا۔

"تم پتے بنا رہے ہو۔" میں نے سخت لہجے میں جواب دیا اور اس کے پتے میز پر کھول دیے۔ وہ تینوں رکے تھے۔ "میں مطالبہ کرتا ہوں۔" میں نے بدستور سخت لہجے میں کہا۔ "کہ تاش کی گڈی چیک کی جائے۔ یقیناً چھا کے برآمد ہوں گے۔"

"تم مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔" چشمے والے نے زور سے میز پر گھونسہ مارا۔

نمبر 'ایک' اور نمبر 2 مجھے قہر آلود نظروں سے گھور رہے تھے۔ جاوید خاموش تھا اور نوشابہ بڑی پریشان نظر آ رہی تھی۔ ہنگامے کی آواز سن کر نگران بھی آ گیا تھا۔ میں نے اسے صورت حال بتائی۔ اس نے بڑے پرسکون انداز میں میرے اس مطالبے کی تائید کی تاش کی گڈی چیک کی جائے۔ چنانچہ ایک ایک پتہ دیکھا گیا اور جیسا کہ میرا خیال تھا اس میں سے چھا کے برآمد ہوئے۔ چار اس کے اپنے اور دو وہ جو چشمے والے نے شامل کیے تھے۔

چشمے والا خاموش بیٹھا تھا۔ مگر وہ کسی طرح بھی گھبرایا ہوا یا پریشان معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ میرے اصرار پر اس کی بھی تلاشی لی گئی اور مختلف جیبوں میں خاص طور سے آستین کے اندر بنی ہوئی خفیہ جیب میں کئی بڑے پتے موجود پائے گئے۔ نگران نے بڑے مہذب انداز میں مجھ سے معذرت کی۔ اس نے کہا کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ یہاں ہر کھیل صاف ستھرا اور

ایماندارانہ ہولیکن ہمارے معزز مہمانوں میں اگر کوئی فراڈ کرنا چاہیے تو ظاہر ہے کہ ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں اس کے بعد اس نے بڑے سخت الفاظ میں چشمے والے کو برا بھلا کہا اور تاکید کی کہ آئندہ وہ کبھی یہاں قدم نہ رکھے۔

پھر حکم دیا کہ اس شخص کو کلب سے باہر نکال دیا جائے۔ نگران نے دو معاون جو کمرے میں ہی موجود تھے چشمے والے کو پکڑ کر باہر لے گئے اس اثناء میں ایک شخص جس نے بڑے قیمتی کپڑے اور بہترین تراش کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ کمرے میں داخل ہوا۔ نگران نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا اور مجھ سے تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ یہ امتیاز صاحب ہیں۔ شہر کی مصروف سیاسی شخصیت جو کبھی کبھی تفریحاً کلب آجاتے ہیں۔ آپ ان کے ساتھ کھیل کے یقیناً لطف اندوز ہوں گے۔

امتیاز بڑے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے خلیقانہ انداز میں ہاتھ ملایا ہم ایک بار پھر میز پر بیٹھ گئے۔ چشمے والے کی کرسی امتیاز نے سنبھال لی۔ وہ ایک وجیہہ آدمی تھا۔ مگر اس کی بھوری آنکھوں کی چمک سے انتہائی زیرک اور چالاک ظاہر کر رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ اپنے دلکش خدوخال کے باوجود وہ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ معلوم ہوا۔ تاش کی نئی گڈی کھولی گئی تو کھیل ایک بار پھر شروع ہوگیا۔

اس کے پتے پھینکنے کے انداز سے میں نے جان لیا کہ وہ خاصا تجربے کار شار پر ہے۔ میں نے جاوید اور نوشابہ کی طرف دیکھا۔ جاوید حسب سابق بڑا غیر متعلق نظر آرہا تھا۔ مگر نوشابہ اب بھی مجھے پریشان ہی نہیں کچھ خوفزدہ بھی محسوس ہوئی۔

پتے تقسیم کیے گئے۔ پہلی بار امتیاز نے جیت لی۔ دوسری مرتبہ میں نے گڈی پھینٹی اور یہ بازی میرے ہاتھ رہی۔ اس سے مجھے اندازے کی تصدیق کرنا مطلوب تھی کہ امتیاز شار پر ہے یا نہیں۔ میں ان لوگوں پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ میں بھی اس فن سے واقف ہوں۔ ایسی صورت حال میں مجھے ایک امریکہ کے بڑے ہی معروف اور ماہر پتے باز نے مخالف کی پھینٹی ہوئی گڈی کاٹنے کی ترکیب بتائی تھی۔ جس کا انحصار اس بات پر تھا کہ میں مخالف کی وہ ٹرک پہچان لوں جس سے اس نے اس مرتبہ پتے پھینٹے ہیں۔

چنانچہ اگلی بار میں نے امتیاز کو گڈی پھینٹنے کا موقع دیا۔ مگر اس کی ٹرک نہ پکڑ سکا نتیجہ میں یہ بازی مجھے ہارنا پڑی۔ مگر اگلی مرتبہ میں نے اس کی چالا کی پکڑ لی اور اسی کے مطابق گڈی کو ایک خاص مقام سے کاٹا۔ شاید امتیاز اس ہنر سے انجان تھا۔ اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ بازی میں جیتا۔ اس کے بعد امتیاز نے ہی ہر مرتبہ تاش پھینٹے لیکن اس کی کوئی بھی چالا کی بھری باریک بین نظروں سے نہ بچ سکی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک گھنٹے کے کھیل میں میں تقریباً ایک لاکھ روپے جیت چکا تھا۔ امتیاز سپاٹ چہرہ لیے بیٹھا تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ اندر سے بری طرح کھول رہا ہے۔

اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں نے کھیل ختم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر امتیاز مجھے یوں کب جانے دے سکتا تھا۔ اس نے مزید کھیلنے پر اصرار کیا میں نے اس شرط پر مان لیا کہ بس تین بازیاں اور ہوں گی۔ امتیاز راضی ہوگیا۔ کھیل پھر شروع ہوا اس دوران جاوید عزیز کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ اگرچہ وہ میری مسلسل جیت پر خود کو بہت خوش ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نوشابہ بھی مطمئن تھی اور ایک ہلکی مسکراہٹ اس کے نرم و نازک ہونٹوں پر رقص کر رہی تھی۔ مگر ساتھ ہی اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کسی موہوم سے اندیشے کی پرچھائیاں بھی گاہے گاہے۔ ایک جھلک دکھا کر غائب ہوجاتی تھیں۔

ان تین بازیوں میں ایک مرتبہ میں نے پتے پھینٹے اور دو مرتبہ امتیاز نے مگر نتیجہ ہر بار ایک ہی رہا۔ یعنی میری جیت تیسری بازی کے اختتام پر میں نے اپنے سامنے رکھے ہوئے نوٹ گنے تو تین لاکھ دس ہزار نکلے۔ یعنی میں دو لاکھ دس ہزار جیت چکا تھا۔

''آج کی رات آپ کی خوش بختی کی رات ہے۔ ناصر صاحب۔'' امتیاز نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ''میری طرف سے مبارکباد قبول کریں امید ہے کہ آپ آئندہ بھی کلب آتے رہیں گے۔ آپ سے جیتنا میری آرزو بن چکا ہے۔''

''میں کوئی پیشہ ور کھلاڑی نہیں ہوں۔'' میں نے نرم لہجے میں ہی جواب دیا اور جاوید عزیز کی طرف اشارہ کیا۔ ''آج تو صرف ایک شریف نوجوان کی مدد کے خیال سے آ گیا تھا۔ ویسے آپ کی خواہش کا احترام کرنا بھی میرے لیے ضروری ہے۔ اس لیے جلد ہی پھر کسی دن حاضر ہوں گا۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے ایک لاکھ کے نوٹ اٹھا کر جاوید کی طرف بڑھا دیے۔

''یہ لو بھائی تمہارا نقصان تو پورا ہو گیا۔'' میں نے کہا۔ ''امید ہے آئندہ کبھی ایسی حماقت میں مبتلا نہیں ہو گے۔''

جاوید نے شکریے کے طور پر کچھ کہا اور نوٹ اپنی جیب میں رکھ لیے۔ اس کے انداز سے بالکل یہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ میری جیت سے خوش ہے۔ البتہ نوشابہ کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ مجھے بار بار احساس ہو رہا تھا کہ وہ کسی اندیشے سے فکر مند ہے۔ امتیاز نے میری جیت کی خوشی میں جام کی تجویز پیش کی۔

یہ کوشش میرے مخالف ساتھی اور نگران کھیل کے دوران بھی کرتے رہے تھے۔ مگر میں نے بیرون ملک اس حرام شے کو منہ نہیں لگایا تھا تو اب بھلا اس کی کیا ضرورت محسوس کرتا۔ شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ اس کے بعد امتیاز نے جوس یا اسکوائش پر اصرار کیا۔ میں نے مان لیا۔ نگران پانچ منٹ میں ایک ٹرے میں اسکوائش کے چھ گلاس لیے حاضر ہوا۔ مشروب اچھا تھا اور مجھے اس کے ذائقے میں بھی کسی تبدیلی کا احساس نہیں ہوا۔ مگر یہ کوئی خاص بات نہیں تھی اس کا اپنا ایک ذائقہ تھا۔ جس سے آج تک کام و دہن کو سابقہ نہیں پڑا تھا۔ میں نے چند گھونٹوں ہی میں گلاس خالی کر دیا۔

رقم پہلے ہی بریف کیس میں رکھ چکا تھا۔ گلاس ٹرے میں واپس رکھتے ہوئے اٹھا۔ امتیاز سے ہاتھ ملایا۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور جاوید اور نوشابہ کو لے کر کمرے سے باہر نکلا لیکن ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ ایک دم چکرا گیا۔ ایک دم سے سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ نظروں کے سامنے تاریکی چھا گئی اور پھر جیسے میں اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا لیکن آنکھ کھلی تو میں ایک کمرے کے فرش پر دست و پا بستہ پڑا ہوا تھا۔ مزید یہ کہ میرے منہ پر ٹیپ چپکا دیا گیا تھا کہ میں آواز بھی نہ نکال سکوں۔ کمرے میں ایک زیرو کا سبز بلب روشن تھا جس کی ہلکی روشنی میں میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ ایک مختصر سا کمرہ تھا۔ جس کی پیمائش دس بائی دس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی اور ہر قسم کے فرنیچر یا کسی بھی چیز کی موجودگی سے یکسر خالی تھا۔ چھت بھی زیادہ بلند نہیں تھی۔

کمرے میں صرف ایک دروازہ اور ایک کھڑکی نظر آ رہی تھی اور دونوں بند تھے۔ میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ جس کے باعث اپنی رسٹ واچ دیکھ کر وقت کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا ہاتھ اور پیروں کی بندشوں کے علاوہ

ان لوگوں نے رسی کو میرے گرد لپیٹ کر مزید اطمینان کر لیا تھا کہ میں کسی بھی طرح اپنے آپ کو آزاد نہ کر سکوں۔ بریف کیس جو میں لایا تھا غائب تھا۔

میں نے اپنی تکلیف دہ پوزیشن کو کم کرنے کے لیے ذہن کو دوسری طرف متوجہ کر لیا۔ اب تک کے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ بات سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت کی ضرورت نہیں تھی کہ پروفیسر ڈان زان کی آمد سے لے کر جاوید عزیز اور نوشابہ کی ملاقات اور ان کی فرضی داستان تک ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا جس کے ذریعے مجھے لوٹنا مقصود تھا کہ غالباً کسی ذہین اور چالاک جرائم پیشہ کی سربراہی میں نہ صرف وہ قمار خانہ' بلکہ دوسری غیر قانونی سرگرمیاں بھی اس قلعہ نما عمارت میں جاری تھیں اور احمق رئیس زادے اور سادہ لوح دولت مند لوگوں کو اسی ترکیب سے پھانس کر لایا جاتا تھا۔ تاکہ غیر ضروری خطرات مول لیے بغیر لاکھوں روپے حاصل کر سکیں۔

ظاہر ہے میری جگہ کوئی دوسرا شخص بھی ہوتا تو وہ ایک حسین دوشیزہ کی مدد اور کچھ خود بھی فائدہ اٹھانے کے لالچ میں اس قمار خانے میں اپنی لاکھ دو لاکھ کی رقم سے ہاتھ دھو بیٹھتا اور مایوسی اور دلگرفتگی کے عالم میں جاوید اور نوشابہ سے خفت آمیز معذرت خواہی کے ساتھ اسی طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر واپس بھیج دیا جاتا۔ واپسی کے بعد اس سے کوئی خطرہ بھی نہ تھا۔ اول تو ایسے سادہ لوح شکار پولیس تک پہنچنے کی ہمت ہی نہیں رکھتے اور ان میں سے اگر کوئی دل جلا قانون کی مدد لینے کی کوشش بھی کرتا تو اس کے پاس اپنے الزامات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہ ہوتا۔ میں بھی اگر ہار چکا ہوتا تو اس وقت اس نیم تاریک کمرے کے ٹھنڈے فرش پر پڑا ہونے کے بجائے اپنے شان دار بیڈروم میں نرم و گداز بستر پر لیٹا اپنی بدقسمتی کا ماتم کر رہا ہوتا۔

غزلیں

ڈاکٹر منوّر ہاشمی

شہرت کے شہر میں ترے سامان ہیں بہت
اپنے لیے تو اس میں بھی نقصان ہیں بہت

اچھا نہیں ہے توڑنا یکسر کسی کا دل
انکار ہو تو اس کے بھی عنوان ہیں بہت

درد و الم، جفا و ستم، بے قراریاں
ہم پر جمالِ یار کے احسان ہیں بہت

پھیلا ہے چار سُو مرے' جنگل حیات کا
مل جائیں ایک دو بھی جو انسان' ہیں بہت

غم سے گریز کر کے منوّر لکھے غزل
کاغذ کے دل میں آج بھی ارمان ہیں بہت

☆

سید جوّاد حسن جوّاد

کم گوُ ہے وہ' نہ ضد ہے مری التماس سے
شیریں دہن ہے' لب نہیں کھلتے مٹھاس سے

دیکھا ہے لے کے جائزہ ہوش و حواس سے
دلکش وہ چاند دُور سے' پیارا ہے پاس سے

چہرہ ہے اس کا مظہر رعنائی و مزاج
اندازۂ کتاب ہوا' اقتباس سے

جوّاد یوں تو واقعی سادہ سا ہے وہ شخص
چاہت بھری نظر میں ہے کیا کچھ قیاس سے

لیکن قابل غور سوال یہ تھا کہ مجھے بے ہوش کر کے اپنی اور میری رقم پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے مجھے یہاں بند کرنا کیوں ضروری سمجھا۔ اس کمرے کے بجائے اگر وہ مجھے شہر کے کسی فٹ پاتھ یا کسی پارک وغیرہ میں ڈال دیتے تو میں ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ ظاہر تھا کہ مجھے نہ اس عمارت کا کوئی پتہ معلوم تھا اور نہ اب تک اس ڈرامے میں حصہ لینے والے کرداروں کے بارے میں کچھ جانتا تھا۔ پھر انہیں میری ذات سے ایسا کیا خطرہ محسوس ہوا کہ مجھے گرفتار کرنا ضروری سمجھا اور یہ کہ اب آئندہ میرے بارے میں ان کے کیا ارادے ہیں۔۔

میں اس مسئلے پر سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور نوشابہ بڑے محتاط انداز میں اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر مجھے کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ دشمن کے کیمپ میں اگر کوئی میری مدد کر سکتا ہے تو وہ یہ ہی حسین لڑکی ہے۔ آہٹ سن کر میں آنکھیں بند کرنے اور بدستور بے ہوش ظاہر کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ مگر اسے دیکھ کر یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے بھی دروازہ اندر سے بند کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ میں ہوش میں آ چکا ہوں۔ وہ دبے پاؤں میرے قریب آئی۔

رسی کھولنے میں کچھ دیر لگی مگر وہ مصلحت جس کے پیش نظر اس نے میری بندشیں کاٹنے کے بجائے کھولنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ اپنے منہ پر لگا ہوا ٹیپ میں نے خود ہی ایک جھٹکے سے الگ کر دیا۔

"وہ لوگ آپ کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ اس مصیبت میں گرفتار ہوئے۔ آپ کو رہا کر کے میں خود اپنی زندگی کے لیے خطرہ مول لے رہی ہوں۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اگر وہ لوگ آپ کی جان لینے میں کامیاب ہو گئے تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی۔"

"مگر کیوں۔" میں نے آہستہ آواز میں پوچھا۔ "انہیں مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ بے ہوش کرنے کے بعد وہ مجھے شہر میں کسی بھی جگہ ڈال کر اپنا پیچھا چھڑا سکتے تھے۔"

"امتیاز...... وہ آدمی جو بعد میں کھیل میں شامل ہوا وہ اس پورے گروہ کا سرغنہ ہے۔ مگر یہ بات صرف چند افراد ہی جانتے ہیں۔ اس وقت شہر میں اگر کوئی کاروباری حریف اور جانی دشمن ہے تو وہ ظہیر الدین ہے۔ جو خود بھی کئی خفیہ اڈوں کا مالک ہے۔ کچھ دن پہلے ظہیر الدین نے امتیاز کے ایک خاص آدمی کو قتل کرا دیا تھا۔ آج رات آپ جس طرح بازی کھیلے ہیں۔ اس سے امتیاز کو شبہ ہو گیا کہ آپ ظہیر الدین کے گروہ کے کارکن ہیں اور ظہیر الدین نے آپ کو امتیاز کے اڈوں کا راز معلوم کرنے یا اسے جان سے مارنے کے لیے بھیجا ہے۔ اس لیے وہ نہ صرف اپنے ساتھی کا انتقام لینے بلکہ ظہیر الدین کو سبق سکھانے کے لیے آپ کو ختم کرنا چاہتا ہے۔"

"تم اگر اس کے گروہ کے ممبر ہو تو تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے۔ یقیناً میں تمہارا پہلا شکار تو نہیں ہو سکتا۔ تم اور جاوید پہلے بھی احمق رئیس زادوں کو پھانس کر لاتے رہے ہو گے۔"

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے"۔ نوشابہ کے لہجے میں عجلت اور گھبراہٹ نمایاں تھی۔ "اس کے آدمی کسی بھی لمحے یہاں آ سکتے ہیں۔ ابھی آپ یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں غنیمت ہے کہ انہوں نے آپ کو اتنی لمبی رسی سے باندھنا ضروری سمجھا یہ کمرہ عمارت کے عقبی حصے اور تیسری منزل پر واقع ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ کھڑکی سے رسی باندھی جائے تو وہ آپ کو زمین تک پہنچا دے گی۔ اس کے علاوہ یہ ریوالور ہے۔ جو آپ کو اپنی حفاظت میں مدد دے سکتا ہے۔ بس میں اتنا ہی

کر سکتی تھی۔''

اس نے اعشاریہ 38 بور کا ایک کولٹ ریوالور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ مگر میں نے اس وقت تک جانے پر آمادگی ظاہر نہ کی جب تک نوشابہ نے دوسرے دن میرے بنگلے پر آ کر ملنے کا وعدہ نہیں کر لیا۔ وہ میرے بنگلے کا پتہ جانتی تھی اور ظاہر تھا کہ ان حالات میں ہمارا کسی عام کلب یا پبلک مقام پر ملنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ واپس چلی گئی اور جاتے ہوئے باہر سے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ جیسا کہ اس کے کہنے کے مطابق پہلے لگی ہوئی تھی۔

امتیاز کے آدمیوں نے قفل لگانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میں نے اس کے جاتے ہی کھڑکی کھولی اور چٹخنی کے ہک میں رسی باندھی خوش قسمتی سے رسی نائیلون کی ہونے کی وجہ سے کافی پتلی مگر بے حد مضبوط تھی ورنہ مجھے کوئی باندھنے کی جگہ تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔ پھر میں نے اپنا کوٹ اتار کر اسے الٹا یعنی پشت کا حصہ آگے کی جانب کر کے اس طرح پہنا کہ آستینیں ہاتھوں سے آگے نکلی رہیں اور نائیلون کی پتلی رسی پکڑ کر نیچے اترنے یا پھسلنے میں میرے ہاتھ زخمی نہ ہوں۔

ابھی تک کوئی ایسا تجربہ تو نہیں ہوا تھا۔ البتہ طالب علمی کے زمانے میں جب میں ڈیڈی سے چھپ کر فلموں کا سیکنڈ شو دیکھنے جاتا تھا تو ایک رسی کی مدد سے اپنے کمرے سے نیچے اترنے اور پھر دوبارہ چڑھنے کی کافی مشق حاصل تھی۔ شاید وہی مشق اس وقت کام آ رہی تھی اور میں کسی خاص دشواری کے بغیر نیچے اترتا بلکہ کہنا چاہیے کہ پھسلتا چلا گیا۔ عمارت میں جتنے بھی کمروں کی کھڑکیاں اس جانب تھیں ان میں سے کوئی بھی کھلی ہوئی نہیں تھی۔ اس لیے کسی نے بھی مجھے اترتے نہیں دیکھا۔ رسی کے بارے میں نوشابہ کا اندازہ قریب قریب درست ہی نکلا وہ زمین تک تو نہیں پہنچی مگر مجھے اتنے فاصلے تک ضرور اتار دیا۔ جہاں سے میں کسی معمولی چوٹ کا بھی خطرہ مول لیے بغیر کود سکتا تھا۔

یہ ایک تنگ تاریک گلی تھی۔ نیم تاریک اس لیے کہ گلی کی اپنی کوئی روشنی نہیں تھی۔ صرف عمارت کی کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر آنے والی روشنی نے اندھیرے کو اس حد تک ضرور کم کر دیا تھا کہ ٹھوکر کھائے بغیر گلی پار کی جا سکتی تھی۔ ابھی تک عمارت میں کوئی ہنگامہ اٹھتا معلوم نہیں ہوا تھا۔ اس لیے یہ ہی سوچا جا سکتا تھا کہ وہ لوگ ابھی میرے فرار سے واقف نہیں ہوئے۔ گلی سے نکل کر ایک بڑی لڑکی پر آیا۔ میں نے گہری سانس لی اور شہر کی جانب چل دیا۔

نوشابہ اپنے وعدے پر پوری اتری۔ اگرچہ جب وہ یہ بات کہہ رہی تھی تو مجھے کچھ زیادہ یقین نہیں تھا لیکن وہ ٹھیک دو بجے میرے بنگلے پر پہنچ گئی۔ اس کے خیال میں یہ ٹائم اس لیے محفوظ تھا کہ اس کی اپنی ڈیوٹی پانچ بجے سہ پہر سے شروع ہوئی تھی اور رات کے تین بجے تک جاری رہتی تھی۔ میں اسے ڈیڈی کے اسٹڈی روم میں لے گیا اور مولا داد کو ہدایت کر دی کہ خواہ کوئی بھی ملنے آئے کہہ دے کہ میں اس وقت گھر میں موجود نہیں ہوں اور نہ یہ معلوم ہے کہ کہاں گیا ہوں۔ یا کب واپس آؤں گا امریکہ سے واپسی کے بعد پہلا موقع تھا کہ کوئی لڑکی بلکہ کوئی خوب صورت لڑکی مجھ سے ملنے آئی تھی۔

مگر مولا داد نے کوئی حیرت ظاہر نہیں کی ممکن ہے وہ ڈیڈی سے میرے بارے میں سنتا رہا ہو یا پھر اس نے سوچا ہو کہ امریکہ میں دو برس رہ کر آیا ہے ابھی تک غیر شادی شدہ ہے۔ اس سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے یا شاید اس نے کچھ سمجھ داری سے کام لیا ہو۔ بہر حال اس نے بڑی سنجیدگی سے سر ہلایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

اب میں نوشابہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے پاس وقت کم تھا یا اسے یہ اندیشہ تھا کہ ممکن ہے وہ

اپنی بات پوری نہ کر سکے کہ اس نے کسی تمہید کے بغیر آغاز کلام کر دیا۔ پہلے اس نے بتایا کہ گزشتہ رات میرے فرار کے دو اثرات مرتب ہوئے۔ پہلا تو یہ کہ امتیاز مجھے غیر معمولی طور پر ذہین اور چالاک خیال کرنے لگا ہے اور اپنے گروہ سے ایک آدمی کو حکم دیا ہے کہ میرے بارے میں جملہ معلومات فراہم کی جائیں۔

دوسرے یہ کہ اسے کچھ شبہ ہو گیا ہے کہ اس کے اپنے گروہ میں ظہیر الدین کا کوئی جاسوس کام کر رہا ہے۔ بہر حال غنیمت ہے کہ اسے کسی بھی طرح نوشابہ پر شک نہیں ہوا۔ پھر اس نے اپنے متعلق بتایا کہ اس کا تعلق ایک شریف اور عزت دار خاندان سے ہے۔ اس کے والد ایک بڑے بزنس مین تھے۔ انہوں نے اس کی ماں سے اپنے خاندان کی مرضی کے خلاف محبت کی شادی کی تھی۔

چنانچہ خاندان کے دیگر لوگوں نے ان سے تعلقات ختم کر دیے مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ اس کی والدہ شادی کے دوسرے سال ہی اس کی پیدائش کے وقت کسی پیچیدگی اور کیس بگڑ جانے کی وجہ سے انتقال کر گئیں۔ ان کی موت کا والدہ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ غم غلط کرنے کے لیے پہلے شراب اور پھر چرس کے عادی ہو گئے۔ اس کی پرورش، تعلیم و تربیت، اس کی بیوہ خالہ نے کی مگر جب تک وہ سن شعور تک پہنچی۔ اس کے والد کا کاروبار تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ اپنی لت پوری کرنے کے لیے انہوں نے ذاتی اور موروثی جائیداد فروخت کرنا شروع کر دی اور ابھی وہ پورے بیس سال کی بھی نہیں ہوئی تھی اور تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی کہ تمام جائداد بھی نشے کی بھینٹ چڑھ چکی تھی۔

صرف وہ چھوٹا سا مکان رہ گیا تھا۔ جہاں وہ اور اس کی خالہ سر چھپائے بیٹھی تھیں۔ والد ہزاروں کے نہیں لاکھوں کے مقروض ہو چکے تھے۔ مگر اتنا ہوش ان کو باقی تھا کہ انہوں نے وہ مکان فروخت کرنے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں۔

پھر ایک دن امتیاز اپنے قرض کی وصولی کے لیے قرقی لے کر آ پہنچا اس دوران اس کے والد کی حالت خراب تھی۔ پیسہ پاس نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی خوراک نہیں خرید سکتے تھے۔ وہ نشے بازوں کو جب ان کی مطلوبہ خوراک دستیاب نہ ہو یا وہ اسے خریدنے سے قاصر ہوں تو ان کی کیسی بری حالت ہو جاتی ہے۔ یہ کوئی منشیات کا عادی شخص ہی جان سکتا ہے۔ امتیاز قرقی لے کر آیا تھا۔ مگر اسے دیکھ کر وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے پیش کش کی کہ اگر نوشابہ اس کی مرضی کے مطابق کام کرنا منظور کر لے تو وہ نہ صرف تمام قرض معاف کر سکتا ہے۔ بلکہ اس کے والد کو بھی چرس کی ایک خوراک روزانہ فراہم کر سکتا ہے اور اگر نوشابہ نے ہوشیاری اور وفاداری سے کام لیا تو اس کی خدمات کا معقول معاوضہ بھی دیا جائے گا۔ جس سے وہ بہ آسانی اپنی گزر اوقات کر سکے گی۔ نوشابہ نے صرف ایک شرط عائد کی کہ اسے جسم فروشی پر آمادہ نہ کیا جائے اور امتیاز نے یہ شرط منظور کر لی۔ تب سے وہ اس کے گروہ میں کام کر رہی ہے اور اب اس حادثے کو تقریباً تین سال گزر چکے ہیں۔ امتیاز نے اس سے مختلف کام لیے۔ کلب کے ریسپشین کاؤنٹر پر بھی بٹھایا اور منشیات گاہکوں کو فراہم کرنے کا ذریعہ بھی بنایا۔ اب لگ بھگ ایک برس سے وہ دولت مند احمقوں کو پھانس کر قمار خانے تک لے جاتی ہے۔ نوشابہ مجھے اس کی پوری تفصیل بتانے لگی تھی۔ مگر میں نے اسے روک دیا اور مسکراتے ہوئے بتایا کہ میں اتنا اندازہ لگا چکا ہوں کہ اس طرح پھانسنے کے پروگرام کا آغاز پروفیسر ڈان زان مغل کی آمد سے شروع ہوتا ہے۔

نوشابہ نے حیرت اور تعریف کے ملے جلے انداز سے میری طرف دیکھا اور چند لمحے ٹھہر کر

دوبارہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ وہ اب تک بے شمار احمق دولت مندوں کو جن میں نوجوان اور ادھیڑ عمر دونوں ہی شامل ہیں امتیاز خانے لے جا چکی ہے۔ اس کا ضمیر شروع سے ہی اسے امتیاز کا آلہ کار بننے پر ملامت کرتا رہا ہے لیکن اپنے والد کی نشے کی عادت اور پھر گزر اوقات کے لیے ایک ذریعہ آمدنی کی مجبوری کے باعث وہ امتیاز کے اشاروں پر چلتی رہی ہے۔ ویسے امتیاز نے بھی اپنے کیے ہوئے وعدے کا پوری طرح لحاظ رکھا ہے۔ آج تک کبھی اسے اسکی مرضی کے خلاف کسی بات پر مجبور نہیں کیا گیا۔ اتنا ہی نہیں۔ وہ خود اور اس کے گروہ کا ہر آدمی اس کے ساتھ بڑی شرافت سے پیش آتا رہا ہے۔ نیز یہ کہ اب امتیاز اسے پانچ ہزار ماہانہ معاوضہ بھی ادا کرتا ہے۔ جو اس کی بوڑھے والد اور بیوہ خالہ کی گزر بسر کے لیے کافی سے زیادہ ہے۔

جب مجھے پھانسنے کے لیے جال بچھایا گیا تو وہ جاوید عزیز کے ساتھ پہلی مرتبہ کلب میں مجھ سے ملاقات کے بعد ہی سے میری شخصیت سے کافی متاثر ہوئی تھی۔ اس کا دل مجھے دھوکہ دیتے ہوئے کچھ زیادہ ہی ملامت کر رہا تھا لیکن پھر بھی وہ میرے لیے شاید اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالتی لیکن شاید کلب میں جو کچھ ہوا اور اس کے بعد جب امتیاز اور اس کے آدمیوں نے مجھے قتل کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کا ضمیر تڑپ اٹھا اور اس نے میری مدد کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مجھے معلوم ہی تھا۔ میں نے نوشابہ سے اس عمارت کے بارے میں سوالات کیے۔ جو شہر کی ایک ماڈرن سوسائٹی کے علاقے میں واقع تھی۔ اس نے بتایا کہ بظاہر وہ عمارت ایک جدید طرز کا بورڈنگ اور لاجنگ ہاؤس ہے۔ جہاں صرف لوگوں کو دکھانے اور قانون کو دھوکہ دینے کے لیے امتیاز کے ساتھی شریف اور معزز کرائے داروں کے بھیس میں رہتے ہیں لیکن حقیقت میں وہاں شب و روز ہر قسم کے مجرمانہ اور غیر قانونی کام ہوتے رہتے ہیں۔ مختلف قسم کا جوا ہونے کے علاوہ وہاں بڑے بڑے پیمانے پر فحاشی بھی ہوتی ہے۔ ایک حصہ ایسا بھی ہے۔ جہاں اونچی سوسائٹی کے لوگ جو کسی نہ کسی نشے کے عادی ہیں۔ بڑے رازدارانہ طریقے پر آتے ہیں اور شاندار سجے سجائے آرام دہ کمروں میں کئی کئی دن نشے کے عالم میں مدہوش پڑے رہتے ہیں۔ وہاں اسمگلنگ کا اڈا بھی ہے۔ جہاں مال بیچنے اور خریدنے والے دونوں خفیہ طریقوں پر ملاقاتیں کرتے ہیں اور روزانہ لاکھوں کا ہیر پھیر ہوتا رہتا ہے۔

میں نے نوشابہ کو بتایا کہ مجھے خوامخواہ خدائی فوجدار بننے کا کوئی شوق نہیں ہے لیکن امتیاز نے مجھ پر ہاتھ ڈال کر اچھا نہیں کیا۔ اب میں نے اس سے انتقام لینے اور نوشابہ کو اس کی قید سے آزاد کرانے کے لیے کوئی دقیقہ نہیں رکھوں گا۔ خاص طور سے اس حقیقت کے پیش نظر کہ امتیاز کا ارادہ بھی مجھے اکیلا چھوڑ دینے کا نہیں معلوم ہوتا اسی لیے اس نے اپنے آدمیوں کو میرے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا حکم دیا ہے اور عقلمندوہی ہے۔ نیز یہ کہ آئندہ نوشابہ کا میرے بنگلے پر آنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ ملاقات اگر دن کے اوقات ہی میں ہو سکتی ہے تو ہم گاہے گاہے ضرور ملیں گے۔ یہ دوسری جوہات سے بھی ضروری ہے لیکن ہر مرتبہ کسی نئے اور مصروف مقام پر۔

اس کے بعد بھی میں اور نوشابہ ملتے رہے۔ میں اس سے امتیاز کے بارے میں جو کچھ اسے معلوم تھا پوچھتا رہا لیکن خود اسے اپنے منصوبے کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔ پندرہ بیس دن تک میں اسے اپنے پلان کے بارے میں سوچتا اور اس کی ہر چھوٹی بڑی تفصیل پر غور اور اسی مناسبت سے اس کی تیاری کرتا رہا۔ یہ ظاہر تھا کہ اگر میں واقعی امتیاز اور اس کے گروہ کو تباہ و برباد

کرنا چاہتا ہوں۔ کہ اس کے بغیر نوشابہ کو ہر خطرے سے آزادی نہیں مل سکتی تھی تو اس کے لیے مجھے لازماً قانون کی مدد لینا ہوگی مجھے یاد تھا کہ ڈیڈی کے دوستوں میں کئی اعلیٰ پولیس افسران بھی شامل تھے۔ ان میں سے ایک ایس پی شیر جنگ صاحب کا نام ابھی تک میری یادداشت میں موجود تھا۔ مگر اس بات کو خاصا عرصہ گزر چکا تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ شیر جنگ صاحب اب بھی پولیس کے محکمے میں موجود ہوں گے۔ ان کا ریٹائرمنٹ ہی نہیں بلکہ خود ان کا مرحوم ہونا بھی غیر متوقع نہیں تھا۔ پھر بھی دریافت حال میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ چنانچہ ایک دن میں پولیس ہیڈ کوارٹر جا پہنچا کتنے ہی کمرے جھانکنے کے اور کافی سے زیادہ سرخ فیتے کی پیائش کے بعد مجھے بتایا گیا کہ ایس پی شیر جنگ ریٹائر ہو چکے ہیں اور میں ضرور ہی ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں تو میر بلاک میں فلاں نمبر کی کوٹھی پر پہنچ جاؤں۔ ایس ایس پی صاحب کا موڈ ہوا تو شرف ملاقات حاصل ہو جائے گی۔

میں تلاش کرتے کرتے منزل مقصود پر پہنچا تو عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا گیٹ پر ایک باریش چوکیدار سے دعا سلام ہوئی میں نے بتایا کہ میں ایس پی صاحب کے مرحوم دوست سیٹھ احمد شاہ درانی کا بیٹا ہوں اور ایک ضروری کام کے سلسلے میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ چوکیدار نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تسبیح کے دانے شمار کرتے ہوئے بتایا کہ صاحب عصر کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ جس سے ٹھیک چھ بجے فارغ ہوں گے میں چاہوں تو انتظار کر سکتا ہوں۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ چھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ چنانچہ میں وہیں چوکیدار کے پاس ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وقت گزاری کے لیے باتیں کرنے لگا۔ تو انکشاف ہوا کہ موصوف ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل ہیں۔

کچھ دیر کے بعد ایک اور لمبی داڑھی والے صاحب اندر سے نمودار ہوئے میں انہیں ایس پی صاحب سمجھ کر سلام کرنے ہی لگا تھا کہ چوکیدار نے بتایا کہ یہ صاحب کا خانساماں ہے۔ میں اس کے ذریعے آپ کے آنے کی اطلاع کرائے دیتا ہوں۔ خانساماں چوکیدار سے کچھ گفتگو کرنے کے بعد اندر واپس گیا تو میرے سوال کے جواب میں چوکیدار نے کہا کہ اس کا نام کریم بخش ہے۔ کبھی فرید کالونی کے تھانے میں کانسٹیبل ہوا کرتا تھا۔ کسی چکر میں پھنس کر ملازمت سے نکالا گیا تو صاحب نے ملازم رکھ لیا۔

تقریباً دس منٹ کے بعد اندر سے میری طلبی ہوئی۔ کریم بخش مجھے اپنے ساتھ جس کمرے میں لے گیا وہاں ایک سفید باریش بزرگ جائے نماز پر بیٹھے۔ ایک دوسرے باریش کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انداز گفتگو سے ظاہر ہوا کہ ان میں سے ایک بزرگ سابقہ ایس پی شیر جنگ ہیں اور دوسرے مولانا ان کے سیکرٹری ہیں۔ جنہیں ایس پی صاحب اپنی وسیع دیہی اراضی کے متعلق کچھ ضروری احکامات دے رہے تھے۔ سیکرٹری صاحب سر ہلاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ تو میں نے ایس پی صاحب سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ میرے والد مرحوم کا نام سنتے ہی اتنے جوش میں آئے کہ مصلے سے اٹھ کر بغل گیر ہوئے اور کافی دیر تک ہوتے رہے۔

خیر و عافیت کے موضوع پر باتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو میں نے اپنی آمد کا مدعا عرض کیا۔ ایس پی صاحب بڑی سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے رہے اور گاہے گاہے سر ہلاتے ہوئے میری گزارشات سنتے رہے۔ پھر اٹھے۔ میز کی دراز سے ایک رائٹنگ پیڈ نکال کر اس پر کچھ لکھتے رہے۔ پھر وہ کاغذ پیڈ سے پھاڑ کر بڑی ہی احتیاط، نفاست سے تہہ کر کے ایک سادہ لفافے میں رکھا۔ لفافے پر کسی انسپکٹر جمال بیگ کا

نام لکھا اور لفافہ مجھے دیتے ہوئے ہدایت کی کہ میں مکتوب الیہ سے کل ہی ملاقات کروں۔ وہ جو کچھ بھی کر سکے گا۔ ضرور کرے گا کیونکہ عنقریب وہ ان کا داماد بننے والا ہے میں نے شکریہ ادا کیا اور رخصتی کی اجازت چاہی‘ چلتے چلتے ایک یوں ہی خیال سا آیا اور میں نے ایس پی صاحب سے ان کے سیکرٹری کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ وہ ایک سابقہ ایس ایچ او تھے۔

☆☆

پولیس ہیڈ کوارٹر میں انسپکٹر جمال بیگ نے شیر جنگ صاحب کا نام سنتے ہی بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ مگر لفافے کے اندر رکھا ہوا خط پڑھ کر ان کا چہرہ اتر گیا۔ مسکراہٹ جاڑوں کی دھوپ کی طرح پھیکی پڑ گئی۔

’’کیا بات ہے۔ جمال بیگ صاحب!‘‘ میں نے پوچھا۔ ’’آپ کس سوچ میں ڈوب گئے۔‘‘

’’کیا عرض کروں ناصر شاہ صاحب!‘‘ وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔ ’’آج کل میں ایک انتہائی پیچیدہ کیس میں الجھا ہوا ہوں۔ نوشاد راہی نامی ایک بہت بڑے اسمگلر کی تلاش کی ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی ہے۔ یہ ایک انتہائی خطرناک بین الاقوامی اسمگلر ہے جو ناجائز منشیات‘ خاص طور سے ہیروئن کی بڑے پیمانے پر اسمگلنگ کرتا ہے۔ انٹرپول تک اسے پکڑنے میں ناکام رہی ہے۔ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس کا ہیڈ کوارٹر ایک بڑے شہر میں کہیں واقع ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اپنے خفیہ مخبروں کی اطلاعات پر پولیس نے مختلف افراد اور مقامات پر چھاپے مار کر گزشتہ ایک سال میں ہیروئن کی جتنی بڑی مقدار پکڑی ہے۔ اس نے تمام گزشتہ ریکارڈ توڑ دیے۔

مگر ان تمام کامیاب چھاپوں کے باوجود

غزلیں

اعتبار ساجد

ہر اِک رہرو، ہر اک رہ گیر کو زنجیر کیا کرنا
اَنا کے نام پر ہر شخص کو تسخیر کیا کرنا

خبر اُس گھر کی بھی لینی ہے جس کی چھت شکستہ ہے
فقط خوابوں میں اِک قصرِ حسیں تعمیر کیا کرنا

بہت کافی ہے‘ سن لیتا ہیں دیواریں مرے دُکھڑے
سنا کر حالِ دل‘ ہر شخص کو دلگیر کیا کرنا

ہمیشہ جس کو عزت دی‘ سر آنکھوں پر بٹھایا ہے
ذرا سی بات پر اب اُس کو بے توقیر کیا کرنا

اسی کٹیا میں رہنا ہے‘ ابھی کھل جائیں گی آنکھیں
تو پھر لے کر تمہارے خواب کی جاگیر کیا کرنا

وہی رکھنی ہے آشفتہ سری جو اُن کا شیوہ تھی
وفا میں کام کوئی بھی خلافِ میر کیا کرنا

غالب عرفان

قسم ہے اس پل کی جب تجھے میں نے دیکھا‘ دیوانہ وار دیکھا
وجود سے ماورا بھی تجھ کو‘ خیال کے آر پار دیکھا

نظر پڑی ہے جہاں بھی تم پر‘ تو صرف زلفوں کا ذکر ہی کیا
تمہارے ملبوس پر بھی میں نے ہواؤں کا اختیار دیکھا

سحر سے پہلے مہکنے والی‘ وہ شب کہیں لوٹ کر نہ جائے
تھکی ہوئی شام نے جو میرا کبھی درِ انتظار دیکھا

ہمیں شبہ ہے کہ مجرم اب بھی نا معلوم ذرائع اور وسائل سے ہیروئن بھاری مقدار میں دوطرفہ طور پر اسمگل کر رہے ہیں۔ نوشاد راہی کا فوٹو اگرچہ پولیس ریکارڈ میں موجود ہے۔ مگر اس کے علاوہ اس کے بارے میں کوئی اور بنیادی معلومات حاصل نہیں ہیں۔ اس کی گرفتاری کے لیے گزشتہ دو سال میں چار ہوشیار اور ذہین آفیسر مقرر کیے گئے مگر وہ تمام جدوجہد کے باوجود کامیاب نہ ہوسکے اور اس کی پاداش میں نہ صرف ان کا کیریئر ریکارڈ خراب ہوا۔ بلکہ کہیں کہیں پر جزوی معطلی اور تبادلہ وغیرہ کی مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑا۔

اب اس مہم کا قرعہ فال میرے نام پڑا ہے۔ بس خدا ہی ہے جو عزت و آبرو کے ساتھ مجھے سرخرو کرسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کیس میرے لیے انتہائی اہم ہے اور میں اس میں اس قدر مصروف ہوں کہ کسی اور معمولی مجرم کی طرف توجہ نہیں دے سکتا میں آپ سے صاف انکار کردیتا۔ مگر آپ سفارش ایسی زبردست لائے ہیں کہ میں کشمکش میں پڑ گیا ہوں کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔"

"آپ بلاوجہ پریشان نہ ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے جو منصوبہ بنایا ہے۔ اس میں بنیادی کردار میرا ہی ہوگا۔ آپ کو صرف اس قدر زحمت دوں گا کہ جب میں کافی ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو آپ میرے بتائے ہوئے مقررہ وقت پر چھاپا مار کر مجرموں کو گرفتار کرلیں۔"

میں نے انہیں امتیاز کے بارے میں کچھ تفصیلات بتائیں انسپکٹر جمال بیگ کچھ فکر مند ہو گئے۔

"آپ کے بیان نے مجھے الجھا دیا ہے۔" انہوں نے کہا۔ "امتیاز صاحب کوئی بڑے سیاسی لیڈر نہیں لیکن مقامی اور صوبائی سطح پر ان کی کافی اہمیت ہے۔ دولت مند ہونے کی وجہ سے ان کا اونچی سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔ اونچے کلبوں اور ایک دو خفیہ قمار بازی کے اڈوں پر ان کی آمد و رفت ممکن ہوسکتی ہے۔ مگر ابھی تک ان کے خلاف پولیس کے پاس جرائم پیشہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا کوئی ریکارڈ یا کوئی اطلاع نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ایک مقتدر شخصیت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں اور بعد میں کف افسوس ملنا پڑے۔ کسی غلطی کی صورت میں آپ کا جو حشر ہوگا۔ وہ تو ہوگا ہی مگر 'آپ سے تعاون کی پاداش میں' میں بلاوجہ مشکل میں پھنس جاؤں گا۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔" میں بولا۔ "میں بلاشبہ کوئی تجربہ کار پولیس آفیسر نہیں لیکن میں نے دو سال تک امریکہ میں وہاں جرائم پیشہ افراد اور ان کی سرگرمیوں کو کافی قریب سے دیکھا ہے میں ہرگز کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے آپ پر کوئی آنچ آئے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنی موجودہ زندگی اور اس کے مفادات بھی بے حد عزیز ہیں میں اس قاضی کے قبیلے سے بھی نہیں ہوں جو شہر کے اندیشے میں دبلا ہوا کرتا ہے۔ آپ یقین رکھیں آپ تک تو بات بعد میں پہنچے گی۔ اس سے پہلے اگر مجھے اپنے لیے کوئی حقیقی خطرہ محسوس ہوا تو بغیر شرمندہ ہوئے بھاگ کھڑا ہوں گا۔"

انسپکٹر جمال بیگ مسکرانے لگے۔ غالباً اب انہیں کچھ اطمینان ہو گیا تھا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ اگر میں نے اسی محتاط سوچ اور طرز عمل سے کام لیا تو ضرورت پڑنے پر وہ ہر ممکن تعاون کے لیے آمادہ ہیں۔ میں ان سے رابطہ قائم رکھوں اور اپنی کارگزاری کی رپورٹ دیتا رہوں گا۔ اس کے لیے انہوں نے مجھے دونوں بھی دیے جس پر ہنگامی حالات یا آفس میں ان کی عدم موجودگی کے بالواسطہ یا بلاواسطہ رابطہ قائم کیا جاسکتا تھا اور اس ملاقات کے تیسرے دن میں اپنے بنگلے سے غائب ہوگیا۔

☆☆

سوسائٹی کے جس چھوٹے مگر خوب صورت اور ویل فرنشڈ بنگلے کو میں نے سیٹھ رحیم خان کے نام سے کرائے پر لیا تھا۔ اس میں پہلی ہی شام کو میں نے علاقے کے تمام عزیزین کو ایک تعارفی دعوت پر مدعو کیا اور اپنی افتتاحی تقریر میں بتایا کہ میرے آباؤ اجداد ایک بہت بڑے سیٹھ تھے اور ہندوستان سے ہجرت کر کے افریقہ چلے گئے تھے۔ خدا نے اپنا فضل وکرم کیا اور ہم جو یہاں سے خالی ہاتھ گئے تھے۔ ایک نسل کے بعد ہی آسودہ حالی کے دور میں داخل ہوگئے۔ ہم نے وہاں ہاتھی دانت کی تجارت اور اس کی مصنوعات کو اپنا ذریعہ معاش بنایا اور اب تین چار نسلوں کے بعد ایک مرتبہ پھر پرانی شان وشوکت کے حامل بن گئے۔ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کی آزاد اسلامی مملکت کے قیام کے بعد ہم لوگ پھر اپنے وطن واپس آنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے میں یہاں حالات کے جائزے اور ابتدائی ضروری انتظامات کے لیے آیا ہوں۔

رفتہ رفتہ باقی اعزاز آتے جائیں گے۔ سردست میں نے رہائش کے لیے آپ کے مہذب تعلیم یافتہ اور معروف کاروباری علاقے کا انتخاب کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ مجھے ایک اچھا پڑوسی پائیں گے اور جواباً خود بھی اچھے پڑوسیوں کی طرح حقوق ہمسائیگی کا پاس رکھیں گے۔ اس کے بعد میں نے فرداً فرداً ہر مہمان سے تعارف حاصل کیا۔ بعد ازاں لذیذ اور خوش ذائقہ کھانوں اور ایک مختصر سے تفریحی پروگرام کے بعد یہ دعوت اختتام پذیر ہوگئی۔

اس تعارفی تقریب کے بعد میں کسی بھی دن پروفیسر ڈان زان مغل کی آمد کا منتظر تھا۔

اور مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پانچویں دن صبح دس بجے ڈان زان موصوف میرے ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ ملاقات کے لیے انہوں نے وہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ جس پر پہلے بھی عمل پیرا ہو چکے تھے۔ مگر آمنے سامنے ہونے کے باوجود مجھے اعتماد تھا کہ وہ مجھے ہرگز نہیں پہچان سکیں گے۔ سیٹھ رحیم خان کی اس حیثیت سے میں نے میک اپ ہی ایسا کیا تھا کہ مجھے نہ صرف ان کے بلکہ نوشابہ کے بھی شناخت کرنے سے قاصر رہنے کا مکمل یقین تھا۔ چھوٹی سی فرنچ کٹ داڑھی ناک پر سنہری فریم کا چشمہ جس کے بغیر پاور کے نیلگو شیشوں کے پیچھے آنکھوں میں سبزی مائل کنٹیکٹ لینس چہرے ہاتھوں بازوؤں پیروں اور جہاں تک جسم کے کھلنے کا امکان تھا۔ قدرے سانولا رنگ گالوں کی ہڈیوں پر معمولی سی پیڈنگ یہ سب ایسی چیزیں تھیں جنہیں نے میرا حلیہ کچھ سے کچھ کر دیا تھا۔

ڈان زان مغل نے حسب معمول اپنے کچھ کرتب دکھائے پھر میرے شوق اور مشغلوں کے بارے میں سوال کیا میں نے محض انہیں تھوڑا سا پریشان کرنے کے لیے موسیقی، مصوری، گھڑ سواری اور ایسی ہی کچھ اور چیزوں کا ذکر کیا۔ انہوں نے بار بار پہلو بدلنے کے بعد آخر پوچھ ہی لیا کہ کیا آپ کو فلش، پوکر، رمی یا ایسے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں میں اچھل پڑا جھٹ سے جواب دیا کہ فلش پر تو میری جان جاتی ہے لیکن میں بڑی بازیاں کھیلتا ہوں۔ انہوں نے گہری سانس لی اور یوں چشمہ بھی ان کے بریف کیس سے باہر آ گیا۔ میں نے کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ کہا کہ میں ایسی چیزوں کا قائل نہیں۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر ناز ہے کیسا ہی شار پر ہو میرے مقابلے پر آ کر اس کی ساری ترکی تمام ہو جاتی ہے اور بالاخر جیت میری ہی ہوئی ہے۔ مغل صاحب نے چشمے کی افادیت پر مزید کچھ فرمایا اور میں یوں جیسے ان پر کوئی احسان کر رہا ہوں اسے خریدنے پر آمادہ ہوگیا۔ ڈان زان نے سمجھ لیا تھا کہ اس گاہک سے زیادہ ملنے کی امید نہیں اس لیے انہوں نے دور

اندیشی سے کام لیا اور یوں وہ چشمے جو پہلے میں نے اپنے شوق اور انجانے پن میں ایک بڑی رقم دے کر خریدا تھا۔ پانچ سو میں لے لیا۔

اس کے بعد جاوید اور نوسابہ سے بھی ملاقات لازمی تھی۔ مگر یہ ملاقات سابقہ کلب میں نہیں ایک دوسرے کلب میں ہوئی۔ مجھے کم و بیش پہلی ہی داستان سننے کو ملی۔ صرف اس جزوی تبدیلی کے ساتھ اس مرتبہ ان دونوں کی شادی ہو چکی تھی اور مالدار سسر نے داماد کو ایک لاکھ نہیں دو لاکھ روپے دیے تھے۔ جیسی کہ توقع تھی۔ نوشابہ مجھے نہیں پہچان سکی اگرچہ کسی نامعلوم وجہ سے وہ گاہے گاہے مجھے بڑی گہری نگاہوں سے دیکھنے لگتی تھی۔ جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو۔ میں نے بڑے پرجوش انداز میں ان کی مدد کا وعدہ کیا اور اس ملاقات کے تیسرے دن رات کے دس بج کر پانچ منٹ پر ایک مرتبہ پھر اسی عمارت میں موجود تھا۔ مگر ایک دوسرے کمرے میں یہ قدرے حیرت کی بات تھی کہ امتیاز نے میرے فرار کے بعد بھی اس اڈے کو بند یا تبدیل نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کسی نہ کسی وجہ سے اسے یہ اعتماد ہے کہ اول تو یہاں چھاپہ نہیں پڑ سکتا اور پڑ بھی جائے تو وہ اس سے بچ نکلے گا۔ نئے شکار کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر غالباً صرف اس لیے لایا جاتا تھا کہ وہ غیر ضروری طور پر آئے دن کی دردسری مول لینا نہیں چاہتے تھے۔

اس بار میں نے چشمے کے سلسلے میں ایک دوسرا طریقہ کار اختیار کیا تھا۔ جس کا ذکر کرنا میں ڈان زان سے ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے بھول گیا۔ پڑوس کے ایک شریر بچے کو جو ہر وقت گلی میں کھیلتا رہتا تھا اور جس کی عمر آٹھ دس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے ببل گم کے ایک پورے پیکٹ کا لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ جب بھی اسے بلاؤں وہ آجائے اور اس وقت میرے ساتھ ڈرائینگ روم میں جو بھی بیٹھا ہو۔ اپنے کھلونا اور اس وقت میرے ساتھ ڈرائینگ روم میں جو بھی بیٹھا ہو۔ اپنے کھلونا' پستول سے اسے ہینڈز اپ کہے اور لبلبی دبا دے یہ کھلونا پستول ایسا تھا جس میں پانی بھرا جاتا تھا اور لبلبی دبانے پر ایک پتلی سی دھار سامنے والے پر پڑتی تھی۔

میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ جب میں بلاؤں تو وہ پستول میں پانی نہیں بلکہ روشنائی بھر کر لائے۔ بس تھوڑی سی چنانچہ عین اسی وقت جب کہ ڈان زان مغل صاحب اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ وہ شوخ لڑکا آیا۔ زان صاحب سے بڑے بارعب لہجے میں ہینڈز اپ کیا اور پچکاری چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اب یہ اس کی نشانہ بازی کی مہارت تھی یا حسن اتفاق کہ روشنائی ڈان ذان صاحب کے روئے مبارک پر پڑی جس نے انہیں روسیاہ کر دیا اور انہیں منہ دھونے کے لیے باتھ روم جانا پڑا۔ ان کے جاتے ہی میں نے ان کا بریف کیس کھولا' اس میں کئی چشمے رکھے ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک چشمہ بالکل ویسا ہی معلوم ہوا جیسا اس رات چشمے والے نے لگا رکھا تھا اور جسے میں نے توڑ دیا تھا۔ میں نے وہ چشمہ نکال کر محفوظ کر لیا اور اطمینان سے ڈان زان صاحب کے باتھ روم سے واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ معذرت وغیرہ میں پہلے ہی کر چکا تھا کہ پڑوس کا یہ بچہ بہت شریر ہے اور میرے معزز مہمانوں کے ساتھ پہلے بھی اس طرح کی شرارت کر چکا ہے۔ پہلے میں نے اسے صرف ڈانٹنا کافی سمجھا تھا۔ مگر اب میں یقیناً اس کے باپ سے شکایت کروں گا کہ وہ اسے مناسب سرزنش کریں۔ کیونکہ آئندہ ایسی کوئی حرکت ناقابل برداشت ہوگئی۔

مغل صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد میں نے تاش کی گڈی نکالی۔ وہ چشمہ لگا جو مغل صاحب فروخت کر گئے تھے۔ حسب سابق پتوں پر نیلے رنگ کے نشانات نظر آنے لگے اس

کے بعد میں نے وہ چشمہ ناک پر رکھا جو خود اڑایا تھا۔ اب جو پتوں پر نظر ڈالی تو چودہ طبق روشن ہوگئے۔ اسی گڈی کے ہر پتے پر دوسرے خفیہ نشانات بھی تھے جو نیلے نہیں' سرخی مائل تھے اور ان سے ہر پتے کی بالکل صحیح قدر و قیمت کا اظہار ہو رہا تھا۔ دونوں بلکہ تینوں چشموں کے فریم کا ڈیزائن یکساں تھا۔ رنگ مختلف تھے۔ وہ جو خریدے تھے۔ کتھئی رنگ کے تھے اور جو اڑایا تھا اس کا فریم کالے رنگ کا تھا۔ ایک اور نازک سا فرق بھی تھا۔ میرے چشموں کے شیشوں کا رنگ ہلکا قرمزی تھا۔ جبکہ کالے فریم کے شیشے نیلگوں تھے۔ دونوں رنگ اتنے ہلکے تھے کہ دن میں تو آسانی سے نظر آجاتے تھے۔ مگر رات کے وقت بجلی کی روشنی میں انہیں دیکھنا تقریباً ناممکن تھا۔ میں دوسرے دن ایک عینک ساز کی دکان پر گیا اور کالے فریم والے چشمے کے شیشے نکلوا کر اپنے خریدے ہوئے چشمے میں لگوا لیے۔

یہ داستان ابھی یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک بار پھر اسی عمارت میں لے جایا گیا۔ جہاں پہلے جا چکا تھا لیکن کمرہ وہ نہیں تھا۔ دوسرا تھا۔ کام یہاں بھی وہی ہو رہا تھا۔ چار پانچ میزوں پر بازیاں جمی ہوئی تھیں اور یہ شاید اتفاق تھا کہ ایک میز پر امتیاز بھی چشمہ لگائے کھیل میں مصروف تھا۔ یہاں بھی ایک نگران میز کرسی ڈالے سب سے الگ بیٹھا تھا۔ مگر اس کا انداز سابقہ نگران سے زیادہ پراعتماد تھا۔ مجھ سے اس کا تعارف شوکت خان کے نام سے کرایا گیا۔

کمرے کے ایک گوشے میں دو میزیں خالی تھیں شوکت خان نے ان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بیٹھنے کی دعوت دی۔ مگر میں امتیاز کی میز کی طرف بڑھ گیا۔ قریب پہنچ کر متوجہ کیا اور کہا کہ آپ شہر کی معروف شخصیت ہیں میں حال ہی یورپ سے آیا ہوں۔ اس کے باوجود آپ سے غائبانہ متعارف ہو چکا ہوں۔ کیا آپ مجھے کھیلنے کا

غزلیں

ناصؔر زیدی

ذہن میں اپنے بساتا' دل کے اندر دیکھتا
میں تصور میں تیری تصویر اکثر دیکھتا

اور تو کچھ بھی نہیں بس ایک خواہش ہے مری
سامنے تجھ کو بٹھاتا' زندگی بھر دیکھتا

یہ بھی اچھا تھا کہ ان آنکھوں میں بینائی نہ تھی
کس طرح اُس سے بچھڑ جانے کا منظر دیکھتا

اُس کو ہی اِدراک ہوجاتا کہ کیا ہے اشکِ غم
قہقہوں میں جو چُھپا تھا وہ سمندر دیکھتا

زندگی دیتی اگر فرصت تو ناصؔر ایک دن
جس قدر دیکھا ہے اس کو اس سے بڑھ کر دیکھتا

ڈاکٹر پرویؔز احمد

بند پنجرے سے ڈر گیا ہدہد
سچ سے ایسے مکر گیا ہدہد

دیکھ کر پر کٹے پرندوں کو
اپنے ہونے سے ڈر گیا ہدہد

کاش رکھتا نہ سر پہ تو کلغی
دیکھ تیرا بھی سر گیا ہدہد

چونچ لمبی ہے اس لیے یارو
بات لمبی سی کرگیا ہدہد

☆☆

موقع دے کر عزت افزائی کریں گے۔ امتیاز نے مجھے غور سے دیکھا۔ اٹھ کر ہاتھ ملایا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ آپ دوسری میز پر تشریف رکھیں میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔''

میں جاوید عزیز اور نوشابہ خالی میز پر بیٹھ گئے۔ چند منٹ بعد امتیاز بھی آ گیا۔ دو افراد اور بھی نمودار ہوئے اور خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے بریف کیس سے بالکل نئی کرنسی نوٹوں کی گڈیاں نکال کر سامنے رکھیں۔ سیل پیک تاش کی گڈی کھولی گئی اور کھیل شروع ہو گیا۔ مجھے ہر پتے کے سرخ نشانات بالکل صاف نظر آ رہے تھے اور وہ پتوں سے پوری مطابقت رکھتے تھے۔ ایک دو بازیاں مجھے دانستہ جیتنے کا موقع دیا گیا۔

پھر امتیاز نے سنبھالا لیا اور اچھے پتوں پر بڑی بڑی رقموں کی چالیں چلنے لگا مگر ظاہر تھا کہ میں بھی اس کے پتے پڑھ رہا تھا۔ اس لیے جب بھی اس کے ہاتھ میں بڑے پتے آتے تھے۔ میں مقابلے سے دستبردار ہو جاتا تھا اور جب میرے پاس اچھے اور اس کے پاس کمزور پتے ہوتے تھے تو اس کے بلف کھیلنے کے باوجود بھی شو نہیں کراتا تھا اور چال پر چال چلتا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں بعد کی زیادہ تر بازیاں بھی جیت کر مجموعی اعتبار سے اپنی رقم میں ایک لاکھ سے اوپر کا اضافہ کر چکا تھا۔ یہ صورت حال امتیاز کے لیے ناقابل قبول تھی۔ وہ قدرے حیرت زدہ سا نظر آ رہا تھا۔ گاہے گاہے غور سے مجھے اور پھر میرے چشمے کو دیکھنے لگتا تھا۔

بالاخر اس نے شارٹنگ اور پتے بازی شروع کر دی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ متواتر جیتنا میرے پلان میں شامل نہیں تھا۔ ہارنا اس لیے ضروری تھا کہ میرے تمام نوٹ نشان زدہ تھے جنہیں بعد میں برآمد کر کے بطور ثبوت استعمال کیا جانا تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی چالوں کا کوئی توڑ نہیں کیا اور ہارنے لگا پہلے وہ جیتے ہوئے لاکھ سوا لاکھ ہارے اور پھر اپنی لائی ہوئی رقم میں سے بھی تقریباً پچھتر ہزار امتیاز کے سامنے پڑے ہوئے ڈھیر میں شامل کر دیے۔ اس موقع پر میں نے پہلی مرتبہ جیب سے سگریٹ کیس اور لائٹر نکالا۔ گویا اپنے اعصاب کو تمباکو کے نشے سے تسکین دینے کی متوقع کوشش کی لیکن میری یہ حرکت اس سے کہیں زیادہ اہم تھی جتنی بظاہر نظر آ رہی تھی۔

چند منٹ ہی گزرے تھے کہ نگران شوکت خان کی میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی اس نے ریسیور کان سے لگایا کچھ سنا اور چند الفاظ میں کچھ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ اٹھ کر امتیاز کے پاس آیا۔ اس کے دائیں کان میں سرگوشی کی امتیاز نے سر ہلایا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

شوکت خان نے بلند آواز میں کمرے میں موجود افراد کو اپنی جانب متوجہ کیا اور بتایا کہ حضرات پولیس نے عمارت پر چھاپہ مارا ہے۔ مگر گھبرانے کی اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ سب شہر کے معززین ہیں۔ ہم آپ پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔ ایسی ہنگامی صورت حال کا مکمل تدارک ہمارے ہاتھ میں ہے۔ آپ صرف اتنا کریں کہ اپنے اپنے بریف کیس ہمارے حوالے کر دیں۔

سب نے بریف کیس دے دیے شوکت خان نے انہیں کمرے میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی آہنی الماری میں رکھا۔ وہیں بجلی کے سوئچ بورڈ پر لگے ہوئے ایک بٹن کو دبایا دیوار کا ایک حصہ الماری سمیت دوسری جانب گھوم گیا اور پہلی الماری کی جگہ ایک دوسری اسی طرح کی الماری سامنے آ گئی۔ اسی کے ساتھ میز پر بیٹھا ہوا اسی کا ایک آدمی اٹھا میز کو کچھ کہا پھر اسے دبایا۔ اس کے پائے چھوٹے ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ جو میز تین فٹ اونچی تھی۔ اس کی اونچائی انچوں میں باقی رہ گئی۔

شوکت خان نے سوئچ بورڈ میں لگا ہوا دوسرا

بٹن دبایا اور میزوں کی لمبائی چوڑائی کے برابر فرش کا حصہ گھوم گیا اور جو نچلا حصہ اوپر ہماری نظروں کے سامنے آیا اس پر صرف ایک بڑی سی میز فرش کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ جلد ہی اسے کھینچ کر بلند کر دیا گیا اور اب اس کے فولڈنگ پایوں کی اونچائی کم وبیش تین فٹ ہوگئی۔ کمرے کے تمام حاضرین اپنی اپنی کرسیاں گھسیٹ کر میز کے گرد آبیٹھے۔ الماری کھولی گئی۔ اس کے نچلے خانوں میں پھولوں، میووں، کریم کیک، پیسٹریوں کی طشتریاں بھری رکھی تھیں۔ انہیں میز پر چن دیا گیا۔

کمرے میں پہلے سے موجود لمبے چوڑے فریج سے ٹھنڈے مشروبات کی بوتلیں ہمارے سامنے رکھ دی گئیں۔ سارا کام پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں انجام پا گیا۔ ہم تیسری منزل پر تھے اور پولیس کو وہاں تک پہنچنے میں اتنا وقت تو لگ ہی سکتا تھا۔

ہم بیٹھے ہی تھے کہ دروازہ پرشور آواز کے ساتھ کھلا اور انسپکٹر جمال بیگ دو مسلح کانسٹیبلوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور اور کانسٹیبلوں کے ہاتھ میں رائفلیں تھیں۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اس مرتبہ مجھے جس کمرے میں لایا گیا تھا۔ وہ عمارت کے نگران اور ذاتی کمرہ اور آفس تھا اور یہ کہ شوکت خان ہی منیجر کا رول ادا کرتا ہے۔

''اس بورڈنگ ہاؤس کا منیجر کون ہے۔''
جمال بیگ نے پوچھا۔

شوکت خان جلدی سے کھڑا ہوگیا۔ ''میں ہوں جناب۔ فرمایئے۔''

''ہمیں رپورٹ ملی ہے کہ بورڈنگ ہاؤس کی آڑ میں یہاں ہر قسم کی غیر قانونی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔'' جمال بیگ نے سخت لہجے میں کہا۔ ''مثلاً قمار بازی، جسم فروشی، منشیات کی تجارت اور اسمگلنگ وغیرہ۔ یہ بلڈنگ اس وقت پولیس کے محاصرے میں ہے اور میں ہر کمرے کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔''

''کس نے آپ کو غلط رپورٹ دی ہے۔'' شوکت خان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہاں صرف شریف کرائے دار رہتے ہیں۔ جو زندگی کے مختلف شعبوں سے منسلک ہیں۔ رہی تلاشی کی بات تو آپ جس طرح چاہیں اپنا اطمینان کر سکتے ہیں۔''

''یہ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔'' شوکت خان نے ریوالور سے ہم سب کی طرف اشارہ کیا۔

''ان میں سے کچھ بورڈنگ ہاؤس کے کرائے دار ہیں اور کچھ میرے ذاتی دوست۔'' شوکت خان نے مطمئن انداز میں کہا۔ ''میں نے آج انہیں ایک چھوٹی سی تقریب کے سلسلے میں مدعو کیا تھا۔''

شوکت خان نے پلٹ کر ایک کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔

''نور محمد جاؤ۔ سب انسپکٹر فرید سے کہو کہ وہ مختلف کمروں کی تلاشی لے۔ ہر منزل کا ہر کمرہ دیکھنا سردست ضروری نہیں ہے۔ بشرطیکہ کوئی مشکوک بات یا چیز نظر نہ آئے۔ ابتدائی کاروائی کے نتیجے سے مجھے پندرہ منٹ کے اندر مطلع کیا جائے۔''

کانسٹیبل نے اٹینشن ہو کر سلیوٹ کیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ اب جمال بیگ پھر شوکت خان کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیا یہاں فلش نہیں ہو رہا تھا۔'' اس نے پوچھا۔

''آپ کو میز پر تاش کے پتے اور نوٹ نظر آ رہے ہیں۔'' منیجر نے پہلی مرتبہ ناگواری کا اظہار کیا۔

''طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' جمال نے ڈانٹا۔ ''جو پوچھا جائے اس کا جواب دو۔''

''جی نہیں۔ یہاں ایسا کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ آپ ان معززین سے دریافت کر سکتے ہیں۔''

جمال نے اب پورے غور اور توجہ سے ہماری طرف دیکھا امتیاز اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

''غالباً ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''درست ہے۔ میں آپ کو جانتا ہوں امتیاز صاحب!'' جمال نے جواب دیا۔ ''اور آپ کی شہرت سے بھی واقف ہوں۔''

''تو پھر میری بات کا یقین کیجیے۔ یہاں سچ مچ ایک دعوت ہی جا رہی تھی۔''

اب میں اپنی کرسی سے کھڑا ہوا ظاہر ہے کہ یہ پوری پلاننگ میری تھی۔ میں انسپکٹر جمال بیگ کو برابر رپورٹیں دیتا رہا تھا اور ہونے والے اقدامات سے آگاہ کرتا رہا تھا۔ آج چھاپے کے لیے بھی ہمارے درمیان طویل گفتگو ہو چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ پولیس کی کتنی نفری بلڈنگ کے باہر محاصرہ کیے ہوئے ہیں اور کتنی تعداد عمارت کے اندر مختلف منزلوں پر تلاشی لے رہی ہے۔ چھاپے کا سگنل اس وقت دیا گیا تھا۔ جب میں نے جیب سے لائٹر نکالا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر تھا۔ جو کئی مخصوص سگنل نشر کر سکتا تھا۔ یہ اشارہ پا کر ہی جمال عمارت میں داخل ہوا تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ میں بھی اپنی زبان کھولوں لیکن پہلے سے طے شدہ فیصلے کے مطابق مجھے ظاہر یہ ہی کرنا تھا جیسے میرا اور انسپکٹر جمال کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

''یہ جھوٹ ہے۔ انسپکٹر صاحب!'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''باقی عمارت کے بارے میں تو میں نہیں جانتا مگر یہاں واقعی جوا ہو رہا تھا۔''

امتیاز اور شوکت خان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ جاوید عزیز اور نوشابہ کی حیرت بھی دیدنی تھی۔

''سیٹھ صاحب! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔'' شوکت خان جلدی سے میری طرف بڑھا اور شانہ دبا کر بولا۔ ''بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔''

''مجھے جو کچھ سمجھنا تھا۔ وہ میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔'' میں نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''اب آپ ذرا آنکھیں اور کان کھول کر حالات کو جاننے کی کوشش کریں۔''

میں نے اس طرح جیسے انسپکٹر جمال میرے لیے بالکل اجنبی ہو اور میں پہلی مرتبہ اسے بتا رہا ہوں۔ ڈان زان مغل کی ملاقات سے لے کر آج تک کی داستان بیان کی اور کہا کہ میں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ اس طرح کے ہتھکنڈے میری لیے نئے نہیں ہیں۔ میں کلب میں پہلے جاوید اور نوشابہ کی ملاقات کے بعد ہی سمجھ گیا تھا کہ میرے لیے جال بچھایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اپنی پوری تیاری کر کے آیا تھا۔

''میری جیب میں ایک مائیکرو کیسٹ ریکارڈ موجود ہے۔ جس میں وہ سب کچھ ریکارڈ ہو چکا ہے جو یہاں ہوتا رہا ہے۔ میں نے مسٹر امتیاز کے ساتھ کھیلنے کی خواہش اسی لیے ظاہر کی تھی کہ کسی اور کی آواز پہچانی جائے یا نہ پہچانی جائے لیکن وہ سیاسی لیڈر ہیں۔ ہزاروں کان ان کی مخصوص آواز اور لب لہجے سے آشنا ہیں کوئی اسے شناخت کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ ویسے ان لوگوں کی ہوشیاری اور چالاکی کا جواب نہیں۔ پولیس کے چھاپے کی اطلاع ملتے ہی انہوں نے جس طرح کمرے کا حلیہ بدلا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ پھر میں نے جمال بیگ کو اس میکینکل نظام اور سوئچ بورڈ کے ان بٹنوں کے بارے میں بتایا جس کے ذریعے پانچ منٹ میں جوئے کا اڈا بورڈنگ ہاؤس کے منیجر کے آفس میں تبدیل ہو گیا تھا۔''

شوکت خان کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ نوشابہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے مجھے گھور رہی تھی۔ شہر کے ان پانچ چھ شرفاء کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں جو آسان دولت کمانے کے لالچ میں ان جعلسازوں کا شکار بنے تھے۔ مگر امتیاز انتہائی سنجیدہ اور خاموش تھا۔ اسی وقت سب انسپکٹر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے جمال کو بتایا کہ تینوں منزلوں پر تقریباً تیس کمروں کی تلاشی لی جا چکی ہے مگر کہیں سے کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہیں ہوئی۔

''ہر کمرے میں ایک کرائے دار مقیم ہے۔ جس کے پاس شناختی کاغذات موجود ہیں۔''

جمال بیگ نے فکر مند انداز میں میری طرف دیکھا۔

''انسپکٹر جمال!'' امتیاز بھاری آواز میں بولا۔ ''اس نوجوان نے ابھی جو دلچسپ کہانی سنائی ہے۔ اس میں کتنی حقیقت ہے اور کتنی اس کی ذہنی اختراع یہ میں نہیں جانتا مگر تم زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت کر سکتے ہو۔ وہ صرف اتنی ہے کہ سوسائٹی کے کچھ معزز افراد اپنا دل بہلانے کے لیے شوکت صاحب کے آفس میں تاش کھیل رہے تھے جو ہم سب کے مشترکہ دوست ہیں۔ بلاشبہ اس سے ہماری کچھ ذلت و رسوائی ہوگی مگر یہ سوچو کہ تمہارے ہاتھ کیا آئے گا۔ اس بااثر طبقے کی دشمنی۔ جس کے ایک اشارے سے تمہاری یہ وردی بھی اتر سکتی ہے۔ جس میں اس وقت تم اتنے اسمارٹ نظر آ رہے ہو۔''

''انسپکٹر صاحب!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''ایک عظیم کارنامہ آپ کی دسترس میں ہے۔ دشمن کی باتوں میں آ گئے تو ساری زندگی کف افسوس ملتے رہیں گے۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جو شخص چند منٹ میں قمار خانے کو آفس میں بدل سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی بعید نہیں کہ بورڈنگ ہاؤس کے دوسرے کمروں میں بھی یہی پرکاری دکھائی ہو۔ آپ یہ مائیکرو کیسٹ ریکارڈ سنبھال لیں۔ جس میں یہاں ہونے والی تمام گفتگو ریکارڈ ہے۔''

''ان شریف آدمیوں کو آہنی زیور پہنائیں اور پھر میرے ساتھ چلیں۔ میں بھی ذرا بورڈنگ ہاؤس کے معزز کرائے داروں سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کمرے میں جو کاریگری کی گئی ہے۔ اس کا مظاہر کسی بھی وقت دیکھا جا سکتا ہے۔''

میں نے جیب سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال کر جمال کے ہاتھ میں دے دیا۔ امتیاز مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔

''سیٹھ صاحب! آخر آپ کو ان شریف آدمیوں سے کیا دشمنی ہے۔ کیا ہم آپس میں اس معاملے کو طے نہیں کر سکتے۔'' وہ بولا۔

''محترم شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔'' میں نے نرمی سے کہا اور دو قدم اس کی طرف بڑھا۔ بڑے اطمینان سے اپنی فرنچ داڑھی اتار کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ چشمہ اتارا۔ گالوں کی پیڈنگ اور آنکھوں کے کنٹیکٹ لینس علیحدہ کیے۔ ''اب آپ کہیں تو منہ بھی دھو آؤں۔ میرے خیال میں اس کی ضرورت تو نہیں ہونا چاہیے کہ آپ اتنے بھی گدھے نہیں ہیں۔''

''اوہ' تم!'' بے اختیار امتیاز کے منہ سے نکلا۔

''جناب والا!'' میں نے سر کو خم کرتے ہوئے جواب دیا۔

گھاؤ

ایم اے راحت

اس کی ماں اس کی دیدہ دلیری پر بھونچکا سی رہ گئی' اس کے چہرہ پر ایک رنگ آیا اور چلا گیا۔ نشرہ نے ایسی بات کہی تھی جس سے اس کے ذہن کو شدید دھچکا لگا۔ وہ بھی اپنی ماں کے بدلتے ہوئے تاثرات سے اس کی اندرونی کیفیات کو بھانپ گئی۔ جلدی سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''امی! میرا اور مہوش باجی کا خون ایک سا کیسے ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق یہ ضروری نہیں کہ سگے بہن' بھائیوں کے خون کا گروپ ایک جیسا ہو۔''

ایک معاشرتی کہانی' عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے

نشرہ ان خوش نصیب لڑکیوں میں سے تھی جن کی مثال دی جا سکتی ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب اس نے نوکری کی کوشش کی تو ہر جگہ سے اس کی پذیرائی ہوئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کا خوب صورت چہرہ اور دلکش نقوش تھے۔ ان دنوں وہ ٹیلی ویژن کی اناؤنسر تھی۔

اس کا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا لیکن اس کی زندگی میں بھی ایک داغ تھا۔ اس کے باپ سرفراز بیگ کی آثار قدیمہ کے ماہر کے طور پر بڑی شہرت تھی۔ چودہ برس پہلے جب نشرہ کی عمر صرف دس سال تھی۔ وہ ایک دن ایکا ایکی لاپتا ہو گیا۔ خاندان کے افراد نے پہلے خود اور بعد ازاں پولیس کی مدد سے اس کی تلاش وجستجو کی' لیکن کوئی کوشش بار آور نہ ہوئی' ناچار سب نے رو پیٹ کر صبر کر لیا۔

نشرہ کا ایک بڑا بھائی تھا۔ جس کا نام سکندر تھا۔ وہ ان دنوں ایک کامیاب انجینئر تھا اور اپنے بیوی' بچوں سمیت کینیڈا میں مقیم تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک بڑی بہن مہوش تھی۔ جو تین سال پہلے اپنے پیارے پیارے بیٹے 'گڈو' کو جنم دے کر اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔

نشرہ کے چاہنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن تین افراد بالخصوص ایسے تھے جنہیں دیوانگی کی حد تک اس سے عشق تھا۔ ان میں سرفہرست اس کا بہنوئی نظام' دوسرا اس کا بوڑھا پروفیسر اور تیسرا اس کا کلاس فیلو انجم تھا۔ انجم گزشتہ چار سال میں اپنی محنت اور ریاضت کے بل بوتے پر تخلیقی مصور کی حیثیت سے زبردست شہرت حاصل کر چکا تھا۔

نشرہ کو ان تینوں کے جذبات کا اچھی طرح علم تھا۔ وہ ایک پڑھی لکھی اور صاف گو لڑکی تھی۔ اس نے مخلوط تعلیم حاصل کی تھی۔ اس لیے اسے کبھی مردوں کے ساتھ گھومنے پھرنے میں عار محسوس نہیں ہوا۔ خوف اور گھبراہٹ کا عنصر اس کی زندگی میں یکسر ناپید تھا۔

ایک دفعہ وہ انجم کے ساتھ پکنک منانے گئے' وہ لمبا تڑنگا' صحت مند اور خوبرو نوجوان تھا۔ نشرہ اس کو اپنا بہترین دوست تصور کرتی تھی لیکن اسے اس کی ایک عادت اچھی نہ لگتی۔ وہ زندگی کے بارے میں عموماً منفی پہلو مدنظر رکھنے کا عادی تھا لیکن فلسفہ اور جمالیات پر اس کی گہری نظر تھی۔ اس کا باپ ایک اعلا افسر تھا۔ مالی پریشانیوں کا اس کی زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اسے فخر تھا کہ اس نے کبھی کسی کے لیے نفرت یا محبت کا جذبہ محسوس نہیں کیا۔ جہاں تک نشرہ کا تعلق تھا وہ برملا کہتا تھا کہ اس سے اسے محبت نہیں' عشق ہے اور اپنی اس کمزوری پر اسے طمانیت کے بجائے شرمندگی کا احساس ہوتا تھا۔

نشرہ اس کی ایسی گفتگو سے جھلکنے لگتی تھی۔ جس دن وہ پکنک پر گئے تھے۔ نشرہ خلاف توقع زیادہ چپ چپ تھی۔ انجم نے ابتدا میں اس کی اس کیفیت پر کوئی خاص توجہ نہیں دی' پھر اچانک بے تکلفی سے اس کے کندھے پر جھکتا ہوا شوخی سے بولا۔

''خونخوار آنکھوں والی لڑکی! آج کون سا غم تمہیں ستا رہا ہے۔''

اس نے اپنے ہونٹ سکوڑے اور سرد مہری سے استفہامیہ لہجے میں بولی۔

''تمہارے نزدیک میری آنکھیں خونخوار ہیں۔''

''ہاں...... تمہاری آنکھوں سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''کیوں۔؟''

''اس کا مجھے خود بھی علم نہیں۔'' وہ بڑے مزے سے پائپ کا کش لگا کر بولا۔ کچھ کہنے کے بجائے وہ بحیرہ عرب کی متلاطم لہروں کو دیکھنے لگی۔

انجم نے پوچھا۔ ''میری بات سے تمہیں

صدمہ پہنچا ہے۔''

''فرض کرو...... تمہارا قیاس درست ہے' پھر۔'' اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

وہ سٹپٹا سا گیا' کہنے لگا۔ ''تمہارا دل رکھنے کے لیے معذرت کرلوں گا۔''

''دل......'' نشرہ طنزیہ طور پر ہنسی۔

''میرے پاس دل ہے کہاں۔''

'کیا مطلب۔'

''مطلب صاف ظاہر ہے' انجم اگر میرے پاس دل ہوتا تو وہ ضرور کسی نہ کسی کے لیے دھڑکتا' مچلتا' بے قرار ہوتا' تمہیں مجھ سے عشق ہے نا۔''

''ہاں...... عشق تو ہے' وہ بھی دھانسو قسم کا۔''

وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی' پھر آہستگی سے بولی۔ ''ہماری دوستی کو کئی سال بیت گئے ہیں۔ اس دوران میں نے کئی بار چاہا کہ مجھے تم سے کوئی دلچسپی پیدا ہو۔ امی نے مجھے اکسایا کہ میں تم سے شادی کرلوں۔ خود تم نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے' لیکن......''

''لیکن تمہارے دل میں کوئی نرم گوشہ پیدا نہیں ہوسکا۔''

''رونا تو یہ ہے کہ میرے پاس دل ہے ہی نہیں۔''

انجم کو ایک دھچکا سا لگا' اس نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم ایک لڑکی ہو اور یہ کیسے ممکن ہے کہ......''

اس نے فوراً اس کی بات کاٹ دی' اور غرائی۔ ''مجھے لڑکی مت کہو۔''

''پھر۔''

انجم نے تلملا کر سوال کیا۔ ''کیا تم واقعی اپنے بہنوئی سے شادی کرنے پر تیار ہوگئی ہو۔''

اس نے بے ساختہ زوردار قہقہہ لگایا اور ہنستی چلی گئی۔ سمندر کی ٹھنڈی ہوا اس کے بالوں کو بری طرح اڑا رہی تھی۔ انجم کو ان لمحوں میں یوں لگا۔ جیسے وقت یکا یک ایک جگہ ٹھہر گیا ہے۔ وہ دیر تک محسور کن نظروں سے اس کو تکتا رہا۔ نشرہ اس کی محسویت سے بے نیاز سوچوں کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔

انجم نے جب دوبارہ اپنا وہ سوال دہرایا تو اس نے اس کی طرف گردن گھمائے بغیر کہا۔

''فرض کرو' تمہارا قیاس درست ہو تو۔''

''وہ جھنجلا کر بولا۔'' نشرہ کبھی تو تم ڈھنگ سے جواب دے دیا کرو۔''

ایک رات ٹیلی ویژن ٹرانسمیشن ختم ہونے کے بعد وہ گھر واپس جانے کا سوچ رہی تھی کہ اس کا بہنوئی نظام اپنے ننھے بیٹے گڈو کے ہمراہ وہاں آ گیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ نشرہ نے لپک کر گڈو کو اپنی گود میں اٹھالیا اور پیار کرتے ہوئے بولی۔

''میں...... میں تمہارے ڈیڈی کو اتنا پیٹوں گی کہ وہ رو دیں گے۔''

''کیوں...... بھئی خیریت ہے' ہم سے ایسی کون سی خطا سرزد ہوگئی ہے۔'' نظام نے ہنس کر پوچھا۔

نشرہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ''آپ گڈو کو چھ دن کے بعد لائے ہیں اور اس کے بعد آپ اپنے آپ کو بے خطا تصور کرتے ہیں۔''

اس کا بہنوئی ہنس کر چلایا۔ ''واہ بھئی! یہ اچھی دھاندلی ہے' شکوہ مجھے کرنا تھا کہ تم نے اس عرصے میں ایک بار بھی فون کرنا گوارا نہیں کیا' آخر کیوں۔''

نشرہ جواب دینے کے بجائے خاموش گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے نظام سے دریافت نہیں کیا کہ وہ گاڑی کدھر لے جا رہا ہے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز گڈو

ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھی‘ جبکہ نظام سارے راستے دزدیدہ نظروں سے گھورے جارہا تھا۔

وہ اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ کئی سال پہلے نظام کی اس سے بات ہوئی تھی اور پہلی ہی نظر میں وہ اس کی محبت کا اسیر بن چکا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے نشرہ نے اسے ٹھکرادیا۔ نظام دنیا میں تنہا تھا۔ اپنے مرحوم والدین کی طرف سے اس کو ورثہ میں ایک بڑی ٹیکسٹائل مل ملی تھی۔ پیسے اور شان شوکت کی کمی نہیں تھی۔ اس سے پہلے وہ ایک بیوی کو طلاق دے چکا تھا۔

نشرہ کی ماں‘ بڑی بہن اور بھائی سب اس پر متفق تھے کہ نشرہ کو اس سے شادی کرلینی چاہیے۔ ان کے نزدیک یہ ان کی خوش نصیبی کی انتہا تھی کہ اس کا رشتہ ایک ایسے گھرانے کی طرف سے آیا جو مہذب اور باعزت تھا۔ نشرہ کے انکار پر سبھی کو غصہ آیا۔ کئی روز تک اس مسئلے پر بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ بڑے بھائی اور بڑی بہن نے بھی اسے سخت سست باتیں سنائیں لیکن اس نے بالکل برا نہیں مانا‘ اس نے انہیں بتایا۔

''میرے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لیے میں آپ لوگوں کو کیونکر مطمئن کروں۔''

یہ قصہ کئی ماہ تک چلتا رہا۔ ایک دن غیر متوقع طور پر نظام نے اس کی بہن مہوش سے شادی کی پیش کش کی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں‘ نشرہ کی ماں اور بڑے بھائی نے سکھ کا سانس لیا۔ نظام نے یہ شادی اس لیے کی تھی تاکہ وہ اپنی ناکام محبت کی تسکین کے لیے کسی نہ کسی طرح نشرہ کی قربتوں کو اپنا سکے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بڑی بہن سے بہت محبت کرتی ہے۔ اس لیے اس نے شادی کے بعد مختلف حیلوں بہانوں سے دعوتیں دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کی ساس ہر دعوت میں باقاعدگی سے شرکت کرتی لیکن نشرہ اپنی بڑی بہن کی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود ان دعوتوں سے بالعموم غائب رہتی۔ جب نظام مہوش سے اس کی شکایت کرتا تو وہ جل کر بولتی۔ ''خدا جانے اس کو کیا ہوگیا ہے‘ چند سال سے وہ بالکل سرد اور بے حس بن چکی ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہے۔''

''تمہارے شبے کی بنیاد کیا ہے۔'' نظام اسے گھورتے ہوئے پوچھتا۔

''امی کا کہنا ہے کہ وہ سوتے میں چلنے کی عادی ہوگئی ہے۔'' وہ اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب۔

نظام کو اس انکشاف پر پہلے پہل بڑا تعجب ہوا۔ دراصل وہ اس سے اب تک شدید محبت کرتا تھا لیکن اس نے اپنی محبت کو بڑی کامیابی سے اپنے سینے میں چھپالیا تھا۔ اپنی ساس اور بیوی کی مخالفت کے باوجود ایک دن موقع پاتے ہی اس نے نشرہ سے کہا۔ ''تمہارے ذہن میں کون سی گھتن ہے۔ میں تمہارا ہمدرد ہوں‘ تمہیں مجھ سے کوئی بات نہیں چھپانا چاہیے۔''

نشرہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''نظام صاحب! آپ بھی مجھے امی اور بہن کی طرح نفسیاتی مریض سمجھنے لگے ہیں۔''

وہ گھبرا کر کہنے لگا۔ ''نہیں نشرہ تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔''

''پھر آپ نے ایسا بے ہودہ سوال مجھ سے کیوں کیا۔'' اس کی تیوری چڑھی ہوئی تھیں۔

وہ بات بتاتے ہوئے بولا۔ ''ماہرین نفسیات کے نزدیک سوتے میں چلنا ایک بیماری ہے اور اس کا تعلق لاشعور سے ہوتا ہے۔''

اس نے لاپروائی سے سر کو جھٹکا دیا اور بڑبڑائی۔ ''امی کا کہنا ہے کہ ڈیڈی بھی اس مرض میں مبتلا تھے۔''

''اچھا۔'' نظام نے حیرت سے کہا۔ کیونکہ یہ اس کے لیے ایک نیا انکشاف تھا۔

نشرہ نے اس کے تاثرات کو نظر انداز

کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''میرے نزدیک بے خوابی زیادہ خطرناک اور موذی مرض ہے اور خدا کا شکر ہے مجھے یہ روگ نہیں لگا' جبکہ آپ' امی دونوں اس کے مریض ہیں اور باجی بھی اس میں مبتلا ہیں اور جب تک آپ لوگوں کے تکیوں کے نیچے خواب آور گولیاں نہ ہوں' آپ کو چین نہیں آتا۔''

نظام اپنی جھینپ مٹاتا ہوا بولا۔ ''تمہاری امی غریب کی نیند تمہارے ڈیڈی اپنے ساتھ جاتے ہوئے لے گئے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تم جانتی ہوں کہ میری نیند' میرے خواب سب تمہارے قبضے میں ہیں۔ رہ گیا تمہاری بہن کا مسئلہ تو وہ بے چاری اسی دکھ میں کڑھ کڑھ کر اپنی آنکھوں کو بے خواب کر بیٹھی ہے کہ اس کا شوہر پھر اس کے بجائے ابھی تک اس کی چھوٹی بہن سے عشق کرتا ہے۔''

اس نے ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا لیکن نشرہ چپ چاپ بیٹھی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔

دنیا میں صرف پروفیسر ہی ایک ایسا شخص تھا جس کی موجودگی میں اسے خاموش رہنا پسند نہیں تھا۔ اسے اس کے سفید بالوں میں بڑی کشش محسوس ہوتی تھی۔ یونیورسٹی میں وہ سارا عرصہ اس کی شاگرد رہی اور ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ کسی بات پر اشتعال میں آیا ہو۔ وہ عمر رسیدہ مخلص تھا اور اس نے شادی نہیں کی تھی۔ پروفیسر یوں تو خاموش طبع اور سنجیدہ انسان تھا لیکن شیام کے ساتھ اس کی خاص طور سے بے تکلفی تھی۔ نشرہ کو اس کے ساتھ گھومنا پھرنا اور تنہائی میں بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیوں نے مشہور کر دیا کہ بوڑھا پروفیسر اس آفت لڑکی پر دل و جان سے فریفتہ ہو چکا ہے۔ جب نشرہ کو اس افواہ کا علم ہوا تو اس نے برملا کہا کہ ''اس میں مضائقہ کیا ہے۔ ایسے پڑھے لکھے بردبار اور ذہین شخص کا عشق میری ادھوری شخصیت کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں بڑا معاون ہوگا۔''

ایک دن نشرہ بڑے اچھے موڈ میں تھی۔ اس نے بڑی بے باکی سے پوچھا۔

''پروفیسر صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے اور میرے اسکینڈل کا بڑا چرچا ہے۔''

''اسکینڈل' کس کا اسکینڈل۔'' اس نے معصومانہ نظروں سے اسے تکتے ہوئے پوچھا۔

نشرہ نے کہا۔ ''یہی کہ آپ مجھ سے عشق کرتے ہیں۔''

پروفیسر دیر تک ہنستا رہا' پھر بولا۔ ''یہ تو ایک بے ضرر انکشاف ہے' پھول' خوشبو' رنگ اور موسیقی کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ ان سے عشق کیا جائے' عشق دراصل اپنی ذات کو خود تسلیم کرنے کا نام ہے۔ انسانوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ زندگی بھر دوسروں سے اپنی ذات کو منوانے کے درپے رہتے ہیں۔ اس چکر میں اپنے آپ کو بھی نہیں مل پاتے۔ اس لیے خوف ان کا مقدر بن جاتا ہے۔''

نشرہ نے فوراً کہا۔ ''پھول' خوشبو' رنگ اور موسیقی ان میں سے آپ مجھے کیا تصور کرتے ہیں۔''

پروفیسر نے دوبارہ قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''اصل چیز پھول ہے' خوشبو' رنگ' موسیقی اس کی جزوئیات ہیں۔''

وہ طنزیہ طور پر چلائی۔ ''پروفیسر صاحب! آپ نے مجھے پھول قرار دے کر میری زندگی بہت مختصر کر دی ہے' اس کا مطلب یہ ہوا کہ تیز ہوائیں اور جھلسا دینے والی دھوپ کسی پل بھی میرا صفایا کر سکتی ہے۔''

اس نے پیار سے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کہنا درست ہے' لیکن یاد یں

پھولوں کو ہمیشہ کے لیے امر بنا دیتی ہیں۔''

عجیب بات یہ تھی کہ اس کی ماں فرخندہ خاتون کو اس کا بوڑھے پروفیسر سے زیادہ میل جو پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ ایک پڑھی لکھی عورت تھی۔ جوانی میں اس نے چند سال شاعری بھی کی تھی۔ شادی کے بعد فرخندہ خاتون نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شاعری کو خیر باد کہہ دیا' اس نے نشرہ پر بلاوجہ روک ٹوک نہیں کی تھی۔ اس کا موقف تھا کہ ہر شخص اس دنیا میں اپنی آزاد' خودمختار زندگی لے کر آتا ہے۔ اپنے دکھوں کی اذیت اور مسرتوں کی لذت وہ خود ہی محسوس کر سکتا ہے۔ اس لیے یہ ظلم نہیں ہونا چاہیے کہ بڑے بوڑھے اپنے احساس کمتری یا برتری سے مجبور ہو کر نوجوان نسل کے گلوں میں بھینسوں کی طرح مخصوص روایات کے لیے ڈال دیں۔

ابتدا میں وہ اپنے موقف پر بڑی مضبوطی سے قائم رہی' لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پر یہ عقیدہ کھلا کہ اس کے نظریات میں کہیں کوئی گھپلا ہو گیا ہے' کیونکہ اس پر شتر بے مہار کی سی کیفیت تیزی سے طاری ہو رہی تھی۔

اسے سب سے زیادہ افسوس نشرہ پر تھا۔ اس نے اس کی ممتا کی تمام ضرورتوں کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ فرخندہ خاتون تنہائی میں اکثر سوچتی۔ ''یہ اپنے ڈیڈی کی طرح ضدی' کرخت مزاج اور ظالم ہے۔ وہ شخص ایذا پسند تھا' اور ہمیشہ مجھے اذیتیں پہنچا کر خوش ہوتا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے ایکا ایکی تنہا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے کیوں غائب ہوا۔ اس کے نزدیک اولاد کے سکھ نے مجھے تھوڑی سی عافیت بخش دی تھی۔ یہ بات اس کی برداشت سے باہر تھی۔ وہ مجھے سسکانے کا خواہاں تھا۔ اس لیے اس نے بالآخر مجھے اتنی بڑی سزا دی۔''

اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے' عین اس وقت نشرہ وہاں آ گئی' ماں کو روتے دیکھ کر اس کی پیشانی پر چند شکنیں نمودار ہوئیں۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنی ماں کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''امی کیا تنہائی اور سناٹے میں آپ کا دل بہت گھبراتا ہے۔''

فرخندہ خاتون نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ ''یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں' کیا جنگلوں میں جانور تنہا نہیں رہتے۔''

وہ جل کر بولی۔ ''تیری نظر میں ماں محض ایک جانور ہے۔''

نشرہ نے جلدی سے کہا۔ ''آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں' میں کہنا چاہتی ہوں کہ ہر جاندار شے ازلی اور فطری طور پر تنہا ہے۔''

''مجھے تیرے فلسفے سے کوئی دلچسپی نہیں نشرہ۔'' وہ ناراض اور بے زار تھی۔ ''ان پڑھ اور غریب مائیں مجھ سے ہزار درجے بہتر ہیں کم از کم انہیں اولاد کی طرف سے تو گرمجوشی ملتی ہے۔ میرا شوہر مجھے چھوڑ کر لاپتہ ہو گیا۔ بیٹا' بیوی' بچوں سمیت بیرون ملک میں گم ہے' اسے یہ توفیق نصیب نہیں ہوتی کہ سال میں ایک' دو بار خط ہی لکھ دیا کرے۔ مہوش میرے دل کو داغ لگا کر اللہ کو پیاری ہو گئی' اور تم ہو' تمہیں رتی برابر پرواہ نہیں۔''

نشرہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں ان پر مرکوز کر دیں اور مسلسل اس کو گھورے جا رہی تھی۔ دفعتاً فرخندہ خاتون نے دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''نشرہ تو مجھے اس طرح نہ دیکھا کر' تیری آنکھوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''کیوں امی' کیا میں چڑیل ہوں۔''

اس کی ماں چپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر آہستگی سے زیر لب بڑبڑائی۔ ''تیری آنکھیں

ہو بہو تیرے ڈیڈی سے مشابہہ ہیں' وہ بھی مجھے اس طرح تکنے کے عادی تھے' اور مجھے کبھی ان کا یہ ظالمانہ انداز پسند نہیں آیا۔"

نشرہ نے سوال کیا۔ "لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ دونوں کی محبت کی شادی تھی اور ڈیڈی نے آپ کو ٹوٹ کر چاہا' کہیں آپ ان کی آنکھوں میں چاہت کا چھپا ہوا طوفانی سمندر دیکھ کر تو نہیں ڈر جاتی تھیں۔"

"نشرہ!" فرخندہ خاتون چلائی' وہ غصہ میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ "مجھے تمہارا ایسا چھچھورا مذاق بالکل پسند نہیں۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ تم نے جہاں بھر کی کتابیں پڑھ لیں اور ابھی تک اس حقیقت سے لاعلم ہو کہ ماں کا احترام کیسے کیا جاتا ہے۔"

اسی رات فرخندہ خاتون نہایت اداسی سے ٹیلی ویژن اسکرین پر اپنی بیٹی کو مسکراتا دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ "نشرہ اپنی مسکراہٹیں بکھیر کر لاکھوں اداس شائقین کو محظوظ اور محسور کرتی ہے لیکن میں نے کون سا جرم کیا ہے جو میرے سامنے گھر میں اس طرح نہیں مسکراتی۔ میں اس کی ماں ہوں اور میرا اس پر اولین حق ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں کس قدر رنجیدہ اور دکھی ہوں۔ پھر یہ میرے زخموں پر مرہم کیوں نہیں رکھتی' میں نے ہمیشہ اسے اپنی بے پناہ محبتوں سے نوازا اور اس پر کبھی چلچلاتی دھوپ کی ایک آنچ تک نہیں آنے دی۔ شاید ماؤں کی تقدیر یہ ہی ہے کہ وہ سدا دکھوں کا بوجھ اٹھائیں اور اندر ہی اندر جل کر کڑھ کر مر جائیں۔"

اس کی آنکھیں اشکبار تھیں اور سامنے اسکرین پر خوب صورت نشرہ کھنکتے لہجہ میں ایک ادا کے ساتھ کسی انگریزی فلم کے آغاز کا اناؤنسمنٹ کرنے میں مصروف تھی' اس سے فراغت پا کر وہ اپنی ماں کی کرب ناک سوچوں سے بے نیاز ٹی وی سینٹر کے ملاقاتی کمرے میں جا پہنچی۔ چند لواحقین اس سے ملنے آئے تھے۔ ایسے افراد کا ٹی وی سینٹر پر بالعموم جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ ان کی اصل خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے من پسند آرٹسٹوں کو براہ راست دیکھیں۔

سینئر کارکنوں نے نشرہ کو سمجھایا تھا کہ وہ ایسے فضول قسم کے لوگوں کو...... کوئی اہمیت نہ دے' کیونکہ آرٹسٹ کے لیے یہ بات ناگزیر ہوتی ہے کہ وہ اپنی شان بنانے کے لیے عام لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو انتہائی مغرور اور مصروف ظاہر کرے۔

نسرہ کو ان کا یہ مشورہ پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اپنے مداحین کے ساتھ نہایت اخلاق سے گفتگو کرتی۔ انہیں چائے پلاتی اور پھر ان کا شکریہ ادا کر کے اسٹوڈیو کی طرف واپس لوٹ آتی۔ البتہ اس نے سینئر آرٹسٹوں کو حقارت سے نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک روز پروگرام مینیجر نے اسے بلوایا اور کہا۔ "پروفیسر ہمارے ملک کی بڑی علمی شخصیت ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم ان کا انٹرویو نشر کریں' لیکن حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر صاحب! اس بات کے لیے رضامند نہیں۔"

اس نے ہونٹ سکوڑ کر پوچھا۔ "اس مسئلہ کا مجھ سے کیا تعلق ہے۔"

پروگرام مینیجر بالعموم اپنے ماتحتوں کو تم اور تو کہنے کا عادی تھا۔ لیکن نشرہ کے ساتھ وہ ہمیشہ بڑے مہذب لہجے میں گفتگو کرتا۔ اس نے کہا۔ "آپ کے متعلق مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ان کی شاگرد خاص رہ چکی ہیں۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ آپ ان کو تیار کریں۔"

نشرہ نے دوبارہ سوال کیا۔ "انٹرویو کون لے گا۔"

وہ برجستہ بولا۔ "اس مقصد کے لیے آپ سے زیادہ کوئی موزوں نہیں ہو سکتا۔"

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی' پھر کہنے لگی۔

ٹیلی ویژن والے بڑے مستعد اور ہوشیار لوگ
ں۔ انہیں غالباً بنیادی تربیت یہ ملی ہے کہ حوصلہ
کن حالات میں بھی مایوس نہ ہوں۔''
''کیا مطلب پروفیسر۔''
''تمہارے پروڈیوسر اور پروگرام مینیجر نے
ری طرف کئی چکر لگائے تھے۔ میں نے انہیں
اف صاف کہہ دیا تھا کہ بھائی اب میں لب گور
ں۔ ٹی وی اسکرین پر آ کر مزید جینے کی ہوس
ں مبتلا نہیں ہونا چاہتا۔ اس کے علاوہ میں اندر
سے بالکل خالی ہوں۔ رٹی رٹائی کتابیں مجھ سے
لوانے کا کیا فائدہ' لوگوں سے کہو کہ بازار سے
ی کتابیں خرید کر پڑھ لیں۔''
نشرہ نقرئی آواز میں بولی۔ ''آپ ظالمانہ
ز کا اظہار کر رہے ہیں۔''
پروفیسر نے جلدی سے کہا۔ ''ایسا مت کہو'
ی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو راضی کیا
ے کہ تم سے سچ بولوں اور اس کے علاوہ تم خود
ر کرو کہ ٹی وی کے لاکھوں شائقین کو مجھ بڈھے
ھوسٹ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میرا حلیہ بھی
لیکچو ل حضرات کی مانند نہیں کہ انہیں میرے
ھرے بال اور سوچ میں ڈوبا چہرہ دیکھ کر ہی
جھ طمانیت ہو جاتی۔ بلاوجہ لوگ ٹیلی ویژن
لوں کو غالبانہ گالیاں دیں گے کہ انہوں نے
ر کیا۔ تم اپنے پروگرام مینیجر سے کہو کہ وہ میری
ائے بابرہ' ندیم یا شبنم کو انٹرویو کے لیے بلا لے
ر اگر کوئی ٹی وی والے اپنے شائقین کو عالمانہ
فتگو ہی سنوانے کے لیے بے چین ہیں تو کلچر
ے ان نمائندوں کو ایک اسکرپٹ لکھ کر تھما دیں۔
یہ باتیں زیادہ خوب صورت انداز میں
ائقین کے دلنشین کرا سکتے ہیں۔''
نشرہ نے زیادہ اصرار نہیں کیا' اور فون بند
رنے کے بعد مینیجر کو اپنی ناکامی کی رپورٹ
ش کر دی۔ وہ تلملا کر بولا۔ ''آپ ان کی اتنی
زیز شاگرد ہیں' بڑے افسوس کی بات ہے کہ

آپ ان کو انٹرویو کے لیے آمادہ نہ کر سکیں۔''
نشرہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔
''پروفیسر صاحب کے دلائل حقائق پر مبنی تھے۔ میں ان کی جگہ ہوتی تو میں بھی یہ ہی کہتی اور پھر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے' ہمارا ملک انٹیلیکچو ل حضرات سے بھرا پڑا ہے۔ آپ نے محض خانہ پری کرنا ہے کہ تفریح پروگراموں کے ساتھ ساتھ آپ ناظرین کو علم و دانش کا عطیہ بھی دینا چاہتے ہیں۔ کسی کو بھی پکڑ لیں کام چل جائے گا۔''
پروگرام مینیجر کا خون کھول گیا لیکن اس نے نشرہ سے کچھ نہیں کہا۔
جب نشرہ نے یہ قصہ انجم کو سنایا تو وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ ''پروفیسر صاحب کو خود نمائی کی عادت ہے۔''
''کیا بکواس کر رہے ہو۔'' وہ جھلا کر چیخی۔
انجم نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''انسان جب زیادہ لکھ پڑھ جاتا ہے تو اس کا احساس کمتری اس کو نت نئے طریقوں سے خود نمائی کے اظہار پر مجبور کرتا ہے۔ جب تک ہمارے ملک میں تعلیم کا تناسب کم تھا۔ لوگوں میں تنقید کی عادت بھی کم تھی۔ آج کل جس شخص کو دیکھو دوسروں پر انگشت نمائی میں مصروف ہے۔ جو نہیں ہو سکا وہ دراصل درست تھا۔ اسی بھیڑ میں پروفیسر صاحب بھی شامل ہیں۔ اپنی اہمیت جتانے کے لیے انہوں نے طنزیہ طور پر یہ تجویز پیش کر دی کہ ٹی وی والے ان کے بجائے بابرا' ندیم' شبنم کو بلا لیں۔''
''کمینے چپ ہو جاؤ' ورنہ میں تھپڑ مار دوں گی۔'' نشرہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
انجم پروفیسر کے نام سے خار کھاتا تھا' کیونکہ اسے بخوبی علم تھا کہ نشرہ اس پر دل و جان سے فریفتہ ہے۔ اس کے علاوہ اسے شبہ تھا کہ وہ

بھی اس بڈھے میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔ نشرہ عام لڑکیوں کے مقابلے میں ایک غیر معمولی نوعیت کی لڑکی تھی۔ اس لیے اسے یہ خوف رہ رہ کر ستاتا تھا کہ کہیں وہ اس کو سچ مچ نظر انداز کر کے پروفیسر سے شادی نہ رچالے۔

وہ سفاک لہجے میں بڑبڑائی۔ ''تمہاری ذہنیت بورژوایانہ ہے' اور تمہارے طبقے کے لوگ یہ بات کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ نچلے طبقے کا کوئی شخص تم پر کسی لحاظ سے اپنی برتری قائم کرنے کے قابل ہو۔ جس پروفیسر پر تم لعن طعن کے کوڑے برسا رہے ہو' وہ ایک غریب' جاہل اور پسماندہ خاندان کا فرد تھا۔ اس نے اپنی ذاتی محنت اور جدوجہد کے ذریعے یہ مقام حاصل کیا ہے کہ دو لیتے اور نو دو لیتے اس کا احترام کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کی دو تحقیقی کتابیں دنیا کی مختلف زبانوں میں چھپ چکی ہیں اور یورپ کا ہر اسکالر ہمارے ملک میں آنے کے بعد اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی ملاقات پروفیسر سے کرائی جائے۔ تمہارے تعصبانہ جذبات دیکھ کر میں بہت مایوس ہوئی ہوں۔''

انجم بے تکلفی سے بولا۔ ''ظاہر ہے رقیب سے کون خوش ہوتا ہے۔''

نشرہ نے نفرت سے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے' دفعتاً اس نے نشرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''نشرہ کیا تم مجھ سے ناراض ہو گئی ہو۔''

''ناراض۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ ''ناراض وہ ہوتا ہے جو کسی سے خوش ہونے کی توقع وابستہ کرتا ہے۔''

''کیا تمہارا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو۔''

''کم از کم تم میری دوست ہو۔ میں تم سے محبت نہیں عشق کرتا ہوں۔ اس ناتے سے ہمارا ایک خصوصی تعلق ہے' اور جہاں کسی قسم کا تعلق ہوتا ہے وہاں انسان چھوٹی موٹی توقع ضرور وابستہ کرتا ہے۔''

''تم مجھ سے عشق کرتے ہو' یہ تمہارا مسئلہ ہے' لیکن میں تمہاری دوست نہیں ہوں۔''

''پھر ہم ایک دوسرے سے کیوں ملتے ہیں۔'' اس نے دکھے ہوئے دل سے سوال کیا۔

اسے خطرہ تھا کہ نشرہ غصے میں آ کر کہیں اٹھ کر نہ چلی جائے لیکن ایسا نہیں ہوا اور وہ اپنی جگہ بیٹھی رہی اور بڑے اطمینان سے بولی۔ ''انسان بعض ایسی حرکتیں کرتا ہے جو بے معنی ہوتی ہیں اور جن کے بارے میں اسے خود بھی علم نہیں ہوتا کہ ان کا مقصد کیا ہے۔''

''مثلاً ......'' وہ باقاعدہ بحث پر اتر آیا۔

نشرہ نے جواب دیا۔ ''جیسے میں ٹیلی ویژن اناؤنسر بن گئی ہوں' مجھے پیسوں یا شہرت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں نے ملازمت اختیار کر لی۔ لوگ مجھے دیکھ کر اپنے طور پر خوش ہوتے ہیں۔ حالانکہ میں انہیں بالکل خوش کرنا نہیں چاہتی' جیسے میں بظاہر امی سے محبت کرتی ہوں' بلکہ جبکہ اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔''

''کیا مطلب۔'' اس نے استفسار کیا۔

''سچ یہ ہے کہ میں ان سے محبت کے بجائے نفرت کرنا چاہتی ہوں۔''

''ماں سے نفرت۔''

''ماں سے کیا' میرا دل چاہتا ہے کہ میں ہر شخص سے نفرت کروں' ایسی بھرپور نفرت کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو۔'' اس پراسرار بڑی بڑی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔

انجم اس کی یہ انجانی کیفیت دیکھ کر ڈر گیا۔ اس نے رکتے رکتے کہا۔ ''لیکن کیوں۔ تمہیں کسی نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ تمہاری کوئی حق تلفی بھی نہیں ہوئی۔ نفرت کرنے کے لیے کوئی جواز تو

ہونا چاہیے۔"

نشرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے خلاؤں میں گھورتی رہی۔ انجم نے کئی بار اپنا سوال دہرایا۔ اس کو جھنجوڑا اور یکلخت اس کے قدم پکڑ کر بولا۔ "نشرہ میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ تم مجھ سے شادی کر لو۔"

نشرہ ایک دم جیسے ہوش میں آ گئی۔ بے ساختہ قہقہہ مار کر ہنسی اور کہنے لگی۔ "واہ...... تم نے اس وقت بہت اچھا لطیفہ سنایا ہے۔"

"لطیفہ......" انجم کے جذبات کو بری طرح ٹھیس لگی۔ "آخر مجھ میں کون سی ایسی برائی ہے کہ تمہیں مجھ سے شادی کرنا پسند نہیں' آج میں تم سے اس موضوع پر کھل کر بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"نشرہ نے ملائم لہجے میں کہا۔" تم بلاشبہ ایک اچھے آدمی ہو اور مجھے اعتراف ہے کہ تمہیں مجھ سے بے پناہ عشق ہے۔ تم نے اپنی پینٹنگز میں کسی نہ کسی طور پر میرا ہی پورٹریٹ بنانے کی کوشش کی ہے' لیکن انجم! جو چیز انسان کو اچھی لگ جاتی ہے۔ وہ اس پر اپنا تسلط جمانے کی فکر میں کیوں لگ جاتا ہے۔ جانتے ہو دنیا کی ساری جنگیں اسی کمزوری کی بنا پر لڑی گئیں۔ ہزاروں بستیاں اجڑیں' کروڑوں انسان قتل ہوئے اور غور سے دیکھیں تو تمہیں زمین کے ہر گوشے پر کسی نہ کسی مظلوم انسان کا لہو دکھائی دے گا۔ جن لوگوں کے ہاتھوں اسے عظیم کارنامے سرانجام پائے وہ تمہاری طرح اس واہمہ میں مبتلا تھے کہ انہیں اپنی پسند پر غلبہ حاصل ہو جائے۔ میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ وجہ مجھے خود بھی معلوم نہیں اور نہ ہی میں اسے جاننے کے لیے فکر مند ہوں' پھر تم کیوں اصرار کر رہے ہو۔"

وہ اٹھ کر چل دی۔ انجم بھیگی آنکھوں سے اس کو جاتا دیکھتا رہا۔

جب وہ گھر پہنچی تو اس کی ماں بھری بیٹھی تھی۔ نشرہ نے اس کو نظر انداز کر کے اپنے کمرے کی طرف جانا چاہا لیکن فرخندہ خاتون نے اسے آواز دے کر بلا لیا اور بولی۔ "مجھے تم سے ایک اہم بات کرنا ہے۔"

"جی امی!" اس نے سعادت مندی سے کہا۔

ماں نے کہا۔ "بیٹی مجھے لگتا ہے کہ میں اب زیادہ دیر تک نہیں جیوں گی۔"

وہ اپنے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "یہ ہی بات آپ گزشتہ کئی سال سے دہرا رہی ہیں۔"

فرخندہ خاتون غصے سے بڑبڑائی۔ "میں پوچھتی ہوں تم میرے ساتھ اس سرد مہری سے کیوں پیش آتی ہو' کیا میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔"

"میں نے آپ کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی' امی صرف آپ کو یاد دہانی کرائی ہے' خیر آپ کو کیا کہنا ہے' میں دراصل بہت تھکی ہوئی ہوں۔"

"میں جب بھی تم سے کوئی بات کرنا چاہتی ہوں' تم ہمیشہ یہ ہی بہانہ پیش کر دیتی ہو' ٹیلی ویژن اسکرین پر تم لاکھوں افراد کو خوش کرتی ہو' کیا تھوڑی دیر کے لیے تم اس گھر میں ویسی با اخلاق اور ہنس مکھ اناؤنسر نہیں بن سکتیں۔"

نسرہ پر ہنسی کا دورہ پڑا اور وہ دیر تک ہنستی چلی گئی۔ اس کی ماں حیرت سے اسے دیکھتی رہی' پھر اس نے سہم کر اس کا بازو پکڑ کر جھنجوڑا۔ "نشرہ...... تمہیں کیا ہو گیا۔"

نشرہ نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پایا اور اس کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ وہ بولی۔ "کچھ دیر پہلے امی! انجم نے مجھے ایک لطیفہ سنایا تھا اور اب آپ نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔"

"انجم......" فرخندہ خاتون بڑبڑائی۔

"اس سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی۔"

"جی۔" اور وہ میرے قدم پکڑ کر بولا۔

''نشرہ میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ تم مجھ سے شادی کرلو۔'' اس نے انجم کے لہجہ کی نقل اتاری۔

''پھر تم نے کیا جواب دیا۔''

''لطیفہ کا جواب کیسے دیا جاتا ہے۔'' زیادہ ہنسنے کے سبب اس کا چہرہ ابھی تک تمتما رہا تھا۔

اس کی ماں شکایتی لہجے میں کہنے لگی۔ ''بیٹی آج نظام آئے تھے' تم جانتی ہو کہ تمہاری بہن کی موت کے بعد سے وہ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ تمہاری شادی ان کے ساتھ کردی جائے۔''

''امی...... آپ کو میرا جواب معلوم ہے۔'' اس کے لہجے میں متانت تھی۔

وہ اس کو دیکھتی رہی اور جب نشرہ اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے اٹھی تو اس نے نرم لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''نشرہ' موجودہ صورت حال پہلے کی نسبت بہت مختلف ہے۔ نظام پہلے بھی تم سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے لیکن تمہارے انکار پر وہ خاموش ہوگئے۔ اب ان کے سامنے گڈو کا مسئلہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہا کہ تمہارے انکار کی صورت میں وہ کسی اور لڑکی کا انتخاب کرلیں گے لیکن اس صورت میں وہ گڈو کے ساتھ ہونے والے سوتیلی ماں کے سلوک کے بارے میں ذمہ دار نہ ہوں گے۔''

نشرہ اطمینان سے بولی۔ ''گڈو...... کو آپ اپنے پاس رکھ لیں۔''

''میں نے یہ تجویز نظام کو پیش کی تھی لیکن انہوں نے اسے تسلیم کرنے سے صاف انکار کردیا۔ بلکہ ڈھکے چھپے الفاظ میں یہ دھمکی دی کہ دوسری لڑکی سے شادی کرنے کی صورت میں وہ ہمارے خاندان سے اپنے تعلقات منقطع کرلیں گے۔'' فرخندہ خاتون نے افسوس ناک شکل بناتے ہوئے انکشاف کیا۔

نشرہ سوچ میں پڑ گئی' اس کی کشادہ خوب صورت پیشانی پر شکنیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

ماں نے آہستگی سے کہا۔ ''بیٹی! آخر تمہیں اس رشتہ پر اعتراض کیا ہے۔ نظام اچھا' سمجھ دار اور نیک لڑکا ہے۔ اس نے تمہاری بڑی بہن کو جب تک زندہ رہی خوب عیش کرائے۔ اللہ اس کو بخشے۔ مہوش نے کبھی ایک بار بھی مجھ سے اس کی شکایت نہیں کی۔ تم مان جاؤ' نشرہ! اپنے لیے نہ سہی' گڈو کا خیال کرلو' وہ بہت کم سن ہے۔ سوتیلی ماں کا ظلم برداشت نہیں کرسکے گا۔''

نشرہ نے سفاکانہ لہجے میں جواب دیا۔ ''نظام سے شادی کرنے کی صورت میں' میں بھی تو اس کی سوتیلی ماں ہی بن جاؤں گی۔''

''پگلی' تو' تو اس کا اپنا خون ہے۔''

''اپنا خون۔ کیا مطلب۔''

فرخندہ خاتون نے غصہ سے اس کو دیکھا اور وہ درشتگی سے بولی۔ ''کیا مہوش تیری بہن نہیں تھی۔''

نشرہ نے سرد مہری سے کہا۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے' اس دنیا میں کئی لڑکیاں ایسی ہیں جو آپس میں سگی بہنیں ہونے کے باوجود سگی بہنیں نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ان کے خون مختلف ہوتے ہیں۔''

اس کی ماں اس کی دیدہ دلیری پر بھونچکا سی رہ گئی' اس کے چہرہ پر ایک رنگ آیا اور چلا گیا۔ نشرہ نے ایسی بات کہی تھی جس سے اس کے ذہن کو شدید دھچکا لگا۔ وہ بھی اپنی ماں کے بدلتے ہوئے تاثرات سے اس کی اندرونی کیفیات کو بھانپ گئی۔ جلدی سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''امی! میرا اور مہوش باجی کا خون ایک سا کیسے ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق یہ ضروری نہیں کہ سگے بہن' بھائیوں کے خون کا گروپ ایک جیسا ہو۔''

نشرہ کے جانے کے بعد فرخندہ خاتون بڑی دیر تک تنہائی میں روتی رہی۔ اس کی بیٹی نے انجانے پن میں اس کے ایک ایسے زخم کو چھیڑ دیا تھا' جسے وقت کا مرہم بھی مندمل نہیں کر سکا۔ وہ برسوں سے ایک نادیدہ آگ میں جل رہی تھی۔ اس کے سوا اس ہولناک اذیت کا کوئی احساس نہیں کر سکتا تھا۔

اپنی جوانی میں وہ نشرہ ہی کی طرح خوب صورت اور پرکشش اور باغی قسم کی لڑکی تھی۔ کالج کا ہر لڑکا اس کا دیوانہ تھا۔ اس دیوانوں میں ایک سرفراز بیگ تھا۔ جس سے بعد ازاں اس کی شادی ہوئی' لیکن فرخندہ خاتون نے کبھی اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا' کیونکہ وہ اپنا دل ایک اور لڑکے کے قدموں میں نچھاور کر چکی تھی۔

ایک دن دونوں کا رنگین خواب دفعتاً چکنا چور ہو گیا۔ اندھیروں نے دھنک کے حسین رنگ اپنے اندر سمیٹ لیے اور رومانی گیت سناٹوں کی نذر ہو گئے۔ فرخندہ خاتون محض کالج کی چار دیواری کے اندر ہی باغیانہ اور انقلابی باتیں کر سکتی تھی۔ سماج اور سماج کی قدروں کا سامنا ہوتے ہی وہ سکڑ کر جل ککڑی بن گئی۔ اس کی شادی نہایت شان و شوکت سے سرفراز سے کر دی گئی' اور شہنائیوں کی زوردار گونج میں اس کی کمزور چیخوں نے اس کی جھلملاتی تمناؤں کی مانند ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دم توڑ دیا۔

ایک معزز خاندان کی بہو بننے کے بعد اس نے اپنا سر اس طرح جھکایا کہ اس کی خالی خالی آنکھیں اپنے شوہر کے قدموں کے سوا کچھ نہ دیکھ سکتی تھیں۔ سرفراز بیگ بہت خوش ہوا تھا۔ اس کی اصل مسرت یہ تھی کہ اس نے ایک ایسی مغرور لڑکی کو زبردست سماجی قوت کے بل بوتے پر اپنی بیوی بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس نے اپنی پسند کے مطابق کسی دوسرے کو اپنی دھڑکنوں میں بسا رکھا تھا۔ پرانے زمانے میں وحشی انسان دوسروں کے ملک پر قبضہ کر کے بڑا خوش ہوا کرتے تھے۔ عورتوں کو بالجبر ہتھیانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اب ہوائی جہاز کا سفر کرنے کا عادی بن چکا ہے۔ لیکن جانے کیا بات ہے کہ زر' زن اور زمین کو کسی نہ کسی طرح ہتھیانے کی اس کی دیرینہ عادت نہیں گئی۔

روایات کے زندان خانے میں اسیر ہونے کے بعد فرخندہ خاتون نے اپنے دل کو کچل ڈالا' آنکھوں کے آئینے ریزہ ریزہ کر دیے اور اپنے اس حصے کو ہمیشہ کے لیے ماؤف اور بے جان کر دیا' جہاں اس کے محبوب کا نام درج تھا۔

اس نے سرفراز کی خوشنودی کو اپنی خوشنودی دی اور اس کی رضا کو اپنی رضا قرار دیا۔ اس کا شوہر اذیت پسند تھا' اسے لاشعوری طور پر سب سے بڑی کوفت یہ تھی کہ اسے تقدیر نے محبوب کے بجائے ولن کا روپ دیا۔ اس نے اپنی ذہانت اور خاندان کے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے فرخندہ خاتون کو ہمیشہ کے لیے اپنا لیا۔ اس کا رنگ و روپ' مرمری بدن' طلسماتی آنکھیں' دراز زلفیں' بنگلے کے دیگر فرنیچر کی مانند اس کی ذاتی ملکیت بن چکی تھی۔

اس کے باوجود اسے کبھی یوں لگتا کہ فرخندہ خاتون کے محبوب کی دو نادیدہ آنکھیں خلاؤں میں اس کو مضحکہ خیز طریقے سے گھورتے ہوئے کہہ رہی ہیں۔ ''فرخندہ خاتون صرف میری تھی اور اب بھی میری ہے' جس کو تم دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے یہ فرخندہ کی لاش ہے' بے وقوف تمہارے احساس میں جمالیاتی قدریں موجود ہوتیں تو تمہیں اس کی لاش سے یقیناً کراہیت آتی۔''

سرفراز بوکھلا گیا۔ دوسروں کا دل توڑنے میں نقصان یہ ہے کہ اپنا دل بھی کمزور ہوتا ہے' سرفراز بھی آہستہ آہستہ نفسیاتی مریض بن گیا۔

ابتدا میں وہ بے خوابی کا شکار رہا۔ اس نے اس سے بچنے کے لیے خواب آور گولیوں کا سہارا لیا۔ چنانچہ اس کی کھوئی ہوئی نیند واپس لوٹ آئی لیکن نئی آفت یہ نازل ہوئی کہ اس نے سوتے میں چلنا شروع کر دیا۔ نفسیاتی امراض کے ماہرین بڑی توجہ سے اس کا علاج کرنے لگے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ اس کی گہرائی تک پہنچ نہ سکے۔ سرفراز ہوشیار اور ذہین انسان تھا۔ اس کی ہرگز خواہش نہیں تھی کہ دنیا کا کوئی شخص اس کے اصل کمپلیکس کی تہہ تک رسائی حاصل کر سکے۔ کیونکہ اس طرح اپنی سوچ کے مطابق اس کی شخصیت کی ہمیشہ کے لیے توڑ پھوڑ ہو جاتی۔ جھکے سر کے ساتھ اسے زندہ رہنا گوارا نہیں تھا۔

اس وقت تک وہ دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ نشرہ کی پیدائش کے بعد اس کی ذہنی حالت ایکا ایکی بگڑ گئی۔ اس کا نام اس نے خود تجویز کیا تھا اور جب سب نے کہا کہ بھلا یہ بھی کوئی نام ہے تو اس نے غم زدہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ اس لڑکی نے مجھے احساس دلایا ہے کہ میری زندگی کے افق پر شام چھا گئی ہے۔ نشرہ کو اپنے باپ سے بڑی محبت تھی۔ جب سرفراز اچانک لاپتہ ہو گیا تو سب سے زیادہ وہی روئی۔ دوسروں کو آہستہ آہستہ پھر بھی صبر آ گیا۔ لیکن نشرہ کی بے چینی اور اضطراب میں کوئی فرق نہیں آیا۔

جب وہ جوان ہوئی تو ایک دن اچانک اس نے اپنی ماں اور بہن سے کہا۔

''میں بے وقوف ہوں' جو بلاوجہ جذباتی طور پر ایک ایسے کے لیے آنسو بہاتی رہی جو میرا نہیں تھا۔ اب تک ڈیڈی! یقیناً مر چکے ہوں گے۔'' اس کی ماں چیخی۔

''چپ ہو جاؤ' نشرہ اپنی زبان سے اور کوئی لفظ مت نکالنا۔'' یہ کہہ کر وہ بے ہوش ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اسے ہوش میں لایا گیا۔

اس وقت وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اسے نشرہ پر شدید غصہ تھا کہ اس نے اس کے شوہر کو آناً فاناً مار ڈالا۔ اس کی واپسی کی راہیں دیکھتے دیکھتے وہ اپنی نصف بینائی گنوا بیٹھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ زندہ ہے اور ایک نہ ایک دن ضرور واپس لوٹ آئے گا۔

اس ناخوش گوار واقعہ کے بعد پھر کبھی نشرہ نے اپنے ڈیڈی کا ذکر نہیں کیا۔ اگر اس کی موجودگی میں کبھی دوسرے لوگ سرفراز بیگ کی باتیں چھیڑتے تو وہ لاتعلق سی بن کر بیٹھی رہتی' یا کوئی بہانہ بنا کر چلی جاتی۔

ان ہی دنوں بدنصیب فرخندہ خاتون پر یہ دہشت ناک انکشاف ہوا کہ نشرہ اپنے باپ کی طرح سوتے میں چلنے کی عادی ہو گئی ہے اور وہ دہل کر رہ گئی۔ اس کے علاوہ اسے احساس ہوا کہ نشرہ کی آنکھوں میں بعض اوقات ایسی پراسرار چمک نمودار ہو جاتی ہے جسے دیکھ کر خوف آتا ہے۔ کیونکہ سرفراز نفرت کی حالت میں بالکل اسی طرح اس کو دیکھتا تھا' اس کا سر گھوم گیا' اسے یوں لگا جیسے سرفراز' نشرہ کے اندر چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔ ابتدا میں وہ زبردستی اس کو ماہر نفسیات کے پاس لے گئی۔

لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات کے مترادف تھا۔ ماہر نفسیات نے سر توڑ کوشش کی اور آخر کار تھک تھکا کر اس نے کہا۔ ''میں حیران ہوں کے نشرہ کو کوئی غم نہیں ہے' اور نہ ہی مجھے اس کسی گیرہ کا سراغ ملا ہے۔ بہرحال بہتر یہ ہے کہ فوراً اس کی شادی کر دی جائے۔''

اس واقعہ کے بعد نشرہ کی ملاقات نظام سے ہوئی۔ ایک دن ان کے گھر دو اجنبی مہمان وارد ہوئے' سہیل اور اس کی چھوٹی بہن کنول' کنول بہت خوب صورت ہونے کے باوجود چلنے پھرنے سے معذور تھی۔ وہ گزشتہ کئی سال سے بیرون ملک مقیم تھے۔ سہیل کی نشرہ کے بھائی سے دوستی

ہوئی۔ دونوں ہم عمر تھے۔ اس لیے بہت جلد ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اب انہوں نے اپنے وطن واپس آ کر اپنے ملک ہی میں سیٹل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ نشرہ کے بھائی نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کچھ عرصہ تک ان کی امی کے بنگلہ پر ٹھہریں گے۔"

ابتدا میں نشرہ کو ان مہمانوں سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ رسمی طور پر تھوڑی دیر کے لیے ان کی خیر خیریت پوچھتی اور اس کے بعد غائب ہو جاتی۔ اس کی ماں کو اس کی یہ سرد مہری پسند نہیں آئی۔ ایک دن اس نے اس کو تنہائی میں ڈانٹا۔ "تمہارا یہ رویہ اچھا نہیں ہے۔ انہیں یہ احساس ہوگا کہ شاید وہ ہم پر بوجھ ہیں۔"

نشرہ خشک خاتون اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

سہیل اور کنول کی امی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کا باپ ایک تاجر تھا لیکن اس نے دوسری شادی کرنے کے بعد نہ صرف ان سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے تھے' بلکہ بیوی کی خوشنودی کی خاطر کئی سال پہلے انہیں اپنی جائیداد سے عاق کر چکا تھا۔ سہیل نے اپنی ذاتی جدوجہد سے تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد تگ و دو کر کے وہ بیرون ملک چلا گیا۔ کنول سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے ایک پل کے لیے بھی کبھی اسے بے سہارا یا تنہا نہیں رہنے دیا۔

کینیڈا میں کئی سال ملازمت کرنے کے بعد اس نے اتنا اثاثہ جمع کر لیا تھا کہ اب وہ چھوٹا موٹا اپنا کاوبار کر سکتا تھا۔ دونوں بہن' بھائی غیر شادی شدہ تھے۔ سہیل وجیہہ اور صحت مند مرد تھا۔ لیکن اسے شادی کے نام سے چڑ تھی۔ جبکہ کنول کے بارے میں وہ ہر وقت اسی فکر میں رہتا کہ اس کا کسی شریف انسان کے ساتھ بیاہ ہو جائے۔

کنول باقاعدہ طور پر تعلیم حاصل نہیں کر سکی تھی۔ سہیل اس کا بھائی نہیں استاد بھی تھا۔ اس کی مدد سے اس نے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں گھر بیٹھے اعلا مہارت حاصل کر لی تھی۔ اسے اپنے باپ کی بے رخی اور اپنی معذوری کا غم بہت ستاتا تھا۔ وہ گھنٹوں تنہائی میں زار و قطار روتی اور خدا سے اپنے لیے موت مانگتی۔ جونہی سہیل کو احساس ہوا کہ وہ خود رحمی میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اس نے نہایت مہارت سے ادب' فلسفہ اور آرٹ کی کتابوں میں متفرق کر دیا۔

کینیڈا میں قیام کے دوران وہاں کے انگریزی اخبارات و رسائل میں اکثر کنول کے مضامین شائع ہونے لگے تھے۔ یہ ایک ایسی انجانی مسرت تھی۔ جس نے اس کی معذوری اور محرومی کا غم بڑی حد تک کم کر دیا تھا۔

ایک دن سہ پہر لان کے ایک گوشے میں وہیل چیئر پر بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی کہ نشرہ کا ادھر سے گزر ہوا۔ وہ ٹھٹکی' اسی وقت کنول کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

"رات میں بھیا کافی دیر تک تمہارے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آج کل تم دونوں بالکل خالی الذہن ہو۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ کنول بے ساختہ ہنس دی۔ نشرہ پر اس کی ہنسی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ سپاٹ نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

کنول بولی۔ "بھیا نے ٹی وی اسکرین پر تمہیں دیکھ کر کہا کہ نشرہ ذہین ہونے کے باوجود اندر سے بے حد دکھی لڑکی ہے۔ اس پر میں الجھ گئی۔ میرا موقف تھا کہ نشرہ کو ساری آسودگیاں اور آسائشیں حاصل ہیں۔ اگر محض اس کے ڈیڈی اس کی زندگی سے نکل گئے یا بڑی بہن مر گئی اور یا اس کا بڑا بھائی کینیڈا میں مقیم ہے۔ تو یہ سب مل کر بھی غم کا وہ کوہ گراں نہیں بن سکتے جو حقیقی معنوں میں انسان کی توڑ پھوڑ کرتا ہے۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ نشرہ کو یہ لڑکی دلچسپ دلچسپ سی دکھائی دی اور وہ اس کے پاس آکر کہنے لگی۔ ''پھر تمہارے بھائی شرمندہ ہوئے۔''

وہ ہنسی اور اس کی ہنسی بڑی جان لیوا تھی۔ اس نے کہا۔ ''نہیں جی۔ پورے دو گھنٹے مجھے دکھوں اور اذیتوں کا فلسفہ سمجھاتے رہے۔ تمہیں انہوں نے گوتم بدھ کے ساتھ ملا دیا۔ میں بھی ان کا خوب خوب مذاق اڑاتی رہی۔ بھلا تم خود فیصلہ کرو کہاں بدھ، اور کہاں نشرہ۔'' اور پھر ہنسنے لگی، لیکن اس بار اس کی ہنسی میں نشرہ بھی شامل ہو چکی تھی۔ یہ ان دونوں کی بے تکلف دوستی کا غیر مشروط آغاز تھا۔

ایک رات ٹی وی پر اس کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ سہیل اور کنول کی خواہش پر وہ با دل نخواستہ ان کے ساتھ سیر کے لیے چلی گئی۔ ایک خاموش اور سنسان گوشے میں وہ پتھروں کے ڈھیر سے ہٹ کر رک گئے۔ کنول وہیل چیئر پر بیٹھی تھی۔ یہاں سمندر بہت ست تھا۔ سمندر کے خشک جھونکوں نے نہایت شرارتی انداز میں ان کا استقبال کیا۔

دفعتاً سہیل بولا۔ ''گوتم جب فروکن کے چکر میں گھوم رہا تھا تو اس کی ملاقات ایک مچھیرے سے ہوئی تھی۔ اس نے اس کو بتایا کہ موجیں بولتی ہیں اور......''

کنول نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''بھیا! گوتم ہر وقت آپ کے ذہن پر کیوں سمایا رہتا ہے۔''

سہیل نے کنکھیوں سے نشرہ کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ''اس لڑکی سے ملنے کے بعد صرف اور صرف گوتم ہی یادوں میں ابھرتا ہے۔''

نشوا اپنی دھن میں مگن تھی۔ یکا یک وہ چونکی اور اس نے سفاکانہ نظروں سے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ''گوتم بدھ اور مجھ میں بڑا فرق ہے۔''

''مثلاً......'' سہیل نے اپنا سگار سلگایا۔

نشرہ بولی۔ ''مثلاً یہ کہ وہ نیک روح تھا۔ جبکہ میں بد روح ہوں۔''

کنول زوردار قہقہہ لگا کر بڑبڑائی۔ ''واہ...... کیسی خوب صورت وضاحت پیش کی ہے نشرہ نے۔''

سہیل نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ توجیہ بالکل صحیح ہے۔'' نیکی اور بدی کا تعلق محض جسم سے ہے، روح سے نہیں۔''

نشرہ نے پہلی بار اس میں دلچسپی لیتے ہوئے تکرار کی۔ ''پڑھے لکھے لوگوں میں برائی یہ ہوتی ہے کہ وہ بچوں کی طرح لفظوں کو اپنے لیے کھلونا تصور کرتے ہیں، اور زندگی پھر ان کھلونوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔'' سہیل بولا۔ ''میں تم سے کسی حد تک متفق ہوں۔ جہاں تک میرے پہلے دعوے کا تعلق ہے تم برقی قوت کے بارے میں غور کرو، جو ہر گھر میں استعمال ہوتی ہے، برقی قوت سے ایک طرف چولہے گرم ہوتے ہیں اور دوسری طرف ایئر کنڈیشنڈ سے کمروں کو ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ اگر ہم روح کو نیک اور بد کہنے میں حق بجانب ہیں تو پھر ہمیں برقی قوت کو بھی گرم اور ٹھنڈے خانوں میں تقسیم کر لینا چاہیے، جبکہ یہ سراسر مضحکہ خیز ہے۔''

نشرہ نے غرا کر پوچھا۔ ''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔''

وہ تھوڑی دیر تک سمندر کی موجوں میں دیکھتا رہا۔ سگار کے کش لگاتا رہا، پھر کہنے لگا۔ ''برقی قوت کی مانند روح صرف ایک توانائی ہے، اس لیے تم اپنے آپ کو بد روح کہنے میں مبالغہ آرائی سے کام لے رہی ہو۔''

نشرہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پہلی بار کسی شخص نے اس کو منطقی طور پر لاجواب کر دیا تھا۔ کنول نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور بھانپ لیا کہ وہ سہیل کی گفتگو سے ناخوش ہے۔ اس نے جلدی سے اپنے بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے

کہا۔

"آپ بار بار نشرہ کو گوتم سے کیوں مشابہت دیتے ہو۔"

وہ بولا۔ "میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ نشرہ دوسری گوتم ہے‘ میرا موقف ہے کہ اسے نصف گوتم کہا جا سکتا ہے۔"

"نصف گوتم۔" نشرہ نے ناخوش گواری کے انداز میں دہرایا۔ سہیل کہہ رہا تھا۔ "مکمل گوتم تو بہت عظیم انسان تھا۔ ابتدا میں اس نے متعدد تنہائی کا دکھ‘ یہیں سے اس نے نروان کی تلاش میں جلا وطنی اختیار کی اور برسہا برس وہ جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ تب ایک موقع ایسا آیا جب اس نے اپنے دکھ کی وساطت سے دوسرے انسانوں کے دکھوں تک رسائی حاصل کی۔ اس طرح وہ مکمل ہو گیا‘ لیکن نشرہ ادھوری ہے۔"

کنول نے شریر لہجے میں نشرہ سے پوچھا۔ "کیا تمہیں کسی نے دکھ دیا ہے‘ میرا خیال ہے محبت کے سوا کوئی اور دکھ تمہارے در دل پر دستک نہیں دے سکتا۔"

اس نے نفرت سے ہونٹ سکڑتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے کسی سے محبت نہیں۔ البتہ لوگ مجھ سے دیوانہ وار عشق کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے‘ جیسے میں انسان نہیں سپنا ہوں‘ سب کا سپنا۔" یہ کہہ کر اس نے پراسرار طریقے سے ایک قہقہہ لگایا۔

سہیل نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور کافی دیر تک اسی طرح دیکھتا رہا۔

تین ہفتے بعد دونوں بہن‘ بھائی کرائے کے ایک کمرے میں منتقل ہو گئے۔ اس دوران نشرہ ان میں کافی دلچسپی لینے لگی تھی۔ کنول کی زندہ دلی نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ معذور اور مجبور ہونے کے باوجود جب قہقہہ لگاتی اور زندگی کے روشن پہلوؤں کو اپنی گفتگو میں پوری طرح اجاگر کرتی تو کبھی کبھی نشرہ کو یوں لگتا جیسے وہ کھلی فضاؤں کا ایک آزاد پنچھی ہے۔

ایک شام اچانک نشرہ پر اداسی کا دورہ پڑا۔ ایسے لمحات میں وہ اکثر پروفیسر کی طرف چلی جاتی تھی۔ اس دن بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کی ٹیکسی ابھی پروفیسر کے بنگلے سے تھوڑی دور تھی کہ یکلخت اس نے ایک ایسا منظر دیکھا جو اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ اس کی ماں اپنی گاڑی ڈرائیو کرتی ہوئی پروفیسر کے بنگلہ سے باہر آ رہی تھی۔ فرخندہ خاتون کی اپنی بیٹی پر نظر نہیں پڑی۔ نشرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مڑ مڑ کر اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ جو اب تقریباً اوجھل ہونے کے قریب تھی۔

پہلے اس نے سوچا کہ گھر جا کر ماں سے پوچھے کہ وہ کس لیے پروفیسر سے ملنے گئی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ماں کو اس کا پروفیسر سے ملنا جلنا پسند نہیں۔ ایک مرتبہ اس نے پروفیسر کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کرنا چاہا لیکن فرخندہ خاتون نے اسے نہایت سختی سے ڈانٹ دیا اور کہا۔

"اگر تمہیں بہت شوق ہے تو اپنے پروفیسر کو کسی ہوٹل میں لے جاؤ۔"

نشرہ نے ٹیکسی والے کو فارغ کیا اور بوجھل بوجھل قدموں سے ڈولتی ہوئی پروفیسر کے پاس آ گئی۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔ پھر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "بہت دنوں بعد یاد آیا کہ دنیا میں ایک ایسا شخص رہتا ہے جسے تم سے بہت محبت ہے۔"

وہ اپنی عادت کے خلاف بالکل نہیں مسکرائی۔

پروفیسر نے سوال کیا۔ "کیا تم پریشان ہو۔"

اس نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں‘ اور خونخوار انداز میں اس کو گھورتی ہوئی بولی۔

"فرخندہ خاتون آپ کے پاس کیا کرنے آئی تھیں۔"

"فرخندہ خاتون' یعنی تمہاری ماں۔"

پروفیسر گھبرا گیا۔

"ہاں...... آپ اسے میری ماں بھی کہہ سکتے ہیں۔" نشرہ کے تیکھے لہجے میں غضب کا طنز پوشیدہ تھا۔

پروفیسر کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ دفعتاً اس نے گمبھیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "اس کی خواہش تھی کہ تمہیں اس کی آمد کا علم نہ ہو لیکن بدقسمتی سے اس کی یہ تمنا بھی پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ نشرہ وہ بے حد پریشان ہے اور اس کی پریشانی کا سبب تم ہو۔ اس نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں کسی طرح تمہیں نظام سے شادی کرنے پر راضی کرلوں' کیونکہ گڈو کے مستقبل نے اس کو نروش کر دیا ہے۔ ویسے تم مجھے بتاؤ اس میں مضائقہ ہی کیا ہے۔ کبھی کبھی انسان کو دوسروں کے لیے چھوٹی موٹی قربانی دے دینی چاہیے۔ ایسا کرتے ہوئے اپنی آرزوؤں کا خون ضرور ہوتا ہے۔ لیکن انسان کی ذات میں بڑائی آ جاتی ہے۔"

"جیسے آپ کی ذات میں بڑائی آ گئی۔" وہ سفاکانہ انداز میں بڑبڑائی۔

"کیا مطلب۔" پروفیسر نے اپنی بھنویں اچکاتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔

نشرہ اپنے بالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگی۔ "میری ماں نے یہ بات ہمیشہ مجھ سے چھپائے رکھی کہ آپ اس کے لیے اجنبی نہیں' اور یہ کہ وہ میرے سامنے آپ کو جو برا بھلا کہتی تھی محض ایک ناٹک ہے' فرخندہ خاتون اگر اداکاری کا پیشہ اپنا لیتیں تو بلاشبہ وہ ایک کامیاب ترین اداکارہ ہوتیں۔"

مزاحیہ

پروفیسر غفار بابر

سر پھرا کوئی دریا یار تک آپہنچا ہے
سر ہتھیلی پہ لیے دار تک آپہنچا ہے

کل میری گرد کو پانا بھی جسے مشکل تھا
آج وہ بھی میرے معیار تک آپہنچا ہے

رند کا کشف کہ ساقی کی کرامت لکھوں
جام خود اپنے ہی میخوار تک آپہنچا ہے

راز بن کر جو کبھی "سینہ گیتی" میں رہا
حرف وہ بھی لب اظہار تک آپہنچا ہے

زاہد خشک! تیرے ہوئے لطف خدا
کس طرح مجھ سے گنہگار تک آپہنچا ہے

وہ ملاقات میں پہلا سا "تسلسل" نہ رہا
حرفِ اقرار بھی "انکار" تک آپہنچا ہے

جس کی خاطر ہے وہ بے نور کئی سالوں سے
نور وہ نرگس بیمار تک آپہنچا ہے

ہے کوئی رشک زلیخا جو خریدے بابر
مال خود اپنے خریدار تک آپہنچا ہے

''نشرہ۔'' پروفیسر گرجا۔ ''بند کرو اپنی بکواس اور نکل جاؤ میرے گھر سے تمہیں اپنی ماں کے بارے میں ایسی شرمناک گفتگو کرتے لحظہ بھر کے لیے بھی شرم نہیں آتی۔'' وہ غصے سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

نشرہ پر اس کے ردعمل کا کوئی خاص ردعمل نہیں ہوا وہ اطمینان سے اپنی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھے ہلاتی رہی۔ دفعتاً اس نے نرمی سے کہا۔ ''پروفیسر صاحب! غصے میں آنے کی ضرورت نہیں، میں ٹی وی اناؤنسر ضرور ہوں' لیکن اداکارہ نہیں۔ اس لیے میں آپ کو ترکی بہ ترکی تیز و تند ڈائیلاگ نہیں سنا سکتی۔ آپ غصے میں صرف اس لیے گرج رہے ہیں' کیونکہ میں نے ایسی عورت کے خلاف توہین آمیز جملے استعمال کیے جو میری ماں ہونے کے علاوہ جوانی کے دنوں میں آپ کی محبوبہ رہ چکی ہے۔''

اس کے آخری الفاظ پروفیسر پر ایٹم بم کی طرح گرے' وہ ہکا بکا بن کر دیوانوں کی طرح اسے گھور رہا تھا' نشرہ کہہ رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں کہ اس ولن نے جو میرا باپ کہلاتا ہے آپ دونوں کی محبت کو پامال کر دیا۔ میں اتنے سال تک آپ کے قریب رہی' لیکن میری ماں کی طرح آپ بھی سادہ لوح تصور کرتے رہے۔ حالانکہ میں اصل صورت حال سے واقف تھی اور کسی کو شبہ تک نہ ہوا کہ میں اپنے ذہن میں کیا کیا اسرار چھپائے ہوئے ہوں اور کس کرب میں مبتلا ہوں۔ ویسے بھی انسان سمندروں کی تہہ تک اتر سکتا ہے' ستاروں کی بھی خبر لے آتا ہے' لیکن قریب بیٹھے انسان تک رسائی حاصل کرنا اس کے لیے ناممکن ہے۔''

پروفیسر نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا اور ہکلاتا ہوا بولا۔ ''میں تمہارا استاد ہوں نشرہ' اس کے باوجود میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں' چلی جاؤ' فوراً چلی جاؤ' اور...... اور اس راز کو اپنے سینے سے کبھی باہر نہ آنے دینا۔''

نشرہ بے نیازی کے عالم میں اٹھی اور باہر کی طرف چل دی۔ معاً پروفیسر نے اسے آواز دی' نشرہ نے مڑ کر دیکھا۔ وہ کرسی کا سہارا لیے نہایت شکستہ حالت میں کھڑا تھا۔ اس کی اجاڑ آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ روتا روتا بولا۔ ''نشرہ اپنی ماں کے ساتھ وہ سلوک نہ کرنا جو تم نے میرے ساتھ کیا' وہ بہت دکھی عورت ہے اور میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اس کو سکون پہنچانے کے لیے تم نظام سے شادی کر لو۔''

نشرہ کچھ دیر تک اس کو تکتی رہی' پھر وہ سنگ دلانہ انداز میں قہقہہ لگا کر مڑی اور بنگلہ سے باہر نکل گئی۔

ایک ہفتے بعد وہ اور نظام اکٹھے ایک ریستوران میں بیٹھے تھے۔ نظام اس کی ہدایت کے مطابق گڈو کو اپنے ہمراہ نہیں لایا تھا۔ اس دن نشرہ سیاہ ساڑھی اور سیاہ بلاؤز میں بلا کی خوب صورت لگ رہی تھی۔ نظام مدہوش سا ہو گیا۔

نشرہ مسکرا مسکرا کر کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی' یکلخت وہ رومانی لہجے میں بولی۔ ''نظام کیا سچ مچ تم مجھ سے بہت عشق کرتے ہو۔''

نظام نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس وہ الفاظ نہیں نشرہ! جو میرے جذبہ کو اظہار کی قوت مہیا کر سکیں۔''

''محبتوں کے دریا اپنے بہاؤ کے لیے کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔ بس ایک تلاطم ہے جدھر مڑ گیا مڑ گیا۔'' وہ بولی۔

وہ خوش ہو کر اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا' نشرہ نے پوچھا۔ ''اگر میں تمہاری بن جاؤں تو تمہارا کیا ردعمل ہوگا۔''

''خوشی سے پاگل ہو جاؤں گا۔'' وہ پہلی

بار نشرہ کو اس مہربان لہجے میں گفتگو کرتے دیکھ کر اپنے آپ میں نہیں تھا۔

وہ مسکرائی اور اس کی طرف جھک کر بولی۔

"مجھے یہ کیونکر یقین آئے کہ تمہارا عشق میرے حسن کا مرہون منت نہیں ہے۔"

اس نے جذباتی لہجے میں سرگوشی کی۔

"نشرہ! میں اپنے دل کی گہرائیوں سے تمہیں چاہتا ہوں۔"

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ دفعتاً اس نے سر اٹھایا اور پراسرار چبھتی نظروں سے اس کو گھورتی ہوئی بڑبڑائی۔ "میری خاطر ایک آزمائش میں پورے اترو گے۔"

"ہاں...... بالکل......" وہ اس وقت بچہ بنا ہوا تھا۔

"تمہیں میری ایک معذور دوست کو سہارا دینا ہوگا۔"

"سہارا۔ کیا مطلب۔"

"کنول...... بے حد ذہین اور پیاری پیاری لڑکی ہے' قدرت نے اسے چلنے پھرنے سے معذور کردیا ہے' میری خواہش ہے کہ تم اس سے شادی کرلو۔"

"میں...... میں اس سے شادی کرلوں' کیا کہہ رہی ہو تم۔"

نشرہ نے طنز کی۔ "بس تمہارا عشق بھانپ بن کر اڑ گیا ہوا میں' تم بھی عام لوگوں کی طرح جھوٹے اور مکار ہو۔ جو اپنی ہوس پر عشق کا ٹائٹل لگا کر لڑکیوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی' نظام نے ہڑبڑا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ "پلیز مت جاؤ۔"

اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور غرائی۔

"تمہارے پاس اداکاری کے سوا اور کچھ نہیں' کیا کروں گی میں تمہارے پاس رک کر۔"

"نشرہ! خدا کے لیے مجھ پر اتنی بڑی تہمت نہ لگاؤ۔" اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ "میں سچ سچ تمہاری پرستش کرتا ہوں۔ مجھے تم سے حقیقی معنوں میں عشق ہے۔"

"عشق......" وہ قہر آلود لہجے میں بڑبڑائی۔ "تمہارے منہ سے یہ لفظ اچھا نہیں لگتا۔ اگر تم سچے دل سے مجھ سے محبت کرتے تو میری خواہش پوری کرنے میں کبھی قائل نہ کرتے۔"

نظام کا سر گھوم گیا' اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ دفعتاً اس نے اپنا لہجہ مضبوط کیا اور بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "اگر تمہارے عشق کا تقاضہ یہ ہے کہ میں اپنے ہاتھوں اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے آپ سے اجنبی بن جاؤں' تو مجھے منظور ہے۔" اس نے سسکی لی۔

نشرہ نے کہا۔ "اور وعدہ کرو کہ میری خاطر ہمیشہ کنول کو خوش رکھو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔

کنول اور نظام کی شادی ہوگئی۔ سہیل بہت خوش تھا۔ اس نے ممنونیت بھرے لہجے میں اس سے کہا۔ "تم نے میری زندگی کی ایک بڑی آرزو پوری کی ہے' میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ خوش رہو۔"

"میرے مقدر میں خوشیاں ضرورت سے زیادہ ہیں' اب مزید ان کی ضرورت نہیں۔" اس نے طنزیہ طور پر اپنے دل ہی دل میں کہا۔

فرخندہ خاتون کو نشرہ پر بہت غصہ آیا تھا۔ وہ کچھ عرصے سے تصورات میں اس کو نظام کی دلہن کی حیثیت سے دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی۔ جب حقیقتوں کی دنیا میں ایکا ایکی کنول نے اس کی جگہ لے لی تو وہ پھٹ پڑی۔ انہوں نے اسے جلی کٹی سناتے ہوئے کہا۔

"قصور میری قسمت کا ہے تمہارے ڈیڈی نے میرے دل پر گھاؤ لگانے کا کوئی موقع ہاتھ

سے جانے نہیں دیا' اب ان کی جگہ ان کی بیٹی نے لے لی ہے۔''

نشرہ کچھ دیر قہر آلود نظروں سے اس کو دیکھتی رہی' پھر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''کبھی آپ کو یہ خیال آیا کہ ڈیڈی کو آپ نے کون کون سے زخم تحفے میں دیے۔''

''نشرہ! اپنی زبان کو لگام دو' توبہ کیسا زمانہ آ گیا کہ بیٹی ڈھٹائی کے ساتھ اپنی ماں کو موردِ الزام ٹھہرا رہی ہے۔''

اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی ہنسی تیر گئی' وہ بولی۔ ''آپ میری ماں ضرور ہیں' لیکن مظلوم ہرگز نہیں۔''

''ہاں...... تم درست کہتی ہو۔'' فرخندہ خاتون فریاد کرنے والے انداز میں بڑبڑائی۔ ''مظلوم تمہارے ڈیڈی تھے۔ جبھی مجھے بے سہارا چھوڑ کر غائب ہو گئے۔''

نشرہ اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے سرد لہجے میں کہنے لگی۔ ''اس کی ذمہ داری بھی آپ ہی عائد ہوتی ہے۔''

''کیا مطلب۔''

''آپ نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ گھر چھوڑ کر غائب ہو جائیں۔''

فرخندہ خاتون پر ایک بجلی سی گری' اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ٹک اسے گھورے جا رہی تھی۔

نشرہ نے نفرت سے اپنی ناک سکڑتے ہوئے دوبارہ کہا۔ ''چند سال پہلے مجھے ان تمام دہشتناک واقعات کا علم ہو گیا تھا۔ جنہیں آپ سے بڑی کامیابی سے چھپایا اور میرا حوصلہ ہے کہ میں نے اپنے لب سی لیے' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نفرتوں کا مہیب سمندر میری آنکھوں میں سمٹ آیا۔ لوگ کہتے ہیں میری آنکھیں پراسرار ہیں۔ ان میں کوئی غیر مرئی قوت پنہاں ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ نفرتوں کا نادیدہ الاؤ کسی ہولناک اور پراسرار قوت کو جنم دیتا ہے' میں ٹوٹ پھوٹ گئی' ذات کی اس شکستگی نے مجھے بزدل بنا دیا اور میں نے اپنے آپ کو موت کے سپرد کرنے کے بجائے سوتے میں چلنا شروع کر دیا۔'' وہ جذباتی رو میں پٹاپٹ بولے جا رہی تھی۔

اس کی ماں پر سکتہ چھایا ہوا تھا' اسے یوں لگا جیسے اس کے سامنے۔ نشرہ نہیں' اس کا ڈیڈی بیٹھا ہو' وہ اس سے اسی انداز میں گفتگو کرنے کا عادی تھا۔

فرخندہ خاتون کے جسم میں جھرجھری آ گئی۔ اس نے بے اختیار پوچھا۔ ''نشرہ کیا تم ہوش میں ہو۔ تم نے اس سے پہلے کبھی مجھ سے ایسی باتیں نہیں کیں۔ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے مجھے بتاؤ' تمہارے دل میں کون سا زہر ہے' تم مجھ سے کس بات کا انتقام لے رہی ہو۔''

نشرہ نے اپنی پراسرار بڑی بڑی آنکھیں اس پر مرکوز کر دیں۔ ایک لحظہ کے لیے فرخندہ بیگم کا جی دہل گیا۔ یہ آنکھیں نشرہ کی نہیں بلکہ سرفراز کی تھیں۔ نشرہ گمبھیر لہجے میں یوں بڑبڑائی جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو۔ ''اگر آپ کو پروفیسر سے عشق تھا تو پھر آپ نے ڈیڈی سے شادی کیوں کی' اور اگر کرنی تھی تو کیا ضرورت تھی آپ کو اپنے شوہر کی امانت میں خیانت کرنے کی۔''

فرخندہ خاتون چلائیں۔ ''نشرہ...... منہ بند کر لو' کہیں ایسا نہ ہو خدائی قہر جوش میں آ جائے اور تمہارے ساتھ دوسروں کو بھی بہا کر لے جائے۔''

نشرہ پر ایکا ایکی ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی' اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ منہ سے جھاگ بہنے لگا تھا اور مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر دورہ پڑا ہے۔ وہ گونج دار آواز میں چیخی۔ ''میرا کیا قصور تھا' بدبخت عورت! اگر تمہیں ڈیڈی سے نفرت تھی تو اس سے طلاق لے

کر پروفیسر سے شادی کرلیتیں۔ ڈیڈی کی نظروں میں دھول جھونک کرتم نے اور پروفیسر نے مجھے اپنے گناہوں کی بولتی نشانی کیوں بنایا' اگر مجھ منحوس نے جنم لے ہی لیا تھا تو تمہیں ڈیڈی کے سامنے گناہ کا اعتراف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔تم نے انہیں اس لیے یہ ذہنی صدمہ پہنچایا تا کہ وہ ندامت و پشیمانی سے گھر چھوڑ کر چلے جائیں اورتم اپنے محبوب کے ساتھ قانون اور اخلاق کی نظروں میں دھول جھونک کر عیش کرو۔ مجھے چار سال پہلے سب کچھ معلوم ہوگیا تھا لیکن میں بزدل تھی' نہ تم سے کچھ کہہ سکی' نہ اپنا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ سکی' کاش میں پیدا نہ ہوتی۔

وہ اپنی شعلہ بار آنکھوں پر ہاتھ رکھے زاروقطار رونے لگی' اسے اس کا بھی احساس نہیں تھا کہ فرخندہ خاتون بے ہوش زمین پر گری پڑی ہیں۔

تین دن کے بعد فرخندہ خاتون کا اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر انہیں ہوش میں نہیں لاسکے تھے۔اسی دن نشرہ کو بھی اسپتال میں داخل کرایا جاچکا تھا۔ اس کی ذہنی حالت نہایت ابتر تھی' وہ بہکی بہکی باتیں کرتی اور اچانک اپنے قریب جو بھی موجود ہوتا اس کو کاٹنے کے لیے لپکتی۔ اس حالت میں اس کی آنکھوں کی چمک اور پراسراریت میں غضب کا اضافہ ہوگیا تھا۔ سہیل نے ہمہ وقت اپنے آپ کو اس کی تیمار داری کے لیے وقف کرلیا۔ اسے فرخندہ خاتون کی ناگہانی موت کے علاوہ نشرہ کی بگڑی ہوئی طاقت دیکھ کر گہرا صدمہ ہوا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اس کے لیے اذیت ناک بات یہ تھی کہ وہ ماں بیٹی کے درمیان ہونے والی گفتگو کا آخری حصہ اتفاق سے سن چکا تھا۔ وہ اس وقت نشرہ سے ملنے کے لیے ان کے بنگلے پر آیا تھا اور دونوں ماں' بیٹی اس حقیقت سے ناواقف تھیں کہ وہ ملحقہ کمرے میں بیٹھا ہے۔

غزل

ناصؔر زیدی

ذہن میں اپنے بساتا' دل کے اندر دیکھتا
میں تصور میں تیری تصویر اکثر دیکھتا

اور تو کچھ بھی نہیں بس ایک خواہش ہے مری
سامنے تجھ کو بٹھاتا' زندگی بھر دیکھتا

جانتا تھا' لوٹ کر وہ پھر نہ آئے گا کبھی
میں کوئی پاگل تھا جو اس سمت مڑ کر دیکھتا

یہ بھی اچھا تھا کہ ان آنکھوں میں بینائی نہ تھی
کس طرح اُس سے بچھڑ جانے کا منظر دیکھتا

تھا جفاؤں میں بھی اس کی' ایک طرزِ التفات
موم ہوجاتا تھا میں جب آنکھ بھر کر دیکھتا

اُس کو ہی اِدراک ہوجاتا کہ کیا ہے اشکِ غم
قہقہوں میں جو چھپا تھا وہ سمندر دیکھتا

زندگی دیتی اگر فرصت تو ناصؔر ایک دن
جس قدر دیکھا ہے اس کو اس سے بڑھ کر دیکھتا

☆☆

سہیل کے سوا کسی دوسرے کو اصل واقعہ کی خبر نہیں تھی۔ اس لیے سب نے اپنے اپنے طور پر یہ قیاس کیا کہ ماں سے بچھڑنے کے سبب نشرہ کی ذہنی حالت بگڑی ہے۔ ٹیلی ویژن کے لاکھوں ناظرین جو نشرہ کی دل نواز مسکراہٹ اور آنکھوں کی پراسرار چمک روزانہ دیکھنے کے عادی تھے۔ اس کی اچانک غیر حاضری پر تلملا گئے۔ بعض لوگ اداس تھے۔ جبکہ دوسرے نشرہ کی جگہ اسکرین پر آنے والی اناؤنسر کے خلاف طنزیہ جملے چست کر رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے۔

نشرہ کا بڑا بھائی بھی اپنے گھر آ چکا تھا۔ اس کے لیے اپنی ماں کی موت اور چھوٹی بہن کی ذہنی حالت بگڑنے کا صدمہ ناقابل برداشت تھا لیکن کیا کرتا، نشرہ کسی کو نہیں پہچانتی تھی۔ جونہی اس کے بھائی کو اطمینان ہوا کہ اس کا دوست سہیل بڑے خلوص کے ساتھ اس کی بہن کا خیال رکھ رہا ہے وہ چند ہفتوں بعد اپنی بیوی اور بچوں کے پاس واپس چلا گیا۔

اب نشرہ اکیلی تھی لیکن اسے اپنے اکیلے پن کا قطعی احساس نہ تھا۔ سہیل کی کوشش تھی کہ ہر وقت اس کے پاس موجود رہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس کے لیے نامونوس کوا جنبی اجنبی سا تھا۔ جب بھی وہ چند لمحوں کے لیے اچھی ہوتی تو گم صم سے انداز میں بڑبڑاتی۔ ''امی...... امی...... کہاں ہیں، اور تم کون ہو۔''

تقریباً سات مہینے کے بعد نشرہ قدرے نارمل ہوئی۔ وہ سہیل کو پہچاننے لگی تھی۔ ایک دن نظام اور کنول اس سے ملنے آئے۔ گڈو ان کے ساتھ تھا۔ گڈو کو دیکھتے ہی نشرہ نے اس کو پکارا اور اگلے لمحے وہ گڈو کو اپنے ساتھ لپٹا کر والہانہ طور پر پیار کر رہی تھی، سہیل...... نظام اور کنول نے باری باری ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر سکون اور طمانیت کے آثار تھے۔

ایک رات، سہیل اس کو سمندر کے کنارے لے گیا۔ نشرہ غیر معمولی طور پر اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ دفعتاً اس نے نشرہ کو مخاطب کر کے کہا۔ ''نشرہ! تمہیں ٹیلی ویژن اسکرین سے غائب ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ تمہارے مداحین کیا سوچتے ہوں گے۔''

اس نے ایک ادا سے جواب دیا۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے، مجھ جیسی بے شمار اناؤنسر لڑکیاں ہیں ٹیلی ویژن کے ناظرین ان میں دلچسپی لے رہے ہوں گے۔''

''لیکن تمہاری انفرادیت مخصوص نوعیت کی ہے۔'' سہیل نے اصرار کیا۔

''کیا واقعی۔'' اس نے قہر آلود نظروں سے اس کو گھورا۔ سہیل گڑبڑا گیا۔ وہ اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے نرمی سے بولا۔ ''نشرہ مجھے لگتا ہے کہ میں اور تم دو کنارے ہیں اور ہمارے درمیان ایک وسیع و عریض متلاطم سمندر حائل ہے۔''

غیر متوقع طور پر نشرہ ہنس دی۔ پھر طنزیہ لہجہ میں کہنے لگی۔ ''کیا تمہیں بھی مجھ سے عشق ہو گیا ہے۔''

''نہیں۔'' اس نے اپنا بجھا سگار پانی میں پھینک دیا۔

نشرہ نے عجیب انداز میں اسے دیکھا اور بولی۔ ''تم پہلے مرد ہو جس نے میرے سامنے نہیں کہنے کی جسارت کی ہے۔''

سہیل کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس نے آہستہ سے کہنا شروع کیا۔ ''یہ زندگی یکسر بے رنگ ہے۔ ہم انسان اپنی اپنی ضرورتوں کے تحت مخصوص رنگ تخلیق کرتے ہیں اور پھر بضد ہوتے ہیں کہ دوسرے ہمارے مخصوص رنگ کو حرف آخر سمجھ لیں۔ محبت، نفرت، رقابت، جرائم جنگیں، سب اسی یکطرفہ سوچ کا نتیجہ ہیں۔ لوگوں کو یہ یاد نہیں رہتا کہ یہ وسیع و عریض کائنات دوطرفہ

نظام پر قائم ہے' جو شے اس اصول سے منحرف
ہوتی ہے۔ اس کا وجود ٹوٹ پھوٹ کی زد میں
آجاتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں دوطرفہ کائناتی
اصول سے روگردانی کر رہی ہوں۔'' نشرہ نے
اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے تلخی سے سوال کیا۔

''ہاں...... جب ہم اپنے آپ کو کسی وجہ
سے الگ تھلک کر کے خول میں بند کر لیتے ہیں' تو
پھر ہمیں اپنے سوا کسی کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ تم
ایک پڑھی لکھی جرات مند لڑکی ہو' مجھے اس بات
پر شدید حیرت ہے کہ تم اپنے آپ سے سہمی سہمی
سی کیوں رہتی ہو۔''

وہ تھوڑی دیر تک سفاکانہ نظروں سے اس
کو گھورتی رہی۔ پھر آہستگی سے بڑبڑائی۔

''میرے ذہن میں بہت کچھ ہے' لیکن میں کسی
سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

سہیل نے متانت سے جواب دیا۔

''انسان کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس
کائنات میں سب سے اہم تصور کر لیتا ہے۔ یہیں
سے فتنہ کا آغاز ہوتا ہے لیکن ممکن ہے تمہارے
ذہن میں جو کچھ پوشیدہ ہے وہ اہمیت سے یکسر
عاری ہو لیکن اس کا فیصلہ کوئی دوسرا کر سکتا ہے۔ تم
نہیں' کیونکہ تم خود ایک فریق ہو۔''

نشرہ نے ایک سسکی لی۔ وہ کچھ دیر خاموش
رہی اور پھر سمندر کی بے چین موجوں کی طرف
دیکھتے ہوئے یکا یک ناگہانی طور پر اس نے سہیل
کو اپنی روداد سنانی شروع کر دی' اس نے کہا۔

''سہیل' میں اپنے آپ سے تنگ آچکی ہوں'
تقدیر نے کئی سال پہلے مجھے جس عذاب میں مبتلا
کر دیا تھا اسے مزید برداشت کرنا میرے بس میں
نہیں' تم دیکھ لینا میں چند دنوں یا ہفتوں کی مہمان
ہوں۔ صرف موت مجھے آسودگی دے سکتی ہے
پہلے میرا غم ایک تھا۔ یعنی اپنی نظر میں اپنی اناؤں
کی پامالی کا غم اور اب میں دہرے غم میں مبتلا
ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میں نے اپنی کچلی ہوئی
انا کا انتقام لینے کے لیے اپنی ماں کو قتل کر دیا۔ وہ
قدرتی موت نہیں مری' میں نے اسے قتل کیا ہے'
جانے کسی جذبہ کے تحت میں نے وقتی اشتعال میں
آکر اسے اپنا اصل سیاہ چہرہ دکھا دیا۔

سہیل! لوگ مجھ سے پیار کرتے ہیں' مجھ
میں اپنے سپنے تلاش کرتے ہیں لیکن وہ نہیں
جانتے کہ میں مجسم سیاہی ہوں۔ پہلے میں بھی اس
تلخ حقیقت سے بے خبر تھی لیکن چند سال پہلے
اچانک مجھے ایک خط ملا! یہ خط میرے ڈیڈی نے
لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے یہ ہولناک
انکشاف کیا کہ میں ان کی جائز بیٹی نہیں ہوں اور
میرا حقیقی باپ پروفیسر ہے۔ میری ماں کالج کے
زمانے میں اس سے عشق کرتی تھی لیکن گھر والوں
کے حکم پر اسے میرے ڈیڈی سے شادی کرنا
پڑی۔ میری بڑی بہن اور بڑے بھائی کی
پیدائش تک وہ ٹھیک ٹھاک رہی' پھر اسے معلوم
ہوا کہ پروفیسر بھی اسی شہر میں آگیا ہے۔ اس
دن سے اس کے تیور بدل گئے اور اس کے طرز
عمل میں سردمہری اور رکھائی آگئی۔ اب وہ
دونوں میاں' بیوی ہوتے ہوئے بھی میاں' بیوی
نہیں تھے۔ ایک دن اچانک امی نے ڈیڈی کو
بتایا کہ وہ ان سے اپنی محبت کا انتقام لینے کے لیے
پروفیسر کے گناہ کی ایک نشانی کو پروان چڑھا
رہی ہے۔ ڈیڈی حواس باختہ ہو گئے۔ انہوں نے
پہلے اسے اور پروفیسر کو قتل کرنے کے بارے میں
سوچا لیکن پھر یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ انہوں نے
لکھا کہ میں دس سال تک اپنے آپ سے جنگ
کرتا رہا ہوں۔ اس دوران وہ صرف دنیا والوں
کے لیے رسمی میاں' بیوی تھے۔ پھر انہوں نے
سب کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔''

نشرہ زار و قطار رونے لگی تھی۔ سہیل اس
کے منہ سے یہ دہشتناک انکشاف سن کر سناٹے
میں آگیا۔ اس نے سوچا کہ وہ نشرہ کو ایک لمبا

چوڑا فلسفیانہ لیکچر دے، لیکن اس کا اپنا ذہن اس کے بس میں نہیں تھا۔

نشرہ دوبارہ بولی۔ ”ڈیڈی کے اس ظالمانہ خط کو پڑھ کر میرے ذہن کی جو حالت ہوئی اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں نے رونا چاہا، لیکن میری آنکھیں اجاڑ قبرستان کی طرح ویران تھیں۔ ایک مرحلے پر میں نے تلخ حقیقتوں سے سمجھوتہ کرتے ہوئے طے کیا کہ مجھے پروفیسر کو اپنا حقیقی باپ تصور کرکے اس کے بالکل قریب ہوجانا چاہیے۔ شاید اس طرح میری کچلی ہوئی انا میں تھوڑی سی تقویت عود کر آئے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے باوجود میں اپنے رستے ہوئے زخموں سے ایک پل کے لیے بھی نجات نہ پا سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے رویوں میں سراسر نفرت عود کر آئی۔ لیکن میرے ذہن میں ہلچل برپا کردینے والے طوفان سے سبھی بے خبر رہے۔ لوگوں کے نزدیک میں ایک ایسی خوب صورت اور آسودہ حال لڑکی تھی جس کا کبھی کسی غم کی پرچھائیں سے تعارف نہیں ہوا تھا۔ میری یہ دو آنکھیں ان کے لیے البتہ پراسرار بن گئیں تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ مجھ میں ہپناٹزم کی قوت آگئی، کسی کا دعوا تھا کہ میں نے ٹیلی پیتھی پر عبور حاصل کرلیا ہے۔

حالانکہ میری آنکھوں میں میری کچلی ہوئی انا کی سڑاند کے سوا کچھ بھی نہیں، تم درست کہتے ہو کہ زندگی کا اپنا کوئی رنگ نہیں، ہم خود اپنی ضرورتوں کے مطابق اس کا ایک مخصوص رنگ فرض کرلیتے ہی اور ہماری ضد یہ ہوتی ہے کہ اس تصور کو اٹل حقیقت مان لیا جائے۔“ سہیل کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”تم نے جس دلیری سے مجھے اپنے دل کے گھاؤ دکھائے ہیں اس کے لیے میں تمہیں سلام کرتا ہوں۔ میرا ایک مشورہ ہے۔“

”کیسا مشورہ۔“ اس نے بے دلی سے پوچھا۔

”کیوں نہ ہم پروفیسر سے اس موضوع پر گفتگو کریں۔“

”اس سے کیا فائدہ ہوگا۔“

”وہ اس کہانی کا ایک اہم کردار ہے، اس کی تائید حقائق کو باضابطہ شکل دے دے گی۔“

”سہیل! میری ماں کی طرح وہ بھی ایک مجرم ہے۔ جرائم پیشہ افراد کا سچائیوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔“

”اس کے جھوٹ سے جب تم اپنے سچ کا تقابل کروگی تو تمہاری انا کو بڑی تقویت ملے گی اور یہ ہی تمہارے زخموں کا مرہم ہے۔“

دوسرے دن سہیل اس کو اپنے ساتھ پروفیسر کے ساتھ لے گیا۔ کچھ دیر تک وہ اس سے رسمی سی گفتگو کرتا رہا۔ پھر اس نے اچانک اس کے سامنے سرفراز کا کئی سال پرانا خط رکھ دیا جو نشرہ نے اب تک سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

پروفیسر کا رنگ یکسر سفید ہوگیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر بجلی گری ہو۔ نشرہ بالکل چپ چاپ محویت کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ پانی کا ایک گلاس پینے کے بعد پروفیسر نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آتا۔ یہ درست ہے کہ میں اور فرخندہ خاتون طالب علمی کے زمانے میں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ لیکن فرخندہ خاتون کو اس سے نفرت تھی۔ پھر خدا کا کرنا یوں ہوا کہ وہ دونوں میاں، بیوی بن گئے۔ اس کے بعد میرا تعلق فرخندہ خاتون سے یکسر ٹوٹ گیا۔ محبت محض ملن کا نام نہیں، میں نے بخوشی دوریوں کو اپنا لیا۔ اس طرح مجھے طمانیت کی نئی روشنی مل گئی۔

برسہا برس بعد ایک دن فرخندہ خاتون مجھ سے ملنے آئی۔ اس کی حالت بے حد خستہ تھی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ سرفراز بیگ اس کو چھوڑ کر ایک عرصہ سے غائب ہے اور جانے سے پہلے اس نے ایک خط میں اس کو لکھا

کہ کیونکہ وہ اس کے ذہن سے میرا نام کھرچنے میں ناکام رہا ہے اور برسوں کی ازدواجی زندگی کے دوران وہ اذیت کے سبب ہر ہر پل یہ سوچ کر جلتا رہا کہ تقدیر نے اسے فرخندہ کا محبوب بنانے کے بجائے وِلن بنا دیا۔ اس لیے وہ اس آس پر چھوڑ کر جا رہا ہے کہ شاید ایک دن اس کی ضرورت اس کو اس سے واقعتاً محبت کرنے پر مجبور کر دے۔

فرخندہ خاتون نے یہ دردناک قصہ سنا کر مجھ سے درخواست کی کہ میں اپنے طور پر سرفراز کو تلاش کر کے اسے کسی طرح سے یقین دلاؤں کہ اس کے توہمات بے بنیاد ہیں اور فرخندہ خاتون واقعتاً ایک وفادار بیوی ہونے کے ناتے اس سے محبت کرتی ہے۔ فرخندہ خاتون کا المیہ یہ تھا کہ وہ یہ سب باتیں کسی سے کہہ سن نہیں سکتی تھی۔''

پروفیسر نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔ سہیل اور نشرہ بے سدھ اس کو تک رہے تھے۔ ''اس کے بعد فرخندہ خاتون سے میری صرف ایک ملاقات اور ہوئی۔ نشرہ نے نظام سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ بے حد پریشان تھی۔ اس کا خیال تھا کہ نشرہ میری بات پر خصوصی توجہ دیتی ہے۔ اس لیے مجھے اسے قائل کرنا چاہیے۔''

سہیل نے سوال کیا۔ ''آپ نے سرفراز بیگ صاحب کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔''

پروفیسر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''چند برس پہلے مجھے اس کا سراغ ملا۔ وہ افریقہ کے ایک ملک میں مقیم تھا۔ میں نے اسے ایک تفصیلی خط لکھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ مجھے جواب دے گا لیکن ایک دن اس کا خط آیا۔ میں نے کئی بار چاہا کہ فرخندہ کو اس کے بارے میں بتاؤں۔ پھر میں نے یہ سوچتے ہوئے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا کہ وہ بلاوجہ پریشان ہوگی۔ اس غریب کا دل پہلے ہی ٹوٹا ہوا تھا۔''

غزل

طارق حسن طارقؔ

جو شاعری میں بہت کامیاب ہے پیارے
اُسی کا اِن دنوں خانہ خراب ہے پیارے

وہی زمانے میں عزت مآب ہے پیارے
کہ مال جس کے یہاں بے حساب ہے پیارے

جو تم بنے ہوئے رشکِ شباب ہو پیارے
مجھے خبر ہے کہاں کا خضاب ہے پیارے

یہ اور بات کہ کانٹوں سے ہاتھ ہے زخمی
یہ کم نہیں مرے گھر میں گلاب ہے پیارے

ہمارے سارے اثاثے کی ٹوہ میں ہو تم
ہماری جب سے طبیعت خراب ہے پیارے!

میں اس کے گھر جو چلا جاتا ہوں تو کیا ناصح
تلاشِ رزق تو کارِ ثواب ہے پیارے!

ہے ڈر مجھے ترے والد نہ مسترد کر دیں
میں ایک چراغ ہوں تُو آفتاب ہے پیارے

سبب بتادوں میں دنیا کی بے حجابی کا
تمہارا حُسن ، تمہارا شباب ہے پیارے

خدا کے واسطے طارقؔ نہ اس سے تنہا مل
لگے گا عیب ، زمانہ خراب ہے پیارے

☆☆

پروفیسر ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ چند ثانیے کے بعد وہ اٹھا اور بیماروں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ سہیل اور نشرہ حیران و پریشان اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ دفعتاً پروفیسر نے آ کر ایک خط ان کی طرف بڑھا دیا اور بولا۔ ''اسے پڑھو۔''

نشرہ بے چینی سے خط کی عبارت پر نظر ڈالتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''یہ تحریر واقعی ڈیڈی کی ہے۔''

دونوں نے ایک ساتھ ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ سرفراز نے پروفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ''میں نے تم پر لعنت بھیجتا ہوں اور دست بددعا ہو کہ تم مر جاؤ۔ ذلیل شخص کیا تم زندگی بھر بھوت کی طرح میرا پیچھا کرتے رہو گے۔ تم ہمزاد بن کر فرخندہ کے اندر حلول ہو چکے ہو اور اس سے شادی کرنے کے بعد مجھے پہلی بار پچھتاوا ہوا کہ میں نے اس سے شادی کر کے اسے اپنی بیوی بنا کر بدترین اور سنگین غلطی کی ہے۔ میں نے اس کو تم سے زیادہ ٹوٹ کر چاہا۔ مگر تم ہمیشہ ہم دونوں کے درمیان غائبانہ طور پر حائل رہے۔ وہ میرے تین بچوں کی ماں بن گئی۔ اس کے باوجود میں رقیب کا رقیب رہا اور یہ ہی میرا روگ ہے۔ جس کے سبب مجھے ہمیشہ کی جلاوطنی اختیار کرنا پڑی۔

میں نے سوچا تھا کہ فرخندہ مختلف اذیتوں سے دوچار ہو کر ایک دن میری اہمیت کو تسلیم کرے گی اور یہ ہی اہمیت اس کو تم سے کاٹ کر صرف اور صرف میرے نزدیک لے آئے گی۔ تمہارا خط مجھے اچانک ملا اور میں ہڑبڑا کر رہ گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ تم نے میری غیر موجودگی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اب مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں نے فرخندہ کو تنہا چھوڑ کر شدید غلطی کی۔ یقیناً تم دونوں آپس میں ملتے ہو گے۔ میں تصورات میں تمہیں خوش و خرم دیکھ کر پاگل ہو چکا ہوں لیکن یاد رکھو میں فرخندہ کو کسی قیمت پر معاف نہیں کروں گا۔ میں نے قدرت کے اس فیصلے کو قبول کر لیا ہے کہ میں واقعی رقیب ہوں۔ رقیب فرخندہ خاتون اب میرا اصل روپ دیکھے گی' میں اپنی پیاری پیاری بیٹی نشرہ کے ہاتھوں اسے ایسا گھاؤ لگاؤں گا کہ وہ اس سمیت تم سے شدید نفرت کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ کمینے' ذلیل انسان کان کھول کر سن لو کہ آج سے میں واقعی ولن ہوں۔ میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ فرخندہ خاتون نشرہ کے پیار کے لیے اسی طرح ترسے کہ جیسے میں اس کے پیار کے لیے ترسا ہوں۔''

تحریر ختم کرتے ہی بے اختیار نشرہ کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی اور وہ ہائے امی میں نے تم پر کیسا ظلم کیا' کہہ کر بے ہوش ہو گئی۔

قبرستان کے ایک کونے میں کچھ فاصلے پر دو قبریں ہیں' ہر شام ایک نوجوان مرد اور عورت ان پر پھول چڑھانے اور فاتحہ پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ ایک قبر پر فرخندہ خاتون اور دوسرے پر ملک کے ممتاز اسکالر پروفیسر شمس الدین کی جو نشرہ کو اس کے ڈیڈی کا خط دکھانے کے بعد حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گیا تھا۔

نشرہ جب بھی ان قبروں پر آتی ہے' اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلتے ہیں' سہیل ہمیشہ اس کو تسلیاں دیتا ہے۔ پر اس کی سسکیاں ختم نہیں ہوتیں۔ کنول' نظام اور نشرہ کے بڑے بھائی کی شدید خواہش ہے کہ وہ سہیل سے شادی کر لے' لیکن نشرہ اس کے لیے تیار نہیں۔ اس نے سہیل سے اقرار کیا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور اس کے سوا کسی سے شادی نہیں کرے گی' مگر وہ ابھی تک طے نہیں کر سکی کہ سہیل کی جھولی میں خوشیاں کب ڈالے گی۔

نقشِ دوام

ایم اے راحت

مجبوراً اس نے ہانگ کانگ جانے کی تیاری کرنی پڑی۔ سیٹھ سکندر علی نے بذات خود اسے بریف کیا اور پھر وہ ہانگ جانے کے لیے تیار ہوگیا جہاز کا سفر اس کے لیے بڑا دلچسپ تھا اسی طرح ہانگ کانگ جہاں اسے ایک ہوٹل میں ٹھہرنا تھا' ہوٹل کی رات ایک مقامی شخص نے اس سے ملاقات کی جو صاف اردو بولتا تھا اپنی شناخت کرانے کے بعد اس نے وہ سوٹ کیس شہریار سے لے لیا جو وہ ساتھ لایا تھا پھر دوسرے دن ایک لڑکی نے اس سے ملاقات کرکے ایک نایاب ماڈل اس کے حوالے کیا اور مسکراہٹ کی بجلیاں گراتی ہوئی چلی گئی۔

ایک معاشرتی کہانی' عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے

صاف ستھرا محلہ تھا پڑھے لکھے لوگ آباد تھا پرامن اور مہذب ایک دوسرے سے رابطہ رکھنے والے‘ اس دن بارش ہورہی تھی۔ صمد یار صاحب نے بیگم سے بارش کے پکوڑے کی فرمائش کی تھی چنانچہ اس وقت باورچی خانے میں چھن چھن کی موسیقی جھنکاریں آرہی تھی اور گول گول پوریاں تیل کی کڑاہی میں رقص کررہی تھیں۔

''یار یہ کڑاہی سے باہر کب آئیں گی۔'' شیر یار نے ندیدوں کی طرح پوریوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

''کیوں قبلہ والد صاحب۔'' شہریار بولا۔

''کیونکہ میں تمہارا باپ ہوں۔''

''آہ کاش۔ ہم بھی کسی کے باپ ہوتے۔'' شہریار حسرت سے بولا۔

''صاحبزادے......'' صمد یار کے جملہ پورا ہونے سے پہلے دروازے کی گھنٹی تیز آواز میں بجی اور سب چونک پڑے۔

''یہ کون آگیا۔ بارش میں۔''

''جاؤ دیکھو۔'' صمد یار بیٹے سے بہت بے تکلف تھے۔

''میں۔'' شہریار چنچناتے ہوئے بولا۔

''اور کیا میں۔ باپ تم ہو کہ میں۔'' صمد یار نے کہا اس دوران گھنٹی دوبارہ بجی تھی۔ شہریار منہ بسورتا ہوا اٹھ گیا۔ ''مالک دوجہاں‘ مجھے بھی جلدی سے ایک بیٹے کا باپ بنادے‘ گن گن بدلے لوں گا سسرے سے۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا اور اس کی چھوٹی بہن عشنا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

وہ بڑبڑاتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ بارش خوب تیز تھی وہ دروازے تک جاتے جاتے بھیگ گیا اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔

دروازہ کیا کھلا جیسے کائنات چمک اٹھی۔ اتنی حسین لڑکی تھی کہ انسان سب کچھ بھول جائے گلابی لباس میں مہکتا گلاب سر پر پلاسٹک اوڑھے ہوئے دودھ جیسے چہرے پر بھیگے بالوں کی تیئں چپکی ہوئی۔

''سوری سر۔ ہم آج ہی آپ کے برابر والے گھر میں شفٹ ہوئے ہیں۔ آپ کو تکلیف دینے کی معذرت اگر ماچس دیدیں تو شکریہ۔''

وہ بول رہی تھی اور شہریار اس کی آواز کی نغمگی میں کھویا ہوا تھا۔

''آپ اندر آجایئے بری طرح بھیگ رہی ہیں۔''

''پلیز آپ ماچس دے دیجیے۔''

''یہ لائٹر رکھ لیجیے۔'' اس نے جیب سے لائٹر نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ لائٹر لیے ہوئے اس کی انگلیاں شہریار کے ہاتھ سے چھو گئیں اسے زور کا کرنٹ لگا تھا۔

''شکریہ پلیز۔''

زور آسمان پر بجلی چمکی بادلوں کا کڑاکا ہوا اور لڑکی غائب ہوگئی۔

''بھائی جان۔ کون ہے۔'' اندر سے ریشم کی آواز سنائی دی جو اس کی بہن تھی۔

شہریار دروازہ بند کر کے پلٹا تو اس کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی بارش میں بھیگی لڑکی اس کے حواس پر بجلی بن کر گری تھی۔

''کون تھا شیری۔'' امی نے پوچھا۔

''ارے کیا دیکھ آئے بھائی جان۔ بولتی بند ہوگئی ہے۔''

''وہ لڑکی۔ ماچس مانگنے آئی تھی۔''

''کون۔''

''برابر والے گھر میں نئے کرائے دار آئے ہیں۔''

''ہاں۔ تو پھر۔''

''وہیں سے لڑکی آئی تھی۔ ماچس مانگ رہی تھی۔''

''ہاں۔ آج ہی ان کا سامان آیا ہے چلو

سمسی صاحب کا یہ ویران گھر آباد تو ہوا ورنہ وہاں بس بھوت ہی آنے والے تھے۔''
''خدا کرے اچھے لوگ ہوں۔'' امی نے کہا۔
بارش کی یہ رات نقش دور بن گئی ایسا نقش جو کبھی نہیں مٹتا۔
بعد میں عالیہ کے بارے میں سب کچھ پتہ چل گیا وہ چار بہنیں تھیں اور ایک بھائی جو سب سے چھوٹا تھا اس کے والد ایک سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک تھے عالیہ گھر کی سب سے لاڈلی سب سے خوبصورت اور سب سے ذہین تھی گریجویشن کر رہی تھی جبکہ شہریار کے والد صمد یار کا اپنا چھوٹا سا کاروبار تھا اور شہریار بھی ملازمت کرتا تھا یوں گھر کے حالات کافی بہتر تھے۔
وہی ہوا جو ہوتا ہے۔ دونوں گھرانوں میں بہت جلد گہرے تعلقات ہو گئے۔ عشنا' عالیہ سے کافی چھوٹی تھی لیکن دونوں گہری دوست بن گئیں۔ عشنا میٹرک میں پڑھتی تھی اور عالیہ یہ کافی۔ تھی عشنا کو بہت جلد پتہ چل گیا کہ بھائی عالیہ میں بہت دلچسپی لیتا ہے وہ دونوں سے خوب چھیڑ چھاڑ کرتی تھی۔
شہریار یکدم اندر آیا تو وہ بولی۔
''ارے ارے کہاں گھسے چلے آرہے ہیں۔ پردہ ہے۔''
''کیسے پردہ ہے۔'' پہلے تو شہریار کچھ نہ سمجھا پھر عالیہ کی ہنسی کی آواز سنائی دی تو سمجھ گیا کہ بہنیں شرارت کر رہی ہے اندر داخل ہو کر بولا۔
''ٹھیک ہے ذرا پردہ نشین کی زیارت تو کریں۔''
''وہ تو آپ کر چکے ہیں۔''
''کب۔''
''زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات۔'' عشنا شرارت بھرے انداز میں کہتی۔

یہ حقیقت بھی تھی' معاملات تو زندگی کی آخری رات تک کا۔ بن گئی تھی شہریار نے کچھ اس طرح دل ہارا تھا کہ محبت کے سمندر میں ایک جزیرہ بن گیا تھا دل کے اس جزیرے پر جو دستک اتری تھی وہ کبھی نہ مٹنے والی تھی رفتہ رفتہ اس کی شدت بڑھتی جارہی تھی اور جب دل کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو اس نے ماں سے کہا۔
''امی۔''
''ہاں۔ کیا بات ہے شہریار۔''
''امی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''
''خدا خیر کرے۔ ایسی کیا بات ہے کہ تم اتنے سنجیدہ ہو گئے۔''
''امی۔ میں عالیہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا اور امی مسکرا دیں پھر بولیں۔
''میں بھی عالیہ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''
''ایں۔'' اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔
''تمہاری ......'' امی نے کہا اور وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔ اس پاگل پن میں اس نے عالیہ کے سامنے زبان کھول دی۔
''عالیہ...... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ عالیہ میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ عالیہ بڑی مشکل سے میں نے تم سے یہ الفاظ کہے ہیں میں جواب چاہتا ہوں۔''
اسے امید نہیں تھی کہ عالیہ بھی اسی آگ میں سلگ رہی ہے اور صرف ایک لمحے کے فاصلے پر ہے اس کی زبان بھی کھل گئی۔
''میں جواب دوں اس کا شیری۔ میں۔ میں ہوں کہاں۔ میں تو تم ہو چکی ہوں شیری جواب میں نہیں دے سکتی تم دو۔ تم شیری تم۔''
''تم اپنی امی سے بات کرو۔''
''کیا۔''

''یہی کہ میری امی اس سلسلے میں تمہارے گھر آنا چاہتی ہیں۔''
''میں کیسے کہوں شیری۔ ایسی باتیں بیٹیاں اپنے منہ سے نہیں کرتیں۔ منہ پر پھٹکار یہ نہ لگتی ہے۔'' وہ ہنس پڑی۔
''پھر میں کیا کروں۔'' میں بے بسی سے بولا۔
''امی کو بھیج دو۔''
''اور لیکن تمہاری امی مان جائیں گی۔''
''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''
''عالیہ۔ میری محبت عبادت کی منزل میں داخل ہو گئی ہے اگر تم مجھے نہ ملیں تو میں زندگی کھو بیٹھوں گا۔''
''خدا نہ کرے۔ میں بھی تمہارے بغیر جینے کا تصور نہیں کر سکتی۔''
صدیوں کے فاصلے لمحوں میں طے ہو گئے۔ دونوں کے دل ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے۔
شہریار نے امی کو عالیہ کے گھر بھیج دیا اور لمحہ لمحہ ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ عشنا بھی امی کے ساتھ گئی تھی۔ امی واپس آئیں تو ان کا موڈ عجیب سا تھا۔
''کیا ہوا امی۔'' اس نے بے قراری کا مظاہرہ کیا۔
''کیا ہو سکتا تھا تیرے خیال میں۔ ایسے فیصلے لمحوں میں ہوتے ہیں۔''
''پھر بھی کچھ تو کہا ہوگا انہوں نے۔''
''ہاں کہنے لگیں اپنے شوہر سے بات کریں۔ وہ جو بھی فیصلہ کریں گے۔''
''آپ کے خیال میں وہ ہمارے حق میں فیصلہ کریں گی۔''
''میں نہ تو ولی ہوں' نہ درویش کہ سب کچھ بتا دوں۔ ویسے بھی بڑی گہری عورت ہیں عالیہ کی امی۔''

''کوئی جواب تو دیا ہوگا۔''
''ہاں۔ کہنے لگیں ایک ہفتہ لگ جائے گا غور کرنے میں۔''
''اف۔ ایک ہفتہ۔'' وہ بولا اور امی اسے تیز نظروں سے دیکھنے لگیں وہ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔
لوگ دن گنتے ہیں وہ لمحے گننے لگا۔ ایک ہفتہ دو ہفتے اور پھر ایک مہینہ گزر گیا کوئی جواب نہیں آیا۔ غضب یہ ہوا کہ عالیہ کا ان کے گھر آنا جانا بھی بند کر دیا گیا۔ شہریار پر زندگی وبال ہو گئی۔ وہ عالیہ کو دیکھ کر جیتا تھا اب ایکدم اس پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی کوئی الٹا سیدھا قدم وہ اٹھانا نہیں چاہتا تھا ورنہ کہیں اور ملنے کی سعی کرتا کسی کو پتہ چل گیا تو قیامت آ جائے گی۔
اس دوران بے چاری امی کئی بار عالیہ کے گھر گئی تھیں لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا اس نے امی سے کہا۔
''آخر وہ جواب کیوں نہیں دے رہے۔''
''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''
''آپ ان سے صاف بات کریں امی۔ میں پریشان ہوں۔''
''ٹھیک ہے تم کہو تو میں ان سے دوٹوک بات کروں۔''
''ہاں میری امی لیکن کوئی سخت بات نہ کریں۔''
''ٹھیک ہے۔ میں کوئی پاگل ہوں۔'' امی کو اس کے دل کا اندازہ ہو گیا تھا۔ امی گئیں واپس آئیں تو ان کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ شہریار کا دل دھک سے ہو گیا بمشکل تمام اس نے امی سے کہا۔
''کیا ہوا امی۔''
''سر پھرے لوگ ہیں۔ پتہ نہیں خود کو کیا سمجھتے ہیں۔''
''کیا ہوا امی۔'' اس نے اندھی آواز میں

پوچھا۔
''پہلے ہی منع کر دیتے تو کیا تھا اتنے دن تک کیوں زبان بند رکھی اب کہہ رہی ہیں کہ عالیہ کی بات کہیں اور طے ہے۔''
''کیا۔'' شہریار کو چکر آ گیا۔
''ہاں۔ میں نے کہا پہلے ہی بتا دیتیں تو کیا تھا۔''
''پھر۔''
''میں' شرمندہ تھیں۔ ویسے مجھے کچھ اور بھی پتہ چلا ہے۔''
''کیا امی۔''
''ان کے بھائی کا لڑکا ہے جو دبئی میں تھا اب وہاں سے واپس آ کر کراچی میں کاروبار کرے گا سب دولت کا کھیل ہے پہلے ان کے دل میں یہ خیال نہیں تھا اب یہ موقع نظر آیا تو چہرہ بدل گئیں سنا ہے وہ بڑے پیسے والے ہیں۔''
''غلط ہے۔ یہ غلط ہے نقصان اٹھائیں گے وہ لوگ۔ نقصان اٹھائیں گے۔'' شہریار نے کہا۔ عالیہ کے لیے وہ ہزاروں زندگیاں قربان کر سکتا تھا اس نے عشنا کے ذریعے عالیہ سے ملاقات کا انتظام کیا۔ عالیہ خود اس کے لیے پاگل تھی مطلوبہ جگہ پہنچ گئی' اس نے سسکتے ہوئے شیریار سے کہا۔
''تم میرے روئیں روئیں میں ہو شیری۔ مجھے کسی اور کا ہونے سے بچا لو۔''
''نہیں ہونے دوں گا میں تمہیں کسی اور کا عالیہ۔ چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔''
''مجھے یقین دلا دو۔ ورنہ میں کچھ کھا کر مر جاؤں گی۔''
''نہیں مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں ساری دنیا سے لڑ جاؤں گا۔ وہ لڑکا کون ہے جو دبئی سے آیا ہے۔''
''ابو کے دوست کا بیٹا ہے۔ ہمارے گھر میں تمہارا رشتہ منظور ہو چکا تھا کہ وہ کمبخت درمیان میں ٹپک پڑا اور ابو بات بدل گئے ورنہ سب ٹھیک ہو گیا تھا ہاں کہی جانے والی تھی اور اب۔ اب۔''
''ہاں اب کیا۔''
''اگلے ماہ شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے۔''
''تم انکار کیوں نہیں کر دیتیں۔''
''کاش میں ایسا کر سکتی۔''
''کیوں نہیں کر سکتیں۔''
''مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے لیکن۔''
''لیکن کیا۔''
''میں خودکشی کر لوں گی۔ یقین کرو' میں زندہ نہیں رہوں گی۔''
''ایسا کبھی نہ کرنا عالیہ۔ ایسا کبھی مت سوچنا۔''
''شیری۔ میں تمہاری جگہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''
''میں جانتا ہوں عالیہ۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں تمہارے بغیر زندہ رہ سکتا ہوں۔'' شہریار نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔
''اب کیا کریں شیری۔ وقت پر لگا کر اڑا جا رہا ہے۔''
''ہاں مجھے اندازہ ہے۔ کروں گا عالیہ کچھ کروں گا۔'' شہریار راتوں کو جاگنے لگا کچھ بھی ہو جائے عالیہ کی شادی کسی دوسری جگہ نہیں ہو سکتی۔ ایک ہی راستہ ہے عالیہ کو لے کر کہیں دور نکل جائے دو خاندانوں کو رسوا کر کے۔
کوئی موثر فیصلہ نہیں ہو سکا اور شادی کا دن قریب آ گیا تب اس نے عشنا کے ذریعہ عالیہ کو ایک خط بھجوایا جس میں اس نے عالیہ سے کہا تھا کہ اس کے ساتھ فرار ہونے کے لیے فلاں جگہ آ جائے اور پھر وقت مقررہ پر وہ طے شدہ جگہ اس کا انتظار کرنے لگا۔
عشنا کو نہیں معلوم تھا کہ بھائی ایسا کرے گا۔

اس نے تو فرض پورا کر دیا تھا لیکن خط پڑھ کر عالیہ کے اعصاب کشیدہ ہو گئے اسے شدید چکر آ گئے۔ اس نے لکھا تھا کہ میں ایسا تو کر سکتی ہوں لیکن ماں باپ کی عزت کو اس طرح جوتوں تلے روند کر نہیں جا سکتی۔

شیری تمہاری محبت میرے ساتھ قبر تک جائے گی میں تمہیں کبھی نہیں بھلا سکوں گی مگر میں ماں باپ کو اپنے لیے ہلاک نہیں کر سکتی۔

وہ آنسو بہاتے ہوئے خط پڑھتی رہی کتنی بار اس کا دل چاہا کہ شہریار کے پاس جائے اس کے سامنے جا کر اس سے بات کرے لیکن رات کے اس پہر باہر جا کر اس سے ملنا بھی خطرناک تھا کوئی دیکھے تو کیا سمجھے کل اس کی شادی تھی آنسو بہانے کے علاوہ کچھ نہ کر سکی ساری رات تکیے پر سر رکھے سسکتی رہی۔

ادھر شہریار اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت شدید وحشت کے عالم میں گزر رہا آنکھیں اس راستے کو دیکھتے دیکھتے پتھرا گئی تھیں۔ سے عالیہ کو آنا تھا مقررہ وقت گزر گیا۔ ایک بجے' دو بجے' تین بج گئے۔ آس دم توڑنے لگی۔ پاؤں سن ہو گئے۔ دماغ تھک کر سو گیا۔

وہ نہیں آئی۔ وہ نہیں آئے گی۔

یہاں تک کہ روشنی نمودار ہونے لگی۔ پر امید دم توڑ گئی۔ ٹھیک سوچا تم نے عالیہ واقعی ٹھیک سوچا تم نے۔ میں جانتا ہوں تم کیوں نہیں آئیں۔ موازنا کیا ہوگا تم نے اس دولت مند شخص کا اور میرا۔ واقعی دولت ہمیشہ جیت پاتی ہے ایک کلرک کے پاس تمہیں کیا ملتا۔ اب کیا کروں یہاں رہنا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔

وہ وہاں سے سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا اور ایک ٹرین آئی تو اس میں بیٹھ گیا۔ انسان کتنا خود غرض ہوتا ہے صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے وہ اپنی محبت میں ناکام ہوا تو' ماں' باپ نہیں سب کو بھول گیا۔

بالآخر تھک ہار کر یارو' ہم نے تو تسلیم کیا
اپنی ذات سے عشق ہے سچا' باقی سب افسانے ہیں

کوئی منزل نہیں تھی' کوئی نظریہ نہیں تھا' ریل میں ٹکٹ خریدا اور کراچی پہنچ گیا۔ روشنیوں کے طوفان میں گھرا کراچی جس کی وسعت قلب بے پناہ ہے وہ سب کو اپنے دل میں جگہ دے دیتا ہے۔

تھوڑی سی رقم ساتھ لایا تھا سوچا تھا کہ عالیہ کا ساتھ ہوگا سر چھپانے کا ٹھکانہ تلاش کرے گا پھر نوکری تلاش کرے گا اور عالیہ کے ساتھ پر عیش زندگی گزارے گا لیکن۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں۔

ایک گندا سا ہوٹل مل گیا اس میں قیام کیا غم کے طوفان سمیٹے وہ ہوٹل کے کمرے میں پڑا رہتا۔ ہوٹل کے ایک بیرے نے جس کا نام مجید خان تھا اس کی۔ کے کیفیت بھانپ کی اور بولا۔

''کس غم کے مارے ہو بابو۔''

''کیوں۔''

''اپن کو لگتا ہے۔ چاہے تو اپن کو یار بنا لو۔''

''کیا فائدہ۔''

''فائدے نقصان کی بات اپن نہیں کرتا۔ باقی تمہارا مرضی۔'' مجید خان نے کہا۔

اور اس نے مجید خان کی پیشکش قبول کر لی۔ مجید خان واقعی کام کا آدمی تھا۔ چند روز کے بعد اس نے پیشکش کر دی۔

''اپن تمہارے کو مشورہ دے شیری بابو۔''

''ہاں بولو۔''

''تم ادر بیرا گیری کر لو۔''

''بیرا گیری۔''

''ہاں جگہ خالی ہے۔ سیٹھ مجید میرے بولا کوئی بندہ ہو تو لے آؤ۔''

''سیٹھ مجید کون ہے۔''

''اس ہوٹل کا مالک۔ اس کا نام بھی مجید خان ہے۔ بس تھوڑا سا فرق میرے اور اس کے ساتھ۔''

''کیا۔''

''وہ سیٹھ مجید خان ہے اور اپن بیرہ مجید خان۔ وہ اپن کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتا ہے۔''

''ٹھیک ہے تم بات کرلو۔'' شہریار نے کچھ سوچ کر کہا۔ دل کے زخم کبھی چین سے سونے نہیں دیتے تھے پیسے بھی ختم ہوتے جا رہے تھے اس نے سوچا یہاں کب تک رہے گا جینے کے لیے کچھ تو کرنا تھا کیوں نہ زندگی کو یکسر بدل دیا جائے چنانچہ اس نے بیرہ گیری قبول کرلی مجید خان نے اسے اپنے کوارٹر میں رہنے کے لیے جگہ دیدی تھی وہاں خوب رونق رہتی تھی مجید خان جوا کراتا تھا اور بہت سے جواری وہاں جوا کھیلتے تھے۔ شہریار کی تقدیر نے اسے چرکا دیا تھا بارش کی وہ رات اس پر عذاب بن کر نازل ہوئی تھی اور وہ عشق کے آزار میں مبتلا ہوگیا تھا جس کے لیے دربدر کردیا تھا لیکن ابھی بہت سے عذاب اس کے منتظر تھے سب کچھ چھوٹ گیا تھا گھربار، ماں باپ، بہنیں، لیکن تقدیر ابھی اس سے بہت کچھ چھیننا چاہتی تھی۔

ایسی ہی ایک رات تھی۔

وہ اس۔ رات میں نہ جانے کب تک آنسو بہا کر سویا تھا کہ اچانک زلزلہ سا آ گیا بہت سے لوگ کوارٹر کی دیواریں پھلانگ کر اندر آ گئے تھے۔ یہ پولیس والے تھے جو پوری طرح مسلح تھے انہوں نے اس کی چارپائی الٹ دی وہ زمین پر گرا تو انہوں نے اس کے بدن پر کئی ٹھوکریں ماریں۔

''اٹھ اوئے کھڑے ہو۔''

وہ کھڑا ہوگیا دوسرے پولیس والے نے اسے بالوں سے پکڑ کر دھکا دیا۔ ''بٹھاؤ سالے کو گاڑی میں۔''

''کیا ہوا کیا بات ہے مجھے بتاؤ تو سہی۔'' اس نے کہا۔

''ہائے معصوم فرشتے۔ جوئے کا اڈہ چلا رہا ہے اور فرشتہ بن رہا ہے چل آگے بڑھ۔'' پولیس والے نے اسے دھکا دے کر کہا۔

''میری بات سنیں۔ یہ گھر میرا نہیں ہے میں تو کچھ روز پہلے ہی یہاں آیا ہوں۔''

''پھر کس کا گھر ہے۔''

''مجید خان کا۔''

''مجید خان کہاں ہے۔''

''اس وقت مجھے نہیں معلوم۔''

''اچھا تو تو تھانے چل۔ مجید خان کو بھی دیکھ لیں گے۔'' پولیس والوں نے کچھ اور جواریوں کو بھی پکڑا تھا لیکن مجید خان اس میں نہیں تھا۔ اسے ساری رات تھانے میں بند رکھا گیا صبح کو مجید خان اس سے ملنے آیا تو وہ غصے سے بولا۔

''یہ تو نے کیا کیا مجید خان۔''

''میری بات سن شیری۔ تیری زندگی بن جائے گی تھوڑی سی سزا بھگت لے میری جان میں جیل میں تجھے کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔''

''کیا بکواس کر رہا ہے۔ میں شریف آدمی ہوں۔''

''او یار...... شرافت بیکار چیز ہے، کوئی فائدہ نہیں ہوگا تجھے شرافت سے۔ ویسے بھی میرا کام پکا ہے پولیس تجھے چھوڑ دے گی۔''

مجید خان کچا کھلاڑی نہیں تھا اس نے خود کو صاف بچالیا اور شہریار کو جوئے کا اڈہ چلانے کے الزام میں سزا ہوگئی۔

تب اس نے جیل کی دنیا دیکھی خود پر ہنسنے کے سوا اور کیا کرسکتا تھا۔ عالیہ تم نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا محبت کتنی نامراد شے ہے لیکن عالیہ تقدیر نے ساتھ دیا تو تم سے ایک بار ملوں گا

ضرور۔

جیل ایک یونیورسٹی ہوتی ہے جہاں ہر طرح کی تعلیمات کا بندوبست ہوتا ہے۔ ایک سے ایک چھٹے ہوئے مجرم سے اس کی دوستی ہونے لگی۔ وہ سب اسے اپنے داؤ پیچ سکھانے لگے اور وہ فنکار بنتا چلا گیا پھر ایک دن مجید خان اس سے ملنے آیا۔

''کیسے ہو دوست۔''

''بالکل ٹھیک ہوں انتظار کر رہا ہوں یہاں سے نکلنے کا' سب سے پہلے تمہارا میں ادھار چکاؤں گا فکر مت کرو۔'' وقت گزرتا رہا' شہریار اب شہریار نہیں رہا تھا۔ وہ سچ مچ شیری بن چکا تھا پہلے سے بالکل مختلف جیل میں جیلا اس کا بہترین دوست تھا۔

''تیری رہائی آ رہی ہے۔'' جیلا نے کہا۔

''ہاں یار۔''

''کیا کرے گا باہر جا کر۔''

''کوئی فیصلہ نہیں کیا۔''

''پتہ دیتا ہوں۔ سائیں فضلا سے مل لینا۔'' جیلا نے اسے فضلا کے بارے میں تفصیل بتائی پھر اس کا پورا پتہ بتا دیا اور آخر کار ایک نیا شیری جیل سے باہر آ گیا۔ ایک معصوم نوجوان محبت کا مارا ایک خوفناک روپ اختیار کر گیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے فضلا کو تلاش کیا باقاعدہ ایک اڈہ چلاتا تھا۔

''مجھے استاد جیلا نے بھیجا ہے۔''

''اوئے ہش کے جیل سے آئے ہو۔''

''ہاں۔''

''شکل سے تو شریفے کا پھول لگتے ہو۔''

''اس کے برعکس ہوں۔''

''کیا نام ہے۔''

''شیری۔''

''اوئے ہش کے نام تو ٹھیک ٹھاک ہے شیری بدمعاش' ہاہا چلے گا۔ چلے گا جیل کیوں گئے تھے۔''

''تقدیر لے گئی تھی۔''

''ہاں پہلے تقدیر ہی لے جاتی ہے۔ اس کے بعد بندے کا باہر جی نہیں لگتا۔ کچھ پڑھے لکھے ہو۔''

''ہاں۔''

''ہش کے۔ کام کرو گے۔''

''کرنا ہی ہے۔''

''مل جائے گا۔ میرے پاس ہر مرض کی دوا ملتی ہے۔ چلو کھانا کھا لو پھر تمہیں آرام کے لیے بھجوا دیتا ہوں۔ کسی نئے کام کے لیے خود کو تیار رکھنا۔'' کھانا بہت اچھا تھا کھانے سے فارغ ہوا تو فضلا نے ایک آدمی کو بلایا اور بولا۔

''انہیں بیس نمبر پہنچا دو۔'' بیس نمبر ایک فلیٹ نمبر تھا جس کا تالا کھول کر شہریار کو اندر جانے کی ہدایت کی گئی۔ شہریار کو کوئی جھجک نہیں ہوئی تھی اب وہ بالکل بدل گیا تھا۔ جیل کے دوستوں نے اسے نئی دنیا دکھا دی تھی ماضی کو بھلا دیا تھا اس نے سوائے ایک نقش کے یہ نقش دوام تھا آخری سانسوں کے ساتھ قبر کی گہرائیوں تک کا ہمسفر۔

فلیٹ خوب آرام دہ تھا سکون کی نیند سویا۔ صرف عالیہ آئی تھی خواب میں وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے۔ رات کو فضلا نے عمدہ کھانا کھلایا تھا۔ ناشتہ اس نے خود تیار کیا۔ کچن میں ہر چیز موجود تھی۔

دن کو گیارہ بجے استاد فضلا آ گیا۔

''مبارک ہو' تمہارے لیے پہلا کام نکل آیا۔''

''کام۔''

''ہاں تمہیں ہانگ کانگ جانا ہوگا۔ بہت بڑے سیٹھ کا کام ہے تم نے سکندر علی کا نام سنا ہے۔''

''نہیں۔''

''اب سن لو۔ تمہارا اسی سے واسطہ رہے گا۔''

''مجھے ہانگ کانگ جانا ہوگا۔''
''ہاں۔ بندہ آ جائے گا۔ تصویریں وغیرہ نکلوالو تاکہ پاسپورٹ بن جائے۔ اس ہفتے تمہیں جانا ہوگا۔''
''ٹھیک ہے۔'' شہریار نے خوش ہوکر کہا۔ پھر بولا۔ ''استاد فضلا ایک ذمے داری ہے میری جس کے لیے میں نے قسم کھائی تھی کہ جیل سے نکل کر اسے پوری کروں گا۔''
''مجھے بتاؤ۔ اور یہ بھی بتاؤ کہ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں۔'' فضلا نے کہا اور شہریار نے اسے پوری کہانی سنادی جسے سن کر فضلا نے کہا۔ ''بدلہ لگتا تو نہیں ہے کیونکہ اس نے تمہیں انسٹیٹیوٹ آف کرائم بھجوایا تھا۔ جہاں سے تم ہیرو بن کر نکلے لیکن قسم، قسم ہوتی ہے اسے ضرور پوری کرنا چاہیے۔ البتہ ایک ہدایت ضرور کروں گا۔''
''جی۔''
''قاتل بننے سے گریز کرنا۔''
''میں اسے قتل نہیں کرنا چاہتا بس اسے تھوڑا سا پیار کرنا چاہتا ہوں۔'' شہریار نے سفاک ہنسی ہنستے ہوئے کہا اور فضلا بھی ہنسنے لگا۔
لیکن مجید خان کی تقدیر اچھی تھی وہ اس گھر کو چھوڑ کر جاچکا تھا مسلسل کوشش کے بعد بھی کہیں سے اس کا پتہ نہیں چل سکا۔
مجبوراً اس نے ہانگ کانگ جانے کی تیاری کرنی پڑی۔ سیٹھ سکندر علی نے بذات خود اسے بریف کیا اور پھر وہ ہانگ جانے کے لیے تیار ہوگیا جہاز کا سفر اس کے لیے بڑا دلچسپ تھا اسی طرح ہانگ کانگ جہاں اسے ایک ہوٹل میں ٹھہرنا تھا، ہوٹل کی رات ایک مقامی شخص نے اس سے ملاقات کی جو صاف اردو بولتا تھا اپنی شناخت کرانے کے بعد اس نے وہ سوٹ کیس شہریار سے لے لیا جو وہ ساتھ لایا تھا پھر دوسرے دن ایک لڑکی نے اس سے ملاقات کرکے ایک نایاب ماڈل اس کے حوالے کیا اور مسکراہٹ کی بجلیاں گراتی ہوئی چلی گئی۔
بس یہی کام تھا جس کی اسے ہدایت کی گئی تھی اپنے کام کی انجام دہی کے بعد تین دن تک اس نے ہانگ کانگ کی سیر کی پھر پاکستان چل پڑا۔ ایر پورٹ پر اس کے لیے مکمل انتظام تھا چنانچہ اس مجسمے کو ایر پورٹ سے باہر لانے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی اور وہ مجسمہ اس نے فضلا کے حوالے کردیا۔
''سیٹھ صاحب تم سے بہت خوش ہیں۔ ہانگ کانگ میں لطف آیا۔''
''ہاں۔''
''یہ لو۔ یہ تمہارا معاوضہ ہے۔'' ایک لاکھ روپے کے نوٹ اس نے اکٹھے کبھی نہیں دیکھے تھے۔
''یہ۔''
''تمہارا معاوضہ ہے۔ اب تین ہفتے تک آرام کرو۔''
''تین ہفتے تک۔''
''ہاں پھر تمہیں دوبارہ ہانگ کانگ جانا ہوگا۔ دوسری بار معاوضہ ڈبل ہوگا اور ہاں ایک کام اور کرو۔''
''کیا۔''
''شیو بڑھالو۔ دوسری بار تمہیں داڑھی میں جانا ہوگا۔''
''ٹھیک ہے۔''
دوسرا دورہ بھی کامیاب رہا پہلے پیسے ہی ختم نہیں ہوئے تھے دو لاکھ اور مل گئے۔ فضلا نے کہا۔
''یار دنیا بہت خوب صورت ہے دولت کماؤ اور لٹا دو۔ یہی زندگی ہے۔'' فضلا نے اسے ریس کی لت لگادی اسے گھوڑوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا چنانچہ گھوڑوں نے اس سے وفا نہیں کی اور پھر وہ اپنی کمائی کھونے لگا سارے پیسے ختم ہوگئے فضلا سے اس نے کبھی کچھ نہیں مانگا

تھا دماغ میں برے خیالات آنے لگے اس دن وہ بہت پریشان تھا جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی سوائے لمبے چاقو کے جو اسے فضلا نے تحفے میں دیا تھا۔

اسے اپنی رہائش گاہ جانا تھا جو یہاں سے کافی دور تھی وہ سڑک پر پیدل جا رہا تھا کہ ایک ٹیکسی قریب آ گئی ڈرائیور نے اس کے قریب آ کر اس۔ ٹیکسی کی رفتار سست کی کہ شاید کوئی سواری مل جائے۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور اسے چلنے کے لیے کہا پھر اچانک اس کے ذہن میں شیطان داخل ہو گیا اس نے جیب سے چاقو نکال کر ڈرائیور کی گردن پر رکھ دیا۔ ''چلو ٹیکسی روکو۔'' ڈرائیور کی گھگھی بندھ گئی تھی۔

''کتنے پیسے ہیں جیب میں۔''

''تین چار سو مائی باپ۔'' ڈرائیور بری طرح کانپ رہا تھا۔

''نکالو۔'' وہ بولا۔

''مائی باپ میرے چھوٹے چھوٹے۔''

''نکالو ورنہ ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔'' اس نے گرج کر کہا اور ڈرائیور نے جلدی سے جیب سے ساری رقم نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ رقم لے کر اس نے کہا۔ ''چلو گاڑی سے نیچے اتر جاؤ۔''

''مر جاؤں گا مائی باپ۔'' ڈرائیور رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

''نیچے اتر۔'' شہریار گرجا اور ڈرائیور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا وہ دھیمی آواز میں رو رہا تھا لیکن اس نے پرواہ نہ کی تو ٹیکسی آگے بڑھا دی اس کا ذہن سادہ تھا ان ظلم وستم کا عادی ہو چکا تھا ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اچانک ایک ذیلی سڑک سے ایک پولیس موبائل نکل آئی۔ یہ سڑک اس سمت سے آئی تھی یہاں اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو چھوڑا تھا۔

پولیس موبائل نے اس کا راستہ بند کر دیا اور مسلح پولیس والے ایک افسر کی سرکردگی میں نیچے اتر آئے وہ ٹیکسی ریورس کرتا تو پولیس والے اسے بھون کر رکھ دیتے یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا پھر موبائل سے ٹیکسی ڈرائیور کو نیچے اترتے دیکھ کر اس نے گہری سانس لی تھی چنانچہ وہ ٹیکسی سے نیچے اتر آیا۔

پھر جو ہونا تھا جو ہوا ایک بار پھر اسے جیل یاترا روانہ کرا دیا گیا لیکن وہاں اس کا دوست جیلا موجود تھا جو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

''آ گیا میرا شیر۔ اوئے بڑا بدل گیا تو کتنے دن کی ہے۔''

''صرف ایک مہینہ۔'' شہریار نے لاپرواہی سے کہا۔

''ایک مہینہ۔'' جیلا انگلیوں پر حساب لگانے لگا پھر ایک دم خوش ہو کر بولا۔ ''اوئے۔ پھر تو ساتھ ساتھ نکلیں گے۔''

دونوں کی ساتھ ساتھ رہائی ہوئی تھی جیل سے باہر فضلا ان کا منتظر تھا۔ بن گیا خوب کمائی ہونے لگی لیکن پیسہ رکتا کہاں ہے بڑی بڑی رقمیں حاصل ہوتی تھیں کبھی ریس کورس کی سیر ہو جاتی تھی۔

''مزے کر رہے ہو جانی۔'' جیلا نے ایک دن کہا۔

''مہربانی ہے تمہاری جیلا لیکن ایک حسرت ہے۔''

''کیا میری جان۔''

''ایک بندہ۔ لگ رہا اس سے بدلہ ضرور لینا ہے۔''

''کون ہے چندا۔'' جیلا نے پوچھا اور شہریار نے مجید خان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا جیلا ہنسنے لگا تھا وقت کچھ اور گزرا پھر ایک دن جب وہ فضلا کے ساتھ موٹر سائیکل پر جا رہا تھا کہ اسے مجید خان نظر آ گیا وہ ایک اسٹور سے نکلا تھا

اور ایک گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑا تھا اس کی شان ہی بدلی ہوئی تھی۔

''استاد۔'' شہریار کے منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

''خیر ہے کیا بات ہے۔''

''وہ نیلی گاڑی۔''

''ہاں کیا ہے اس میں۔''

''مجید خان۔'' وہ بولا اور فضلا نے موٹر بائیک نیلی کار کے پیچھے لگا دی رات کا وقت تھا ٹریفک بہت کم تھا وہ آرام سے مجید خان کا پیچھا کرنے لگے۔

''کیا کرنا ہے۔'' فضلا نے پوچھا اس کی زندگی بس یہیں تک تھی۔ شہریار نے خونخوار لہجے میں کہا۔ مجید خان ایک فلیٹوں کے علاقے میں رکا اور کار کھڑی کر کے آگے بڑھ گیا فضلا نے بھی بائیک پارکنگ میں کھڑی کر دی اور مجید خان کے پیچھے پیچھے چل پڑے مجید خان کو گمان بھی نہیں تھا کہ موت پیچھے آ رہی ہے اس نے ایک فلیٹ کی بیل بجائی اور دروازہ ایک خوبصورت سی عورت نے کھولا یہ دونوں سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

''ہاں کیا کہتے ہو۔'' فضلا بولا۔

''چلتا ہوں۔'' شہریار نے کہا۔ ''تم نگرانی رکھو۔''

''پرواہ مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' فضلا بولا اور شہریار آگے بڑھ کر فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گیا پھر اس نے کال بیل پر انگلی رکھ دی دروازہ مجید خان نے ہی کھولا تھا شہریار نے چاقو ہاتھ میں سنبھال رکھا تھا دوسرے لمحے اس نے چاقو مجید خان کے پیٹ میں اتار دیا مجید خان کے چیخنے سے پہلے اس نے مزید دو وار اور کیئے پھر لات مار کر مجید خان کو اندر پھینک دیا اور خود دروازے سے اندر داخل ہو گیا مجید خان انہیں پر جا پڑا تھا۔

''ہاں میری جان پہچان لے اپنے شیری کو۔'' اس نے کہا اور جھک کر مجید خان کی ناک کاٹ لی پہچان گئے نا وہ دوبارہ بولا اس وقت عورت آ گئی جو شاید مجید خان کی بیوی تھی۔

''نہیں اگر تمہارے حلق سے آواز نکلی تو تم بھی ناک سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔''

یہ دھمکی سن کر عورت کی چیخ حلق میں ہی رک گئی شیر یار بولا۔

''کیا کروں تمہارا مجید خان سوچا تو یہ تھا کہ تمہیں اوپر بھیج دوں لیکن مزہ نہیں آئے گا چلو جیو اور یاد کرتے رہو کہ تم نے کسی بے گناہ کو جیل بھجوایا تھا میں نے اپنا قول پورا کر دیا ہے۔''

اس کے بعد وہ باہر نکل آیا تھا اور پھر وہ واپس چل پڑے۔

''مار دیا۔'' فضلا نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''خوش ہو۔''

''ہاں بڑی آرزو تھی۔''

''اب تو کوئی خلش دل میں نہیں رہ گئی۔''

''خلش۔'' اس کی آواز میں حسرت پیدا ہو گئی جو خلش اس کے دل میں تھی وہ تو زندگی کا حصہ تھی اس رات پھر عالیہ اس کے دل میں چبھنے لگی اور اس نے جی بھر کر شراب پی لیکن عالیہ ساری رات سلگتی رہی تھی۔

برائی جب قریب آتی ہے تو اسے دور کرنا بہت مشکل ہوتا ہے شہریار کے دل سے بھی سارے احساسات نکل گئے تھے وہ ماں باپ کو بہن کو بھول گیا تھا' ہاں اسے عالیہ یاد تھی عالیہ کا نقش اس کے دل میں ایسا بیٹھا تھا کہ نکالے نہ نکلتا اس نے عالیہ کو شراب میں ڈبونے کی کوشش کی لیکن یہ بھی ممکن نہیں ہوا کبھی کبھی تو عالیہ اس کے دل میں بری طرح سلگتی تھی اب وہ شیری دادا بن گیا تھا ایک خطرناک مجرم قاتل اور نہ جانے کیا فضلا جیلا اور نہ جانے کون کون پر سب سیٹھ سکندر علی کے لیے کام کرتے تھے اور وہ انہیں اپنے

تعلقات کی وجہ سے کسی مشکل میں نہیں پڑتے دیتا تھا۔

ایک دن سکندر علی نے اسے طلب کرلیا اسے دیکھ کر وہ مسکرایا۔

''یار تو شکل سے وہ نہیں لگتا جو تو ہے۔''

''میرا قصور نہیں ہے سر۔''

''ہاں مگر یہ برے کام کی بات ہے خیر چھوڑ کام کرنا ہے تجھے۔''

''حاضر سر حکم کریں۔''

''پتہ دے رہا ہوں تجھے میرے دوست ہیں شہباز دستی بہت بڑے سیٹھ ہیں ان کا کوئی کام ہے جو تجھے کرنا ہے۔''

''جی سر جی۔''

''کل ٹھیک بارہ بجے اس کے پاس پہنچ جاؤ۔ وہی بتائیں گے۔''

ٹھیک بارہ بجے وہ شہباز دستی کے آفس میں داخل ہو گیا شہباز دستی نے اسے دیکھ کر خشک لہجے میں کہا۔

''ہاں کون ہو تم۔ کیا بات ہے۔''

''سکندر علی نے بھیجا ہے مجھے۔''

''تمہیں۔''

''جی سر۔''

''آؤ بیٹھو۔ کیا سکندر نے مجھ سے مذاق کیا ہے۔''

''یہ تو وہی بتا سکیں گے سر۔''

''نہیں میرا مطلب ہے تمہیں معلوم ہے کہ میرا کام کیا ہے۔''

''نہیں سر۔''

''ایک بندے کو اڑانا ہے۔''

''اڑ جائے گا نام اور پتہ بتا دیں۔''

''کتنا معاوضہ لو گے۔''

''آپ سکندر صاحب کے دوست ہیں۔''

''ہاں۔''

''پھر یہ کام وہی کریں گے۔''

''نہیں تم بتاؤ۔''

''سوری سر۔ وہ ہمارے سرپرست ہیں اور آپ ان کے دوست معاوضے کا فیصلہ وہیں کریں گے آپ صرف ہمیں اس بندے کے بارے میں بتائیں۔''

''مجھے حیرت ہے کون تفتیش کرے گا کہ تم کس کو قتل بھی کر سکتے ہو پڑھے لکھے اور شریف آدمی جیسے لگتے ہو۔''

''لگتا ہوں مگر ہوں نہیں کسی کو قتل کرنے کی منزل تک پہنچتے پہنچتے نہ جانے خود کتنی بار قتل ہوتا پڑتا ہے۔''

''ہاں یہ انسان کی زندگی کی کوئی نہ کوئی کہانی ہوتی ہے خیر یہ لو اس میں تمہاری محنت کا معاوضہ ہے۔'' سیٹھ شہباز نے ایک وزنی لفافہ اسے دیتے ہوئے کہا اور اس نے لفافہ جیب میں رکھ لیا۔ ''اور یہ اس کی تصویر' جسے تم شکار کرو گے۔''

شہریار نے تصویر دیکھی اور گردن ہلانے لگا۔ ''کہاں ملے گا۔''

''یہ بھی بتاتا ہوں لیکن ایک خاص بات اور ہے۔''

''بولیں۔''

''قتل کی یہ واردات ڈکیتی کی واردات لگنی چاہیے۔''

''ڈکیتی کی۔''

''ہاں۔''

''کیوں۔''

''قتل کا شبہ میری طرف بھی جا سکتا ہے کیونکہ حال ہی میں میرا اس سے جھگڑا ہو چکا ہے بہت سے لوگ اس کے گواہ ہیں۔''

''ٹھیک ہے اس کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتائیں۔''

''وہ میرا بزنس پارٹنر ہے شاہد بیگ نام ہے میرے ساتھ فیکٹری میں بیٹھتا ہے شہباز اس کے

بارے میں مکمل تفصیل بتانے لگا تفصیل سننے اور معلوم کرنے کے بعد شہریار وہاں سے روانہ ہوگیا تھا۔

تمام تر منصوبہ بندی کرنے کے بعد دوسرے دن شہریار اس خوبصورت پروجیکٹ پر پہنچ گیا جہاں شاہد بیگ رہتا تھا شاہد بیگ کا اپارٹمنٹ اس وقت لاک تھا اپارٹمنٹ کا تالا کھول لینا شہریار کے لیے معمولی بات تھی اس نے مہارت سے تالا کھولا اور اندر داخل ہوگیا فلیٹ میں اندھیرا تھا اس نے تمام روشیاں جلا لیں اور فلیٹ کی اندرونی سجاوٹ دیکھنے لگا بے حد شاندار فلیٹ تھا اور لگتا تھا کہ بے حد دولت مند شخص کی رہائش گاہ ہے خوب صورت صوفے دیدہ زیب قالین بڑے بڑے لیمپ البتہ دیوار پر صرف ایک تصویر لگی ہوئی تھی تیز روشنی میں اس نے اس حسین عورت کی تصویر دیکھی اور ان کا دل بند ہونے لگا۔

یہ عالیہ کی تصویر تھی۔

اس کی عالیہ کی۔

''عالیہ......'' اس کے منہ سے نکلا اور وہ آہستہ آہستہ تصویر کی طرف بڑھ گیا اس کے منہ سے آواز نکلی۔ ''تم یہاں کیا کررہی ہو عالیہ۔ بولو تم اتنے عرصہ کے بعد میرے سامنے کیوں آئی ہو اور اور مگر تم یہاں کیا کررہی ہو تم جانتی ہو میں یہاں کیوں آیا ہوں اوہ آہ عالیہ تم...... تم اتنے عرصے کے بعد آخر کیوں تم یہاں کیوں ہو میں یہاں قاتل بن کر آیا ہوں ایک مجرم تمہارے سامنے ہے عالیہ آہ کیا یہ تمہارا گھر ہے تمہارے شوہر کا گھر کون ہے تمہارا شوہر کیا شاہد بیگ اگر ایسا ہے تو میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہے تقدیر نے مجھے اس شخص سے انتقام لینے کا موقع دیا ہے میں نے تمہیں مجھ سے چھین لیا تھا آج میں اس سے اس کی زندگی چھین لوں گا۔''

وہ جنون میں بکتا گیا پھر اچانک اسے ایک خیال آیا کیا واقعی یہ عالیہ ہی کی تصویر ہے اس سے ملتی جلتی کوئی اور بھی ہوسکتی ہے۔

اب کیا کروں۔

وہ سوچتا رہا تصویر کو گھورتا رہا پھر اس کی نظریں ادھر ادھر بھٹکنے لگیں کوئی اور تصویر کوئی اور ثبوت اور یہ ثبوت اسے بیڈ روم کی ایک الماری سے مل گیا یہ تصویروں کا البم تھا عالیہ اور شاہد بیگ کی شادی کا البم۔

اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی اس البم میں عالیہ اور شاہد کی شادی کی تصویریں تھیں اس کے گھر والوں کی تصویریں بھی تھیں شہریار پر سکوت سی کیفیت طاری ہوگئی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اسے وہ رات یاد آگئی جب وہ صبح تک پتھر کے بت کی طرح کھڑا انتظار کرتا رہا تھا اور وہ نہیں آئی تھی۔

آہ کس قیامت کی رات تھی۔

کس قدر جان لیوا انتظار تھا۔

اور پھر صبح ہوگئی تھی۔

لیکن ایک تاریک صبح جس نے سب کچھ چھین لیا۔

اس کا شہر۔

ماں باپ۔

عشنا۔ بہن۔

گھر۔ جہاں سارا بچپن گزرا تھا۔

پانچ سال ہوگئے تھے دنیا بدل گئی تھی لیکن اب تک ان سے عالیہ کی یاد نہیں نکلی تھی وہ اب بھی اسے اتنا ہی چاہتا تھا وہ شاہد اور عالیہ کی شادی کی تصویریں دیکھتا رہا اور اس کی آنکھوں سے خون چھایا قیامت گزر گئی تھی اس کے دل پر۔

رشتہ منظور ہوچکا تھا مگر اچانک کوئی دبئی سے آگیا اور عالیہ اس سے چھن گئی تو یہ شاہد بیگ تھا جس نے دولت کے بل پر عالیہ اس سے چھین لی تھی۔

اس نے جیب سے چاقو نکالا اور پھر اس نے شاہد کی ایک ایک تصویر کو چاقو سے گود کر رکھ دیا اب عالیہ کے ساتھ اس کی کوئی تصویر سلامت نہیں رہی تھی' اچانک بیرونی دروازے پر ایٹ ہوئی اندر آنے کی آواز سنائی دی اور کوئی سیٹی بجاتا اندر آنے لگا پھر۔ والا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

سامنے شہریار چاقو سنبھالے خونی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شاہد کا چہرہ خوف سے بگڑ گیا اس نے پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی تو شہریار چھلانگ لگا کر اس پر جا پڑا اس کے دو تین گھونسوں نے شاہد کے حواس چھین لئے تب شہریار نے اسے ایک کرسی پر بٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیے۔

''کک کون ہو تم اور یہ...... یہ تصویریں۔''

اس نے فرش پر پڑی تصویروں کے ٹکڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم ڈاکو ہو۔''

''ڈاکو...... ڈاکو میں نہیں تم ہو۔'' شہری ار غرایا۔

''ہیں۔ کیا مطلب۔'' وہ بولا۔

''تم عالیہ کے شوہر ہو۔''

''ایں۔'' وہ چونک پڑا۔ ''تم عالیہ کو کیسے جانتے ہو۔''

''وہ میرا پیار تھی وہ مجھے زندگی سے زیادہ پیاری تھی اور تم نے میری زندگی مجھ سے چھین لی تم دبئی سے لوٹنے والے کس سے کیا کیا چھین لیتے ہو تم نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔''

''لیکن پانچ سال ہو گئے میری شادی کو اور تم اب۔ تم اب مجھ سے بدلہ لینے کے لیے آئے ہو۔''

''پانچ سال بعد میری۔ یہ خوبصورت موقع عطا کیا ہے۔''

''اوہ ایک بات بتاؤ۔''

''ہاں پوچھو میری جان پھر مجھے بھی تم سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔''

''کیا تمہارا نام شہریار ہے۔''

''ہاں تم نے یہ نام کیسے سنا۔''

''مجھے عالیہ نے ہی تمہارے بارے میں بتایا تھا۔''

''کیا کہا تھا میری روح نے۔''

''بس اتنا کہ تم اس کے پڑوس میں رہتے تھے اور اچانک گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔''

''بس۔''

''ہاں تمہارے والدین بہت غمزدہ تھے۔''

''اور...... اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی زندگی تھے ایک دوسرے کے ساتھ جیتے تھے پھر تم ہماری جنت میں سانپ بن کر آ گئے۔''

''نہیں دوست مجھے تمہاری محبت کا پتہ نہیں تھا۔ میرا قصور نہیں ہے اگر بات مجھے پتہ چل جاتی تو میں خود تم دونوں کی شادی کراتا لیکن عالیہ ہمیشہ مجھ سے دور رہی آج مجھے پتہ چلا کہ وہ کیوں۔ اس قدر اداس رہتی ہے لیکن ایک بات بتاؤ۔''

''پوچھو۔''

''تم یہاں ڈاکہ ڈالنے آئے ہو۔ یا مجھ سے اپنے پیار کا بدلہ لینے۔''

''میں تمہیں قتل کرنے آیا ہوں لیکن اس کی وجہ کچھ اور ہے۔''

''بتاؤ گے۔''

''ہاں سیٹھ شہباز دستی نے تمہارے قتل کی سپاری دی ہے۔''

''اوہ۔ مجھے اس کمینے سے یہی امید تھی دیکھو۔ زندگی موت اللہ کے ہاتھ ہے زندگی جانے کے لیے آئی ہے لیکن تم ایک برے انسان کے لیے میری زندگی لے رہے ہو۔ میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں جواب دو گے۔''

''بولو۔''

''تمہیں عالیہ سے اب بھی محبت ہے۔''
''ہاں اپنی روح سے محبت کبھی کم ہوتی ہے۔''
''پھر تم مجرم کیوں اور کیسے بن گئے محبت تو دلوں میں رحم پیدا کرتی ہے۔''
''تقدیر نے مجھے اس راستے پر لا ڈالا ہے۔''
''ایک بات اور بتاؤ۔''
''ہوں۔''
''تم نے اب تک یہ نہیں پوچھا کہ عالیہ کہاں ہے۔''
''اپنے والدین کے گھر گئی ہوگی۔''
''ہاں وہ وہیں ہے آج مجھے پتہ چلا ہے شہریار کہ وہ آج تک تمہیں چاہتی ہے ہم دونوں کبھی میاں بیوی نہیں بن سکے کیونکہ اس کے دل میں تم تھے......اور......ہوا اور بس تمہیں شہباز دستی کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔''
''ہاں ضرور بتاؤ تمہاری اس سے کیا دشمنی ہے۔''
''وہ میرا پرانا دوست ہے کالج کے زمانے کا ساتھی۔ میں نے دبئی میں بڑی دولت کمائی پھر پاکستان آ گیا یہاں میری شادی کا سلسلہ چل پڑا میں نے شہباز دستی کے ساتھ مل کر ایک فیکٹری قائم کی میرے پاس سرمایہ تھا اس کے پاس تجربہ کاروبار میں میرا حصہ پچھتر فیصد تھا اور اس کا پچیس فیصد۔ ہم نے سخت محنت کرکے اپنے کاروبار کو بہت آگے بڑھا لیا ہے لیکن اب شہباز دستی کی نیت خراب ہو چکی ہے وہ پورے کاروبار پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور۔''
''اور کیا۔''
''کہتا ہے اپنا سرمایہ واپس لے کر فیکٹری سے دور ہو جاؤ لیکن کچھ اور بھی عوامل ہیں جن کی وجہ سے وہ ایسا ہو گیا ہے۔''
''مثلاً۔''
''عالیہ۔''
''کیا مطلب۔'' شہریار کا سانس رک گیا۔
''عالیہ بھی اس میں ملوث ہے۔''
شہریار کا ذہن ہوا میں اڑنے لگا اس نے چاقو کھول لیا اور خونی نظروں سے شاہد بیگ کو گھورنے لگا۔
''مجھے اندازہ تھا کہ تم یہ سن کر برا مان جاؤ گے لیکن پوری بات سن لو۔ عالیہ نے مجھ سے بے وفائی نہیں کی بلکہ شہباز دستی نے عالیہ پر نیت خراب کی اور مجھے اپنے راستے صاف کرنے کے لیے تمہیں میرے قتل پر مجبور کیا۔''
''عالیہ کا کیا رویہ رہا۔''
''وہ ایک پاکباز لڑکی ہے یقین کرو اگر وہ آج بھی تم سے محبت کا اقرار کرے تو میں اس سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔''
''یعنی۔''
''میں اس کی اور تمہاری محبت کو یکجا کر دوں ان کے پس پردہ ایک اور خواہش بھی ہے۔'' شاہد بیگ نے کہا۔
''کیا۔''
''ظاہر ہے پھر تم مجھے قتل نہیں کرو گے لیکن افسوس آج وہ یہاں نہیں ہے۔''
''تو کیا تم۔''
''ہاں میں آج تک اس کا شوہر نہیں بن سکا میں اسے طلاق دے کر تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔''
''کیا۔'' شہریار کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔
''عالیہ کبھی میری نہیں ہو سکی۔ میرا خیال تھا وہ میری عمر سے منحرف ہے مگر اب مجھے اس کی حقیقت معلوم ہو گئی ہے چنانچہ میں تم سے سودا کر سکتا ہوں۔''
''سودا۔''
''ہاں سودا' مجبوری کا سودا۔'' شاہد بیگ

اداس لہجے میں بولا۔ ”لیکن میں نے لفظ سودا بلاوجہ نہیں کہا۔“
”کیا مطلب۔“
”کیا تم عالیہ کو حاصل کر کے اپنی مجرمانہ زندگی ختم کر دو گے۔“
”میں اس کے لیے زندگی ختم کرنے کو تیار ہوں۔“
”ٹھیک ہے عالیہ کو حاصل کرنے کے لیے تمہیں آخری جرم کرنا ہوگا تبھی عالیہ تمہیں مل سکتی ہے۔“
”آخری جرم۔“
”ہاں۔“
”وہ کیا۔“
”تمہیں شہباز دستی کو ختم کرنا پڑے گا۔ اس کے لیے میں تمہیں اس رقم سے چار گنا زیادہ رقم دے سکتا ہوں جو اس نے تمہیں دی ہے۔“
شہریار کھو سا گیا عالیہ کے حصول کے لیے وہ سب کچھ کر سکتا تھا اسے رقم کی ضرورت نہیں تھی اسے بس عالیہ درکار تھی محبت کبھی کبھی ایسے رنگ بھی اختیار کر لیتی ہے پھر اس نے کہا۔ ”مجھے تمہاری بات پر بھروسہ کیسے ہو۔“
”طلاق نامہ، میں ابھی تمہیں لکھ کر دے سکتا ہوں لیکن تمہیں شہباز دستی کو ختم کرنا ہوگا عالیہ اس وقت تمہیں ملے گی۔“
”میں تیار ہوں۔“ شہریار نے کہا اور شاید بیگ کے ہاتھ کھولنے لگا۔
واپسی میں وہ عالیہ کی قربت کے نشے میں سرشار جب فلیٹ میں داخل ہوا تو اسے احساس ہوا کہ کوئی اندر موجود ہے اس نے جلدی سے خنجر نکال کر ہاتھ میں لے لیا سامنے کے کمرے میں روشنی تھی وہ آہستہ آہستہ اس کمرے کی طرف بڑھنے لگا اندر جو کوئی موجود تھا اسے بھی کسی کے فلیٹ میں آنے کا احساس ہو گیا لیکن روشنی بند نہیں ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔

شہریار حملہ کرنے کی پوزیشن میں آ گیا لیکن اس وقت اسے فضلا کی آواز سنائی دی۔ ”اوئے شیر دل، اوئے شیر دل میں ہوں یار میں ہوں۔“ شہریار نے خنجر والا ہاتھ نیچے کر لیا۔
”تم۔“ وہ بولا۔
”ہاں نا جانی تیری نئی بھابی کے ساتھ۔“
”اندر کیسے آ گئے۔“
”او بھول گیا دوسری چابی میرے پاس ہے۔“
”اوہ کہاں ہے نئی بھابی۔“
”اندر ہے۔“
”چلو ٹھیک ہے میں اپنے بیڈ روم میں جا رہا ہوں۔“
”اوئے نہیں جانی تیرے ساتھ چائے پیوں گا۔“
”ٹھیک ہے چائے بنائی ہے کیا۔“
”او نہیں بھائی اب تو میرے لیے چائے بھی نہیں بنائے گا۔“
”ٹھیک ہے بناتا ہوں ڈرائنگ روم میں آ جانا تھوڑی دیر کے بعد۔“ شہریار نے کہا اور فضلا نے اندر جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔
فضلا کے بڑے احسانات تھے اس پر اسے فضلا کے اعمال سے غرض نہیں تھی، وہ شرابی تھا عیاش تھا شہریار کو اس سے بھی اختلاف نہیں تھا وہ جانے اور اس کا کام، فضلا کے کئی بار اسے بھی عیش کوشی کی دعوت دی تھی لیکن یہاں وہ عالیہ سے مخلص تھا اس نے عالیہ کو اپنے دل میں بسا رکھا تھا وہ اس کے خیال سے غداری نہیں کر سکا تھا اس لیے اس نے فضلا کی کوئی پیشکش قبول نہیں کی تھی۔
اور آج ...... اسے اس کی وفا کا صلہ مل گیا تھا اچھا ہوا اس نے جلد بازی نہیں کی اور شاہد بیگ کو دیکھتے ہی ٹھکانے نہ لگا دیا ورنہ عالیہ کی کہانی راز میں رہ جاتی شاہد بیگ اچھا آدمی تھا اس کے عالیہ کی محبت کی قدر کی تھی اور آخر کار۔

آخرکار۔ اسے زندہ رہنا چاہیے وہ میرا اور عالیہ کا محسن ہے۔ بہت بڑی قربانی دے رہا ہے وہ ہم دونوں کے پیار کے لیے۔

اس نے چائے تیار کی اور ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا کچھ دیر کے بعد فضلا بھی مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔

''کیا زبردست خوشبو آ رہی ہے چائے کی۔''

''بیٹھو......'' اس نے کہا اور فضلا بیٹھ گیا۔

''ہاں جانی۔ تم سناؤ۔''

''بہت بڑی خوش خبری ہے۔'' شہریار نے کہا۔

''اوئے زبردست جانی۔'' فضلا نے چائے کی پیالی اپنی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

''مجھے عالیہ مل گئی۔'' شہریار خوشی کے عالم میں بولا اور فضلا کے ہاتھ سے چائے کی پیالی ہل گئی' عالیہ کے بارے میں اسے تفصیل معلوم تھی۔

''کیا۔'' وہ حیرت سے بولا۔

''ہاں یار مجھے میری زندگی مل گئی۔''

''او میری جان۔ تو میرا میں تیری خوشی میں شریک ہوں۔ کہاں مل گئی۔ کیسے مل گئی مجھے بتا تو سہی۔'' فضلا واقعی خوش ہو گیا۔

''میں......شاہد بیگ کو ٹھکانے لگانے گیا تھا مگر شاہد بیت وہی بندہ نکلا جو دبئی سے آ گیا تھا اور اس نے عالیہ کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ عالیہ اس کی بیوی ہے۔''

''وہ مارا۔ پھر تو تو نے اس ماں کے۔ کے ٹوٹے کر دیے ہوں گے۔''

''نہیں۔''

''ایں۔ چھوڑ دیا اسے۔''

''ہاں۔''

''کیوں۔''

''وہ تو بڑے کام کا بندہ نکلا۔''

''کیسے۔'' فضلا نے پوچھا اور شہریار اسے پوری کہانی سنانے لگا اس نے شہباز دستی کی پوری کہانی بھی اسے سنا دی اور وہ طلاق نامہ بھی فضلا کو دکھایا جسے دیکھ کر فضلا بہت حیران ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

''کیا بات ہے۔'' شہریار نے پوچھا۔

''یار گڑبڑ ہو گئی۔''

''ایں......کیا۔''

''تم شہباز دستی کو قتل کر دو گے۔''

''ہاں۔ میں نے وعدہ کر لیا ہے۔''

''مگر وہ سکندر سیٹھ کا گہرا دوست ہے اور تم جانتے ہو کہ ہم سکندر علی کے گروپ کے بندے ہیں اور وہ ہماری پشت پناہی کرتا ہے۔''

شہریار خاموش ہو گیا پھر اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اس نے اوندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''فضلا۔ یہ میری زندگی کی پہلی خوشی ہے میرے دوست۔ میں نے آج تک زندگی ترس ترس کر گزاری ہے۔ تڑپتا ترستا رہا ہوں میں زندگی بھر۔ عالیہ مجھے مل رہی ہے مجھے میری کائنات مل جائے گی سب کچھ چھوڑ دیا ہے میں نے عالیہ کے لیے سب کچھ۔''

اس کی سسکیاں جاری ہو گئیں اور فضلا جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

''ارے۔ ارے میری جان۔ ارے ارے تیری آنکھوں میں آنسو ارے میرے یار۔''

''ماں باپ' بہن بھائی سب چھوٹ گئے فضلا بھائی عالیہ کے لیے اور اب وہ مجھے ملی ہے تو......تو میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔''

''بھائی کہہ دیا تو نے سسرے۔ بھائی کہہ دیا ارے پاگل میں بھی تو ترسا ہوں ساری زندگی کسی سے بھائی کا لفظ سننے کے لیے۔ بھائی کہہ دیا تو نے۔ اب کسی کی مجال ہے کہ میرے بھائی کا

دل توڑے۔''
فضلا کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے دیر تک دونوں تاثر میں ڈوبے رہے پھر فضلا نے کہا۔
''میں تجھے نئی زندگی کی مبارک باد دیتا ہوں۔ اور سن۔ اب شہباز دستی کو تو نہیں میں ٹھکانے لگاؤں گا۔''
''نہیں بھائی فضلا۔ یہ آخری کام مجھے دیانت داری سے کرنے دے۔''
''میری بات سن شیری۔''
''جی بھائی۔''
''وہ بہت شاطر ہے تجھے کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔''
''نہیں بھائی۔ یہ کام مجھے ہی کرنے دو۔''
شہریار نے کہا اور فضلا خاموش ہو گیا۔
حسب پروگرام شہریار اس وقت شہباز دستی کے آفس میں داخل ہوا جب وہ تنہا تھا شہباز کسی سے فون پر بات کر رہا تھا شہریار کو دیکھ کر اس نے فون بند کر دیا اور مسکرا کر بولا۔
''آؤ شیری۔ یقیناً تم شاہد بیگ کی موت کی خوشخبری لائے ہو۔''
''نہیں شہباز دستی۔'' شہریار نے جیب سے چاقو نکال کر اسے کھولتے ہوئے کہا اور شہباز کو کسی خطرے کا احساس ہو گیا اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔
''کک۔ کیا مطلب۔''
''کھیل بدل گیا۔ شہباز سیٹھ۔''
''کیا کہنا چاہتے ہو۔''
''یہ کہ شاہد بیگ کے بجائے اب تمہیں مرنا ہو گا۔''
''کیا بکواس کر رہے ہو۔''
''تمہیں تمہاری موت کی خوشخبری دے رہا ہوں۔''
''لیکن کیوں۔'' شہباز دستی نے چالاکی سے میز کی دراز سے موبائل فون نکالنے کی کوشش کی تو شہریار غرا کر بولا۔
''اپنی زندگی کو اور کم کرنے کی کوشش مت کرو مسٹر شہباز۔ دونوں ہاتھ میز پر رکھ لو۔'' یہ کہہ کر شہریار نے چاقو حملہ کرنے کے انداز میں پکڑ لیا اور شہباز دستی نے گھبرا کر دونوں ہاتھ میز پر سامنے رکھ دیے پھر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔
''لیکن میں نے تمہیں۔''
''ہاں بولو میں تمہیں بات کرنے کی مہلت دے رہا ہوں۔''
''میں نے تمہیں اسے قتل کرنے کا بھاری معاوضہ دیا ہے۔''
''میں تمہیں وہ رقم واپس بھی کر سکتا ہوں لیکن اب کیا کرو گے موت کے بعد وہ رقم تمہارے کس کام آئے گی اسے میرے پاس ہی رہنے دو۔''
''آخر تمہارا مائنڈ کیسے بدل گیا مجھے بتاؤ تو سہی۔''
''میں یہ چاقو پھینک کر تمہیں قتل کر سکتا ہوں۔ اس میں ایک لمحہ نہیں لگے گا چاقو تمہارے حلق میں پیوست ہو جائے گا۔''
''مگر مجھے میری موت کی وجہ تو بتا دو۔''
''مجھے باتوں میں لگا کر تم کوئی چالاکی کرنے کی کوشش کرو گے تو فوری موت کے شکار ہو جاؤ گے۔''
''میں ایسا نہیں کروں گا۔''
''شاہد بیگ نے تمہارا کچا چٹھا مجھے بتا دیا ہے۔''
''آہ گویا اس نے تمہیں الٹا میرا دشمن بنا دیا۔''
''یہ سمجھ۔''
''وہ بہت شاطر ہے شیری آخر کار اس نے تمہیں بھی بے وقوف بنا دیا۔''

''اس نے نہیں تم نے دنیا کو بے وقوف بنا دیا ہے وہ ایک شریف اور بے ضرر آدمی ہے۔''
''بے ضرر۔'' شہباز نے پھیکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔
''ہاں بے حد شریف۔''
''ہاں وہ اتنا شریف اور بے ضرر ہے کہ اس ظالم نے اپنی معصوم اور خوب صورت بیوی تک کو سسکا سسکا کر ہلاک کر دیا۔''
''ویری گڈ۔ نئی کہانی۔'' شہریار ہنس پڑا۔
''کہانی نہیں ایک ایسا سچ جسے دنیا جانتی ہے۔'' شباز دستی نے کہا۔
''اور دنیا یہ نہیں جانتی کہ تم نے اس کی بیوی کو اپنے جال میں پھانسنا چاہا تھا یہیں سے تم دونوں کی دوستی میں جال پڑا۔''
''کیا اس نے تمہیں یہ کہانی سنائی ہے۔''
''یہ کہانی ہے۔'' شہریار نے طنزیہ کہا۔
''ہاں شیری صرف کہانی۔ اس کی معصوم بیوی اب اس دنیا میں نہیں ہے وہ منوں مٹی کے نیچے سو رہی ہے۔''
شہریار کا دل جیسے بند ہونے لگا اس کے پورے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔ آہ یہ مردود کیا بک رہا ہے شہباز دستی پھر بولا۔
''میں تمہیں اس کی قبر بھی دکھا سکتا ہوں جس پر اس نے بڑا۔ کتبہ لگوایا ہے۔''
''بکواس مت کرو۔'' شہریار حلق پھاڑ کر چیخا۔ اور شباز دستی حیرت سے اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔
''تم اس کی بیوی کے تذکرے پر اس قدر حواس باختہ کیوں ہو گئے۔''
''پلیز۔ یہ بکواس مت کرو۔ پلیز۔ مجھے بتاؤ تم جھوٹ بول رہے۔''
''مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے شہری کیا اس کی بیوی سے تمہارا کوئی رشتہ تھا براہ کرم بیٹھ جاؤ میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہا۔''

''دیکھو۔ دیکھو۔ میں یہ چاقو تمہاری گردن پر پھیر دوں گا میں تمہارے ٹکڑے کر دوں گا مجھے بتا دو تم جھوٹ بول رہے ہو وہ تو بہت اچھا آدمی ہے اس نے میرے لیے اپنی بیوی کو طلاق دیدی ہے یہ دیکھو طلاق نامہ۔''
شہریار نے طلاق نامہ اس کے سامنے کر دیا۔
شہباز دستی نے طلاق نامہ دیکھا اور اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے پھر اس نے کسی قدر زہریلے لہجے میں کہا۔ ''اب تم بیشک مجھے قتل کر دو ورنہ میں تمہیں ایک افسوسناک کہانی سنا دوں گا۔''
''کیسی کہانی بتاؤ۔ پلیز بتاؤ۔''
''تمہارا نام شہریار ہے نا۔''
''ہاں۔'' شہریار نے دھڑکتے دل سے کہا۔
''اس کی بیوی کا نام عالیہ تھا۔''
''تھا نہیں ہے۔'' شہریار بولا۔
''نہیں شہریار عرف شہری۔ ہے نہیں تھا۔''
''تم بکواس بند نہیں کرو گے کیا مطلب ہے تمہارا۔''
''چلو بند کیے دیتا ہوں تمہاری مرضی۔''
''ٹکڑے کر دوں گا سمجھے ٹکڑے کر دوں گا تمہارے۔'' شہریار نے شدید جنوب کے عالم میں لمبا تیز دھار چاقو شہباز دستی کے نرخرے پر رکھ دیا۔
''اپنے بارے میں سنو' تم شاہد بیگ کی بیوی عالیہ کے پڑوسی تھے پھر تم دونوں کے درمیان عشق ہو گیا تمہاری عالیہ سے شادی ہونے والی تھی لیکن اچانک شاہد بیگ درمیان میں ٹپک پڑا اور عالیہ کے والدین نے دولت کی ریل پیل سے چکا چوند ہو کر عالیہ کی شادی عمر رسیدہ شاہد بیگ سے کر دی۔ کیا سمجھے۔ یہ جھوٹ ہے۔''
''نہیں۔''

''اور تم وہی شہریار ہو۔''

''ہاں۔ آگے بولو۔''

''چاقو میری گردن کاٹ رہا ہے۔ اسے ہٹاؤ۔''

''ایک شرط پر۔''

''کیا۔''

''تم صرف سچ بولو گے۔''

''تمہاری شناخت میرا سچ نہیں ہے۔''

''ہاں۔''

''تب میں آگے بھی سچ بولوں گا چاقو ہٹاؤ۔'' شہریار نے جلدی سے چاقو شہباز کی گردن سے ہٹا لیا تو اس نے کہا۔ ''یہ طلاق نامہ بہت بڑا فراڈ ہے اس نے جان بچانے کے لیے تمہارے ساتھ یہ فریب کیا ہے جبکہ تمہارے اور عالیہ کے عشق کی کہانی سن کر اس نے عالیہ سے بھیانک انتقام لیا شادی کے بعد وہ کبھی اپنے میکے نہیں جا سکی اس نے چار سال شدید اذیت میں گزارے اور پھر زندہ نہ رہ سکی اور سسک سسک کر مر گئی۔''

''خدا کے لیے۔ یہ مت کہو۔''

''وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ شاہد اسے ہفتوں بھوکا پیاسا رکھتا تھا شدید اذیتیں دیتا تھا۔''

''نہیں پلیز نہیں۔''

''بہت سے لوگ گواہ ہیں فیکٹری کے ملازم بھی۔ تم چاہو تو میں انہیں بلا کر عالیہ کی موت کی تصدیق کرا سکتا ہوں۔''

''نہیں۔'' شہریار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

شام کو شہریار گھر پہنچا تو فضلا اسے دیکھ کر چونک پڑا۔ شہریار کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ رنگ زرد تھا اور وہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔

''ارے خیر ہے جانی۔ تمہیں کیا ہوا۔''

''برباد ہو گیا یار۔ تقدیر نے ایک بار پھر چرکہ لگا دیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔''

''مجھے بتاؤ تو...... کیا ہوا۔''

''اس نے بہت بڑا دھوکہ کیا ہے میرے ساتھ۔''

''کس نے۔''

''شاہد بیگ نے۔''

''ایں۔ کیسے کیا طلاق نامہ۔''

''جسے اس نے طلاق دی ہے وہ اب اس دنیا میں ہی نہیں ہے۔''

''کیا۔'' فضلا اچھل پڑا۔

''عالیہ کو مرے ہوئے ایک سال گزر چکا ہے۔''

''کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔'' فضلا سر کھجاتا ہوا بولا۔

''ہاں یار۔ اس نے میری عالیہ کو مار دیا۔'' شہریار ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا پھر اس نے ساری کہانی فضلا کو سنا دی۔

''یہ تمہیں شہباز نے بتایا ہے۔''

''ہاں۔''

''ممکن ہے اس نے بھی اپنی جان بچانے کے لیے یہ کہانی گھڑی ہو۔''

''نہیں ہر بات کی تصدیق ہو گئی ہے بہت بری طرح اذیت دی ہے شاہد نے اسے۔ بہت بڑی سزا ملی ہے اسے۔ مار دیا اس نے میری عالیہ کو۔ مر گئی میری عالیہ۔''

''حوصلہ کرو شہری میرے یار۔ تمہاری عالیہ تو اس دن مر گئی جب تم ساری رات اس کا انتظار کرتے رہے اور وہ نہ آئی۔''

''وہ بے وفا نہیں تھی مجبور تھی۔''

''اس کی مجبوری نے تم سے سب کچھ چھین لیا شہری۔''

''میں اس سے شکایت کرنے جا رہا ہوں فضلا میرے بھائی۔''

"کک ...... کیا ...... کہاں۔"

"اس دنیا میں۔ جہاں وہ چلی گئی ہے۔"

"کیا فضول بات کررہے ہو۔" فضلا تڑپ کر بولا۔

"ہاں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا میں۔ یہ اس سے بے وفائی ہوگی۔"

"اور شاہد بیگ ...... اس کا قاتل۔"

"اسے بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ عالیہ کی عدالت میں۔ وہ روپوش ہوگیا ہے لیکن میرا نام بھی شہریار ہے ڈھونڈ لوں گا اسے۔ کتے کی موت ماروں گا اسے۔ ایسی موت کہ اس نے خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا۔"

"میری بات سنو شہری۔"

"میرے دوست۔ میرے بھائی۔ مجھے دعا دو کہ میں اپنی عالیہ کے قاتل کو تلاش کروں۔"

اس کی لگن سچی تھی کہ صرف تین دن کے بعد ہی شاہد بیگ اسے نظر آگیا وہ ایک ہوٹل میں داخل ہوا تھا اور شہریار نے اسے دیکھ لیا تھا۔

پھر کئی گھنٹے شہریار کو انتظار کرنا پڑا۔ البتہ وہ اس کی کار کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہوگیا تھا اسے کام اب اس کے لیے مشکل نہیں تھے۔ پھر شاہد بیگ واپس آیا اور کار میں بیٹھ کر چل پڑا۔ شہریار کو اندازہ نہیں ہوسکا کہ وہ کہاں جارہا ہے لیکن ایک سنسان سڑک پر وہ سیٹوں کے درمیان سے نکل کر سیدھا ہوگیا اور اس نے سیٹوں کی نال شاہد کی گدی پر رکھ دی۔ شاہد کے ہاتھ اسٹیرنگ پر بہک گئے تھے۔

"چلتے رہو۔ چلتے رہو میری جان۔ گاڑی مت روکنا۔"

"تت تم ...... شہری ...... شہریار۔"

"عالیہ کا شہریار۔"

"مم مگر یہ کیا ہے۔"

"پستول۔"

"میری گردن پر کیوں ہے۔"

اندازِ فکر

سوال: آپ کے شوہر کیسے ہیں مسز کولن؟

جواب: بہت بیمار ہیں انہیں خون کی کمی کی شکایت ہے۔ ان کے جسم میں خون اتنا کم ہے کہ اگر کبھی رات کو دیر تک جاگتے ہیں تو اگلی صبح صرف ایک آنکھ سرخ ہوتی ہے۔

☆☆☆

سوال: میں نے سنا ہے آپ کے شوہر کسی حادثے کا شکار ہوگئے تھے؟

جواب: ہاں اور اس حادثے میں ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ہوا یہ کہ انہوں نے کھلے مین ہول میں پہلے سگریٹ پھینکا اور عادتاً جوتے کی نوک سے اسے بجھانے کی کوشش کی تھی۔

☆☆☆

ایک استاد نے بچوں کو ہمارے ماں باپ کے عنوان سے مضمون لکھنے کے لیے دیا۔ ایک بچے نے کچھ اس طرح سے لکھا ہوا تھا۔

"ہمارے ماں باپ ہمیں اس وقت ملتے ہیں جب وہ بڑے ہو چکے ہوتے ہیں لہٰذا ان کی عادتوں کو بدلنا ہمارے لیے مشکل ہوتا ہے۔"

☆☆☆

ایک مرتبہ میاں بیوی دونوں ایک ساتھ بیمار ہوگئے مثلاً پیٹ میں درد، چکر آنا، متلی وغیرہ۔ ڈاکٹر کے خرچے سے بچنے کی خاطر دونوں میاں بیوی نے یہ طے کیا کہ دونوں میں سے ایک ڈاکٹر کے پاس جائے۔ انہوں نے ٹاس کیا اور فیصلہ بیوی کے حق میں ہوا۔

ڈاکٹر سے ملاقات کے بعد واپسی پر جب شوہر نے بیوی سے پوچھا کہ ڈاکٹر نے کیا کہا تو بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا کہ "ڈاکٹر کی تشخیص کے مطابق ہم دونوں امید سے ہیں۔"

''عالیہ کا خون تمہاری ہی گردن پر ہے۔ اپنے فلیٹ پر چلو۔''

کچھ دیر کے بعد شہریار شاہد بیگ کو پستول کے۔ فلیٹ میں داخل ہو گیا۔ اندر پہنچ کر روشنیاں جلائیں اور پھر ایک زوردار لات شاہد کی کمر پر رسید کی اور شاہد اچھل کر دور جا گرا۔

''آخر...... آخر......'' اس کے منہ سے نکلا۔ موت کے سائے اس کے چہرے پر رقصاں ہو گئے تھے۔

''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے شہریار۔''

''عالیہ کہاں ہے۔'' شہریار غرایا۔

''میکے۔ میکے گئی ہے وہ۔''

''افسوس۔ میکے تو تم نے اسے ایک بار بھی نہیں جانے دیا۔''

''اس مکار شہباز نے تمہیں یہ کہانی سنائی ہو گی۔''

''نہیں اس نے نہیں بہت سے لوگوں نے۔ تم میری اس سے بات کرا سکتے ہو لو میرے فون سے اس کا نمبر ملاؤ۔ بات کراؤ میری اس سے۔''

''میری بات تو سنو۔''

''ساری باتیں سن لی ہیں میں نے بس اب دیر نہ کرو۔ ہم دونوں عدالت عالیہ میں چل رہے ہیں وہیں چل کر باتیں کریں گے۔''

شہریار نے پستول جیب میں رکھ کر چاقو نکالیا اور شاہد لرز گیا۔

''شہریار...... مجھے معاف کر دو۔ میں تمہیں اتنی دولت دوں گا کہ......'' ابھی شاید نے اتنا ہی کہا تھا کہ شہریار باز کی طرح جھپٹا اور اس نے شاہد کو دبوچ لیا پھر اس کی قمیص کی آستین کاٹی اور اسے رول کر کے شاہد کے حلق میں ٹھونس دیا۔

اب شاہد صرف اشاروں سے اس سے معافی مانگ رہا تھا۔ زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا تب شہریار نے اس کے بازو میں چاقو پیوست کر دیا اور اسے چیرتا چلا گیا۔ شاہد بری طرح تڑپنے لگا تھا۔

''تم نے اسے بھوکا رکھا تھا۔''

شاہد نفی میں گردن ہلانے لگا تھا۔

''مارا بھی ہو گا۔''

''اور......اور۔''

ہر جملے کے ساتھ وہ شاہد کے جسم پر چاقو کے وار کرتا جا رہا تھا اور شاہد کے جسم سے خون کی دھاریں پھوٹ رہی تھیں لیکن شہریار کا جنون ختم نہیں ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہے نا عالیہ۔ دیکھو بس میرے آنے کی دیر تھی۔ سارے بدلے چکا دیتا ہوں میں تمہارے۔'' شہریار پر جنون طاری تھا اس کے لبوں میں وحشتیں ناچ رہی تھیں اس کے ہاتھ میں دبا چاقو وحشیانہ انداز میں شاہد بیگ کے جسم کو چھلنی کر رہا تھا۔ وہ ہر ضرب کو لگاتے ہوئے مسکرا کر عالیہ کی تصویر کو دیکھتا تھا۔

''ٹھیک ہے نا عالیہ۔ ٹھیک ہے نا میری زندگی' چار سال اذیتیں برداشت کی ہیں نا تم نے میرے لیے دیکھو۔ میں اس سے تمہارا بدلہ لے رہا ہوں۔ دیکھو عالیہ کیا پھڑ پھڑا رہا ہے یہ۔''

شاہد کا جسم سرد ہو گیا لیکن شہریار کی وحشت کم نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے شاہد کے جسم کا قیمہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک انچ کی جگہ بھی نہیں چھوڑی تھی۔ پھر وہ خود بھی تھک گیا اور اس نے غور سے شاہد کو دیکھا۔

''ارے یہ تو چل بسا مجھ سے پہلے تمہارے پاس پہنچ گیا نہیں میری جان اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں بس ایک منٹ میں آ رہا ہوں۔ آیا میں۔'' اس نے چاقو پھینک کر جیب سے پستول نکالا اس کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔

وحشت زادے

ایم اے راحت

وہ بہت ٹھنڈے دل و دماغ کا بہت مستقل مزاج آدمی تھا۔ اس نے بنگلے پر کوئی ہنگامہ نہیں کیا اور یونس سے کہا کہ وہ دوسرے دن یعنی بدھ کی شام کو اس کے گھر آکر اس مسئلے پر بات کرے گا۔ یونس نے آمادگی کا اظہار کیا اور رخصت ہو گیا۔ بدھ کی شام ساڑھے آٹھ بجے سیٹھ شمشاد بیگ اس کے فلیٹ پہنچا جو کہ نوری نگر کی ایک نو تعمیر پانچ منزلہ پلازہ کی آخری منزل پر واقع تھا۔ فلیٹ میں بجلی جل رہی تھی۔ اس سے سیٹھ شمشاد بیگ نے اندازہ لگایا کہ یونس اندر موجود ہے۔

ایک معاشرتی کہانی، عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے

کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ اس قسم کے قہوہ خانے نجانے کہاں کہاں کھلے ہوئے ہیں۔ تعلقات والی عورتوں نے صاحب اقتدار لوگوں کی مدد سے یہ جگہیں قائم کر رکھی ہیں۔ وہ دونوں بھی سسٹر ڈیوسیانہ کے اس قہوہ خانے میں داخل ہوئے۔ یہاں اس طرح کے مہمانوں کے لیے ہر طرح کی آسائشیں موجود تھیں۔ نوشابہ اور اس کے ساتھی جس نے اپنا صرف پاشا بتایا تھا' نے سسٹر ڈیولیانہ سے بات کی اور انہیں ایک کمرہ حاصل ہو گیا۔ نوشابہ ایک عجیب سی کیفیت کا شکار تھی۔ حالانکہ پاشا کے ساتھ اس نے صرف کافی پی تھی لیکن کافی پینے کے بعد ہی اسے ہلکے ہلکے نشے کا سا احساس ہوا تھا۔ یا تو پاشا نے کوئی کارروائی کی تھی۔ یا پھر خود اسی کی طبیعت خراب تھی۔

بہر طور وہ دونوں فرضی نام اور پتے کے ساتھ اس کمرے میں مقیم ہو گئے پھر صبح نو بجے تک جب اس کمرے کے مہمان بیدار نہ ہوئے تو سسٹر ڈیولیانہ کو بڑا غصہ آیا' مہمانوں کے لیے ہدایت نامہ موجود تھا۔ انہیں آٹھ بجے تک کمرا چھوڑ دینا ہوتا تھا۔ وہ غصے سے تیز تیز قدم رکھتی ہوئی کمرے پر پہنچی کمرے میں وہ لڑکی بے خبر سو رہی تھی۔ جو رات کو اپنے ساتھی کے ساتھ اس کمرے پر پہنچی کمرے میں وہ لڑکی بے خبر سو رہی تھی۔ جو رات کو اپنے ساتھی کے ساتھ اس کمرے میں مقیم ہوئی تھی۔ اس کا جسم کسی تراشے ہوئے مجسمے کی طرح خوب صورت اور سڈول تھا۔ اس کے سینے پر ایک سرخ گلاب رکھا ہوا تھا۔ جس کی پتیاں بکھر گئی تھیں۔ سسٹر ڈیولیانہ نے دروازہ آہستہ سے بند کیا اور لڑکی کو بیدار کرنے کے لیے جھکی اور پھر دم بخود رہ گئیں۔ ان کے اندر ایک ہلکی سی کپکپاہٹ بیدار ہو گئی تھی۔ کیونکہ لڑکی مر چکی تھی۔ اس کے دل کے اوپر خنجر کا ایک گہرا گھاؤ تھا۔ جس سے نکلنے والا خون جم گیا تھا اور اس خون کو گلاب کی پتیوں نے چھپا لیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ اس موت کی خبر فوری طور پر پولیس کو کی جائے۔

میجر شاہ کسی زمانے میں ملٹری انٹیلی جنس کے ایک اہم رکن تصور کیے جاتے تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے اپنا ایک ارادہ قائم کر لیا۔ مقامی طور پر پرائیویٹ جاسوسی کے لائسنس تو جاری نہیں کیے جاتے لیکن میجر شاہ خصوصی مراعات کے ساتھ اپنا یہ کاروبار چلا رہے تھے۔ دو اسٹنٹ شارق اور صوفیہ انہوں نے اپنے ساتھ رکھے تھے۔ اکثر پولیس بھی ان سے مدد لے لیا کرتی تھی اور وہ پولیس کے پسندیدہ افراد میں سے تھے۔

بہر حال اس دن بھی وہ اپنے دونوں ماتحتوں کے ساتھ بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے کہ ایک خاتون اندر داخل ہوئیں میجر شاہ نے انہیں پہچان لیا۔ یہ میڈم رخسانہ تھیں۔ کافی عرصہ پہلے میجر شاہ کے تعلقات طاہر علی صاحب سے تھے اور اس وقت مسز رخسانہ ان کی بیگم تھیں لیکن ان کی موت کے بعد مسز رخسانہ ان کے کاروبار کی مالک بن گئیں۔ اور پھر انہوں نے اپنے منیجر الیاس بیگ سے شادی کر لی' ان کی بیٹی نوشابہ اپنے سوتیلے باپ سے بالکل منحرف تھی۔ اس کے اپنے باپ نے اس کے لیے اچھی خاصی دولت چھوڑی تھی اور اس نے علیحدہ رہائش اختیار کر لی تھی۔

اس وقت میڈم رخسانہ کو دیکھ کر میجر شاہ کو سب کچھ یاد آ گیا۔

''آیئے میڈم کیسی ہیں آپ۔''

''آپ نے مجھے پہچان لیا۔''

''آپ کو نہ پہچاننے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔''

''میں آپ کے پاس ایک بہت ضروری کام سے آئی ہوں۔ مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔''

''جی جی...... فرمایئے۔''

''میری بیٹی نوشابہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ آپ نے اخبارات میں خبر پڑھی ہوگی۔''

''اوہو...... کیا سسٹر ڈیولیانہ کے گھر پر جو لاش ملی ہے وہ آپ کی بیٹی نوشابہ کی تھی۔''

''ہاں ...... لیکن جو کچھ اخبارات میں لکھا گیا ہے۔ وہ قطعی غلط ہے۔ خدا کی قسم میری بیٹی ایسی نہیں تھی' اسے دھوکہ دے کر وہاں لے جایا گیا۔ طریقہ کار کچھ بھی رہا ہو' پولیس نے بالکل غلط فیصلہ کیا ہے اور اسے پھر اس آوارگی کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو خود کچھ عرصے کے بعد شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس کے باپ کا چھوڑا ہوا کافی کچھ اس کے پاس موجود ہے۔''

''ٹھیک ہے کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گی کہ کوئی اس کا مرکز نگاہ تھا۔ یعنی کوئی ایسا شخص جس سے وہ شادی کرنا چاہتی ہو۔''

''بالکل نہیں یا اگر ہو بھی تو اس نے آج تک مجھ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا یہ تو میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ دوسری شادی کرنے کے بعد وہ مجھ سے کشیدہ رہنے لگی تھی۔''

''کیا آپ یہ بتا سکتی ہیں کہ الگ رہتے ہوئے اس کے مشاغل کیا رہتے تھے۔''

''بالکل نارمل۔ اگر آپ اس کے کردار کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ سے پورے دعوے کے ساتھ یہ بات کہہ سکتی ہوں کہ وہ ایک باکردار لڑکی تھی اور جس انداز میں اس کا قتل ہوا ہے۔ وہ تو تصور سے بھی باہر ہے۔''

''ہوں۔'' میجر شاہ نے پر خیال انداز میں نچلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے کہا۔ اور پھر دیر تک خاموش رہا اور پھر بولا۔ ''ایک بات تو بتائیے۔ میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔''

''کمال ہے۔ آپ جو کچھ کر رہے ہیں۔ مجھے اس کا علم ہے۔ اگر آپ اپنے کسی معاوضے کی بات کرتے ہیں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔'' میجر شاہ ہنسنے لگے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''نہیں میرے آپ کے شوہر کے ساتھ اتنے گہرے تعلقات تھے کہ اگر میں آپ کے لیے کوئی کام کروں تو اس کا کوئی معاوضہ طلب نہیں کروں گا۔''

''تو آپ براہ کرم پولیس سے رابطہ قائم کیجیے۔ پولیس نے اس سلسلے میں کافی کام کیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ آپ کی مدد ضرور کر سکتی ہے۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی پھر میجر شاہ نے ٹیلی فون اٹھایا اور پولیس آفس کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔ انہوں نے انسپکٹر نواز کو طلب کر لیا تھا۔

''میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ میرے آفس آ جاؤ۔''

''کوئی بہت ضروری کام ہے۔''

''ہاں ...... وہ لڑکی نوشابہ جو سسٹر ڈیولیانہ کے کمرے کے بیڈ پر ختم ہوئی ہے۔ اس کے بارے میں تمام تفصیلات لے کر آ جاؤ۔'' انسپکٹر نواز بیشک میجر شاہ کا ملازم نہیں تھا۔ نہ میجر شاہ کوئی بڑا پولیس آفیسر تھا لیکن بہت سے معاملات میں میجر نے خود انسپکٹر شاہ کی بڑی مدد کی تھی اور میجر شاہ کی مدد سے انسپکٹر نواز ایس آئی سے انسپکٹر بنا تھا۔ وہ ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک فائل اٹھائے ہوئے میجر شاہ کے آفس میں داخل ہو گیا۔ وردی میں ملبوس تھا اور بہت شاندار نظر آ رہا تھا لیکن میجر شاہ جانتے تھے کہ اس کا اپر چیمبر بالکل خالی ہے اور وہ کبھی کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کر سکا۔ اس نے تمام کاغذات کچھ ٹرانسپیرنسی وغیرہ میجر شاہ کے سامنے رکھ دیں۔

''کہاں تک پہنچے۔''

''بس سر! ابھی تو ابتدائی منزل میں ہوں۔''

''اچھا...... ذرا دیکھو!'' میجر شاہ نے شارق سے کہا اور شارق وہ ہیئر ڈراؤن اٹھا لایا جس میں اسے ٹرانسپیرنسی دیکھنا تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہیئر ڈراؤن پر ٹرانسپیرنسی لگا کر اس نے اس کا سوئچ آن کر دیا اور میجر شاہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆

ایک بار پھر وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ ٹرانسپیر نسیوں سے تصویر غائب ہو جانے سے انسپکٹر نواز پریشان تھا اور حیران بھی میجر شاہ نے اس سے لاش کی کیفیت زبانی بتلانے کے لیے کہا۔

''لاش بستر پر چت پڑی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے نوشابہ سو رہی ہے اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ سینے پر عین زخم کے اوپر ایک گلاب کا پھول رکھا ہوا تھا۔ جس کی پتیاں ٹوٹ کر زخم پر بکھر گئی تھیں۔ اس لیے پہلی نظر میں نظر نہیں آتا تھا۔ وار عین دل پر کسی تیز دھار لیکن باریک خنجر سے کیا گیا تھا۔ اس لیے خون برائے نام نکلا تھا اور لاش بالکل عریاں تھی۔''

''یہ ٹیپ کا بند ہے۔'' شارق نے آہستہ سے کہا۔ میجر شاہ نے اسے غصے سے گھورا۔

''یہ گلاب کا پھول کیا ہوٹل کے باغیچے سے لیا گیا تھا۔'' میجر شاہ نے پوچھا۔

''نہیں' اس گھٹیا ہوٹل میں باغیچہ تو کیا گلاب کا پودا تک نہیں ہے۔'' پھر اچانک اسے اس سوال کی اہمیت کا احساس ہوا۔ ''اوہ سر! آپ نے تو بہت بڑا نکتہ پکڑ لیا' اتنی رات گئے قاتل وہ پھول لایا کہاں سے۔''

''قتل کسی جنات نے نہیں کیا ہے۔ وہ گلاب کا پھول گل بکاؤلی کے باغ سے لایا ہوگا۔'' شارق نے فوراً کہا۔

''تم خاموش نہیں رہ سکتے۔'' میجر شاہ نے ڈانٹا۔

''رہ سکتا ہوں۔ بشرطیکہ یہ احمق بھی ہمیں الف لیلیٰ کی کہانی نہ سنائے۔'' اس نے انسپکٹر نواز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

اس سے پہلے کہ نواز جواب دیتا میجر بول پڑا۔ ''اچھا ختم کرو یہ نوک جھونک ہاں نواز وہ خنجر ملا جس سے قتل کیا گیا تھا۔''

''جی نہیں' خنجر وغیرہ کچھ نہیں ملا۔''

''ہوں تو آلہ قتل بھی نہیں ملا۔'' میجر شاہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''قاتل کوئی اناڑی معلوم نہیں ہوتا' ایک ہی وار میں اس نے لڑکی کو ٹھکانے لگا دیا اور خنجر بھی ساتھ لے گیا۔''

''آپ نے وہ شعر سنا ہے میجر۔ کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ...... قاتل خودکشی کے لیے خنجر ساتھ لے گیا ہوگا۔''

''تم باز نہیں آؤ گے۔''

''کیسے باز رہوں۔ اتنی رومانی داستان دو چاہنے والے ظالم سماج کے ڈر سے چھپ کر ہوٹل جاتے ہیں اور پھر مر جانے کا عہد کرتے ہیں۔ محبوب آنکھیں بند کر کے اپنی انارکلی کو خنجر کی نوک سے ہمکنار کرتا ہے۔ اس کی لاش پر محبت کا گلاب رکھ کر دیوانہ وار باہر نکل جاتا ہے اور پھر کسی ویرانے میں پہنچ کر وہی خنجر اپنے دل میں پیوست کر لیتا ہے۔ بس اس کی لاش تلاش کر لو۔ کیس مکمل ہو جائے گا۔''

''شارق یہ نہ بھولو کہ نوشابہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی۔'' میجر شاہ نے اسے غصے سے گھورا۔

''لیکن میجر۔'' نواز نے ہچکچاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''وہ' وہ شریف لڑکی نہیں تھی۔ سرسری معائنے کے مطابق وہ کنواری نہیں تھی۔''

''گمراہی پر چلنے کے لیے کسی کو مجبور کرنے کے دو مؤثر طریقے ہیں' بلیک میل اور منشیات کا استعمال۔'' میجر شاہ نے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم سے یہ تو نہیں ظاہر ہوا کہ وہ منشیات کی عادی تھی۔'' نواز نے اپنی گھڑی دیکھی اور کھڑا ہو گیا۔ ''میں فون کر کے معلوم کرتا ہوں۔ ٹرانسپیر نسیوں کے معمہ کے علاوہ پوسٹ مارٹم کے بارے میں بھی معلوم کرتا ہوں۔ کیونکہ ابھی تک وہ مکمل نہیں ہوا تھا۔''

وہ فون پر کسی سے بات کرتا رہا۔ ٹرانسپیر نسیوں کے بارے میں وہ بار بار جھنجھلاہٹ اور غصے میں دیر تک الجھتا رہا۔ اس کے بعد پوسٹ

مارٹم رپورٹ کے بارے میں پوچھا۔ چند لمحے بعد جب میجر کی طرف مڑا تو چہرہ فق تھا۔

''وہ ٹرانسپرنسیوں کے لیے تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ کہیں غلطی سے ڈبہ تو بدل نہیں گیا۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن پروفیسر...... پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بارے میں میں کچھ نہیں بتلا سکوں گا۔''

''کیوں ابھی تک پوسٹ مارٹم مکمل نہیں ہوا۔''

''نہیں ......نہ مکمل ہوا اور نہ ہو سکے گا۔''

''کیوں میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکا۔'' میجر نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اس لیے کہ......نوشابہ کی لاش اچانک پانی کی طرح بہہ گئی۔ اس کی ہڈیاں بھی باقی نہ رہیں۔''

''کیا۔'' شارق حیرت سے اچھل پڑا۔

''جس طرح ٹرانسپیرنسی سے تصویریں غائب ہو گئیں' اسی طرح اس کا جسم بھی باقی نہیں رہا۔ میجر آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔'' نواز نے بے بسی کے عالم میں پوچھا۔

میجر شاہ خاموش تھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆☆

رخسانہ جیسے ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ الیاس بیگ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''رخسانہ تم کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ میں نے سب جگہ فون کر لیا بس پولیس اسٹیشن باقی رہ گیا تھا۔'' اس نے غصے میں کہا۔

''مجھے افسوس ہے الیاس صاحب۔'' رخسانہ نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔''

الیاس بیگ نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن تم کہاں چلی گئیں تھیں۔ ڈارلنگ۔''

رخسانہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''تم جانتے ہو کہ نوشابہ کی موت کا مجھے کتنا صدمہ ہے۔ الیاس جب تک اس کا قاتل گرفتار نہیں ہو جاتا۔ مجھے چین نہ آئے گا۔ مجھے اچانک یہ خیال آیا کہ پولیس نوشابہ پر کیچڑ اچھالنے کے سوا کچھ نہ کر سکے گی۔ اس لیے میں ایک جگہ گئی تھی۔ ایک ایسے شخص کے پاس جو قاتل کو گرفتار بھی کرا سکتا ہے اور نوشابہ کی بے گناہی بھی ثابت کر سکتا ہے۔''

''لیکن پولیس سے بہتر یہ کام اور کون کر سکتا ہے رخسانہ۔''

''میجر شاہ' لیکن شاید تم اسے نہیں جانتے ہو گے۔'' رخسانہ نے کہا۔ ''جو کام پولیس نہیں کر سکتی وہ کر سکتے ہیں۔''

الیاس بیگ کے چہرے پر ایک لمحہ پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے پھر وہ فوراً ہی اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ ''مجھے تمہارے دکھ کا احساس ہے۔ ڈارلنگ اس طرح تو نوشابہ کی اور بدنامی ہو گی۔''

''نہیں الیاس تم میجر شاہ کو نہیں جانتے وہ قاتل کو گرفتار کرانے کے لیے سب حقیقت معلوم کر لیں گے کہ نوشابہ کو اس ظالم بدرالدین نے مجبور کیا۔ وہ اپنی مرضی سے ایسی حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ جب تک بدنامی کا یہ داغ اس کے دامن سے دور نہیں ہو جاتا مجھے چین نہیں آئے گا۔''

''تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ اخراجات کہاں سے آئیں گے۔ بزنس کا حال تم جانتی ہو اور میجر شاہ جیسے لوگ لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ آخر پولیس کس لیے ہے۔''

رخسانہ غور سے اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ ''میں نے ابھی کہا تھا ناں کہ تم شاہ کو نہیں جانتے وہ پیشہ ور سراغرساں نہیں ہیں۔ وہ کوئی معاوضہ نہیں لیتے وہ نوشابہ کے باپ کے دوست بھی ہیں اور اگر خرچے کی بات ہوتی بھی تو میں تمہاری کمائی سے خرچہ ادا نہ کرتی۔ بیشک نوشابہ کی موت کے بعد وصیت کے مطابق اس کی کروڑوں کی دولت میں

وارث ہوں لیکن الیاس میں نوشابہ کے نام سے بدنامی کا داغ دھونے کے لیے یہ ساری دولت خرچ کر دوں گی۔ ویسے بھی اس دولت کی ایک پائی بھی مجھ پر حرام ہے۔ میں یہ ساری دولت کسی ٹرسٹ یا یتیم خانے کو دے دوں گی۔ تاکہ میری بچی کا نام ہمیشہ عزت سے لیا جائے۔ سمجھے۔''
رخسانہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

الیاس کا چہرہ غصے سے سیاہ پڑ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ رخسانہ ٹھیک ہے۔ تم ذہنی طور پر ابھی بہت پریشان ہو۔ جاؤ آرام کرو۔''

رخسانہ کو بیڈ روم تک پہنچا کر وہ ایک کام کے بہانے باہر نکل گیا۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے الیاس بیگ وعدے کے مطابق ایک ویران ہوٹل میں بیٹھا تھا اور اس کے سامنے جو شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا حلیہ نوشابہ کے قاتل بدر سے بہت ملتا جلتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے سیاہ بال اب نیم سفید نظر آرہے تھے۔ لباس بھی معمولی اور ملگجا تھا اور چہرے پر جھریاں نمایاں تھیں اور وہ بہت خوفزدہ نظر آرہا تھا۔ کیونکہ درحقیقت یہ وہی شخص تھا۔ جو نوشابہ کو ہوٹل میں لے کر گیا تھا۔ جس نے اپنا فرضی نام پاشا بتایا تھا۔ اور جس کی پولیس کو تلاش تھی اور جس کا اصلی نام بدرالدین تھا۔ پولیس نے لوگوں کی انفارمیشن کے مطابق اس کی جو شناختی تصویر بنا کر اخبارات کو جاری کی تھی۔ وہ اس سے بہت ملتی جلتی تھی۔

بدر خوب صورت لباس اور امیرانہ ٹھاٹ باٹ کے ذریعے خوب صورت لڑکیوں کو پھنسا کر گناہ کی راہ پر لگانے کا بڑا ماہر تھا۔ اسے اپنے فن پر اتنا عبور حاصل تھا کہ ان گنت لڑکیوں کو پھنسا کر گناہ کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھیں۔ ان کو بلیک میل کر کے وہ آرام دہ زندگی بسر کرتا رہا تھا اور اس لیے الیاس بیگ نے اس کی خدمات حاصل کی تھیں۔

''تم رقم لے آئے ہو۔'' بدر نے الیاس بیگ سے پوچھا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔

''رقم ...... تم نے سارا بیڑہ غرق کر دیا۔ پھر بھی رقم کی بات کر رہے ہو۔'' الیاس نے غصے سے کہا۔

''اس میں میرا کیا قصور ہے۔'' بدر کا چہرہ اچانک خطرناک ہو گیا تھا۔ ''میں نے تم کو ابھی بتا دیا ہے کہ نوشابہ کے قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اسے زندہ چھوڑ کر آیا تھا' اسے شراب میں خواب آور دوا بھی پلا دی تھی۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے کپڑے بھی ساتھ لے آیا تھا تاکہ صبح کو جب پولیس ہوٹل پہنچے تو اسے شرمناک حالت میں پائے۔ تمام اخبارات میں اس کا چرچا ہو۔ وہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ تم یہی تو چاہتے تھے۔''

''لیکن قتل کا الزام تم پر لگ چکا تھا۔ پولیس تم کو قاتل قرار دے رہی ہے۔''

''یہ جھوٹ ہے تم جانتے ہو یہ جھوٹ ہے۔'' بدر نے جلدی سے کہا۔ ''میں اسے کیوں ہلاک کرتا۔''

''لیکن یہ تم کہہ رہے ہو...... کون اس پر یقین کرے گا۔ قتل کی وجہ سے سب کام بگڑ گیا اس کی ماں نے عہد کر لیا ہے کہ نوشابہ کی ساری دولت یتیم خانے کو دے دی گی۔ مجھے کیا ملا جو تم کو معاوضہ دوں۔'' الیاس بیگ غصے میں سب کچھ بول گیا۔ پھر گھبرا کر بولا۔ ''میرا مطلب ہے۔''

''میں تمہارا مطلب پہلے ہی سمجھ رہا تھا۔ الیاس بیگ کوئی سوتیلا باپ ایسی حرکت بلا لالچ کے نہیں کرتا۔''

''تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔ میں پولیس کو۔''

''رہنے دو الیاس صاحب! میں گرفتار ہوا تو تم بھی نہیں بچو گے۔ رقم میرے حوالے کرو اور جا

کر خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔ ورنہ......"

الیاس جانتا تھا کہ بدرالدین کی دھمکی وزن رکھتی ہے۔ اس نے خاموشی سے رقم اس کے حوالے کر دی اور خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ "تم بہت کمینے ہو بدرالدین اب مجھے کبھی اپنی شکل نہ دکھانا۔ ورنہ خواہ انجام کچھ بھی ہو۔ میں پولیس کو مطلع کر دوں گا۔" وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

بدر نے رقم جیب میں رکھی وہ جلد از جلد اس شہر سے بہت دور نکل جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اگر پکڑا گیا تو قتل کے الزام سے بچنا مشکل تھا۔ یہ اور بات تھی کہ قتل واقعی اس نے نہیں کیا تھا۔ ہوٹل سے نکل کر وہ ایک تنگ و تاریک گلی میں تیز تیز قدم رکھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ہوٹل سے نکل کر وہ ایک تنگ و تاریک گلی میں تیز تیز قدم رکھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ سر پر کوئی پہاڑ آ گرا ہو۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ اس شخص کے بازوؤں میں جھول گیا۔ جس نے عقب سے اس کے سر پر وار کیا تھا۔ اس شخص نے اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی کار کی عقبی سیٹ پر ڈال دیا۔

کار رات کی تاریکی میں گلی سے نکل کر غائب ہو گئی۔

☆☆

شارق نے ایک بوتیک سنٹر کے سامنے رک کر جائزہ لیا خاصی بڑی اور دیدہ زیب دوکان تھی۔ شیشے کی بڑی بڑی شو ونڈوز میں لیڈیز کے جدید فیشن کے ملبوسات اور میک اپ کا سامان سجا ہوا تھا۔ چند لمحے انتظار کر کے وہ اندر داخل ہوا۔ کاؤنٹر پر تین عورتیں خریداری میں مصروف تھیں۔ ایک دبلی پتلی سی سیلز گرل نے انہیں سامان دکھانے میں مصروف تھی۔ کونے میں ایک گداز بدن کی خوب صورت سی لڑکی کھڑی اسے عجیب سی نظروں سے گھور رہی تھی۔ اس کے سامنے کاؤنٹر پر ایک رجسٹر رکھا ہوا تھا۔ شاید وہ بوتیک کی منیجر تھی۔ شارق کو دیکھ کر وہ مسکرائی تو شارق اس کی سمت بڑھ گیا۔

"جی فرمایئے۔" لڑکی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "شاید آپ کو اپنی مسز کے لیے کوئی تحفہ چاہیے۔"

شارق نے اسے غور سے دیکھا۔ لباس سے وہ کرسچن معلوم ہوتی تھی۔ خدوخال بنگالیوں جیسے تھے۔ بڑی جاذب نظر اور اسمارٹ لگ رہی تھی۔

"کیا میں شکل سے شادی شدہ لگتا ہوں۔" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

لڑکی نے چونک کر اسے دیکھا پھر شوخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "دو بچوں کے باپ بھی۔"

"آپ شاید اپنے شوہر سے میرا موازنہ کر رہی ہیں۔"

"جی ...... جی نہیں۔ ابھی میں نے یہ مصیبت نہیں پالی۔" لڑکی نے فوراً کہا۔ "آپ فرمایئے کیا چاہیے۔"

"جی ...... فی الحال تو صرف آپ کی ضرورت ہے۔"

لڑکی کے ماتھے پر بل آ گیا۔ "مسٹر آپ غلط جگہ آ گئے ہیں۔" اس نے غصے سے کہا۔

"کیا یہ بوتیک نوشابہ کا نہیں ہے۔" شارق نے کہا۔

لڑکی چونک پڑی۔ اس نے شارق کو غور سے دیکھا۔ "شکل سے پولیس والے تو آپ لگتے نہیں۔ شاید پریس سے تعلق ہو گا۔"

"دونوں اندازے غلط ہیں۔"

"پھر آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔"

لڑکی کی آنکھوں سے ہلکا سا خوف جھلکنے لگا۔ "میں نوشابہ کے بارے میں باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن تنہائی میں۔" شارق نے کہا۔ "آپ گھبرائیں نہیں آدمی شریف ہوں۔"

لڑکی بے ساختہ مسکرا دی۔ "یہ بھی اندازہ ہو

جائے گا آپ اندر آفس میں آجائیے۔"

دفتر کا کمرہ چھوٹا سا لیکن بڑا دیدہ زیب اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ کونے میں میز تھی۔ جس پر ملبوسات کے بہت سے ڈیزائن رکھے ہوئے تھے۔ لڑکی نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میز کے گردن رکھی ہوئی ریوالونگ چیئر پر سمٹتے ہوئے بولی۔

"مجھے کیتھرین کہتے ہیں نوشابہ کی سہیلی بھی ہوں اور پارٹنر بھی۔"

شارق نے اپنی جیب سے کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ "میں نوشابہ کی موت کے سلسلے میں حقائق جاننا چاہتا ہوں۔ آپ یقیناً کچھ روشنی ڈال سکتی ہیں۔"

کیتھرین کا لہجہ سنجیدہ ہوگیا۔ "اس کی اچانک موت سے ہم حیران رہ گئے ہیں' وہ میری دوست بھی تھی اور پارٹنر بھی...... ہم دونوں بہنوں کی طرح ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لیکن' لیکن پہلی مرتبہ وہ مجھے اعتماد میں لیے بغیر...... میرا مطلب ہے۔ اس نے مجھے اس شخص کے بارے میں نہیں بتایا جو اسے رات کو ساتھ لے کر گیا تھا اور جس نے اسے بے دردی سے قتل کر دیا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔

شارق نے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

"مجھے افسوس ہے کیتھرین لیکن میں بھی نوشابہ کے قاتل کو بے نقاب کرنا چاہتا ہوں امید ہے۔ تم میری مدد کرو گی۔"

"میں کیا مدد کر سکتی ہوں جو کچھ معلوم تھا سب کچھ پولیس کو بتلا چکی ہوں۔"

"بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو پولیس کو بھی نہیں بتلائی جا سکتیں۔ وہ باتیں جو راز کی باتیں ہوتی ہیں جو صرف سہیلیوں کے درمیان راز ہوتی ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اس شخص کے بارے میں بالکل نہیں جانتی جس کی پولیس کو تلاش ہے۔"

"اس کے دوسرے دوستوں کے بارے میں تو جانتی ہو گی۔"

"ہاں ...... وہ بہت آزاد خیال اور خوش مزاج تھی لیکن ایسی نہیں جیسا کہ پولیس کا خیال ہے۔"

"دیکھو کیتھرین میرا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔ تم مجھے ایک دوست سمجھ کر بات کرو۔ جو نوشابہ کے متعلق کوئی ایسی بات جو اس کی ذات اس کی مصروفیات حلقہ احباب پر روشنی ڈال سکے۔ اس کے قتل کا معمہ حل کرنے میں بڑی مدد دے سکتی ہے۔ تم' میں اور نوشابہ کی ماں سب یہی چاہتے ہیں کہ اس کا قاتل پکڑا جائے۔"

کیتھرین اسے چند لمحے گھورتی رہی پھر مسکرا کر بولی۔ "وہ زندہ ہوتی تو تم کو بہت پسند کرتی۔"

"چلو یہ ہی سمجھ کر تم اعتماد کر لو۔ ویسے عموماً لڑکیاں مجھے پسند کرتی ہیں۔"

کیتھرین چند لمحے غور کرتی رہی پھر سوچتے ہوئے بولی۔ "نوشابہ نے مجھ سے کبھی کوئی بات راز نہیں رکھی لیکن کل جب میں اس کی دراز صاف کر رہی تھی تو وہ تصویر اچانک مل گئی اس نے مجھے نہیں بتلایا تھا کہ وہ کب اور کہاں اتروائی اور بڑی احتیاط سے چھپا کر رکھا گیا تھا۔ اسی لیے میں نے پولیس کو اس کے بارے میں نہیں بتایا۔"

"کون سی تصویر۔" شارق نے چونک کر بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

کیتھرین اس کے چہرے کو گھورتی رہی۔

"میرا خیال ہے تم پر اعتماد کر ہی لوں۔" اس نے دراز کھول کر ایک ڈکشنری نکالی۔ اس کے اند سے ایک چھوٹی سی تصویر نکالی ایک لمحہ سوچتی رہی پھر تصویر شارق کو دے دی۔ "لو ...... یہ رہی و تصویر۔"

شارق نے تصویر کیتھرین کے ہاتھ سے لی لیکن اس پر نظر ڈالتے ہی اس کا چہرہ سرخ ہوگیا

"مائی گاڈ ...... خدا بچائے تم لڑکیوں سے۔

تصویر۔'' اس نے کیتھرین کی سمت دیکھا۔ ''کیا تم نے اتاری تھی۔''

کیتھرین کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا۔ ''نہیں نہیں تو...... مجھے تو اس کا علم بھی نہیں تھا اور نوشابہ نے بھی اسے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔''

''لیکن اگر کسی نے یہ تصویر اتار دی تھی تو نوشابہ نے اسے دی کیوں نہیں۔''

''میں بھی یہ ہی سوچتی رہی ہوں۔ میرا خیال ہے ایسے اور پرنٹ بھی رہے ہوں گے جو اس نے کھینچنے والے کو دے دیے ہوں گے۔ یہ پرنٹ ذرا خراب ہو گیا تھا۔ اس لیے نہیں دیا ہو گا۔''

''کیا خرابی ہے اس میں۔'' شارق نے سوال کیا۔

''ذرا غور کرو سینے پر ایک دھبہ نہیں آ گیا ہے۔''

شارق نے میز پر رکھا ہوا محدب شیشہ اٹھا کر تصویر کو غور سے دیکھنا شروع کیا تصویر پر نظر آنے والا دھبہ کچھ واضح ہو گیا۔ شارق نے غور کیا تو وہ دھبہ نہیں تھا۔ لکیروں سے بنائی گئی ایک تصویر تھی۔ سیاہی یا پھر گودنے سے ایک تصویر بنی نظر آ رہی تھی۔ نقوش واضح نہیں تھے لیکن تھی وہ بہر حال ایک تصویر جسے شاید جسم پر گدوایا گیا تھا لیکن وہ اتنی مبہم تھی کہ کچھ کہنا دشوار تھا۔ اس نے کیتھرین کی سمت دیکھا۔ ''کیتھرین تم نوشابہ کی راز دان دوست تھیں۔ کیا اس کو اس قسم کے مشاغل کا شوق تھا۔''

''نہیں۔'' کیتھرین نے فوراً کہا۔ ''اسی لیے تو مجھے اس تصویر کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔''

شارق چند لمحے سوچتا رہا اب نوشابہ کی لاش بھی باقی نہیں تھی جو دیکھا جا سکے۔ اسے حیرت تھی کہ انسپکٹر نواز نے اس نشان کا ذکر کیوں نہیں کیا پھر اچانک اسے نواز کا ایک جملہ یاد آ گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے سینے پر کسی نے کھر و نچے لگائے ہوں گوشت جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا۔ کسی نے نوشابہ کے سینے سے یہ نقش مٹا دیا تھا۔ قاتل نہیں چاہتا تھا کہ کوئی یہ نقش دیکھ سکے لیکن کیوں۔''

''کیا میں یہ تصویر رکھ سکتا ہوں۔'' شارق نے اچانک پوچھا۔

''ہاں ...... بشرطیکہ تم اسے راز رکھو۔'' کیتھرین نے جواب دیا۔

کیتھرین سے تصویر لے کر وہ سیدھا گھر پہنچا اور میجر شاہ کو تمام تفصیلات بتلائیں۔ وہ اسے ساتھ لیتے ہوئے سیدھے اپنی لیبارٹری میں پہنچے اور اسے اپنی ڈایا سکوپ میں لگا کر جو ہر چیز کو کئی گنا بڑا کر کے دکھانے کا آلہ تھا پروجیکٹر کا سوئچ آن کر دیا۔ اسکرین پر نوشابہ کی قد آدم سے بھی دوگنا بڑی تصویر نمایاں ہوگئی فوکس درست کرنے کے بعد شاہ نے غور سے تصویر کو دیکھنا شروع کیا۔

''بڑا ظالم شخص تھا۔ جس نے نوشابہ کو قتل کر دیا۔'' شارق نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''حواس پر قابو رکھو برخوردار۔'' ...... میجر شاہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''بلاشبہ یہ تصویر جسم پر گودی گئی تھی۔ تصویر کے ساتھ یہ تم انجان زبان کے حروف دیکھ رہے ہو۔ یہ قدیم مصری زبان کے ہیں اور تصویر کے نقوش پہچان رہے ہو۔ تم نے بہت ہی اہم سراغ حاصل کر لیا ہے۔ شارق ...... لیکن اس سے مسئلہ اور بھی پراسرار ہو گیا ہے۔''

''مسئلے سے زیادہ آپ کی باتیں پراسرار ہو گئی ہیں۔'' شارق نے کہا۔

''یہ تمہاری جہالت کا ثبوت ہے۔ برخوردار' پندرہویں صدی کے مصر اور اٹھارہویں صدی کے فرانس میں شاہی محلوں میں یہ لباس عام تھے۔ قدیم مصر میں تو یہ رواج بہت پہلے سے عام تھا۔ یہ جو تصویر کے گرد بیضوی دائرہ نظر آ رہا ہے۔ اسے کارتوش کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی ہیروغلافی کہلاتی ہے۔ جس میں حکمران کے نام اور عہد تحریر ہوتا ہے۔ اس مخصوص کارتوش کی زبان دائیں سے

بائیں جانب پڑھی جائے گی اور اس دائرے میں بنی ہوئی ملکہ کی تصویر کے نقوش بھی اگر تم نہیں پہچان سکتے تو یقیناً تمہاری کھوپڑی بھیجے سے خالی ہے۔"

"قلوپطرہ۔" شارق نے اچھل کر کہا۔

"شاباش تم تو واقعی تھوڑی سی عقل بھی رکھتے ہو۔" میجر شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور پروجیکٹر کا سوئچ آف کر دیا۔ "اب سوال یہ ہے کہ یہ نشان نوشابہ کے سینے پر کیوں گودا گیا اور قاتل نے اس کو مٹانے کی کوشش کیوں کی۔"

"آپ جانتے ہیں کہ میں سوالات کے جواب کے معاملے میں بچپن ہی سے کمزور ہوں۔" شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چند باتیں قابل غور ہیں۔" میجر شاہ نے شارق کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بات اب تصدیق ہو چکی ہے کہ نواز جو ٹرانسپیرنسی لایا تھا وہ اصلی تھیں اور ان پر سے نوشابہ کی لاش کی تصویر پراسرار طور پر مٹ گئی تھی۔ اس کے بعد نوشابہ کی لاش پوسٹ مارٹم کی میز پر اس طرح پگھل گئی جیسے وہ گوشت پوست کی نہیں برف کی رہی ہو۔ قاتل نے اس کے سینے سے یہ نشان اپنی دانست میں مٹا دیا تھا۔ یہ ساری باتیں عقل سے بالاتر ہیں اور اب تک ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔"

"خوب تو آپ لوگ میری کم عقلی کا ڈھنڈورا بلا سبب پیٹتے ہیں۔" شارق نے کہا۔ "اسی دوران آپ نے کچھ بھی معلوم نہیں کیا۔"

"نواز سے فون پر بات کرنے کے بعد میں اسٹاک ایکس چینج چلا گیا تھا۔ وہاں میرا ایک دوست فیروز ہے۔ اس سے چند باتیں ضرور معلوم ہوئی ہیں۔"

"لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ قاتل کا تعلق اسٹاک ایکسچینج سے تھا۔"

"احمق ہو تم ...... میں نے یہ کب کہا ہے۔ قاتل کا نہیں نوشابہ کے سوتیلے باپ کا تعلق اسٹاک ایکسچینج سے ہے۔ میں الیاس بیگ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے گیا تھا۔"

"لیکن کیوں۔"

"اس لیے کہ نوشابہ کی موت سے جس کسی کو بھی مالی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ آیا تمہاری کھوپڑی میں۔" میجر شاہ نے جھنجھلا کر کہا۔

"تھوڑا تھوڑا ...... لیکن جناب مسز بیگ نے رات صاف صاف کہہ دیا تھا کہ نوشابہ کے ورثے کی ایک پائی بھی وہ خرچ نہیں کرے گی۔ سب فلاحی کاموں کے لیے وقف کر دے گی۔ پھر الیاس بیگ اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

"تمہیں یہ کیسے معلوم کہ مسز بیگ نے یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتلا دی تھی۔ ممکن ہے وہ یہی سمجھ رہا ہو کہ یہ ساری دولت مسز بیگ کے ذریعہ اس کی دسترس میں آ جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ پھر آپ کو کیا معلوم ہوا۔"

"الیاس بیگ کو فوری طور پر بھاری رقم کی ضرورت ہے۔" میجر شاہ نے بتلایا۔ "وہ بری طرح مقروض ہے اور دیوالیہ ہونے کی حد کو پہنچ چکا ہے اور تباہی سے بچنے کے لیے اسے فوری طور پر رقم درکار ہے۔"

"اور اس لیے اپنی سوتیلی بیٹی کو قتل کر کے اس کی دولت ہتھیانا چاہتا تھا۔ گڈ ویری گ معاوضہ حاصل ہو گیا۔"

"ابھی نہیں ابھی تو محض ایک مفروضہ ہے۔" میجر شاہ نے کہا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ انسپکٹر نواز کو بتا دیجیے، وہ مار مار کر الیاس بیگ سے اقرار جر کرا لے گا۔ قتل خواہ کسی نے کیا ہو۔"

"ہمیں اس سے غرض نہیں کہ پولیس کیا کرتی ہے۔" میجر شاہ نے کہا۔ "قاتل کی تلاش کے ہمیں

نوشابہ کے دامن سے بدنامی کا داغ بھی دھونا ہے۔''

''اب یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ تصویر اور پوسٹ مارٹم دونوں سے ظاہر ہے کہ نوشابہ پاکباز تو نہیں تھی۔''

''لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اسے مرضی کے خلاف اس راہ پر چلنے کے لیے مجبور کیا گیا تھا۔ تو اس کی بیگناہی ثابت ہو سکتی ہے۔''

''میجر ...... یہ ثابت کرنے کے لیے ہمیں پہلے پاشا کو تلاش کرنا پڑے گا اور یہ کام آسان نہ ہوگا۔''

''آسان ہوتا تو تمہارے سپرد کیوں کیا جاتا۔'' میجر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''حلیہ اور شناختی تصویر تمہارے پاس موجود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایسی جگہوں پر ضرور آتا جاتا رہا ہوگا جہاں نوشابہ جیسی آزاد خیال اور خوب صورت لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ تمہارے لیے ہم دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ پاشا اور الیاس بیگ میں کوئی رابطہ تھا تو معاملہ آسان ہو جائے گا۔''

☆☆

تقریباً چوبیس گھنٹوں کے درمیان بدرالدین کی آنکھ تیسری مرتبہ کھلی تھی۔ ہر مرتبہ اس نے خود کو اسی چکنے فرش پر پڑا ہوا پایا۔ جس عجیب طرز کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور ہر مرتبہ اس نے ایک بلی کو گھورتے ہوئے پایا۔ جو اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نیم تاریک میں بلی کی انگارے کی طرح چمکتی آنکھیں اسے مسلسل گھورتی رہتی تھیں۔ خوف سے اس کے جسم پر پھریری سی آ گئی۔

اس کے ہاتھ پیر اسی میں بندھے ہونے کی وجہ سے اکڑ گئے تھے۔ گردن دکھ رہی تھی اور جسم بے حس محسوس ہو رہا تھا۔ سر پر لگنے والی ضرب سے ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔ اسے کچھ یاد نہ تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا اور اسے کیوں یہاں قید کیا گیا تھا اور وہ کون لوگ تھے۔ جو اسے پکڑ کر یہاں لے آئے تھے۔ وہ جس کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ اس کا فرش اور دیواریں اتنی چکنی اور صاف ستھری تھیں کہ تاریکی میں بھی چمک رہی تھیں۔ بناوٹ میں بھی عجیب تھی۔ کم از کم جدید دور میں شہر کے اندر ایسی بناوٹ اسی نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ قدیم دور کے کسی مندر میں آ گیا ہے۔

دیواروں پر ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ جن پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ اس کے بالکل سامنے والے پردے پر ایک خوفناک درندے کی تصویر تھی۔ جس کا سر انسانوں جیسا تھا۔ ایک جانب بلند اسٹینڈ پر ایک بڑی بلی کا مجسمہ رکھا ہوا جس کے نیچے انگریزی کے رومن حرف میں 'ٹائیگر' لکھا ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ اس بلی کا نام ہوگا لیکن اس سے بمشکل دو گز دور بیٹھی ہوئی بلی کو مجسمہ نہ تھی۔ وہ مخملی گدے پر کسی مجسمے کی طرح بیٹھی ہوئی اسے گھور رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں حرکت کر رہی تھیں۔ کمرے میں اسی بلی کے علاوہ کوئی جاندار چیز نہیں تھی۔

بدر کا خیال' بار بار الیاس بیگ کی طرف جاتا لیکن پھر خیال آیا کہ اگر اس نے رقم واپس لینے کے لیے یہ حرکت کی ہوتی تو یہاں قید کیوں کرتا۔ اسے بار بار احساس ہو رہا تھا کہ اسے اس مکار آدمی کا آلہ کار نہیں بننا چاہیے تھا۔ اس نے دولت کی خاطر اپنی سوتیلی بیٹی کو بدنام کرنے کی سازش کی ممکن ہے کہ اس کے آنے کے بعد نوشابہ کو الیاس بیگ نے ہی قتل کر دیا ہو۔ کچھ بھی ہو لیکن پولیس کی نظروں میں تو قاتل وہ تھا اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اسی لمحے ہلکی سی آواز ہوئی اور وہ چونک پڑا کسی نے ہلکے سے پردہ کھینچا تھا۔ اس نے نظریں اٹھائیں تو حیرت زدہ رہ گیا۔

اندر سے آنے والی روشنی میں اسے وہ

دونوں خوفناک افراد نظر آئے۔ ایک تو دیو قامت شخص تھا۔ جس کے جسم پر صرف ایک سفید لنگوٹی بندھی ہوئی تھی۔ جسم پر کسی چکنے تیل کی مالش کی ہوئی تھی جس سے وہ چمک رہا تھا۔ پیر ننگے تھے۔ وہ اتنا جثیم اور توانا تھا کہ بازوؤں کے پٹھوں کی مچھلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس کے برابر کھڑے ہوئے شخص کے جسم پر سلک کی سفید رنگ کی عبا تھی۔ جس کی لانبی آستینوں سے اس کے ہاتھ باہر نکلے ہوئے تھے۔ عباء پر دل کے مقام پر سنہری رنگ سے ایک تصویر گڑھی ہوئی تھی اس کا چہرہ لانبا اور سفید ہو رہا تھا۔ آنکھیں بلی کی طرح چمک رہی تھیں اور ماتھے پر ایک سیاہ پٹکا باندھا ہوا تھا۔ خوف کی ایک سرد لہر بدرالدین کے جسم میں دوڑ گئی۔

اس شخص نے بدر کے بجائے بلی کو مخاطب کیا اور اس کے قریب جا کر آہستہ سے بولا۔ ''شکریہ ٹائیگر۔'' بلی نے آخری بار بدر کی طرف دیکھا اور پھر شاہانہ انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے بعد وہ شخص بدرالدین کی طرف مڑا' قدیم مصر میں بلیوں کو دیوتاؤں کا اوتار تصور کیا جاتا تھا۔ خصوصاً بوباستی کی دیوی باست کا جب وہ مر جاتی تھی تو اس کی لاش کو حنوط کر کے بوباستی کے شہر مقبرے کے اندر محفوظ کر دیا جاتا تھا۔

''تم اس کے مستحق تو نہ تھے کہ اتنی متبرک محافظ تمہاری نگرانی کے لیے مقرر کی جاتی بدرالدین لیکن اتفاق سے تم ہمارے لیے بڑے اہم بن گئے ہو۔'' اس کے اشارے پر قوی الجثہ شخص نے کرسی بدر کے سامنے رکھ دی۔ وہ شخص کرسی پر بیٹھ گیا۔ اپنی تھوڑی کلائی کے سہارے رکھ کر بدرالدین کی جانب جھکا اور غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا بدر کا حلق خوف سے خشک ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ عبا پہنے ہوئے شخص کی دائیں ہاتھ کی ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی۔ جس میں سرخ رنگ کا بڑا سا یاقوت لگا ہوا تھا۔ اس یاقوت کی شکل بالکل آنکھ کی طرح تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی سرخ دہکتی ہوئی آنکھ اسے گھور رہی ہو اور اس کے دماغ میں پیوست ہوتی جا رہی ہو۔ ''یہ...... یہ تم کیا کر رہے ہو۔'' بدر نے گھبرا کر کہا۔ ''آخر تم کیا چاہتے ہو۔''

''خاموش رہو...... بدرالدین۔'' ایک نرم اور ملائم آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ''تمہاری ساری مصیبتیں دور ہونے والی ہیں لیکن پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم کتنا جان چکے ہو۔ اس نادان لڑکی نے جواب دنیا میں نہیں ہے تم کس حد تک بتلایا ہے۔ اور میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں ہے۔ اس لیے جھوٹ اور سچ کی تمیز کرنے میں اپنی صلاحیت برباد نہیں کرنا چاہتا۔''

''سچ اور جھوٹ۔'' بدر نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس نے یقین دلایا۔ نوشابہ نے مجھے کچھ نہیں بتلایا کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔''

''انگوٹھی کو غور سے دیکھو بدرالدین' غور سے دیکھو' ذہن پر زور دو جسم کو ڈھیلا چھوڑ دو۔'' میٹھی اور نرم آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں انگوٹھی کے نگینے سے چپک کر رہ گئیں تھیں۔ وہ گہرائیوں میں ڈوبا چلا جا رہا تھا۔

''اب اپنی آنکھیں بند کر لو۔ بدر تم سو رہے ہو۔ تم سو رہے ہو تم کو نیند آ رہی ہے۔ گہری۔ میٹھی اور آرام دہ نیند۔'' بدر کا جسم ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ وہ سو رہا تھا۔

''اب یہ قابو میں ہے۔ اسے پوجا کے کمرے میں لے آؤ۔'' دراز قد والے عبا پوش نے کہا۔

وہ ایک بلند چھت والا کشادہ کمرہ تھا۔ چھت میں پوشیدہ جگہوں سے رنگ برنگی روشنیاں اس طرح نیچے آ رہی تھیں جیسے دھوپ چھاؤں ہو رہی ہو۔ دیواروں میں پوشیدہ میٹروں نے کمرے کے

درجہ حرارت کو مصر کے ریگزاروں کے برابر کر دیا تھا۔ کمرے میں پجاریوں کا مجمع اس حرارت میں لذت محسوس کر رہا تھا۔ سامنے بنے ہوئے بلند چبوترے پر جو کمرے کے ایک کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک نہایت خوب صورت اور نقشین تخت رکھا ہوا تھا۔ جس کے نقش رنگار پر سرخ اور سیاہ ملمع چڑھا ہوا تھا۔ بتیوں کا رنگ سنہرا تھا۔ تخت کے بالکل سامنے قربان گاہ تھی جو ایک لانبی ربر کی سل رکھ کر بنائی گئی تھی اور اس کے ایک کونے میں دائرہ نما گڑھا سا بنا ہوا تھا۔ جس میں انسانی سر بہ آسانی آ سکتا تھا۔ اس کے دونوں جانب نالی نما سوراخ بنے ہوئے تھے کمرے کے مخالف سمت کا پورا حصہ ایک دبیز پردے نے چھپا رکھا تھا۔ وہاں موجود پجاریوں میں سے کوئی بھی ادھر نہیں دیکھ رہا تھا۔

کمرے میں موجود افراد جن کی تعداد بیس کے قریب تھی اضطراب کے عالم میں پہلو بدل رہے تھے۔ ان میں چند کھڑے تھے اور باقی قدیم مصری طرز کی نیچی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ سب کی بے چین نگاہیں اس دروازے پر مرکوز تھیں۔ جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ تخت کے پیچھے شجر کا ایک بڑا پردہ پڑا ہوا تھا۔ جس پر ایک بھیانک شکل والا پرندہ ...... بنا ہوا تھا۔ اسکا سر انسان نما تھا۔ اس پر دو سینگ بھی نکلے ہوئے تھے۔ چہرہ اتنا بھیانک تھا کہ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ مصری علوم کا ماہر فوراً پہچان لیتا کہ یہ بدی کے قدیم دیوتا کی شکل تھی۔ قربان گاہ کے آخر میں ایک شمعدان تھا۔ جس میں مصری عود سلگ رہی تھی۔ اس کی بھینی خوشبو دھوئیں کے ساتھ تمام کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

اور پھر اچانک پردہ ہٹا اور دراز قد اپنے بازوؤں پر ایک بے ہوش کو اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوا۔ یہ بدرالدین تھا۔ جو تنویمی نیند کے زیر اثر تھا۔ دراز قد نے اسے قربان گاہ پر لٹا دیا اور پھر ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ بلندی پر بنی ہوئی ایک محرم دار کھڑکی سے اچانک تیز روشنی نے چبوترے کی ہر چیز کو نمایاں کر دیا۔ اور پھر اچانک عبا پوش پجاری نے اچانک اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور انجانی زبان میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے گلے میں ایک ننھا سا مائیکروفون پوشیدہ تھا۔ جس کے ذریعے دیواروں میں لگے ہوئے خفیہ لاؤڈ اسپیکر سے اس کی آواز گونج رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ مدھم آواز میں کہنا شروع کر دیا۔

''بدی کے دیوتا کے پجاریو! تم جانتے ہو ہماری ایک پجارن جسے ہم نے قلوپطرہ کے نام سے موسوم کیا تھا۔ گمراہی کی راہ پر چل نکلی تھی۔ اس نے دیوتا سے کیا جو عہد توڑ دیا تھا اور میں نے سب کے سامنے یہ اعلان کیا تھا کہ اس پر دیوتا کا قہر نازل ہوگا تم جانتے ہو اسے سزا مل گئی اور اب وہ دنیا میں نہیں ہے۔ اس کی لاش کا بھی نام و نشان نہیں ہے۔ اس کی سسکتی ہوئی روح تمام عہد عذاب کا شکار رہے گی۔''

پجاریوں کو خوف سے پھریری آ گئی۔

عبا پوش پجاری نے پھر کہنا شروع کر دیا۔

''تمہارے سامنے قربان گاہ میں بے حس پڑا ہوا شخص قلوپطرہ کا شریک جرم ہے۔ اب میں تم سب کے سامنے اس شخص کی زبان سے قلوپطرہ کی گمراہی کا ثبوت فراہم کروں گا۔ بدرالدین تم میری آواز سن رہے ہو۔'' بدرالدین کے لبوں کو حرکت ہوئی۔ ''ہاں۔''

''تب پھر تم میری ہر بات کا سچ سچ جواب دو گے۔ تم جس لڑکی کو نوشابہ کے نام سے جانتے ہو اس نے پجاریوں کے بارے میں تمہیں کچھ بتلایا تھا۔''

چند لمحے کے وقفے کے بعد بدرالدین نے کہا۔ ''پجاری نہیں کچھ نہیں کہا۔''

''کیا اس نے کسی خوف اور اندیشے کا ذکر کیا تھا۔''

''نہیں، لیکن کبھی کبھی وہ مجھے انجانے خوف

میں مبتلا نظر آتی تھی۔ اسی لیے میں نے اسے آسانی سے شراب پلادی تھی۔''

''تب پھر تم اس کے بارے میں کوئی۔ پوشیدہ بات نہیں جانتے۔''

''نہیں ...... سوائے اس کے کہ میں اس کی زندگی میں پہلا مرد نہیں تھا۔'' بدر نے جواب دیا۔ ''لیکن الیاس بیگ کو اس کا علم نہیں تھا لیکن میں نے اسے یہ بات نہیں بتلائی۔''

عبا پوش چونک پڑا۔ ''اس نے تم سے کالے جادو۔ یا کسی پوجا وغیرہ کا ذکر کیا تھا۔ کوئی ایسی بات بتلائی تھی جو تمہیں پراسرار لگی ہو۔''

''کالے جادو یا پوجا کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ میں نے اس کے سینے پر گودی ہوئی تصویر کے بارے میں پوچھا بھی لیکن۔''

''اوہ ...... تم نے وہ نقش دیکھا تھا۔''

''ہاں ...... میرے پوچھنے پر اس نے بتلایا کہ یہ قلوپطرہ کا نشان ہے۔ ایک احمق نے اس کے سینے پر نقش کر دیا تھا۔''

''اوہ ...... احمق نے۔'' عبا پوش کے لہجے میں سختی آ گئی تھی۔ ''تم نے اس نقش کے بارے میں کسی کو بتلایا تھا۔''

''ہاں ...... اس کے سوتیلے باپ الیاس بیگ کو۔''

''اور کسی کو نہیں۔''

''نہیں میری اور کسی سے بات ہی نہیں ہوئی۔''

عبا پوش نے دراز قد کی طرف دیکھا۔ ''لے جاؤ اسے ختم کر دو ...... دو منٹ بعد یہ ہوش میں آ جائے گا۔'' اس نے کہا۔ ''بدر تم اب سے ٹھیک دو منٹ بعد بیدار ہو جاؤ گے۔''

پجاری اس خوفناک حکم کا مطلب سمجھتے تھے۔ دراز قد خوفناک آدمی جب بدر کو اٹھا کر چلا تو وہ خوف سے کانپ اٹھے۔ دروازے سے نکل کر وہ غلام گردش میں آ گیا۔ جس کے آخر میں ایک زینہ تھا۔ سیڑھیاں اتر کر وہ نیچے گیا۔ چند لمحے بعد فضا بدرالدین کی دلخراش چیخوں سے گونج اٹھی اور یہ دردناک چیخیں آہستہ آہستہ ختم ہو گئیں۔ سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

''دیوتا سے غداری کا انجام سب نے دیکھ لیا تھا۔'' عبا پوش کی آواز پھر گونجی۔ ''اب پوجا کا آغاز ہوتا ہے۔''

اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ کمرے میں دھیمی بے جان موسیقی گونج اٹھی، عبا پوش کا ہاتھ بلند ہوا اور تخت کے قریب رکھے ہوئے تابوت کا ڈھکن خود بخود ہٹ گیا اندر لیٹی ہوئی ممی آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی یہاں تک کہ سیدھی کھڑی ہو گئی۔ نشے میں جھومتے ہوئے پجاریوں کے جوڑے پوجا میں داخل ہونے لگے۔

☆☆

شارق کی جدوجہد رایگاں نہیں گئی تھی۔ الیاس بیگ کے بارے میں اسے حیرت انگیز انکشافات ہوئے تھے۔ اس نے میجر شاہ کے مشورے پر کلبوں اور ہوٹلوں کے رنگین ماحول میں صرف دو دن گزارے تھے کہ نتاشا جونیئر سے ملاقات ہو گئی۔ نتاشا ایک معمولی گھرانے کی لڑکی تھی لیکن نشے اور آوارگی کی بنا پر گھر والوں کی توجہ سے محروم ہو چکی تھی۔ وہ مالدار لوگوں کو متوجہ کرنے کی ماہر تھی اور قیمتی لباس میں شارق کی دلکش شخصیت نے اسے چونکا دیا تھا جیسے ہی رقص شروع ہوا اس نے شارق کو دعوت دی اور رقص کے دوران تکلفات کی منزل سے آگے نکل گئی۔ رقص کے بعد شارق اسے لاؤنج میں لے کر بیٹھا ہی تھا کہ نتاشا نے شراب کا آرڈر دے دیا۔

''صرف ایک بار۔'' شارق نے کہا۔ ''میں شراب نہیں پیتا۔''

''ہائیں ...... یہ کیسے ممکن ہے۔ تم جیسا خوب صورت نوجوان اور شراب سے پرہیز۔''

''بات یہ ہے۔ نتاشا کہ ڈیڈی کا منتر دیکھ کر

توبہ کرلی ہے۔"

"کیا ہوا تمہارے ڈیڈی کو......"

شارق نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "شراب اور......عورت کے چکر میں لاکھوں روپے برباد کر دیے۔" اس نے کہا۔ "ممی نے بزنس نہ سنبھال لیا ہوتا تو اب تک ہم روٹیوں کو محتاج ہو جاتے ان کے دوست میں ایسے تھے۔ ابھی کچھ دنوں قبل ایک شخص ان سے بھاری رقم لے کر چلتا بنا دیکھو شاید تم اسے پہچانتی ہو۔" اس نے جیب سے تصویر نکال کر دکھائی۔

نتاشا چونک پڑی۔ "بدرالدین یہ تو بڑا مکار بلیک میلر ہے تمہارے ڈیڈی کا نام کیا ہے۔"

"جانے دو میں نہیں چاہتا کہ وہ بدنام ہوں۔ ان کو اس راستے پر ڈالنے والا ایک شخص الیاس بیگ ہے۔"

"تم الیاس بیگ کو بھی جانتے ہو۔" نتاشا نے حیرت سے کہا۔ "بڑا کمینہ شخص ہے۔ مجھے بدرالدین نے ہی اس سے ملوایا تھا۔"

شارق کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ بدر اور الیاس ایک دوسرے سے واقف تھے۔ میجر شاہ کا شک حقیقت بن گیا تھا۔ "تم بتلا سکتی ہو کہ بدر کہاں ملے گا۔" اس نے پوچھا۔

"اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ دو تین دن پہلے وہ الیاس بیگ کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ تب سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔" نتاشا نے جام خالی کرتے ہوئے کہا۔ "تم الیاس بیگ سے کیوں نہیں پوچھ لیتے۔"

شارق نے اس سے مزید پوچھ گچھ نہیں کی وہ جلد از جلد یہ خبر میجر شاہ کو دینا چاہتا تھا۔

☆☆

الیاس بیگ گھر سے نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ نوشابہ کی موت نے اس کے منصوبے پر پانی پھیر دیا تھا اور وہ بے حد پریشان رہنے لگا تھا۔ اب تک جو قرض اس امید پر لیے تھے کہ نوشابہ کی دولت رخسانہ کو ملنے کے بعد ادا کر دے گا۔ ان کی ادائیگی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

شراب اور عیاشی نے اسے تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی اور اس نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو میں الیاس بیگ بول رہا ہوں۔" اس نے کن انکھیوں سے رخسانہ کی سمت دیکھتے ہو کہا۔ جو اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

"ہیلو الیاس!" ایک سریلی نسوانی آواز سنائی دی۔ "تم کتنی جلدی میرے پاس پہنچ سکتے ہو۔"

الیاس چونک پڑا۔ آواز نئی تھی لیکن بہت سریلی۔ "کون بول رہا ہے۔" اس نے رخسانہ کو سنانے کے لیے پوچھا۔

"نام پوچھ کر کیا کرو گے ڈارلنگ' بس آ جاؤ۔" بولنے والی نے اس انداز میں کہا کہ الیاس بیگ کے خون میں حدت آ گئی۔

"لیکن کیوں کیا کام ہے۔" اس نے آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"قلوپطرہ کے بارے میں بات کریں گے۔"

الیاس بیگ کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اسے یاد آیا کہ بدر نے اس نقشے کا ذکر کیا تھا جو نوشابہ کے سینے پر بنا ہوا تھا۔ قلوپطرہ کی تصویر۔ تو بدر نے ایک بلیک میل کرنے کے لیے کسی عورت کا استعمال کیا تھا۔ کمینہ کہیں کا الیاس بیگ نے پھر بھی اپنے شبہے کی تصدیق ضروری سمجھی۔ "کون قلوپطرہ۔ میں نہیں سمجھا۔" ایک ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا۔

"تم اتنے بھولے نہیں الیاس بیگ۔ بدر کی زبانی اتنی آسانی سے بند نہیں ہوگی۔" خوف کی ایک سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ بدر نے بلیک میلنگ کا نیا طریقہ اختیار کیا تھا لیکن وہ انکار نہ کر سکتا تھا۔ پتہ نہیں اس

کمینے نے اس عورت کو کیا کیا بتا دیا تھا۔ ''کہاں آنا ہے مجھے۔'' الیاس بیگ نے تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''اور کب۔''

''ٹھیک گیارہ بجے نوزادہ اسٹیشن کے پاس ہوٹل نیو گارڈن ہے۔ بس ہوٹل کے گیٹ کے سامنے آ جاؤ میں تمہیں پہچان لوں گی۔''

وہ کار سے اتر کر ہوٹل گارڈن کی سمت بڑھا ہی تھا کہ کسی نے بڑے پیارے سے اسے پکارا۔ الیاس بیگ اس نے چونک کر دیکھا۔

تاریکی سے نکل کر وہ اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ الیاس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ سنہرے بالوں والی یہ حسینہ اسے کسی دوسری دنیا کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ اتنی حسین و جمیل اور بھرپور عورت اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ چند لمحے وہ مبہوت بنا اسے گھورتا رہا اور پھر آہستہ سے بولا۔

''ہاں ...... میں الیاس ہوں اور تم۔'' وہی کھنکھناتا ہوا سر ہلا قہقہہ پھر سنائی دیا۔ ''نام میں کیا رکھا ہے۔ تم کام سے غرض رکھو۔ اس نے کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔'' الیاس بیگ کسی سحر زدہ انسان کی طرح اس کے ساتھ چلنے لگا۔

''اس کمینے بدرالدین نے اگر تمہیں اس لیے بھیجا ہے کہ تم مجھے بلیک میل کرو تو ......'' وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

''اوہ ...... الیاس ڈارلنگ کیا میں تم کو بلیک میلر نظر آتی ہوں۔'' اس نے الیاس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ''میں تو صرف قسمت کا حال بتلاتی ہوں۔ ممکن ہے تمہاری قسمت کھلنے والی ہو۔''

''خوب تو یہ کافر ادا قسمت کا حال بتلا کر لوگوں کو پھانستی ہے۔'' الیاس نے سوچا۔ ''اگر آج رات یہ مل جائے تو واقعی قسمت کھل جائے۔'' یہی لالچ اسے آگے لے جا رہی تھی۔

سڑک کے موڑ پر ایک مرسیڈیز کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس ہوشربا کو کار چلاتے دیکھ کر الیاس کو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ گارڈن پارک سے ہو کر مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی پارک اسٹریٹ سے ہو کر مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایک بنگلے کے سامنے رک گئی۔ ہر سمت سناٹا طاری تھا۔ عورت دروازہ کھول کر اتری اور پھر مرسڈیز سائیڈ پر کھڑی کر کے مڑ کر الیاس کو دیکھا اور کہا۔ ''کیا اندر آنے کا ارادہ نہیں ہے۔ ڈارلنگ۔''

الیاس کا دل اس دعوت سے اچھلنے لگا۔ اس کا دماغ اس کافر ادا کے جسم سے آنے والی بھینی بھینی خوشبو سے مخمور ہو رہا تھا۔ عورت نے گھوم کر گرد و پیش دیکھا اور پھر مطمئن ہو کر بنگلے کے گیسٹ میں داخل ہوئی۔ لان کے زینے سے چڑھتے ہوئے۔ وہ بالائی منزل پر کھینچے اس نے دروازہ کھول کر لائٹ جلائی اور لیاس کی سمت دیکھ کر مسکرائی۔

''کیا۔ بدر یہاں موجود ہے۔'' الیاس نے پوچھا۔

''نہیں ...... ڈارلنگ یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی اور موجود نہیں۔'' عورت نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''کیا پیو گے۔''

''جو چاہو پلا دو۔'' الیاس بیگ مسکرا کر بولا۔ ''مجھے تو بن پیے نشہ ہو رہا ہے۔'' وہ دلنواز ادا سے مسکرائی۔ ''تم آرام سے بیٹھو میں لباس تبدیل کر کے ابھی آئی۔'' اس نے شراب کی بوتل اور گلاس اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''اتنا نہ پی لینا کہ جب واپس آؤں تو بیہوش ملو۔''

وہ دروازہ کھول کر برابر والے کمرے میں چلی گئی۔ الیاس نے قیمتی شراب کا جام بھرا اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔ کمرے کے ایک کونے میں بڑا سا اسٹینڈ رکھا تھا۔ جس پر ایک عجیب طرز کی شیشے کی ہانڈی رکھی تھی۔ اس میں بھورے رنگ کی ریت رکھی ہوئی تھی۔ دیواروں پر جگہ ریشمی کپڑے کے لانبے لانبے پردے ٹنگے ہوئے تھے۔ جن پر

بنے ہوئے نقش اس کی سمجھ سے باہر تھے۔ یہ عورت واقعی قسمت کا حال بتلانے کا کاروبار کرتی تھی۔ اپنے اصلی پیشے کی پردہ پوشی کا اچھا طریقہ تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔

الیاس بیگ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''ہاں اب بتلاؤ بدر نے تم سے کہا کیا ہے۔''

''یہ ہی بات پوچھنے کے لیے تو میں نے تم کو یہاں بلایا ہے۔'' عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں جاننا چاہتی ہوں کہ نوشابہ کے بارے میں بدر نے تم کو کیا باتیں بتلائی تھیں۔''

''نوشابہ کے بارے میں۔'' الیاس نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''کوئی خاص بات تو نہیں۔''

''کوئی خاص بات نہیں جو کچھ اس نے کہا تھا۔ وہ اب سب کو معلوم ہو چکا ہے۔''

عورت کے لبوں سے مسکراہٹ اچانک غائب ہو گئی۔ وہ چند لمحہ الیاس بیگ کو گھورتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ جو کچھ بدرالدین نے بتلایا تھا۔ وہ تم نے سب کو بتلا دیا۔''

''نہیں میرا مطلب ہے کہ نوشابہ کے بارے میں سب کچھ اخبار میں آ چکا ہے۔ اور بدرالدین نے سوائے ایک چیز کے اور کوئی بات نہیں بتلائی۔''

''اور وہ ایک چیز کیا ہے۔''

''تم پہلے ہی جانتی ہو ورنہ فون پر اسی کا حوالہ کیوں دیا تھا۔'' الیاس بیگ نے جواب دیا۔ ''نوشابہ کے سینے پر قلوپطرہ کی شکل گودی ہوئی تھی۔''

وہ بے ساختہ مسکرا دی اور الیاس بیگ سے اور قریب ہو گئی۔ ''تم نے یقیناً یہ بات اپنی بیوی کو بتلائی ہو گی۔''

''نہیں۔'' اس نے فوراً کہا۔ ''کسی کو نہیں۔ تم جانتی ہو کہ میں اس کا ذکر کسی سے نہیں کر سکتا تھا۔''

''اب میں تمہاری قسمت پڑھ دوں۔'' اس نے ایک ہاتھ ہانڈی میں بھری ہوئی ریت پر رکھا اور دوسرے سے الیاس بیگ کا ہاتھ تھام لیا اور پھر ریت کو گھورنے لگی۔

لیکن اس کے جسم کے لمس نے الیاس بیگ کو دیوانہ کر دیا تھا۔ اس نے مخمور آواز میں کہا۔ ''میری قسمت میں اس وقت جو کچھ ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے۔''

عورت اس طرح اچھل کر کھڑی ہو گئی جیسے بچھو نے ڈنگ مار دیا ہو۔ اب وہ مسکرا نہیں رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سفاکی اور خوف جھلکنے لگا تھا۔ ''ٹھیک ہے اب تم اسے سنبھال لو۔'' اس نے سامنے کھڑے دراز قد آدمی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

الیاس بیگ پھرتی سے مڑا۔ دروازے میں کھڑے ہوئے دیو قامت کو دیکھ کر اس کی روح فنا ہو گئی۔ دراز قامت آہستہ آہستہ اس کی سمت بڑھ رہا تھا۔ الیاس بیگ گھبرا کر کھڑا ہو گیا لیکن خوف نے اس کے پیر منجمد کر دیے تھے۔ کیونکہ دراز قد نے اچانک خنجر نکال لیا تھا۔

''شلوکا ...... یہاں کوئی خونریزی نہیں ہو گی۔'' عورت نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''ناتک بھوکا ہو گا۔ اسی کے لیے اسے محفوظ کر لو۔''

الیاس بیگ نے خوفزدہ ہو کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن شلوکا کے آہنی ہاتھوں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ الیاس بیگ اس کی گرفت میں تڑپنے لگا' اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اگر عورت مداخلت نہ کرتی تو شاید الیاس بیگ وہیں دم توڑ دیتا۔ شلوکا نے حقارت آمیز انداز میں اسے صوفے پر ڈال دیا۔

☆☆

شارق ایک تاریک دروازے میں کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں بنگلے کے اس دروازے پر مرکوز تھیں۔ جس میں لیاس بیگ ایک انجانی عورت کے ساتھ داخل ہوا تھا۔

میجر شاہ گھر پر موجود نہیں تھا۔ اس لیے شارق

نے اس کے نام پیغام چھوڑ کر فون سے صورت حال کی تفصیل تارا کو بتا دی تھی اور خود الیاس بیگ کی نگرانی کے لیے روانہ ہوگیا تھا۔ الیاس بنگلے سے نکلا تو شارق کی کار اس کے تعاقب میں تھی۔ ہوٹل نیوگارڈن سے یہاں تک وہ بلا کسی دشواری کے تعاقب کرتا آیا تھا۔ اب اچانک پھوار پڑنا شروع ہوگئی تھی۔ شارق کے لیے یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ بدرالدین یہاں موجود ہے یا نہیں لیکن وہ الیاس بیگ کا تعاقب اس لیے کر رہا تھا کہ شاید اس کے ذریعے بدر تک پہنچ جائے۔

وہ بنگلے کے بالکل قریب ایک بند دروازے سے چپکا ہوا کھڑا تھا۔ دروازے کے اوپر چوڑا سا چھجا تھا۔ جس کا سایہ اسے تاریکی اور بارش سے تحفظ فراہم کر رہا تھا۔ اس نے دوبارہ فون کیا تھا لیکن میجر شاہ واپس نہیں آیا تھا۔ اس نے صوفیہ کو پھر صورتحال سے آگاہ کیا کھڑے کھڑے جب پیر رکھنے لگے تو اچانک اس نے دروازے کے کھلنے کی آواز سنی اور وہ چونک کر اس طرف دیکھنے لگا۔

دروازے سے وہی خوب صورت عورت باہر نکلی۔ جس کے ساتھ الیاس بیگ آیا تھا۔ شارق سوچ رہا تھا کہ شاید الیاس بیگ کے ساتھ بدرالدین بھی نظر آ جائے لیکن وہ ایک سیاہ دیو قامت کو دیکھ کر حیران رہ گیا جو اپنی پشت پر ایک بڑا لانبا بکس لے کر نیچے اتر رہا تھا۔ تن و توش اور حلیے سے وہ بہت خونخوار معلوم ہو رہا تھا۔ عورت نے گیٹ کے باہر کھڑی ہوئی کار کا پچھلا دروازہ کھول لیا لیکن دراز قد کی تمام تر کوششیں کرنے باوجود کار کے اندر نہ جا سکا۔

''بکس اندر نہیں جا سکتا۔ مجھے اوپر واپس جانا پڑے گا۔'' دراز قدم آدمی نے مایوس ہو کر کہا۔

عورت نے ادھر ادھر دیکھا اور جھنجھلا کر کہا۔

''تو پھر جلدی کرو۔ ویسے کوئی خطرہ نہیں ہر سمت سناٹا ہے۔''

شارق چوکنا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تاریکی میں دروازے سے چپک گیا تھا۔ تاکہ کسی کے نظر میں نہ آسکے لیکن اگلے ہی لمحے وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ دراز قد اس مرتبہ تنہا نہیں آ رہا تھا۔ وہ کسی کو پشت پر اٹھا کر لا رہا تھا۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر جب وہ روشنی میں آیا تو شارق چونک اٹھا۔ اس نے الیاس بیگ کو پہچان لیا تھا۔ جو بے ہوش نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ جب دراز قد آدمی نے اسے اندر ڈالنے کی کوشش کی تو اس کے لبوں سے ایک کراہ نکل گئی تھی۔ دراز قد نے واپس جا کر دروازہ مقفل کر دیا اور واپس آ گیا۔

کار فوراً روانہ ہو گئی تھی۔

شارق بھاگتا ہوا۔ اپنی کار تک پہنچا جو کچھ فاصلے پر کھڑی تھی بارش اچانک شدید ہوگئی تھی اور وہ کسی قیمت پر بھی مرسڈیز کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ بارش کی وجہ سے کار کا تعاقب دشوار ہو گیا تھا۔ کیونکہ موسلا دھار بارش کی بناء پر تھوڑے فاصلے کی چیز بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ شارق نے دانستہ فاصلہ زیادہ نہیں رکھا۔ ویسے احتیاطاً اس نے مرسڈیز کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔

وہ مین سڑک سے گزرے اور پھر مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے کئی بار مرسڈیز کی لائٹ نے اس کی راہنمائی کی۔ یہاں تک کہ برج پار کر کے وہ سڑک پر اس سمت بڑھنے لگے جہاں آبادی کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ جہاں رات کو لوگ کم آتے تھے۔ جیسے ہی مرسڈیز مڑی شارق نے تیزی سے اپنی کار آگے بڑھائی اور اس لیے وہ سائیڈ سے آنے والے ٹرک کو نہ دیکھ سکا۔ ٹکراتے زور سے ہوئی تھی کہ دھماکے سے فضا گونج اٹھی۔

ٹرک کی رفتار خاصی تیز تھی۔ کار کے پرخچے اڑ گئے اور ٹرک اپنے ساتھ اسے دور تک گھسیٹتا لے گیا۔ ٹرک ڈرائیور جب نیچے اترا تو بڑی مشکل سے کار کے کچلے ہوئے ڈھانچے سے شارق کو باہر نکال سکا۔ شارق خون میں لت پت تھا۔ ہسپتال

پہنچتے پہنچتے اس کی حالت خطرناک ہو چکی تھی۔ اسے فوراً ایمرجنسی آپریشن کے لیے تھیٹر میں لے جایا گیا۔

میجر شاہ نے اپنا کام نوشابہ کی پارٹنر کرن سے شروع کیا لیکن وہ نوشابہ کی نجی زندگی کے بارے میں کوئی بات نہ بتلا سکی۔ میجر شاہ نے بوتیک کی عورتوں اور کرن سے نوشابہ کی دوستوں اور واقف کاروں کی ایک فہرست تیار کی اور ہر ایک سے فرداً فرداً معلومات حاصل کرنا شروع کر دی۔ یہ بور ذمہ داری دانستہ شارق کو نہ دی گئی تھی۔ وہ ہر ایک کو پاشا کی شناختی تصویر دکھا کر اس کے بارے میں پوچھتا لیکن کوئی کارآمد معلومات نہ حاصل ہو سکی' کرن نے اسے فیشن آرکیڈ کا پتہ بھی دیا تھا۔ یہ وہی آرٹ اسکول تھا۔ جہاں جدید فیشن کے ڈیزائنوں کی ترتیب دی جاتی تھی۔ نوشابہ اور کرن دونوں نے یہیں تربیت حاصل کی تھی۔ اور یہیں سے ان کی دوستی ہوئی تھی۔

میجر شاہ جب فیشن آرکیڈ کے ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اپنے آرٹ ڈائریکٹر مسٹر مائیکل سے کسی نئے ڈیزائن کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ شاہ کو دیکھ کر مسکرائے اور انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''فرمایئے میجر شاہ ہم کیا خدمت کر سکتے ہیں۔'' ڈائریکٹر صاحب نے کہا۔

''میں نوشابہ کے سلسلے میں کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔'' میجر شاہ نے کہا۔ ''وہ آپ کی طالبہ رہ چکی ہے۔''

مسٹر مائیکل نے غور سے میجر شاہ کو دیکھا لیکن خاموش رہے۔ ''نوشابہ جی بے شک پوچھیے لیکن ہم زیادہ نہیں بتلا سکیں گے' پروفیسر آپ جانتے ہیں یہاں اتنی لڑکیاں تربیت کے لیے آتی ہیں کہ۔''

''آپ دونوں نے کبھی اس شخص کو نوشابہ کے ساتھ دیکھا ہے۔'' میجر نے پاشا کی تصویر نکال کر میز پر رکھی۔

''جی نہیں۔'' ڈائریکٹر صاحب نے کہا۔ ''شاید مسٹر مائیکل کچھ بتلا سکیں۔ ڈیزائن کلاس یہی لیتے ہیں۔''

''میں نے اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا۔'' مائیکل نے ناگواری کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں ڈیزائن آرٹسٹ ہوں مسٹر میجر شاہ ...... مجھے اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ چہروں پر نظر رکھوں۔''

''ممکن ہے یہ شخص بھی آرٹ اسٹوڈنٹ رہا ہو۔'' میجر شاہ نے کہا۔

''مجھے یاد نہیں کہ اسے کبھی کلاس میں دیکھا ہے۔'' مائیکل نے جواب دیا۔ ''آپ کا تعلق پولیس سے ہے۔''

میجر شاہ نے غور سے مائیکل کو دیکھا۔ ''جی نہیں ..... لیکن آپ کو یہ خیال کیوں آیا۔''

''دیکھیے۔ مسٹر نوشابہ جیسی لڑکیاں ہمارے پیشے کی بدنامی کا باعث بن سکتی ہیں۔'' مائیکل نے خشک لہجے میں کہا۔ ''لوگ سمجھیں گے کہ یہاں آنے والی سب لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں۔ مجھے افسوس ہے لیکن ہم کوئی مدد نہیں کر سکتے۔''

''میرا خیال ہے میجر شاہ۔'' ڈائریکٹر نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''شاید اس کی کوئی کلاس میٹ آپ کی مدد کر سکے۔ آپ ہمارے سیکشن میں معلوم کر لیں۔''

مائیکل نے قہر آلود نگاہوں سے ڈائریکٹر صاحب کو گھورا۔ میجر شاہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

آرٹ سلیکشن میں ایک لڑکی نوشابہ کے ساتھ پڑھ چکی تھی۔ دبلی پتلی سانولے رنگ کی سونیتا نے تصویر دیکھتے ہی کہا۔ ''یہ تو کاشف معلوم دیتے ہیں۔''

میجر شاہ چونک پڑا۔ ''کاشف ...... تم یقین سے کہہ سکتی ہو۔''

''یہ اصلی تصویر تو نہیں ہے۔ آپ ان کو خود جا کر دیکھ لیجیے۔ بڑے مشہور آرٹسٹ ہیں۔''

''دلنشین اسٹریٹ چوراہے کے قریب ان کا اسٹوڈیو ہے۔'' اس نے پتہ بتلاتے ہوئے کہا۔
میجر شاہ کا شکریہ ادا کر کے دلنشین اسٹریٹ پہنچا۔ کاشف کا اسٹوڈیو ایک بوسیدہ عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ جیسے ہی اسٹوڈیو کے سامنے پہنچا ایک موٹی سی خوب صورت لڑکی بڑبڑاتی ہوئی باہر نکلی۔ میجر شاہ کو دیکھ کر اس نے منہ بنالیا اور سیڑھیاں اترتی نیچے چلی گئی۔ میجر شاہ جب اسٹوڈیو میں پہنچا تو ایک شخص کینوس پہ جھکا کسی تصویر میں رنگ بھر رہا تھا۔ وہ مڑا تو میجر شاہ چونک اٹھا۔ تصویر سے اس شخص کے چہرے میں بلا کی مشابہت تھی۔

''جی۔'' کاشف نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''آپ کس سلسلے میں آئے ہیں۔'' وہ لہجہ دوستانہ نہ تھا۔

''میرا خیال ہے۔ اس فربہ لڑکی نے آپ کو مایوس کر دیا ہے۔'' میجر شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کاشف نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
''دیکھیے بھائی میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ وہ موٹی ماڈل بننا چاہتی تھی۔ میرے پاس اتنا بڑا کینوس نہیں جس میں وہ سما سکے۔ آپ ماڈل تو نہیں ہیں۔''

''جی نہیں، میں تو صرف چند باتیں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس شخص کو جانتے ہیں۔''
کاشف نے ایپرن پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے تصویر لے لی۔ چند لمحہ غور سے دیکھتا رہا۔ پھر مسکرایا۔ ''بڑی بھونڈی تصویر ہے۔ مگر مجھ سے ملتی جلتی ہے۔ آپ نے بنائی ہے۔''
''آپ اس شکل کے کسی اور شخص کو نہیں جانتے۔''

''آپ کیا چاہتے ہیں۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔''
''آپ نے ایک لڑکی نوشابہ کے قتل کی خبر پڑھی ہوگی۔''
''ہاں ...... یاد آیا۔ قاتل کی یہ شناختی تصویر بھی اخبار میں چھپی تھی۔ اب یاد آ گیا۔''
''پھر بھی آپ نے خود کو پولیس کے حوالے نہیں کیا۔'' میجر شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
کاشف ایک لمحے تک اسے گھورتا رہا۔ پھر زور کا قہقہہ لگا کر بولا۔ ''سمجھا، لیکن میں نے کسی لڑکی کو قتل نہیں کیا۔''
''اس بات پر اور کوئی یقین کر سکتا ہے۔''
''کیوں نہیں لڑکی کا قاتل تو ضروری کرے گا۔'' کاشف نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ویسے شکل سے آپ پولیس والے تو نہیں لگتے۔''
''شکر ادا کیجئے کہ پولیس والا نہیں ہوں ورنہ آپ کو گرفتار پہلے کرتا۔ یہ باتیں بعد میں پوچھتا۔'' میجر شاہ نے کہا۔ ''قتل والی رات آپ کہاں تھے۔''

''اپنے فلیٹ پر جہاں تین آرٹسٹ اور رہتے ہیں۔ وہ سب گواہی دیں گے کیونکہ ہم تینوں ایک ہی ماڈل کے ساتھ تھے کہ آپ بھی ہوتے تو رات وہیں گزار دیتے۔'' کاشف نے جواب دیا۔
''اب جان چھوڑ دیجیے۔''
میجر شاہ کو یوں بھی اس شخص کے قاتل ہونے پر یقین نہیں تھا۔ وہ وہاں سے سیدھا انسپکٹر نواز کے پاس پہنچا اور اسے اب تک کی تگ و دو کے نتیجے سے آگاہ کیا۔ اگر اس نے کاشف کی مشابہت کے باوجود اس کی بے گناہی کا یقین نہ دلایا ہوتا تو نواز یقیناً اسے قاتل قرار دے کر گرفتار کر لیتا لیکن میجر شاہ کے مشورے پر اس نے یہ مان لیا کہ فی الحال اس کی نگرانی پر اکتفا کرے۔ بارش زور و شور سے شروع ہو گئی تھی۔ اس لیے میجر شاہ نے گھر فون کیا۔

''اوہ ...... خدایا ...... آپ کہاں غائب ہو گئے تھے۔'' نفیسہ بوا نے بدحواسی کے عالم میں کہا۔ ''آپ فوراً ہسپتال جایئے شارق کی حالت

بہت خراب ہے۔ حادثہ ہوگیا۔'' اس کی آواز سسکیوں میں دب گئی۔

☆☆

انسپکٹر نواز اور میجر شاہ ایک ساتھ ہسپتال پہنچے' شارق کے سر کا آپریشن ہو چکا تھا اور وہ کمرے میں بے ہوش پڑا تھا۔ مدھم روشنی میں اس کا سر پٹیوں میں بندھا نظر آ رہا تھا۔ میجر شاہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اسے آج اندازہ ہوا کہ شارق اس کو کتنا عزیز تھا۔ کمرے سے باہر نکل کر بھی وہ چند لمحہ تک خود پر قابو نہ پا سکا پھر گھٹی ہوئی آواز میں ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''حالت کیسی ہے۔''

''مجھے افسوس ہے۔ میجر صاحب ...... لیکن حالت خطرناک ہے۔ دماغ کو شدید صدمہ پہنچا ہے لیکن آپریشن کے بعد خون بند ہو گیا ہے۔ پھر بھی ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''ہم ان کو ہر لحہ آبزرویشن میں رکھے ہوئے ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔''

''آپ کو حادثے کی کچھ تفصیل معلوم ہے۔''

''کسی ٹرک سے کار کی ٹکر ہوگئی تھی۔ حادثہ ایک سڑک پر ہوا تھا۔''

''آپریشن کس نے کیا ہے۔''

''سرجن ...... ہارون نے اور نیورو سرجن عمر گل نے ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ شارق آپ کے اسسٹنٹ ہیں۔''

ڈیوٹی نرس کو تاکید کر کے کہ اگر خدانخواستہ شارق کی حالت خراب ہو تو فوراً فون کر دے۔ میجر شاہ اپنے بنگلے پہنچے کیونکہ نفیسہ بوا کو اطمینان دلانا ضروری تھا۔ انسپکٹر نواز ان کے ساتھ تھا۔ نفیسہ بوا جائے نماز پر مصروف دعا تھیں' وہ بدحواسی کے عالم میں بھاگتی ہوئی آئیں۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ انہوں نے کچھ پوچھا نہیں۔ صرف سوالیہ نگاہوں سے میجر شاہ کو دیکھا۔

''خدا کا شکر ہے بوا۔ آپریشن ہو گیا ہے۔ شارق کی حالت اب بہتر ہے۔'' میجر شاہ نے کہا۔

''کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں میجر صاحب۔''

''ابھی نہیں بوا۔ وہ بے ہوش ہے۔ صبح آپ کو ضرور لے چلیں گے۔ میں صرف آپ کو اطمینان دلانے آیا تھا ابھی پھر ہسپتال جاؤں گا۔''

ابھی وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہی تھے کہ نفیسہ بوا حسب معمول کافی تیار کر کے لائیں میجر شاہ نے پوچھا۔ ''حادثے سے پہلے شارق نے کوئی پیغام تو نہیں دیا تھا۔ بوا۔''

''ہاں میاں دو مرتبہ فون کیا تھا۔ وہ الیاس بیگ کا تعاقب کر رہے تھے۔ جو اپنے بنگلے سے گیارہ بجے روانہ ہو کر ہوٹل نیو گارڈن پہنچے تھے۔ وہاں ایک بے حد خوب صورت عورت جس کے بال سنہری تھے اس کی منتظر تھی۔ اپنی کار وہیں چھوڑ کر الیاس بیگ عورت کی کار میں بیٹھ گیا۔ وہ ایک ماڈرن کالونی کے ایک بنگلے پر پہنچے بنگلے پر نام کی کوئی تختی نہیں تھی لیکن نمبر پی ۸۷ ہے۔ شارق کو یقین ہے کہ بدرالدین عرف پاشا وہاں موجود ہے۔ شارق اب تک وہیں نگرانی کر رہا ہے۔''

''شارق نے کسی بدرالدین کا پتا چلایا ہے۔ جس کا حلیہ پاشا سے مشابہہ ہے۔'' میجر شاہ نے پرچہ انسپکٹر نواز کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''ایسا لگتا ہے کہ وہ عورت وہاں سے کہیں اور روانہ ہو گئی تھی اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے شارق کو حادثہ پیش آیا۔'' نواز نے کہا۔

''ہاں لیکن اب قاتل سے مشابہ ایک نہیں دو افراد ہو گئے۔ کاشف کی بے گناہی یقینی ہوتی جا رہی ہے۔''

''کیا صوفیہ بی بی کو اطلاع نہیں دیں گے۔'' نفیسہ بوا نے برتن اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں اتنی رات گئے اسے پریشان کرنا لاحاصل ہوگا۔ صبح اطلاع دے دیں گے۔'' میجر شاہ نے کہا۔ ''آپ آرام سے سوئیں' ہم ہسپتال جا

رہے ہیں۔"
نفیسہ بوا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "میں سو کیسے سکتی ہوں۔ اسے ہوش آ جائے تو اطلاع کر دینا۔"

راستے میں میجر شاہ نے نواز کو بتلایا کہ شارق نے کس طرح ایک لڑکی کیتھرین کے ذریعے نوشابہ کی وہ تصویر حاصل کر لی تھی۔ جس میں اس کے سینے پر نقش گودا گیا تھا اب ایک اور پراسرار عورت درمیان میں آ گئی تھی۔ "میں حیران ہوں کہ یہ سنہرے بالوں والی حسینہ کون ہے۔ افسوس کے ہم فی الحال شارق سے کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔"

"اس نے کار نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ اس سے ممکن ہے کچھ پتہ چل جائے۔" نواز نے کہا۔
"افسوس کے ہمارے آدمی بھی اب تک قاتل کو تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔"
شارق کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اب تک بیہوش تھا۔

☆☆

ہری رام کے مندر میں ایک بار پھر وہی ڈرامہ دہرایا جا رہا تھا۔ دیو قامت شلوکا نے الیاس بیگ کو مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔ پوجا کے بلند چبوترے پر عبا پوش پجاری کے علاوہ عورت بھی موجود تھی۔ جس کے سینے پر کسی دیوی کا نشان تھا لیکن الیاس بیگ اتنا دہشت زدہ تھا کہ اسے حسن و شباب کے اس شاہکار کو دیکھنے کا خیال بھی نہ آیا۔ حالانکہ چند گھنٹے قبل وہ اس کے حسن سے مسحور ہو کر اس کے جال میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس کی خوف سے پھٹی نگاہیں سامنے رکھے ہوئے تخت پر تھیں۔ جہاں عبا پوش پجاری کسی بت کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ایک بھیانک نقاب میں پوشیدہ تھا۔ جس کے سوراخوں سے صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔
"مجھے یقین ہے الیاس بیگ کہ اپنی سوتیلی بیٹی کے متعلق تم نے اب تک کسی کو کچھ نہیں بتلایا اور یہ کہ تم اس کے سینے پر بنے ہوئے نقش کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔"

عبا پوش نے کہا۔ "لیکن افسوس کے اب صورت حال مختلف ہو گئی ہے۔ اب تم یقیناً اس راز کو جاننے کی کوشش کرو گے۔"
الیاس بیگ صرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے گھورتا رہا۔ جیسے تنویمی اثر کے تحت ہو۔
"نہیں ...... نہیں۔" الیاس بیگ کے لبوں سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔
"تم نے ابھی خود بتلایا کہ تمہاری مسز نے نوشابہ کے قتل کی تفتیش کے لیے میجر شاہ کو مامور کیا ہے۔" عبا پوش نے سرد لہجے میں کہا۔
"وہ پولیس سے زیادہ خطرناک ہے۔ میں خطرے کی بو بہت قریب سے سونگھ رہا ہوں۔ اب تمہارا وجود بھی ایک مستقل خطرہ بن چکا ہے۔ اس لیے الوداع الیاس بیگ ...... شلوکا اس خطرے کو ہمیشہ کے لیے ناٹک کے جڑوں میں دفن کر دو۔"
اس نے ہوا میں ہاتھ بلند کر کے چٹکی بجائی۔
کمرے میں دھیمی لیکن ہیجان خیز موسیقی گونجنے لگی۔ شلوکا نے الیاس بیگ کو اس طرح شانوں پر اٹھا لیا۔ جیسے وہ اناج کا بورا ہو۔
الیاس بیگ ہاتھ پاؤں مارتا رہا لیکن شلوکا کی آہنی گرفت سے نہ نکل سکا۔ پجاریوں نے اسے راستہ دے دیا۔ شلوکا پردے کے پیچھے جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ عبا پوش نے ایک بار پھر ہاتھ اٹھا کر چٹکی بجائی۔ روشنی کا اتنا جھماکا ہوا کہ سب کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ عبا پوش چبوترے سے غائب ہو چکا تھا اور پھر فضا میں الیاس بیگ کی آخری دلخراش چیخ ابھر کر ڈوب گئی۔

☆☆

کچھ دیر بعد عبا پوش نے فکر مند لہجے میں کہا۔ "یہ میجر شاہ بہت چالاک شخص ہے۔ یہ بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"
اس نے نقاب اتار دی تھی اور صوفے پر

دراز تھا۔ اس کے برابر ہی سنہرے بالوں والی حسینہ بیٹھی تھی۔ صوفے کے بازو پر وہ سیاہ بلی بیٹھی ہوئی تھی۔ جسے وہ ٹائیگر کہتے تھے۔ کونے میں رکھے ہوئے ریڈیو سے موسیقی کی ہلکی دھن بج رہی تھی۔

''پھر کیا سوچا ہے۔'' عورت نے مترنم آواز میں پوچھا۔

اسی وقت ریڈیو سے مقامی خبریں شروع ہوگئیں۔ نیوز ریڈر شارق کے حادثے کی خبر سنا رہا تھا۔ ''ٹریفک کے حادثے میں زخمی ہونے والا یہ نوجوان ایک ابھرتا ہوا سائنس دان ہے۔ اور مشہور شخص میجر شاہ کا اسسٹنٹ ہے۔ سر کے ایمرجنسی آپریشن کے بعد سے اب تک وہ بے ہوش ہے۔ ڈاکٹروں نے حالت خطرناک قرار دی ہے۔''

''ریڈیو بند کرو۔'' عبا پوس نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔

عورت نے ریڈیو بند کر کے اس کی طرف قدرے حیرت سے دیکھا۔ ''خیر تو ہے۔''

''یہ شارق ...... پتہ نہیں اس کی بیماری میجر شاہ کو کتنی دیر معروف رکھ سکتی ہے اگر ایسا نہ ہوا تو کوئی دوسرا بندوبست کرنا ہوگا۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔''

''تم جانتی ہو کہ میں اپنے روحانی عمل کے ذریعے دور دراز فاصلے کے مریضوں کا علاج کر سکتا ہوں۔ میں اس عمل کو الٹا بھی کر سکتا ہوں۔ شارق بے ہوش ہے اور وہ مزاحمت بھی نہیں کر سکے گا اور ابدی نیند سو جائے گا۔''

''نہیں۔'' عورت نے سہم کر کہا۔

''اس عمل کے لیے مجھے اپنی تمام تر قوت کو بروئے کار لانا ہوگا اور تم کو بھی مدد کرنا ہوگی۔'' اس نے عورت کی سمت دیکھا۔

☆☆

صبح چھ بجے کا وقت تھا۔ جب میجر شاہ نے ہسپتال فون کیا ڈیوٹی نرس نے بتلایا کہ شارق کی حالت قدرے بہتر تھی لیکن وہ ہوش میں نہیں آیا تھا۔ میجر شاہ نے صوفے کی سمت دیکھا۔ نواز بے خبر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ اس نے شارق کی کیفیت ایک پرچے پر لکھ کر میز پر رکھ دی تاکہ انسپکٹر نواز جب بیدار ہو تو پڑھ لے لباس تبدیل کر کے اس نے کار باہر نکالی اور روانہ ہوگیا۔ وہ سیدھا اس بنگلے پر پہنچا جس کا نمبر شارق نے اپنے پیغام میں لکھا تھا۔ دروازے پر نام کی تختی نہیں تھی میجر شاہ نے گھنٹی بجائی لیکن کئی بار کوشش کے باوجود جواب نہیں ملا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔

لیکن ہر سمت سناٹا تھا۔ جیب سے پرس نکال کر اس نے اندر سے ایک باریک سا اوزار نکالا چند بار کی کوشش سے دروازہ کھل گیا۔ میجر شاہ نے دبے پاؤں اندر داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور آگے بڑھ گیا۔ اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہاں کوئی نہ تھا۔

میجر شام نے ڈرائنگ روم میں رکھی ہوئی اس ہانڈی کو دیکھا جس میں ریت بھری ہوئی تھی۔ یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ عورت جو بھی تھی قسمت کا حال پڑھنے کا مصری فن جانتی تھی۔ دیواروں پر آویزاں پردوں پر بنے ہوئے نقش بھی سب مصر کی قدیم تہذیب سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ برابر والے کمرے میں داخل ہوا۔ جو بالکل تاریک تھا۔ پردہ کھینچ کر اس نے جیب سے ٹارچ نکالی اور سوئچ تلاش کر کے لائٹ آن کی۔ روشنی ہوتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

یہ کمرہ نہیں قدیم مصری دیوی کا مندر معلوم ہوتا تھا۔ اس کا بڑا سا مجسمہ رکھا تھا۔ پورا جسم ایک عورت کا اور سر شیر کا تھا۔ دیواروں پر جگہ جگہ مختلف عمل اور جادو کے نقش لٹک رہے تھے۔ کتابوں کے شیلف میں قدیم مصری علوم اور پراسرار عملیات کی کتابیں رکھی تھیں۔ وہ میز کے پاس پہنچا اور دراز کھولی۔ تو اس میں مختلف شکلوں کے کارڈ رکھے

ہوئے تھے۔ جس میں دیوی کی شکل کا وہ نقش بھی تھا۔ جو نوشابہ کے سینے پر بنا ہوا تھا۔ نیچے کی دراز میں گودنے کی مشین بھی مل گئی۔ اب ہر چیز واضح ہوتی جا رہی تھی۔ دروازہ بند کرنے کے بعد میجر شاہ کی نظر میز پر رکھی ہوئی نام کی تختی پر پڑی جس پر شگفتہ سامری' لکھا ہوا تھا۔ اب میجر شاہ کو اس بات میں کوئی شک نہیں رہا تھا۔ شگفتہ سامری کا الیاس بیگ سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور تھا اور نوشابہ بھی اس عورت کے زیر اثر تھی کیونکہ کوئی بھی لڑکی بلا کسی گہرے تعلق کے اپنے سینے پر ایسا نقش بنوانے کے لیے رضامند نہ ہو سکتی تھی۔

میجر شاہ کو وہاں نوشابہ کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہ مل سکا نہ ہی کوئی ایسا کاغذ یا دستاویز ملی جس سے ظاہر ہوتا کہ نوشابہ جیسی لڑکیاں اور مکار عورت کے دام فریب میں گرفتار ہو چکی تھیں۔ ہر چیز کو اسی طرح رکھ کر وہ خاموشی سے باہر نکلا اور جب گھر پہنچا تو نواز بیدار ہو چکا تھا وہ کافی پی کر فارغ ہوئے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی میجر شاہ نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو میں میجر شاہ بول رہا ہوں۔''

''اوہ...... میجر صاحب۔'' نرس گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''آپ فوراً اسپتال آجایئے مسٹر شارق کی حالت اچانک بہت خراب ہو گئی ہے۔''

میجر شاہ اور انسپکٹر نواز تقریباً بھاگتے ہوئے ہسپتال کی پہلی منزل پر پہنچے جہاں ایک پرائیویٹ روم میں شارق کو رکھا گیا تھا' لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی میجر شاہ کا رنگ فق ہو گیا۔ شارق کو اسٹریپس سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود اس کا جسم تڑپ رہا تھا۔ جیسے بندھنوں کو توڑ ڈالے گا۔ اس کا چہرہ کسی شدید ذہنی کرب واذیت سے سیاہ ہو رہا تھا۔ سر کو پٹیوں سے کس کر اس طرح باندھ دیا گیا تھا کہ اس میں مزید چوٹ نہ آسکے۔ نیوروسرجن اور کئی ڈاکٹر بستر کے گرد کھڑے تھے۔

''میں بہت حیران ہوں۔'' سرجن نے میجر شاہ کے قریب آکر آہستہ سے کہا۔ ''نہ برین ہیمرج کے کوئی آثار ہیں اور نہ سر کے زخم میں اور کسی خرابی کی' یہ جو تشنج اور دورے کی علامات نظر آرہی ہیں۔ عقل سے بالاتر ہیں۔ اس کے ساتھ ہی دل کی حالت دم بدم کمزور ہوتی جا رہی ہے۔''

''دماغ کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچ گیا۔'' میجر شاہ نے پوچھا۔

''آپریشن کے دوران تو کوئی ایسی علامت نظر نہیں آئی تھی۔'' نیوروسرجن نے کہا۔ ''لیکن تشنج اور ہیجان کی یہ کیفیت ختم نہیں ہوئی تو مجھے ڈر ہے۔'' اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

میجر شاہ دیر تک شارق کے چہرے کو دیکھتا رہا تھا۔ جس پہ ہر لمحہ موت کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ شارق کی موت اس کے لیے گہرے صدمہ کا باعث ہوتی ایسا لگتا تھا کہ بے ہوشی کے عالم میں وہ بھیانک ڈراؤنے خواب دیکھ رہا تھا۔ میجر شاہ گہری سوچ میں تھا۔

''آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ نواز نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''اگر آپ لوگ اجازت دیں تو ہم ایک اور آپریشن کر کے سر کو کھولنا چاہتے ہیں تاکہ حقیقت معلوم کر سکیں۔''

نواز نے میجر شاہ کی سمت دیکھا۔ ''بے شک آپ ہر ممکن کوشش کریں۔'' میجر شاہ نے آہستہ سے کہا۔

وہ کمرے سے باہر آگیا۔ نواز اس کے ساتھ تھا لیکن میجر شاہ کو جیسے اس کی موجودگی کا احساس نہ ہو۔ چند لمحے بعد وہ تیزی سے ریسپشن کی سمت بڑھا اس کے لبوں سے صرف ایک لفظ نکلا تھا۔ ''کاہونہ۔'' لیکن نواز کی سمجھ میں اس کا مطلب نہیں آسکا۔ ڈیوٹی پر موجود نرس سے اجازت لے کر میجر شاہ نے ایک نمبر ملایا۔ ''بابا صاحب ہیں۔''

''نہیں جناب وہ اس وقت گھر پر تشریف

نہیں رکھتے۔'' کسی خاتون نے جواب دیا۔
''کچھ اندازہ ہے کہ کب تک تشریف لے آئیں گے۔'' میجر شاہ نے سوال کیا۔
''یا ان سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے۔''
''جی نہیں وہ کچھ بتلا کر نہیں گئے۔'' خاتون نے جواب دیا۔ ''آپ اپنا نام اور نمبر بتا دیجیے وہ آئیں گے تو ہم انہیں بتلا دیں گے۔''
میجر شاہ کی آنکھوں میں نظر آنے والی امید کی جھلک ختم ہوگئی۔ ''اس وقت تک تو بہت دیر ہو جائے گی۔'' اس نے مایوس لہجے میں کہا۔ ''دوبارہ فون کرلوں گا میں۔''
وہ نواز کی سمت دیکھے بغیر کھڑا رہا۔ نواز نے پہلے کبھی بابا صاحب کا نام نہیں سنا تھا بابا صاحب کوئی نام نہاد عامل فقیر نہیں تھے۔ وہ ایک بلند پایہ سائنسدان تھے اور پراسرار علوم پر انہوں نے کئی ممالک میں تحقیق کی تھی۔ میجر شاہ جانتا تھا کہ پراسرار علوم پر وہ اتھارٹی تھے۔ ہپناٹزم' ٹیلی پیتھی اور سحر کے موضوع پر ان کی معلومات بے پناہ تھیں یہ اور بات تھی کہ اپنی علمی قابلیت کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے' نواز بڑے غور سے میجر شاہ کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک میجر شاہ کچھ کہے بغیر شارق کے کمرے کی سمت واپس چل دیا۔ وہ آخری لمحات میں شارق کے پاس رہنا چاہتا تھا۔
''السلام علیکم میجر۔'' ایک بھاری آواز سنائی دی۔
میجر شاہ نے چونک کر سامنے دیکھا اور حیرت زدہ ہوگیا۔ نواز نے اس ادھیڑ عمر گورے چٹے شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جو سامنے آ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ سفید شیروانی اور ٹوپی میں وہ بہت خوب صورت اور باوقار لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں میجر شاہ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔
''آ...... پ۔ بابا صاحب میں نے تو ابھی آپ کو فون کیا تھا۔'' میجر شاہ نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔
''آپ نے یاد کیا تھا۔ میں حاضر ہوگیا۔'' بابا صاحب نے کہا۔
''لیکن بابا صاحب ...... کیا آپ گھر سے آ رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے۔ آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں۔''
''اس کے لیے فون کی ضرورت نہیں میجر۔ ذہن بھی رابطہ قائم کرسکتا ہے۔ آپ نے اتنی شدت سے یاد کیا کہ مجھے خبر ہوگئی۔''
''بابا صاحب ...... شارق کی حالت بڑی خراب ہے۔ اس کا حادثہ ہوگیا تھا۔'' میجر شاہ نے تفصیل بتلانے کے بعد کہا۔ ''لیکن اس وقت جو کیفیت ہے اس نے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ کا ہونہ......''
''چلیے' پہلے اس کی کیفیت دیکھ لیں۔'' بابا صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔
وہ ایک بار پھر شارق کے کمرے میں آئے' ڈاکٹر سے آپریشن تھیٹر لے جانے کے لیے تیاری کر رہے تھے۔ بابا صاحب اس کے سرہانے کھڑے ہوگئے۔ شارق کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کرلیں اور چند منٹ اسی حالت میں کھڑے رہے۔ سب لوگ حیرت زدہ تھے۔ شارق کا تشنج اچانک ختم ہوگیا تھا۔ وہ بالکل پرسکون لیٹا ہوا تھا۔ چند لمحے بعد بابا صاحب نے آنکھیں کھولیں اور میجر شاہ کی طرف دیکھا وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔
''میجر آپ کا شبہ تو صحیح تھا لیکن مسئلہ نازک ہے کوئی شیطانی قوت اس کی جان لینے کے درپے ہے۔''
''میں ابھی آپ کو بتلاتا ہوں۔'' میجر نے کہا اور سرجن کی سمت دیکھا۔ ''آپ مریض کو آپریشن تھیٹر لے جاسکتے ہیں ڈاکٹر۔''
''نہیں۔'' بابا صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''شارق کا علاج ان کے پاس نہیں

ہے۔ اسے کوئی جسمانی تکلیف نہیں ہے۔"
ڈاکٹر نے حیرت اور تذبذب کے عالم میں میجر شاہ کو دیکھا۔ "میں نہیں جانتا کہ سبب کیا ہے لیکن مریض اب پرسکون ہے۔ کیوں نہ کچھ دیر انتظار کرلیں۔"
"ٹھیک ہے ڈاکٹر جیسی آپ کی مرضی۔"
ڈاکٹر اور نرسیں چلی گئیں تو بابا صاحب نے میجر شاہ کی سمت دیکھا۔ "تم کچھ بتلانا چاہ رہے تھے۔"
"جی ہاں بابا صاحب آپ نے شاید اخبار میں ایک لڑکی نوشابہ کے قتل کی خبر پڑھی ہوگی۔" میجر شاہ نے کہا۔ "یہ انسپکٹر نواز ہیں۔ ہم دونوں لڑکی کے قتل کی تفتیش کررہے ہیں۔"
"تم نے کیا پولیس میں ملازمت کرلی ہے میجر۔"
"نہیں بابا صاحب ...... لڑکی کا باپ میرا دوست تھا۔ اس کی بیوی نے ذاتی طور پر مجھ سے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں نوشابہ کے قاتل کا پتہ چلاؤں۔ اسی سلسلے میں لڑکی کے سوتیلے باپ کا تعاقب کرتے ہوئے شارق کو حادثہ پیش آیا۔" اس نے تمام واقعات دہرائے اور پھر کہا۔ "آج صبح ہی میں نے شگفتہ سامری کے بنگلے کی تلاشی لی تو پتہ چلا کہ وہ کسی دیوی کی پجارن ہے۔ بنگلے میں ریت کے ذریعے قسمت پڑھنے پوجا کرنے اور ساحرانہ عمل کا تمام سامان موجود تھا۔ آج جانتے ہیں اور مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ آج بھی ایسے شیطان کے چیلے موجود ہیں جو ایسے ساحرانہ عمل کرتے ہیں۔ اس عورت کا تعلق مصر سے ہے اور مصر میں تو طرح طرح کے ساحرانہ عمل کے عامل موجود ہیں۔ وہ فاصلے پر رہ کر بھی لوگوں کو اذیت کی موت مار سکتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ شارق پر یہی عمل کیا جارہا ہے۔"
انسپکٹر نواز کا منہ حیرت سے پھیل گیا۔ "لیکن ...... لیکن آپ نے مجھے تو یہ سب بتلایا ہی نہیں تھا۔ میجر۔"
"مجھے خود آج صبح یہ اندازہ ہوا ہے اور پھر تم ان باتوں پر کب یقین کرلیتے۔"
"اس عمل کے لیے وہ خاص مقدر ہونا ضروری ہے جس میں یہ عمل کیا جاتا ہے۔" بابا صاحب نے کہا۔ "تصویر کا غائب ہوجانا۔ لاش کا پگھل جانا اور اب شارق کی یہ حالت بے شک تمہارا شبہ درست ہے۔ میجر اور ایسی صورت میں تم کو فوری طور پر مندر کے پجاری کو اس عمل سے روکنا ہوگا اور اس کے لیے سب سے پہلے مندر کا پتہ لگانا ضروری ہے۔ میں شارق پر اس کا اثر روک تو نہیں سکتا ہوں لیکن زیادہ دیر تک نہیں۔ مجھے اس کا توڑ نہیں معلوم، شارق کو بچانے کے لیے تمہیں مندر کا پتہ چلا کر عمل روکنا ہوگا۔"
"آیئے میجر صاحب، ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" انسپکٹر نواز نے کہا۔
"نہیں، نواز تم اس میں مداخلت نہیں کرو یہ کام۔"
"میجر، یہ اب ممکن نہیں۔" نواز نے کہا۔ "پولیس افسر کی حیثیت سے میرا بھی کچھ فرض ہے۔"
"تم ضرور یہ فرض پورا کرو انسپکٹر۔" بابا صاحب نے کہا۔ "لیکن میجر شاہ کو اپنی مہم پر تنہا جانے دو۔ اس دوران میں یہاں بیٹھ کر تحفظ فراہم کرونگا لیکن تم کو اپنا کام جلد از جلد کرنا ہوگا۔"
"میجر جلد از جلد اس سے پہلے کہ میں بھی بے بس ہوجاؤں۔"
میجر اور نواز جیسے ہی باہر نکلے انہوں نے صوفیہ کو اپنی سمت بڑھتے ہوئے دیکھا اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔ میجر کو دیکھتے ہی وہ بھاگتی ہوئی آئی۔ اور اس سے لپٹ کر سسکیاں لینے لگی۔ "اوہ ...... سر آپ نے مجھے پہلے اطلاع کیوں نہیں دی۔" صوفیہ نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔
"رات کو تمہیں بیدار کر کے پریشان کرنا

مناسب نہ تھا صوفیہ۔'' میجر شاہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں دعا کرو۔''

''میں اسے دیکھ سکتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے' جا کر دیکھ لو۔'' میجر شاہ نے پس وپیش کے بعد کہا۔ ''لیکن پھر واپس بنگلے پر پہنچ کر انتظار کرنا۔ ممکن ہے تمہاری ضرورت ہو۔''

انسپکٹر نواز کو اس کے دفتر چھوڑ کر میجر شاہ نے اس جگہ کا رخ کیا جہاں شارق کی کار کو حادثہ پیش آیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ مندر اسی علاقے میں کہیں ہوگا۔ دریائے ششنی کے کنارے اس علاقے میں یوں تو کئی مندر تھے لیکن میجر شاہ کو جس مندر کی تلاش تھی وہ یقیناً کسی ایسی جگہ ہوگا۔ جہاں کسی کو پتہ نہ چل سکے۔ ایک چوراہے سے آگے بڑھ کر اس نے کار روک دی۔ ٹریفک کانسٹیبل سے اس نے دریافت کیا تو اس نے فوراً جائے حادثہ کی نشاندہی کر دی۔ میجر وہاں پہنچا تو اسے شارق کی کچلی ہوئی کار سڑک کے کنارے رکھی نظر آ گئی۔ اس وقت بہت سے بچے وہاں جمع تھے۔ میجر شاہ کو دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے۔

میجر شاہ حیران تھا کہ شارق بچ کیسے گیا کیونکہ کار اس طرح کچلی گئی تھی کہ کوئی حصہ سلامت نہیں رہا تھا۔

''آپ پولیس والے ہیں جی۔'' ایک خوب صورت بچے نے آگے بڑھ کر اچانک سوال کیا۔

میجر شاہ نے چونک کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔

''کیوں بیٹے کیا بات ہے۔''

''کیا وہ آدمی مر گیا ہے۔ جو اس کار میں تھا۔'' بچے نے پوچھا۔

میجر کا دل دھک سے ہو گیا۔ ''نہیں بیٹے وہ زندہ ہے۔ دعا کرو بچ جائے۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔ ''بیٹے تم نے اس علاقے میں ایک لمبی سیاہ کار کو آتے جاتے دیکھا ہے۔''

''جسے ایک عورت چلاتی ہے جی۔'' دوسرے بچے نے جلدی سے پوچھا۔

میجر کا دل زور زور سے اچھلنے لگا۔ ''ہاں' ہاں تم نے اسے دیکھا ہے۔''

''ہاں وہ کالی گھاٹ والے آشرم میں روز آتی ہے۔'' بچے نے کہا۔ ''میرا گھر وہیں ہے۔''

''تم مجھے وہاں تک لے چلو گے۔''

''ہاں چلیے۔'' بچہ خوش ہو گیا۔

لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ چھ سات بچے تھے اور سب جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ میجر شاہ ان کو خفا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے سب کو بٹھا لیا۔ تنگ سڑکوں سے گزرتے ہوئے وہ نشیبی علاقوں میں ایک ایسی جگہ پہنچ گئے۔ جہاں سے آگے گاڑی لے جانا ممکن نہ تھا۔ میجر نے گاڑی روک دی۔ بچے نے اشارے سے بتلایا آشرم داہنے جانب والی گلی میں ہے۔ میجر شاہ نے جیب سے دس کا نوٹ نکال کر بچے کو دیا اور ان کی ٹولی سے جان چھڑائی' بچے شور مچاتے بھاگ گئے تو وہ گلی کی سمت بڑھا۔

اینٹوں کی بنی ہوئی یہ تنگ گلی کافی دور تک چلی گئی تھی اس کے ختم ہوتے ہی اچانک اسے دریا کا پانی نظر آیا لیکن آشرم کی عمارت یا کار اسے نظر نہ آئی۔ میجر شاہ سوچنے لگا۔ وہ یقیناً کسی غلط موڑ پر آ گیا تھا لیکن اسی وقت میجر کی نگاہ گھاٹ پر پڑی۔ جہاں اسٹیمر رکنے کی جیٹی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اس سمت بڑھنے لگا۔ چند فرلانگ جاتے ہی اسے دریا کے کنارے بنی ہوئی ایک پرانی عمارت نظر آ گئی۔ ایک تنگ سی سڑک عمارت کے قریب آ کر ختم ہو جاتی تھی اور عمارت کا اگلا حصہ بلند پشتے پر دریا کے عین کنارے پر بنا ہوا تھا۔ میجر شاہ جیسے ہی قریب پہنچا اسے کنارے پر کھڑی مرسیڈیز نظر آ گئی۔

اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا اور اب اسے اندازہ ہوا کہ وہ اگر درمیان والی گلی کا راستہ اختیار کرتا تو سیدھا اسی عمارت تک پہنچ جاتا۔

اس نے ابھی عمارت کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ وہ بھاگتا ہوا عمارت کے گیٹ تک پہنچا گیٹ بند تھا۔ اس نے اوپر بنے ہوئے چوڑے چھجے کے نیچے کھڑے ہو کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ہر سمت سناٹا طارہ تھا۔ گرج چمک کے ساتھ گھر کر آنے والے بادلوں نے تاریکی پھیلا دی تھی۔ میجر شاہ نے گیٹ کے برابر لگی ہوئی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دو تین منٹ گزر گئے لیکن کوئی باہر نہیں نکلا اس نے دوبارہ بٹن دبایا اور کچھ دیر تک اسے دبائے رہا۔ پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ گیٹ اندر سے بند تھا۔ بارش شدید نہ ہوتی تو وہ عقبی دروازے کو تلاش کرتا۔ تیسری بار اس کا ہاتھ ابھی اٹھا ہی تھا کہ دروازہ کھلا میجر شاہ ایک لمحے کے لیے مبہوت رہ گیا۔

عورت کے حسن و جمال نے اسے یقین کرنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ شگفتلہ سامری کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔

''میں اندر آ سکتا ہوں۔'' اس نے بڑی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

عورت نے ایک لمحہ پس و پیش کیا پھر سامنے سے ہٹ گئی۔ میجر شاہ کے اندر آنے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا۔ ایک نیم تاریک راہداری سے گزر کر وہ کشادہ سے کمرے میں پہنچے جہاں ایک صوفے کے علاوہ کوئی فرنیچر نہ تھا۔ فرش پر قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے اور سامنے کی دیوار کے ساتھ کرشن جی کی ایک بڑی سی مورتی رکھی ہوئی تھی۔

''آپ شاید بارش میں پھنس گئے تھے۔'' عورت نے ایک دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تشریف لائیے۔ میں چائے منگواتی ہوں۔''

میجر شاہ نے مسکرا کر کہا۔ ''شکریہ چائے کی زحمت نہ کیجیے میں صرف آپ سے ملنے آیا تھا۔''

''مجھے ملنے یہاں۔'' عورت نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''آپ مجھے جانتے ہیں۔''

''جی ہاں' میڈم شگفتلہ سامری۔'' میجر شاہ نے جواب دیا۔

عورت خاموشی سے اسے گھورتی رہی۔ وہ سناٹے میں آ گئی تھی لیکن اس نے میجر سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ اس جگہ تک کیسے پہنچا۔

''فرمایئے ......'' شگفتلہ نے آہستہ سے کہا۔

''میں کسی کی قسمت کا حال جاننا چاہتا تھا۔'' میجر شاہ نے جواب دیا۔

عورت کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے اطمینان کی جھلک نمودار ہوئی۔ وہ شدید ذہنی کشش و پنج میں معلوم ہوتی تھی۔ ''لیکن یہاں' یہاں میں ہاتھ نہیں پڑھتی ...... میں تو''

''میں ہاتھ پڑھوانے نہیں آیا میڈم' یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ الیاس بیگ کہاں ہے۔''

وہ اس طرح اچھلی جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ پھر شدید غصے پہ قابو پاتے ہوئے بولی۔

''کون الیاس بیگ' کون ہو تم۔''

''میں کون ہوں۔ میرا خیال تھا کہ تمہارے دیوتاؤں نے اتنا علم ضرور دیا ہو گا کہ مجھے پہچان لو اور الیاس بیگ وہی جسے تم ہوٹل گارڈن سے اپنی کار میں بٹھا کر لائی تھیں۔''

''اوہ ...... وہ شخص ...... وہ شخص تو رات ہی ہاتھ دکھا کر چلا گیا تھا۔ اپنے گھر ہو گا۔''

''نہیں میڈم وہ اپنے گھر نہیں گیا۔ کیونکہ اسے آپ دوبارہ بیہوشی کی حالت میں اپنے ساتھ کار میں لے کر آئی تھیں۔ شاید اسی جگہ۔''

شگفتلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خونخوار نگاہوں سے میجر کو گھورتی رہی۔ میجر نے پھر کہا۔ ''شاید اس لیے کہ نوشابہ کی طرح وہ بھی تمہارے راز سے واقف ہو چکا تھا۔''

''پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ کون نوشابہ کون سا راز۔''

''میڈم شگفتلہ تم خوب جانتی ہو میں کیا کہہ

رہا ہوں۔ نوشابہ کے سینے پر جو نقش کیا گیا تھا۔ تم ہی نے بنایا تھا ناں۔ اس کے قتل کے بعد گودنے کا نشان اسی لیے مٹا دیا گیا تھا کہ تم سے قتل کا کوئی تعلق باقی نہ رہے۔ انکار نہ کرو' میں بھی ایک جادو جانتا ہوں۔ جس کا نام ہے پولیس اور اگر تمہارے گھر کی تلاشی سے ثبوت برآمد ہو جائے تو جانتی ہو کیا انجام ہوگا۔ پھانسی۔''

شگفتلہ کا چہرہ سفید پڑ گیا لیکن وہ بڑی جی دار عورت تھی۔ فوراً ہی سنبھل گئی۔ اس کے لبوں سے ایک نقرئی قہقہہ نکلا اور وہ میجر کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔

''تم بڑے دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میرا جادو تمہارے سامنے ہے میجر شاہ' میری آنکھوں میں دیکھو کیا ان میں تم کو جادو نظر نہیں آتا۔''

میجر شاہ کی نگاہیں جیسے ہی اوپر اٹھیں اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ ایک لمحے کو وہ بے بسی کے عالم میں ساکت رہا۔ پھر اس نے زور سے گردن کو جھٹکا دیا اور اٹھ کر کھڑا ہوگا۔

''نہیں میڈم تم مجھے ہپناٹائز نہیں کر سکو گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میڈم شگفتلہ حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ پھر اس کی نگاہوں سے خوف جھلکنے لگا لیکن اس لمحے کمرے میں اچانک تاریکی چھا گئی۔ میجر شاہ بڑی پھرتی سے پلٹا لیکن ایسا لگا جیسے اسے کسی نے فولاد کے شکنجے میں جکڑ لیا ہو۔ اس نے بہت ہاتھ پیر مارے' بڑی جدوجہد کی لیکن گرفت سے نہ نکل سکا۔ تاریکی میں اچانک دو مضبوط ہاتھوں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن جسم آزاد ہوگیا تھا۔ میجر نے صورت حال کو سمجھتے ہی اپنا جسم بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا اور پھر پوری قوت سے جھکتا چلا گیا۔ حملہ آور بہت وزنی تھا۔ اس لیے میجر کے ساتھ ہی نیچے گرا۔

میجر نے گردن کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی پوری قوت سے پلٹ کر لات ماری۔ ہلکی سی غراہٹ سنائی دی لیکن میجر شاہ اس کی گرفت سے نکل چکا تھا۔ وہ پھرتی سے ایک سمت ہٹا۔ تاریکی میں کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس لمحہ ہلکی سی آہٹ ہوئی میڈم شگفتلہ سامری تیزی سے ایک دروازے میں غائب ہوگئی لیکن اتنی دیر میں میجر شاہ نے دروازے کی سمت جست لگا دی تھی۔ اس نے دروازہ بند ہونے سے پہلے اس پر لات مار دی دروازہ کھلا تو اس نے راہ داری میں شگفتلہ کا بھاگتا ہوا سایہ دیکھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ تعاقب کرتا۔ شلوکا کا تاریک وجود سر پر پہنچ چکا تھا۔ میجر شاہ نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس دیوقامت وجود میں بلا کی طاقت ہے اور اگر وہ دوبارہ گرفت میں آ گیا تو نکلنا مشکل ہوگا۔ اس لیے وہ واپس مڑنے کے بجائے برق رفتاری سے اس راہداری میں داخل ہو کر اسی سمت بھاگا۔ جدھر شگفتلا گئی تھی۔ راہ داری کے اختتام پر ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ میجر شاہ اندر گھستا چلا گیا اور پھر اگلے ہی لمحے وہ دم بخود رہ گیا۔

ایک وسیع کمرے کے اندر جہاں بہت مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ بیس پچیس افراد فرش پر خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے ایک بلند چبوترے پر ایک تخت کے اوپر ...... نقاب پوش کسی بت کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ کمرے میں ایک عجیب بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی لیکن موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ شگفتلا بھاگتی ہوئی اس چبوترے پر پہنچ گئی تھی اس کی نظر میجر شاہ پر پڑی شگفتلا سامری کے لبوں سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

اور اسی لمحے میجر شاہ کے سر پر اتنی زور کی ضرب پڑی کہ وہ چکرا کر وہیں ڈھیر ہوگیا۔

وہ بے ہوش نہ ہوا تھا لیکن ہاتھ پیروں میں دم نہ رہا تھا۔ حواس بجا ہوئے تو نقاب پوش کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''تم نے سب کچھ غارت کر دیا۔ عین اس وقت میرے ٹرانس کو توڑ دیا۔ جب میں اسے موت کے شکنجے میں لینے والا تھا۔''

''لیکن یہ...... یہ یہاں پہنچ گیا تھا۔'' شکنتلا نے کانپتی ہوئی آواز میں میجر شاہ کی سمت اشارہ کیا۔ ''یہ میجر شاہ ہے۔''

اور تب میجر شاہ کو احساس ہوا کہ وہ قربان گاہ کے چبوترے پر بے حس پڑا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ اسے قربان گاہ سے باندھ کر جکڑ دیا گیا تھا۔

''مجھے معلوم ہے...... اور یہ بھی اچھا ہوا کہ یہ خود ہی ہمارے پاس پہنچ گیا۔ ورنہ اس کے ساتھی کو ٹھکانے لگانے کے بعد ہمیں اس کو یہاں تک لانے کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی۔''

''لیکن یہ پولیس کی دھمکی دے رہا تھا۔''

نقاب پوش نے قہقہہ لگایا۔ ''جلد ہی یہ کسی قسم کی دھمکی دینے کے قابل نہ رہا جائے گا۔ شلوکا۔'' اس نے حبشی کی سمت دیکھا اور کہا۔ ''نائیک بھوکا ہے۔''

شلوکا کے سیاہ موٹے لبوں پر ایک بھیانک مسکراہٹ نمودار ہوئی ہلکی روشنی میں اس کے سفید دانت چمک رہے تھے۔ وہ میجر شاہ کے بندھن کھولنے کے لیے جھکا۔

''تم یہ بھول رہے ہو کہ پولیس جلد یہاں پہنچ جائے گی۔''

میجر نے اچانک کہا۔ نقاب پوش نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ''پولیس...... ٹھہر شلوکا۔ یہ شخص خطرناک ہے۔'' اس نے اپنی عبا سے ایک ریوالور نکال کر شلوکا کی سمت بڑھایا۔

''اگر یہ بھاگنے کی کوشش کرے تو بے دریغ گولی مار دینا۔''

میجر شاہ کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نائیک ایک دیوتا کا نام ہے اور یہ حبشی اسے مگرمچھ کی غذا بنانے لے جا رہا تھا۔ شلوکا نے بندھن کھولتے ہی اس کو گردن سے دبوچ کر اس طرح اٹھا لیا تھا۔ جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہو۔ ریوالور کا لمس اسے اپنی پشت پر محسوس ہو رہا تھا۔ چبوترے سے نیچے اتر کر شلوکا نے اسے آگے دھکا دیا۔ اس کا رخ اسے چھوٹے دروازے کی سمت تھا۔ جس پر ایک سیاہ پردہ پڑا ہوا تھا اور میجر کو بچنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

☆☆

شارق کے پرسکون جسم میں اچانک حرکت پیدا ہوئی۔ ہلکا سا تشنج تھا۔ سرہانے بیٹھے ہوئے بابا صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ صوفیہ برابر کھڑی ہوئی تھی۔ شارق نے آنکھیں کھول دیں لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ خلاء میں دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اتنی دہشت تھی کہ صوفیہ کانپ اٹھی۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے شارق کوئی بھیانک اور ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہو۔

اچانک اس کے لبوں میں حرکت ہوئی۔ وہ دہشت زدہ آواز میں بڑبڑایا۔

''وہ...... وہ میجر' وہ میجر کو قتل کر رہے ہیں۔ وہ اسے مار ڈالیں گے۔''

صوفیہ نے خوفزدہ نگاہوں سے بابا صاحب کو دیکھا۔ انہوں نے سرگوشی میں کہا۔

''جلدی کرو۔ فون کر کے انسپکٹر نواز کو میرے پاس بلا لو۔ جاؤ لڑکی میرا منہ نہ دیکھو۔''

☆☆

شلوکا نے اب تک میجر شاہ کی گردن نہ چھوڑی تھی۔ ریوالور کی نال اس کی پشت سے لگائے ہوئے وہ میجر شاہ کو چکردار زینے سے نیچے لے جا رہا تھا۔ سیڑھیاں ختم ہوئیں تو وہ ایک بند کمرے میں پہنچ گئے۔ زینے کے علاوہ یہاں سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ کمرے کے عین درمیان میں ایک گول سا دہانہ تھا۔ جس کے گرد چھوٹی سی منڈیر بنی ہوئی تھی۔ اس کنویں نما حوض کے کنارے پہنچ کر وہ رک گئے۔ میجر شاہ نے دیکھا

کہ کنویں کی گہرائی اتنی تھی کہ کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ شاید یہ ہی اس آدم خور مگرمچھ کی پناہ گاہ تھی۔ جسے نائیک کہتے تھے۔

بھیانک موت کا تصور کر کے میجر شاہ کانپ گیا۔ شلوکا کی گرفت سے بچ نکلنے کی کوئی امید نہ تھی۔ جدوجہد کے نتیجے میں گلی جسم میں پیوست ہو جاتی۔ نجات کا راستہ مسدود تھا۔ کسی بھی لمحے وہ موت کے دہانے میں جانے والا تھا اور شارق ہسپتال میں بے بس پڑا ہوا تھا۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ کہاں گیا ہے۔ اس نے نواز کو بھی کچھ نہیں بتلایا تھا۔

باہر تمام پجاری ساکت بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ میجر شاہ کی آخری بھیانک چیخ سننے کے منتظر تھے۔

اور پھر اچانک فضاء میں اتنی دلخراش چیخ ابھری کہ سب کانپ اٹھے‘ عبا پوش کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

”تم قربان گاہ کے چبوترے پر لیٹ جاؤ۔“ عبا پوش نے شکنتلا سے کہا۔

شکنتلا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ”میں...... میں۔“

”ہاں ڈرو نہیں‘ میں تمہارے ذریعے اب اپنا آخری عمل کروں گا۔“ وہ مسکرایا۔ ”کوئی قوت میری راہ میں مزاحمت کر رہی ہے۔ کوئی اس بدنصیب میجر کے ساتھی کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اب اس قربانی کے بعد میری قوت بے پناہ ہو جائے گی۔ میں ایک خاص عمل کرنے جا رہا ہوں۔ اس کی قوت کے آگے کوئی مزاحمت نہ کر سکے گا۔“

”اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ تم خود اب وہیں پہنچ جاؤ گے۔“ پشت سے ایک آواز سنائی دی۔

☆☆

شلوکا نے میجر شاہ کی گردن چھوڑ دی۔ وہ مطمئن تھا۔ میجر شاہ اس کے ریوالور کی زد میں تھا۔ فرار کی ذرا بھی کوشش کی تو گولی اس کے جسم سے پار ہو گی۔ وہ میجر کو دھکا دینے کے لیے ایک قدم پیچھے ہٹا ہاتھ بڑھایا اور پھر پوری قوت سے دھکا دیا۔

میجر نے اندازہ کر لیا تھا۔ وہ اسی لمحے کا منتظر تھا۔ جیسے ہی شلوکا نے دھکا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا‘ میجر شاہ نے پوری قوت سے جست لگائی اس نے کنویں کے درمیانی فاصلے کا اندازہ کر لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اندازے کی ذرا سی غلطی یقینی موت کا ذریعہ ہو گی۔ فاصلہ کافی تھا لیکن بچنے کا صرف یہ ہی ایک آسرا باقی تھا۔ ایک لمحے کو یوں لگا جیسے وہ تاریک دہانے میں جا رہا ہے لیکن اگلے ہی لمحے اس کے پیر کنویں کی منڈیر سے دوسری جانب ٹکرائے اس نے موت کے کنویں کو پار کر لیا تھا۔

اور دوسرے ہی لمحے شلوکا کی دلخراش چیخ سے فضاء گونج اٹھی تھی۔

چند لمحے تک میجر زمین پر پڑا رہا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا لیکن جلد ہی اس نے خود پر قابو پا لیا۔ کنویں میں گرنے سے بچنے کی کوشش میں شلوکا نے ریوالور پھینک دیا تھا۔ میجر شاہ نے ریوالور اٹھایا‘ سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچا‘ وہ جس دروازے سے راہ داری میں داخل ہوا تھا۔ اس کی مخالف سمت بھی ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ جو بند تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے پڑے ہوئے پردے کو ذرا ہٹایا‘ نقاب پوش پجاری کی پشت اس کے سامنے تھی۔

میجر شاہ کی آواز نے ایک لمحہ کے لیے پجاری کو اپنی جگہ ساکت کر دیا تھا۔ اس کی یہ بات سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میجر کے بجائے شلوکا نائیک کی غذا بن گیا۔ وہ اپنے عمل کو بھول کر نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ترکیب سوچ رہا تھا کہ میجر نے سفاک لہجے میں کہا۔

”ذرا سی حرکت کی تو تم بھی اس حبشی کے پاس پہنچ جاؤ گے خبردار ہلنا نہیں۔“

پجاری   ا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا آخری

سہارا بدی کا دیوتا تھا۔ اس کے لب آہستہ آہستہ ہلنے لگے۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔

میجر شاہ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے ریوالور کی لبلبی پر انگلی رکھی ہوئی تھی۔ ''ہاتھ بلند کر کے کھڑے ہو جاؤ۔'' اس نے گرج کر کہا۔

پجاری کھڑا نہیں ہوا لیکن اچانک اس کا ہاتھ بلند ہوا۔ فضا میں ایک تیز روشنی کا جھماکا ہوا' سب کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ میجر شاہ نے فائر کیا لیکن گولی ضائع گئی کیونکہ پجاری اپنی جگہ موجود نہ تھا اور پھر میجر شاہ نے بڑا ہولناک منظر دیکھا۔ اچانک در و دیوار سے شعلے نکلنے شروع ہو گئے۔ ہر چیز جل رہی تھی۔ دروازے پردے' چبوترہ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ پجاریوں کی چیخوں میں میڈم شکنتلا کی دلخراش چیخ بھی شامل تھی۔ ہر شخص مزار کی راہ ڈھونڈ رہا تھا لیکن برق رفتاری کے ساتھ شعلوں نے سب کو گھیر لیا تھا۔ آگ کی تپش سے میجر شاہ بھی پسینے میں تر ہو چکا تھا۔

اور تب اس کو چبوترے کے نیچے وہ دروازہ نظر آیا جسے پجاری گھبراہٹ میں بند کرنا بھول گئے تھے۔ میجر شاہ نے اس میں چھلانگ لگا دی۔

☆☆

بارش کے باوجود میجر شاہ کار کو بہت تیز رفتاری سے چلا رہا تھا۔ وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچ گیا تھا۔ جہاں شہر کے متمول لوگوں کے بنگلے تھے۔ اسے خوشی تھی جبکہ محض شبہ کی بناء پر اس نے یہ پتہ نوٹ کر لیا تھا۔ جلد ہی اس نے ایک چھوٹے خوب صورت بنگلے کے سامنے پہنچ کر کار روک لی۔ بنگلہ بظاہر تاریک تھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ میجر شاہ نے دروازے پر پہنچ کر گھنٹی کا بٹن دبایا اور دبائے رہا۔ ذرا دیر بعد اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر لائٹ جلی اور گاؤن پہنے ہوئے ایک شخص نے دروازہ کھولا' ریوالور کی نال دیکھ کر وہ جلدی سے پیچھے ہٹا۔ میجر شاہ نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

''یہ...... یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ میجر۔'' گاؤن پہنے ہوئے شخص نے غصے میں کہا۔ ''اتنی رات گئے آپ ریوالور لے کر یہاں کیوں آئے ہیں۔''

''شکر ہے تم نے مجھے پہچان لیا۔'' میجر شاہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ریوالور بھی پہچان لیا ہو گا تمہارا ہی ہے۔''

''میرا ریوالور۔ آپ ہوش میں تو ہیں مجھے ریوالور کی کیا ضرورت۔''

''بکواس مت کرو' اندر چلو۔'' میجر شاہ نے کھلے ہوئے دروازے کی سمت اشارہ کیا لیکن میجر شاہ کو اپنے فیصلے پر اعتماد تھا۔ ''یہ فرض بھی میں خود ہی ادا کروں گا اندر چلو۔''

وہ جس کمرے میں پہنچے وہ بیڈ روم تھا۔ میجر شاہ نے ہر سمت کا جائزہ لیا۔ ایک لمحے کے لیے اسے شبہ ہونے لگا کہ اس سے واقعی غلطی ہوئی ہے۔ پھر اس نے دیوار میں لگی ہوئی سیف کی سمت دیکھا۔ ''سیف کی چابی نکالو۔''

''مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ جیسا شریف آدمی ڈاکہ زنی کر سکتا ہے۔'' اس شخص نے کہا۔

اچانک میجر شاہ آگے بڑھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بال پکڑے اور ایک جھٹکا دیا' سیاہ بالوں کی وگ میجر شاہ کے ہاتھوں میں آ گئی۔ ''اب بھی یقین نہیں آتا۔'' اس نے گاؤن والے کے بھورے بال دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب وگ پہننا کوئی جرم ہے۔''

''اتنے اچھے بالوں پر وگ کی کیا ضرورت تھی لیکن وقت ضائع نہ کرو۔ سیف کی چابی دو۔''

وگ والے نے بڑی پھرتی سے جست لگائی تھی لیکن میجر شاہ اس کے لیے تیار تھا۔ برق رفتاری سے ایک سمت ہٹ کر اس نے اپنی ایڑی کو جنبش دی' ایک پیر وگ والے کے گھٹنے پر پڑا۔ وہ قالین پر منہ کے بل گرا اور میجر شاہ نے موقع نہیں

دیا۔ ریوالور کا دستہ پکڑ کر وہ جھکا اور اٹھنے سے پہلے وگ والے کے سر پر ضرب لگائی وہ کراہ کر گر پڑا اور پھر نہیں اٹھا۔ سیف کی کنجی سونے کی زنجیر کے ساتھ اس کے گلے میں پڑی تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے میجر شاہ نے سیف کھولی اور مسرت سے اس کی نگاہیں اٹھیں۔

سیف میں رکھے ہوئے رجسٹر میں ان تمام افراد کے نام اور پتے درج تھے جنہیں اب تک پجاری بنایا جا چکا تھا۔ اس میں نوشابہ کا نام بھی درج تھا اور اسی کے ساتھ وہ عبا اور نقاب بھی موجود تھی۔ جو ذرا دیر پہلے وہ مندر میں دیکھ چکا تھا۔ میجر نے بیڈ کے پاس رکھی ہوئی میز پر سے پانی کا جگ اٹھایا اور بے ہوش شخص پر الٹا دیا۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔

''اب اٹھ بھی جاؤ مسٹر مائیکل۔ تمہاری خواہش پر میں پولیس کو فون کر چکا ہوں۔'' مائیکل نے خوفزدہ نگاہوں سے ریوالور کی نال اور سامنے رکھی ہوئی عبا اور رجسٹر کو دیکھا۔ اس میں اٹھنے کی سکت نہ رہی تھی۔

''تم حیران تو ہو گے کہ میں نے تمہیں کیسے پہچانا۔'' میجر شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم کو فیشن آرکیڈ کی ملاقات یاد ہے۔ یہ بھی یاد ہوگا کہ میں نے ڈائریکٹر صاحب سے نوشابہ کے بارے میں پوچھا تو تمہیں ناگوار گزرا تھا۔ تم فرم کے مالک نہیں بلکہ ڈیزائن آرٹسٹ تھے۔ تمہارے رویے نے مجھے مشکوک کر دیا اور پھر میں تمہاری آنکھوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا' ان میں ایسی سونے جیسی چتیاں میں نے پہلے شلوکا کو میری موت کا حکم دے رہے تھے۔''

اسی لمحے دروازہ کھلا انسپکٹر نواز پولیس والوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

''ہم پہلے کالی گھاٹ پہنچے تھے۔'' انسپکٹر نواز نے کہا۔ ''بابا صاحب نے شارق سے اس جگہ کا پتہ معلوم کر لیا تھا۔''

''شارق سے۔''

''ہاں...... وہ بیہوشی کے عالم میں بھی بول رہا تھا۔ اسی نے بتلایا کہ وہ تمہیں ہلاک کر رہے ہیں۔ یہ بابا صاحب تو بہت پہنچے ہوئے آدمی ہیں۔''

''پھر...... پھر کیا ہوا۔''

''وہ عمارت جل کر راکھ ہو چکی ہے۔ کوئی بھی بچ نہیں سکا۔ ہم فائر بریگیڈ والوں کی مدد سے لاشیں نکال رہے تھے۔ میں ان میں تمہاری لاش تلاش کر رہا تھا کہ وائرلیس پر تمہارے فون کا پیغام ملا اور ہم آندھی طوفان کی طرح یہاں پہنچ گئے۔'' اس نے کہا۔

''یہ شخص کون ہے۔''

''نوشابہ اور اس کے قاتل کا قاتل۔'' میجر نے کہا۔ ''اور الیاس بیگ کے علاوہ ان تمام لوگوں کا قاتل جن کی لاشیں تمہیں ملی ہیں۔''

☆☆

وہ ہسپتال پہنچے تو شارق ہوش میں آ چکا تھا اور صوفیہ سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ ان کو دیکھتے ہی وہ مسکرایا۔ ''شکر ہے آپ خیریت سے آ گئے۔ میجر شاہ۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''میں بیہوشی کے عالم میں جو کچھ دیکھ رہا تھا۔''

''بے ہوشی نہیں ہوش کے عالم میں۔'' بابا صاحب نے اسے ٹوکا۔ ''تم اس وقت خوفناک سحر کے زیر اثر تھے۔''

''بابا صاحب۔'' انسپکٹر نواز نے کہا۔ ''میری کھوپڑی میں تو یہ گورکھ دھندا آیا نہیں۔ اب آپ ہی کچھ بتا دیجیے کہ کیا چکر تھا۔ یہ سب کچھ کیا تھا۔''

''قصور تمہاری کھوپڑی کا ہے۔ جو اندر سے خالی ہے۔'' شارق نے آہستہ سے کہا۔

انسپکٹر نواز نے اسے بناوٹی غصے سے گھورا۔ ''میری کھوپڑے کے اندر کا حال تو پتہ نہیں لیکن تمہاری کھوپڑی تو سرجن کھول کر دیکھ چکے ہیں۔ اندر جانتے ہو کیا بھرا ہوا ہے۔ بھس۔''

''میرا خیال ہے۔ دونوں کی کھوپڑیوں میں بھس بھرا ہوا ہے۔'' میجر شاہ نے مسکرا کر کہا۔ ''تم کو اندازہ نہیں کہ تم نے کتنے خطرناک گروہ کو ختم کیا ہے۔''

''پلیز میجر ہم یہ جاننے کے لیے بے چین ہیں کہ شارق کی کھوپڑی کا یہ حشر ہوا کیسے۔'' صوفیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

میجر ایک لمحے سوچتا رہا۔ ''یہ مائیکل مصری سحر کا ماہر تھا۔ یہ عمل جو اس نے کیا ایک قسم کا کالا جادو ہے جو وہاں کے قبائلی جزیروں میں عام ہے۔ اس کے ذریعے خواہ دشمن کتنے ہی فاصلے پر کیوں نہ ہو۔ اسے ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ آج کے سائنسی دور میں یہ تمام باتیں ناقابل یقین سمجھی جاتی ہیں لیکن بابا جان اس موضوع کے ماہر ہیں اور وہ گواہی دیں گے کہ سحر کا وجود ایک حقیقت ہے۔ کچھ عرصہ قبل آسٹریلیا کے میڈیکل سرجن نے اس عمل پر جو یہ پجاری کر رہے تھے۔ ایک تفصیلی مضمون شائع کیا ہے۔ جس میں کہا گیا تھا کہ اس عمل کے ذریعے ہونے والی اموات کے بارے میں تحقیق کی ضرورت ہے۔''

''لیکن یہ ہے کیا بلا۔'' انسپکٹر نواز نے پوچھا۔

''تم نے ٹیلی پیتھی یا ای' ایس پی کا نام تو سنا ہوگا۔ ذہن کی اس قوت کے ذریعے فاصلے پر بیٹھے ہوئے انسان سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اسے کسی کام کی ہدایت کی جا سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح کا عمل یہ پجاری اپنے عمل کے ذریعے کرتے ہیں۔ عامل اپنی ذہنی قوت کے سحر کے ذریعے سب کچھ کر سکتا ہے۔ تم سب نے دیکھا کہ پولیس کی ٹرانسپیرنسی سے تصویریں غائب ہو گئیں۔ نوشابہ کی لاش پگھل گئی۔ شارق مرتے مرتے بچا' یہ تمہاری یقین دہانی کے لیے کافی ہے۔ مائیکل کا اصل نام ہربینڈ تھا۔ وہ مصری جزیرے کا مشہور ساحر تھا اور کئی اہم افراد کا قتل کر کے وہاں سے بھاگ گیا تھا۔

وہاں سنانی کے مندر میں مصری ساحروں کا فن سیکھا' جس کے ذریعے لوگوں کو اپنے تابع بنا کر جرائم کا ارتکاب کر لیا۔ وہاں جب خطرہ محسوس ہوا تو فرار ہو کر یہاں آ گیا۔ بلا کا چالاک شخص تھا۔ پڑھا لکھا اور فنکار تھا۔ فیشن آرکیڈ میں اس نے ملازمت کر لی آرٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے بڑے گھرانوں کی لڑکیوں سے اس کا رابطہ رہتا تھا۔ جنہیں وہ اپنے مندر کے پجاریوں میں شامل کر کے سحر کے ذریعے مجبور کرتا اور پھر بعد میں بلیک میل کر کے استعمال کرتا تھا۔ نوشابہ بھی اسی کا شکار بنی لیکن وہ ضدی اور خود سر لڑکی تھی۔ اس نے پوجا کی شرمناک رسموں سے انکار کر دیا۔ اس لیے اسے قتل کر دیا گیا۔ بدرالدین اور الیاس بیگ کو اس لیے ہلاک کر دیا گیا کہ وہ نوشابہ کے جسم پر بنے ہوئے خفیہ نقش کو دیکھ چکے تھے اور تم کو اور مجھے اس لیے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہم ان کی سرگرمیوں کو معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔'' میجر شاہ نے انسپکٹر نواز کی سمت دیکھا۔ ''یہ صرف اتفاق ہی ہے کہ ہم نے بروقت اس گروہ کا قلع قمع کر دیا۔ ورنہ پولیس کا پراسرار جرائم کی بنا پر ناطقہ بند ہو جاتا۔''

''میجر...... آپ نے یہ سب باتیں پولیس سے پوشیدہ رکھی تھیں۔'' انسپکٹر نے شکوہ کیا۔

''اگر میں پہلے سے سب کو بتا دیتا تو یقین کون کرتا اور پولیس اگر کوشش بھی کرتی تو ہربینڈ کا پتہ نہ لگا سکتی۔''

''کیا آپ ہمیں اتنا احمق سمجھتے ہیں میجر شاہ۔''

''میجر مروت سے کام نہ لیجیے۔ صاف بتلا دیجیے کہ کتنا سمجھتے ہیں۔'' شارق نے کہا اور کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

◆......◆......◆

یادش بخیر

ایم اے راحت

شادی کے چار ماہ بعد نئی نویلی دلہن کا جینز اور مردانہ قمیض کے ساتھ نارتھ اسٹار ٹائپ جوتے چڑھا کے یوں مصافحہ کرنا اور ایسی بے باکی سے اظہار خیال سگریٹ نوشی وغیرہ اب کوئی غیر اخلاقی یا معیوب بات نہیں' قدریں بدلتی رہتی ہیں اور مانگ میں ستاروں کی افشاں' حنا سے عارض پر شفق کا کھلنا۔ رنگ پیراہن کا یا خوشبو زلف لہرانے کا نام اور حسن کی ادائے محبوبی اور نسوانیت کی نزاکت پرانی اصطلاحات اور استعارے ہیں لیکن محمود کا ذہن اس سے مطمئن نہ ہوا کیونکہ اس کے ارد گرد دنیا ابھی اتنی نہیں بدلی تھی اور خود محمود دنیا سے اتنا بے تعلق بھی نہیں تھا کہ کسی انقلاب سے ایشیاء بھی یورپ بن جاتا اور اسے خبر نہ ہوتی۔ خود شمائلہ کبھی عام عورت نہیں رہی تھی اور پیشے کے اعتبار سے بیسوا تھی مگر اس کے انداز دلیری میں بھی ایک رکھ رکھاؤ تھا اور اس کی نسوانیت میں بھی رعنائی حسن تھا۔

آپ کے پسندیدہ قلمکار کی تحریر...... اس ماہ کی خاص کہانی

بازار میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ ستمبر کے آغاز سے ہی گرمیاں گزارنے کے بہانے مری آنے والوں کی گہما گہمی کم ہونے لگی تھی۔ اِکا دُکا کوٹھیوں کے بند دروازوں پر قفل دکھائی دینے لگے تھے اور رخت سفر باندھ کے روانہ ہونے والوں کی گاڑیاں دن بھر پہاڑی راستوں کے نشیب پر رینگتی رہتی تھیں۔ ملک کے ہر شہر اور ہر علاقے سے پہنچنے والی خواتین کے خوبصورت چہرے میک اپ کے باوجود ملول نظر آتے تھے۔ کسی کو گل بداماں وادیوں اور کوہساروں کی فرحت بخش فضاؤں کو چھوڑ کر سپاٹ میدانی علاقوں میں لوٹنے کا ملال نہیں تھا' جہاں اب بھی چلچلاتی دھوپ پڑ رہی تھی کیونکہ اس سے زیادہ ٹھنڈک تو ان کے ایئر کنڈیشنڈ گھروں اور کاروں میں تھی اور یہی عیش و عشرت کے لوازمات وہاں بھی تھے جو دولت کی فراوانی سے حاصل ہوتے ہیں۔

مگر وہاں مصروفیات میں بیزار کن یکسانیت کا احساس ہوتا تھا اور خوشی بھی ایک کاروبار لگتی تھی۔ مری ان خواتین کو سالانہ فیشن کانفرنس کے لیے بہترین ماحول فراہم کرتی تھی۔ علاقائی ملکی اور غیر ملکی فیشن کے امتزاج سے وجود میں آنے والے نئے فیشن پورا سال مروج رہتے تھے۔ صنعت کاروں' بڑے بڑے تاجروں اور اسمگلروں کے اہل خانہ کے ساتھ اوپر کی کمائی سے دولت مندوں کی صف میں شامل ہو جانے والے بدعنوان سرکاری حکام اور جاہل ٹھیکیداروں کے گھروں کی خواتین بھی تعلقات عامہ کو فروغ دینے کے لیے آتی تھیں اور عام پیشہ ور عورتوں کے ساتھ اعلیٰ قسم کی وہ طوائفیں بھی آجاتی تھیں جس کو کسی لکھ پتی خان کی نظر سے گرنے سے پہلے کسی کروڑ پتی کی نظر میں سما جانے کا فن آتا تھا۔ مری ایک لوکل سوئٹزر لینڈ تھا۔ میرج بیورو تھا اور ایمپلائمنٹ ایکس چینج تھا جو پندرہ مئی کو کھل کے پندرہ ستمبر کو بند ہو جاتا تھا۔

گزشتہ چند سالوں میں اس نے کئی بار شمائلہ کو مری میں دیکھا تھا۔ ہر مرتبہ اس کے ساتھ نیا آدمی نظر آتا تھا۔ چنانچہ وہ نظر چرا کر یا اجنبی بن کر گزر جاتا تھا۔ وہ ہر سال چند دن تفریح میں گزارنے کی خاطر مری آتا تھا تو کسی بھی ہوٹل میں ٹھہر جاتا تھا۔ سیزن کے شروع میں کمرے یا تو ملتے نہیں تھے یا ملتے تھے تو دگنے کرائے پر۔

چنانچہ وہ ستمبر میں پہنچتا تھا۔ ہر سال اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ مری کی طرح شمائلہ کے حسب شباب میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کی عمر چالیس سال سے اوپر ہو چکی تھی مگر وہ اپنی اٹھارہ سال کی بیٹی کے ساتھ اس کی بڑی بہن لگتی تھی۔ ایک بار تو اس نے بیک وقت ماں' بیٹی کو ایک جیسے لباس میں اور آرائش جمال میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے دیکھا تھا تو حیران رہ گیا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ خود اپنی بیٹی نائلہ کا ہم سن ثابت کر کے وہ کس کو دھوکہ دیتی ہے۔ دنیا کو یا اپنے آپ کو۔

تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا کہ شمائلہ اب بھی بھرپور عورت تھی اور اسے دیکھ کر نوجوانی کی عمر سے گزر جانے والے مرد ٹھٹک کر رک جاتے تھے۔ ان میں خود محمود بھی شامل تھا۔ شمائلہ کا بڑا لڑکا تو اب بیس سال کا ہو چکا تھا۔ محمود کی کبھی شمائلہ سے براہِ راست مراسم نہیں رہے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ شمائلہ کس قماش کی عورت ہے انیس سو اسی میں جب وہ پشاور کے ایک کالج میں فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی اور اس کے کاروباری والد ویسٹرج کے علاقے میں رہتے تھے تو ایک رات ڈاکوؤں نے گھر میں کود کر سب کچھ لوٹ لیا۔ مزاحمت کے دوران اس کے والدین مارے گئے بلکہ گھر کو بھی آگ لگا گئے۔ ڈاکو با اثر لوگ تھے اور انہوں نے جو کچھ کیا تھا' وہ ایک انتقامی کارروائی تھی۔

شمائلہ کو کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس کارروائی کا جواز کیا تھا' وہ سال بھر کسی دور افتادہ گاؤں کی حویلی میں مقید رہی۔ اگر وہ بیوقوف ہوتی تو اسی حویلی کے احاطے میں دفن کر دی جاتی مگر اس نے بڑی چالاکی سے کام لیا اور چوہدری صاحب کا دل جیتنے میں کامیاب ہو گئی۔ سال بھی کے بعد جب اس کی بچی دو

ماہ کی تھی۔ اسے تقدیر نے موقع فراہم کیا، جس کے انتظار میں اس نے ایک سال گزارا تھا۔ ایک ٹوکے سے اس نے چوہدری سمیت دو مجرم بھائیوں، ان کی بیویوں اور ایک بہن کے سرتن سے جدا کیے۔ ان میں سے ایک کی بیوی کے چار سالہ بچے کو باہر نکالا۔ اپنے بچے کو سمیٹ کر بغل میں دبایا اور حویلی کو آگ لگا کر فرار ہوگئی۔ اس کے لیے واپس اپنے گھر یا کسی عزیز کے گھر جانا ناممکن تھا۔ وہ جانتی تھی پولیس والے اور چوہدری کے رشتے دار اسے تلاش کرتے ہوئے کہاں کہاں پہنچ سکتے ہیں۔

بچے کو اس نے تین دن بعد شہر کے ایک خوبصورت علاقے میں کوٹھی کے پورچ میں کھڑی ہوئی کار کے اندر لٹایا اور اس کے ساتھ ہی ایک رقعہ چھوڑ دیا کہ میں بحالت مجبوری اس بچے کو چھوڑ رہی ہوں کیونکہ اس کے بدقماش باپ نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اپنے ساتھ اس معصوم کی جان لینا میرے لیے مشکل ہے اور ایک صاحب ثروت کے لیے اس کی پرورش کا بار اٹھانا کوئی مشکل نہیں۔ اس کا اجر خدا دے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کی چال کامیاب رہی۔ وہ بچہ اس گھر میں پرورش پانے لگا۔ یتیم خانے میں پہنچا۔

خود شمائلہ نے کئی جگہ ناکام ہونے کے بعد بالآخر ایک دولت مند رنڈوے کی ملازمت قبول کر لی جس نے بالآخر اس سے نکاح کیا کیونکہ شمائلہ نے پولیس کے پاس جا کے اپنا حق طلب کرنے کی اور اس کی عزت خاک میں ملا دینے کی دھمکی دے دی تھی۔ وہ دل کا مریض تھا اور سال بھر شمائلہ کو بے اولاد چھوڑ کر مر گیا۔ اس کی جائیداد پر لعنت بھیج کر شمائلہ نے نقد مال سمیٹا اور غائب ہوگئی۔

قانونی وراثت کے چکر میں اسے نقصان کے سامنے پیش ہونا پڑتا اور بہت جھوٹ بولنا پڑتا۔ زیورات کی مالیت ہی پچاس ہزار سے کم نہ تھی اور اس نے گھومتے پھرتے اور ٹھکانے بدلتے اس سال گزار دیا۔ شوقین مزاج رئیس زادے آسانی سے اس کے دام حسن میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور پھر اپنے عزت دار والدین کے ڈر سے شوق کی بہت بھاری قیمت دے کر جان چھڑاتے تھے۔ شمائلہ کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہوا تو مغل پورہ کے ایک بدمعاش کا اس پر دل آ گیا۔ اس نے شمائلہ سے باقاعدہ شادی کی اور شمائلہ دھڑلے سے شانی کے ساتھ گھومنے لگی۔ مشہور یہ تھا کہ وہ بدمعاشی میں بھی اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ وہ اپنی ذہانت اور دلیری کے باعث چوری، ڈکیتی کی متعدد وارداتوں میں شریک ہوئی لیکن کبھی پولیس کے ہاتھ نہیں آئی۔ اس بدمعاش سے اس کی بیٹی نائلہ پیدا ہوئی تھی جو سال بعد ڈاکہ ڈالنے کی ایک ناکام کوشش میں مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ شمائلہ جو گاڑی لیے انتظار کر رہی تھی، آخری وقت میں فائرنگ کرتی ہوئی نکل گئی۔ اس کا سراغ ملا تو وہ ایک بہت معزز شخص کی بیوی تھی۔ اس نے یہ ثبوت بھی فراہم کر دیا کہ یہ ازدواجی تعلق پرانا ہے۔ کسی معزز اور معتبر آدمی کی بیوی پر جو واردات کے وقت ملتان میں ہو، یہ الزام کون لگاتا کہ وہ ایک بدمعاش کی بیوی تھی اور ڈاکے میں شریک تھی۔ شانی بدمعاش مر چکا تھا اور باقی ملزم ہنوز روپوش تھے۔ مغل پورہ کے اس بدمعاش نے بھی شمائلہ کے لیے بہت کچھ چھوڑا تھا اور اس کاروباری ذہن رکھنے والی عورت نے اپنا سب کچھ نقد رقم کی صورت میں جمع کر رکھا تھا۔ اس کی اپنی زندگی عیش وعشرت میں اور بہت آرام سے بسر ہو رہی تھی۔ مغل پورہ کے شانی بدمعاش کے بعد وہ بہت محتاط ہوگئی تھی اور اس نے جرائم سے کنارہ کشی اختیار کر کے باعزت زندگی گزارنی شروع کر دی تھی۔ یعنی باعزت لوگوں کی داشتہ بن کے رہنے لگی تھی اور یہ سلسلہ جاری تھا۔ اس نے ایک کوٹھی اسلام آباد میں خریدی تھی اور دوسری مری میں۔ بحریہ ٹاؤن میں ایک کنال پر محیط اسلام آباد کی کوٹھی اسی کوٹھی کے جلے ہوئے کھنڈر پر تعمیر ہوئی تھی جو شمائلہ کے والدین کا مقتل تھی اور جہاں سے اس کی تباہی کی داستان کا آغاز ہوا تھا۔ سولہ سال بعد حالات ہی نہیں، وقت بھی

اور لوگ بھی بدل گئے تھے اور کسی کے ذہن میں نہ اس چونکاں سانحے کی یاد تھی اور نہ اس لڑکی کی صورت کا عکس تھا جو انتقال کی آگ میں جل کر خاک ہو جانے والے گھر کا ایک ہی روشن چراغ تھی۔ شمائلہ کی موجودہ مالکوں سے نئی کوٹھی خریدنے کے لیے اصل قیمت سے دو لاکھ زیادہ پیش کرنے پڑتے تھے اور اتنے فائدے کو دیکھتے ہوئے وہ مجبور ہو گئے تھے کہ دوسری اس سے بڑی اور بہتر کوٹھی میں منتقل ہو جائیں۔ نئی کوٹھی کے نقشے میں ردوبدل ضرور ہوا تھا مگر بہت کچھ وہی تھا' چنانچہ وہ کمرہ بھی موجود تھا جہاں اس کے والدین کا لہو گرا تھا۔ اس نے یہ کمرہ مقفل کر دیا تھا اور سال میں بڑی عقیدت سے اس مزار پر دو موم بتیاں روشن کرتی تھی' جہاں دیکھنے والوں کو موزائیک کے خوبصورت فرش پر کہیں خون کا داغ تک نظر نہ آتا تھا۔

اور یہ سب باتیں محمود کو اس لیے معلوم تھیں کہ وہ معتبر اور معزز شخص جس نے شمائلہ کے شوہر مغل پورہ کے بدمعاش شانی کے مارے جانے کے بعد یہ جھوٹ بول کر شمائلہ کو بچا لیا تھا کہ سال بھر سے وہ اس کی منکوحہ ہے' خود محمود تھا۔

محمود کا کل اسباب ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا جس میں چند سوٹ' شب خوابی کے لباس' شیونگ کا سامان اور ایسی ہی کچھ ذاتی ضروریات کی چیزیں تھیں۔ شمائلہ کی رہائش گاہ بہت عالی شان تو نہ تھی مگر مری میں اتنی بڑی جگہ کی ملکیت بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ سامنے کے حصے میں پھیلا ہوا لان تقریباً تیس گز لمبا اور تیس گز چوڑا تھا اور اندر جانے والے راستے کے دائیں ہاتھ پر تھا۔ گھنے درختوں کے دامن میں کاٹج ٹائپ مکان کے شمالی اور شرقی حصے میں ایک ہی برآمدہ تھا جس میں کھلنے والی کھڑکیوں کی تعداد سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ نچلی منزل پر کم سے کم چار بیڈ روم ضرور ہوں۔ دو کمرے اوپر کی منزل پر بھی تھے اور ان کا رخ مغرب کی جانب تھا۔ جدھر گیراج اور سرونٹ کوارٹر کی دیوار کے بعد سو فٹ سے زیادہ کی گہرائی تک نشیب تھا اور غیر آباد جنگل تھا۔ دوسرے مکان بائیں جانب تقریباً ایک قطار میں مگر اتنے فاصلے پر بنے ہوئے کہ درمیان میں حائل درختوں اور جھاڑیوں کے باعث صاف دکھائی نہ دیتے تھے۔

اندر داخل ہوتے ہی اسے چار افراد پر مشتمل ایک گروپ لان کے آخری کنارے پر نظر آیا۔ وہ سب رنگین پلاسٹک کی سیٹوں والی گارڈن چیئرز پر بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تاش کے پتے تھے۔ کھیلنے والوں میں تین مردوں کے ساتھ ایک عورت بھی شامل تھی۔ ان کے سامنے زرد اور سرخ رنگ کے مشروب سے بھرے ہوئے گلاس رکھے تھے۔ زرد مشروب صرف عورت کے پاس تھا اور دور سے دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ گلاسوں میں سے ناب ہے یا اصطلاحاً کوئی سوفٹ ڈرنک شمائلہ کے لیے یا اس کے گھر کے مہمانوں کے لیے حرام و حلال کے تصورات آؤٹ آف ڈیٹ تھے۔ رات کے دوسرے حصے میں صرف دوگانا نہیں ہو رہا تھا' ورنہ پورا منظر کسی رومانی فلم کا حصہ تھا اور شوٹنگ میں حصہ لینے والے چاکلیٹ ہیرو ٹائپ نوجوان کے ساتھ جو لڑکی ہیروئن بنی بیٹھی تھی' وہ بھی دھان پان سی تھی۔ وہ دنیا مافیہا سے بے نیاز مکالمے بولنے سے مگن تھے کہ سیٹ پر محمود نے قدم رکھا اور نوجوان اس دخل اندازی پر برا مانتا ہوا اٹھ کے آگے بڑھا۔ جب وہ اس کے قریب آیا تو مختیار نے اس کی صورت کے نقوش میں شمائلہ کی جھلک دیکھی اور سمجھ گیا کہ وہ شمائلہ کا بیٹا ہے۔

''جی؟''

وہ محمود کے آگے واجبی شائستگی سے بولا۔ ''کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

''آپ کی امی سے۔'' محمود نے کہا۔

''کیا کہتے ہیں آپ انہیں۔ ممی یا امی؟'' وہ چونکا۔

''آپ مجھے جانتے ہیں؟''

''میں نے تو کبھی آپ کو نہیں دیکھا۔''

''دیکھا تو میں نے بھی نہیں تھا تمہیں۔'' محمود نے بزرگی کا انداز اختیار کیا۔

''اور مجھے تمہارا نام بھی نہیں معلوم لیکن یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ یہ لڑکی تمہاری بیوی ہے۔''

نوجوان کو محمود کی یہ بے تکلفی کی ادا پسند نہیں آئی۔ ''آج تک مجھے بھی اندازہ نہیں ہوسکا کہ ممی کے دوستوں کی تعداد کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ خود انہیں بھی یاد نہیں۔''

وہ بولا اور محمود کو اس کے لہجے میں طنز سے زیادہ حقارت اور تلخی کا واضح احساس ہوا۔ اگر وہ مشتعل ہوتا تو دوست کی جگہ ''یار'' اور ''آشنا'' جیسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے بھی نہ ہچکچاتا۔ بیٹے کی نگاہ میں شمائلہ جیسی ماں کے لیے پُرتقدس احترام کا جذبہ نہیں تھا تو اس کا قصوروار وہ نوجوان نہیں تھا جس نے تین سال کی عمر سے باپ کے بغیر صرف ماں کی آغوش میں پرورش پائی تھی لیکن محبت کا یہ دروازہ کسی گھر کی خلوت کا محافظ اور امانت دار نہیں تھا۔ یہ شارع عام پر واقع مکان کا دروازہ تھا۔ شمائلہ اپنے بیٹے کو نفرت کا یہ ردعمل ہی دے سکتی تھی۔

''تم ان سے جا کے کہو مسٹر محمود آئے ہیں۔''

اس نے متانت سے کہا۔ اسی وقت برآمدے کا دروازہ کھول کے شمائلہ نمودار ہوئی۔ محمود کو دیکھ کر اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کررہی ہے۔

''محمود صاحب۔'' وہ اس کی طرف لپکی۔

''آپ یہاں؟ آپ نے تو کمال کردیا۔''

قریب آکر وہ اپنے بیٹے سے مخاطب ہوئی۔ ''احمد! یہ تمہارے پاپا کے دوست ہیں مسٹر محمود صاحب یہ میرا بیٹا ہے۔''

احمد نے اخلاقاً ہاتھ ملایا۔

''انہیں معلوم ہے یہ تو رابعہ کو بھی جانتے ہیں۔''

اس نے پھر طنز سے بات کی۔ اس کی مسکراہٹ صاف سوال کررہی تھی کہ آخر تم یہ بات کیسے بھول گئے تھے کہ تم پاپا کے دوست تھے۔

''اچھا تم ان کا سامان اندر پہنچاؤ۔''

شمائلہ نے ہنس کر تھوڑی سی خفت کے ساتھ بات ٹالی۔ ''اوپر والا کمرہ......''

''اوپر ایک میں پروڈیوسر صاحب مقیم ہیں، دوسرے میں ڈائریکٹر صاحب۔'' احمد نے مطلع کیا۔

''ان کو ایک کمرے میں کردو۔''

شمائلہ نے تھوڑا سا چڑ کے کہا۔

''آؤ محمود! تمہیں دوسرے مہمانوں سے ملواؤں مگر پہلے مجھے یہ بتاؤ، تم یہاں کیسے آپہنچے اور آئے ہو تو کچھ دن یہاں رہوگے نا؟''

یہ سب رسمی قسم کے سوال یہ تاثر برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھے کہ وہ اچانک بھول کر آجانے والا کوئی بے ضرر قسم کا پرانا ملاقاتی ہے۔ باقی لوگ اب اس کی طرف متوجہ تھے اور اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی عجیب الخلقت چیز ہو۔ سوا آٹھ فٹ کا یا سوا فٹ کا قد یا ہاتھی جیسے کانوں والا۔ ان کی یہ دلچسپی کس حد تک تشویش آمیز تھی یا یہ محض محمود کے احساس کا کرشمہ تھا کیونکہ اس کے ذہن میں شمائلہ کی بات تھی۔ احمد کی بیوی نے بڑی شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس سے باقاعدہ مصافحہ کیا۔ عام معاشرے میں عورت کا مرد سے ہاتھ ملانا معیوب سمجھا جاتا تھا مگر یہاں ساس کے سامنے بہو اس بے تکلفی کا مظاہرہ کررہی تھی تو اس کی وجہ بھی وہی تھی کہ یہ گھر عام معاشرے کی اخلاقی اقدار کا پابند نہ تھا۔ خود بہو کا لباس روایت سے بغاوت کی نمایاں مثال تھا۔

''رابعہ کا اصل نام زینب النساء ہے۔'' شمائلہ نے کہا۔

''احمد اب رابعہ کہتا ہے۔ یونیورسٹی میں احمد کے ساتھی۔''

''ممی! میں احمد سے ایک سال آگے تھی۔'' رابعہ نے فخر سے بتایا۔

''وہ تو ڈگری بھی نہیں لے سکا۔ نالائق۔''

''رابعہ نے نفسیات میں ایم اے کیا ہے۔''

شمائلہ نے ناگواری سے خشک لہجے میں تسلیم

کیا۔ ''لیکن میں ماہر نفسیات نہیں ہوں۔''

وہ بے تکلفی سے ہنسی اور آلتی پالتی مار کے زمین پر بیٹھ گئی۔

''کتنا عرصہ ہوا ہے ان کی شادی کو؟'' محمود نے شمائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی چار مہینے ہوئے ہیں۔'' شمائلہ نے کہا۔ اس وقت رابطہ اپنی جیب سے ایک خمیدہ کمر سگریٹ نکال کر سیدھا کرنے میں مصروف تھی۔

''لیکن جناب!'' پیچھے سے آواز آئی۔ ''یہ دیکھیے کہ میں نے ممی کو دادی بننے کی خوشخبری سنادی ہے۔''

محمود بھونچکا رہ گیا۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں' ورنہ شادی کے چار ماہ بعد نئی نویلی دلہن کا جینز اور مردانہ قمیض کے ساتھ نارتھ اسٹار ٹائپ جوتے چڑھا کے یوں مصافحہ کرنا اور ایسی بے باکی سے اظہار خیال سگریٹ نوشی وغیرہ اب کوئی غیر اخلاقی یا معیوب بات نہیں' قدریں بدلتی رہتی ہیں اور مانگ میں ستاروں کی افشاں حنا سے عارض پر شفق کا کھلنا۔ رنگ پیراہن کا یا خوشبو زلف لہرانے کا نام اور حسن کی ادائے محبوبی اور نسوانیت کی نزاکت پرانی اصطلاحات اور استعارے ہیں لیکن محمود کا ذہن اس سے مطمئن نہ ہوا کیونکہ اس کے اردگرد دنیا ابھی اتنی نہیں بدلی تھی اور خود محمود دنیا سے اتنا بے تعلق بھی نہیں تھا کہ کسی انقلاب سے ایشیاء بھی یورپ بن جاتا اور اسے خبر نہ ہوتی۔ خود شمائلہ بھی عام عورت نہیں رہی تھی اور پیشے کے اعتبار سے بیسوا تھی مگر اس کے انداز دلیری میں بھی ایک رکھ رکھاؤ تھا اور اس کی بازانیت میں بھی رعنائی حسن تھی۔

محمود نے کوٹھے پر بیٹھنے والی طوائف میں بھی وہ عورت دیکھی تھی جو اپنے بناؤ سنگھار سے اور عشوہ غمزہ ادا سے ہوشمند مرد کو دیوانہ کر دیتی تھی۔ معلوم نہیں اس نیم مردانہ عادات واطوار والی عورت اور نیم زنانہ ٹائپ مرد کے درمیان ربط اور کشش کے جذبات کی شدت بھی وہ ہے یا نہیں پھر اس نے خود کو یاد دلایا کہ حسن تو ایک حیوانی جذبہ ہے اور ذہن کے ایک کیفیت کا نام ہے اور آگے بڑھ گیا۔ تاش کھیلنے والے مردوں میں ایک فلم پروڈیوسر تھا جس نے پہلی پنجابی فلم بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ چالیس سال کا ایتھلیٹ ٹائپ صحت مند شخص تھا۔ دوسرا اسی فلم کا ڈائریکٹر تھا۔ اپنی صحت اور قدوقامت میں پروڈیوسر اگر سیر تھا تو وہ تولہ کم سولہ چھٹانک تھا۔ انہیں ساتھ ساتھ دیکھ کر محمود کو منکر نکیر کا خیال آیا۔ تیسرا شخص عمر میں کچھ زیادہ تھا لیکن پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ یہ شمائلہ کا تازہ ترین شوہر تھا اور تعارف پر اس نے بڑی خوش دلی اور خوش اخلاقی کے ساتھ محمود سے مصافحہ کیا۔ ان کے ساتھ والی عورت پنجابی بھی ٹھیک سے بس بول سکتی تھی لیکن وہ مجوزہ پنجابی فلم میں متعارف کرائی جانے والی تہلکہ خیز ہیروئن تھی۔ بظاہر وہ ایک عام قسم کی عورت نہ تھی اور اسے حسین کہنا بھی مشکل تھا مگر محمود جانتا تھا کہ اسکرین ٹیسٹ کے لیے چہرے کا ''فوٹو جینک'' ہونا ضروری ہے۔

حسین ہونا شرط نہیں۔ یہ کیمرے کی آنکھ کی نامعقولیت ہے کہ حسین کو حسین نہیں دیکھتی اور بدصورت کو اتنا خوبصورت بنا کے دکھاتی ہے کہ دلوں پر قیامت ڈھائے۔ اس عورت کی ادائیں بھی اتنی بھونڈی نہیں تھیں کہ آنے والی پنجابی فلم کی ہیروئن کی حیثیت سے اس کی کامیابی کے بارے میں محمود کا شک یقین میں بدلنے لگا۔ لیلیٰ مجنوں پھر سابقہ پوز اور پوزیشن میں آچکے تھے۔ چنانچہ محمود نے اجازت چاہی۔ زیر استعمال مشروب کو قبول کرنے سے معذرت کے ساتھ انکار کرتے ہوئے محمود نے کہا کہ وہ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کے ترجیحاً کافی' ورنہ چائے پیے گا۔

شمائلہ سے بات کرنے کا موقع اسے آدھے گھنٹے کے بعد ملا۔ اس نے شمائلہ کی ''بہو'' اس کے فلمی مہمانوں پر تبصرے سے گریز کیا مگر شمائلہ خود ہی خاصی غیر مطمئن' خفت زدہ اور پریشان سی تھی۔

''تم نے میرے شوہر کو دیکھا' نظامی کو؟'' وہ

بولی۔ ”باقی سب اس کے دوست ہیں‘ میرے نہیں۔“
”تمہارا شوہر کیا کرتا ہے؟“ محمود نے کافی بناتے ہوئے کہا۔ ”آدمی تو معقول لگتا ہے‘ مجھے نظامی۔“
”اس کی نامعقولیت یہی ہے کہ وہ کچھ نہیں کرتا۔“ شمائلہ نے کہا۔ ”وہ کچھ کر ہی نہیں سکتا۔“
”پھر تم نے یہ چنڈال چوکڑی کیوں پال رکھی ہے؟“ محمود نے کہا۔ ”کیا مجبوری ہے تمہیں؟“
”تم مانو گے نہیں۔“ وہ کچھ دیر بعد بولی۔ ”مجھے اپنے شوہر سے واقعی محبت ہے۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتی۔ میں نظامی کی ہر جائز ناجائز خواہش پوری کرتی ہوں۔ اس کے سو ناز اٹھاتی ہوں اور زرخرید لونڈی کی طرح اس کی تابعدار ہوں۔ میں جانتی ہوں‘ اس میں کوئی خوبی نہیں اور اس کی ذات کی خامیاں کیا ہیں۔ تم سے پہلے خود میں نے اپنے آپ سے یہی سوال کیا تھا کہ مجھے کیا مجبوری ہے اور جواب یہی تھا کہ میں اسے چاہتی ہوں۔ اچھا یا برا‘ نظامی جیسا بھی ہے۔“
”شانی سے بھی اتنی ہی محبت تھی تمہیں؟“ محمود نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”جانی۔“ وہ خلاء میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اس کی محبت کا موازنہ کسی سے نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد مرد تھا۔ اس جیسا کوئی دوسرا کیسے ہو سکتا ہے۔ میری بڑی آرزو تھی کہ احمد دوسرا شانی بنے۔ پیشے کے اعتبار سے نہیں‘ اس میں وہی مردانہ صفات ہوں‘ وہ اتنا دلیر اور جرأت مند اور بے باک اور کھرا ہو کہ قول اور ایمان کو سمجھنے والا یار کہہ کر یاری پر جان دینے والا‘ اپنی ذات پر اعتماد کے سہارے بڑے سے بڑے طوفان کا چیلنج قبول کرنے والا اور ساری دنیا کو اپنی ٹھوکر میں رکھنے والا مگر اس میں ایک بھی ایسی بات نہیں‘ وہ خود کو شاعر اور افسانہ نگار کہتا ہے لیکن میرا خیال ہے۔ اس میں بھی جھوٹ ہے۔ اس نے مجھے بے حد مایوس کیا ہے محمود۔“
”اور تم نے......تم نے اسے بالکل مایوس نہیں کیا؟“ محمود نے کہا۔ ”تم نے خود کو ایک مثالی ماں ثابت کیا ہے۔“
شمائلہ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ ”نہیں شیلا! میں نے اسے زیادہ مایوس کیا۔ میں اس ماں کا عکس بھی نہ تھی جس کے قدموں کے نیچے بیٹے جنت تلاش کرتے ہیں پھر وہ سعادت مند کیسے ہو سکتا تھا۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے اسے اور اس کی بیوی کو۔“
”کیا انہی مسائل کو تم اپنی زندگی کے لیے خطرہ تصور کرتی ہو؟“ محمود بولا۔
”نہیں محمود! یہ تو سرے سے مسائل ہی نہیں۔ وہ کچھ اور بات ہے۔“ شمائلہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔
”تم نے چوکیدار کے مارے جانے کی خبر تو سنی ہوگی؟“ محمود نے نفی میں سر ہلایا۔
”میں ابھی دو دن پہلے ہی پہنچا ہوں۔ یہ کب کی بات ہے؟“
”یہ چار ہفتے پرانی بات ہے۔ مری میں اس سے بڑی سنسنی پھیلی تھی۔“ شمائلہ نے کہا۔ ”وہ میرا پرانا چوکیدار تھا۔ جب میرے پاس ملازم ہوا تھا تو بارہ سال کا تھا اور اوپر کے چھوٹے موٹے کام کیا کرتا تھا۔ آٹھ سال تک میرے ساتھ ہی رہا۔ یہاں اس کی ماں بھی تھی۔ اس کا گھر مری کے نواح میں تھا۔ باپ سردیوں کی برفباری میں راستے سے بھٹک گیا اور اس کی نعش کئی دن بعد برف پگھلنے کے بعد ملی تو آدھی سے زیادہ بھیڑیے کھا چکے تھے پھر میں نے اسے یہاں بھیج دیا۔ سارا سال یہیں رہتا تھا۔ گرمیوں میں ماں بھی اِدھر اُدھر کسی کوٹھی میں ملازمت کر لیتی تھی۔“ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی اور محمود کو اس کی آنکھوں میں نفرت کے الاؤ نظر آئے۔
”آج کل وہ ایک بہت خطرناک عورت کے پاس ملازم ہے جو میرے سارے مصائب کی ذمہ دار ہے۔“
”تمہارا خیال ہے کہ چوکیدار کو اسی نے قتل کرایا ہے؟“ محمود نے کہا۔

"معلوم نہیں۔ پولیس کے سامنے میں نے ایسا کوئی بیان نہیں دیا۔" وہ پہلو بدل کر بولی۔ "چوکیدار کو کسی نے بڑی بے حرمی سے خنجر کے وار کر کے قتل کیا تھا اور اس کی نعش سرونٹ کوارٹر کے ساتھ خاردار تاروں کی باڑھ پر ڈال دی تھی۔ اس کی دشمنی کسی سے نہیں تھی، اس کا مقصد مجھے دہشت زدہ کرنا تھا۔

"یہ اندازہ کیسے کیا تم نے؟" محمود چونکا۔

"لوگوں کی باتوں سے نجانے کس نے یہ افواہ پھیلائی کہ قاتل کا اصل نشانہ میں تھی اور چوکیدار تو خوامخواہ مجھے بچاتا ہوا مارا گیا۔ خود پولیس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کہ یہ بکواس ہے۔ آپ اس سے پوچھیں جو یہ بات کہتا ہے لیکن اس سے مجھے ایک نقصان یہ ہوا کہ دوسرا چوکیدار مجھے نہیں ملا۔ سیزن میں ملازموں کی ویسے ہی قلت رہتی ہے۔ اس پر قتل کی دہشت اور یہ باتیں کہ اب جو میرا محافظ بنے گا، پہلے مارا جائے گا۔ یہ بات جان بوجھ کر مشہور کی گئی تھی۔"

"کیوں؟ کون ہے جو تمہیں دہشت زدہ کرنے کی خاطر ایک بے گناہ کو قتل کرے گا؟" محمود نے کہا۔

"اور کیا فائدہ ہوگا اس کو؟ کرنا ہوتا تو وہ پہلے تمہیں نہ قتل کر دیتا۔ میری سمجھ میں تو تمہاری یہ منطق نہیں آتی۔ شمائلہ اس لڑکے کا کسی سے تنازعہ ہوگا۔ پٹھان ایک نسل کا انتقام دوسری نسل سے بھی لیتے ہیں۔"

"پہلے میری بات تو پوری سن لو۔" شمائلہ نے نروس لہجے میں کہا۔ "اس واقعہ کو دو ہفتے گزرے تھے کہ مجھے ڈاک سے ایک پارسل ملا۔ اس میں سے کپڑے کی بنی ہوئی گڑیا نکلی۔ گڑیا کی گردن کٹی ہوئی تھی اور صرف ایک دھاگے سے لٹک رہی تھی۔ سرخ روشنائی کو خون کے طور پر استعمال کیا گیا تھا جس سے گڑیا کے کپڑے تک لال ہو رہے تھے اور گردن کا زخم بالکل حقیقی لگتا تھا۔"

"یہ کسی کا بے ہودہ مذاق بھی ہو سکتا ہے۔" محمود نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "قتل کے سانحے کے بعد تم دہشت زدہ تھیں۔ تم نے پولیس کو بتایا تھا؟"

شمائلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا کہ گڑیا پارسل میں سے نکلی ہے مگر محمود! تم اسے مذاق کیوں کہتے ہو۔ دھمکی کیوں نہیں سمجھتے۔ دو دن بعد ایک اور واقعہ پیش آیا۔ کسی نے میرے بے ضرر سے پالتو کتے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور میری کار میں ڈال دیے۔ میں سیٹوں پر سفید کور رکھتی ہوں۔ اگلی پچھلی سب سیٹوں پر خون ہی خون تھا۔ سر کہیں پڑا تھا، دھڑ کہیں، ٹانگیں الگ الگ۔" اس کی آواز کانپنے لگی اور اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو گیا۔

لان پر تاش کھیلنے والے گاڑی میں کہیں جا چکے تھے اور لیلیٰ گھاس پر لیٹے آسمان کو تک رہے تھے۔ محمود نے شمائلہ کا ہاتھ تھاما تو وہ برف کی طرح سرد ہو رہا تھا۔

"دیکھو شمائلہ! تم ایک بہت بہادر عورت ہو۔ کیا میں یہ بات نہیں جانتا پھر اتنی معمولی بات پر خوف......" وہ بولا۔

"یہ معمولی بات نہیں ہے محمود۔" شمائلہ نے لرزتے ہوئے کہا۔ "مجھے پھر دھمکی دی گئی تھی کہ ہم تمہیں کتے کی موت مار سکتے ہیں۔"

"بفرض محال یہ بات مان لی جائے تو محض دھمکی کا مقصد؟" محمود نے کہا۔ "کیا اس کے بعد بھی کوئی بات ہوئی؟"

"ہاں پھر دو دن کے وقفے سے کسی نے میری کھڑکی میں منڈیر پر آ کے بیٹھنے والے ایک کبوتر کا ایئر گن سے نشانہ لیا اور زخمی کبوتر پھڑ پھڑاتا ہوا ٹوٹے ہوئے شیشے سے کمرے میں میرے بستر پر آ گرا۔ میں چیخ مار کر بھاگی۔ خون کے چھینٹے مجھ پر بھی پڑے تھے اور بستر کو پھڑکنے والے کبوتر نے لہو میں رنگ دیا۔ میں نے دوسروں کو بتایا تو سب نے ادھر ادھر کا علاقہ دیکھا مگر کسی کو شکاری نہ ملا۔

ایئر گن تو یہاں بارہ تیرہ سال کے بچے بھی لیے پھرتے ہیں۔ پولیس کو میں نے کتے کی موت کا

بتایا تھا تو انہوں نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔ بیگم صاحب! اب ہم ان کی خاطر تین سو دو کے تحت ایف آئی آر تو درج کرنے سے رہے۔ معلوم کریں گے کہ کون آپ کو پریشان کر رہا ہے۔ کبوتر والے واقع پر بھی ان کا ردعمل یہی رہا کہ کسی بچے کی حرکت تھی جو بھاگ گیا۔ میں دہشت زدہ تھی اور ان کے رویے نے مجھے مشتعل بھی کر دیا۔ میں نے انہیں گالیاں دے کر اور دھمکیاں دے کر نکال دیا۔ پولیس کو تم جانتے ہو میری آنے والے لوگوں کی بیگمات سے ذرا دب جاتے ہیں اور کوئی ہوتا تو بند کر دیا جاتا اور پولیس افسر کو بے عزت کرنے کا خمیازہ بھگت لیتا۔

مزید دو دن گزرے تھے کہ کسی نے اڑتی چڑیا کا نشانہ لیا اور چڑیا لان پر میرے قریب آ کر گری۔ میرے اعصاب جواب دینے لگے۔ مجھے ہر روز ایک لہولہان چڑیا ملنے لگی۔ کبھی باتھ روم میں، اس کا ایک روشن دان باہر کھلتا تھا۔ کبھی تکیے کے نیچے، کبھی کپڑوں کے اندر جو الماری میں لٹکے رہتے ہیں۔ یہ مذاق کی بات نہیں تھی۔ مجھے سمجھایا جا رہا تھا کہ تمہاری جان ایک چڑیا سے زیادہ اہم نہیں ہے مگر ہم تمہیں مارنا نہیں چاہتے، وہ مجھ سے اپنی بات منوانا چاہتے تھے۔"

"وہ......؟" محمود نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "وہ کون ہے؟ کیا بات، کیسی بات، کھل کر کہو؟"

"میں نے ابھی کچھ دیر پہلے ایک خطرناک عورت کا ذکر کیا تھا۔" شمائلہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"ہاں اگر تم کہتی ہو تو وہ خطرناک ہی ہوگی۔" محمود نے کہا۔ "کون عورت ہے وہ؟"

"وہ اسی اسٹریٹ میں چھٹے گھر میں رہتی ہے۔" شمائلہ نے کہا۔ "میری سوکن نظامی کی چہیتی۔"

"تمہارے شوہر نے پہلے شادی کر رکھی تھی۔" محمود نے چونک کر کہا۔ "یا بعد میں کی تھی۔"

"اس نے شادی تو ابھی نہیں کی ہے لیکن وہ میرے شوہر کو مجھ سے چھین لینا چاہتی ہے۔ ان کے مراسم بھی خطرناک حد تک بڑھ گئے ہیں۔" شمائلہ نے رونا شروع کیا۔ "نظامی کو میری ذرا پروا نہیں ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ ارے شمائلہ! تم کیا بزدل گھریلو عورتوں کی طرح رونے بیٹھ گئی ہو۔" محمود نے اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا۔ "ذرا اپنے ماضی کے کارناموں پر نظر ڈالو۔ کوئی عورت تم سے تمہارا شوہر لے سکتی ہے؟"

"میں...... میں اب وہ شمائلہ نہیں ہوں محمود۔" وہ اسی طرح روتے ہوئے بولی۔ "وہ شانی تھا جس نے مجھے اتنا حوصلہ عطا کر دیا تھا۔ اس وقت میں کچھ بھی گنوانے سے نہیں ڈرتی تھی کیونکہ سب کچھ میری دسترس میں تھا پھر جانی مر گیا اور اس کے ساتھ ہی میں مر گئی۔ میں ڈر ڈر کر زندگی گزارتی رہی۔ عیش و عشرت کی زندگی سے پیار کرنے لگی۔ مستقبل سے پیار کرنے لگی۔ میرے پاس اب نقد لاکھوں جمع ہیں۔ میری دو کوٹھیاں ہیں اور ایک شوہر ہے جس سے مجھے بہت محبت ہے۔ میرے بچے جوان ہیں اور اب ان کے بچے ہونے والے ہیں۔ اب میں مرنا نہیں چاہتی محمود، مجھے اپنی یہ زندگی بہت عزیز ہے جس میں سکھ اور راحت کے سوا کچھ نہیں۔ میں کسی قیمت پر اس خوشی سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں اور وہ عورت مجھے کھلی دھمکی دے رہی ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔

محمود کا ذہن واقعات کا تجزیہ کرنے کے عمل میں الجھا ہوا تھا۔ واقعات بڑے پُراسرار تھے اور ان کا یقیناً کوئی مقصد بھی تھا مگر اس کی عقل میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ ایک عورت یہ سب کھیل محض رقابت میں کھیل رہی ہے۔

دوسری ناقابل فہم بات یہ تھی کہ مردہ پرندے شمائلہ کے تکیے کے نیچے یا الماری کے کپڑوں میں کیسے پہنچ جاتے تھے۔ اُڑنے والے پرندے کا یا کھڑکی کی چوکھٹ میں بیٹھے کبوتر کا کسی ماہر نشانے باز کے ہاتھوں زخمی ہو کر شمائلہ کے بستر پر یا اس کے پاس آ کر گر جانا تو سمجھ میں آتا تھا مگر گھر کے کسی فرد کی مدد

کے بغیر مردہ جانور کا گھر کے اندر سے ملنا سمجھ آنے والی بات نہیں تھی۔

''ان واقعات کے بعد تم نے کیا احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں؟'' محمود نے کہا۔

''میں نے اپنا کمرہ بدل دیا تھا۔'' شمائلہ نے کہا۔ ''میرے لیے اس بستر پر سونا ناممکن ہوگیا تھا۔ میں کھڑکیاں اور روشن دان بند رکھنے لگی تھی۔ یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ میرے پاس ایک ریوالور بھی ہے جو میرے پہلے شوہر شانی نے مجھے دیا تھا اور کہا تھا۔ شمائلہ! یہ میرا سب سے قابل اعتماد دوست ہے۔ اسے اپنے ساتھ رکھنا۔ یہ تیرا سب سے اچھا محافظ ثابت ہوگا۔ اگر تو نے سوچے سمجھے بغیر اس کا استعمال نہیں کیا' اس نے مجھے ریوالور چلانے کی تربیت بھی خود ہی دی تھی۔

اور اس وقت میرا نشانہ اتنا پکا ہوگیا تھا کہ میں بیس فٹ کے فاصلے سے موم بتی کا شعلہ بجھا دیتی تھی لیکن موم بتی نہیں گرتی تھی۔ بعد میں شانی سرکس والوں کی طرح سر پر سیب رکھ کر کھڑا ہوجاتا اور مجھے مجبور کرتا کہ نشانہ لو اور میرا نشانہ اس لیے خطا نہیں ہوتا تھا کہ میں شانی کی جان لے ہی نہیں سکتی تھی۔ اب بھی مشق نہ ہونے کے باوجود میں اس ریوالور سے اپنی حفاظت کرسکتی ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ دشمن سامنے آکر وار نہیں کرتا۔''

''شاید وہ جانتا ہے کہ تم کتنے مضبوط اعصاب کی مالک ہو یا نہیں ہو اور اب وہ اندازہ کرنا چاہتا ہے کہ وہ کس طرح تمہیں ذہنی طور پر خوف زدہ کرسکتا ہے۔'' محمود نے کہا۔

''ایک اور بات محمود۔'' شمائلہ نے کہا۔ ''اس چوکیدار نی ماں کو جوان بیٹے کی موت نے تقریباً پاگل کردیا ہے۔ وہ میرے پاس آئی تھی تو ایک ہی بات بار بار دہرا رہی تھی۔''

''میں اپنے بیٹے کا خون معاف نہیں کروں گی۔ وہ میرا دودھ تھا جو اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ماسی تم جانتی ہو میں نے اسے اپنے گھر میں کتنے عرصے رکھا۔ میں اس پر کتنا اعتماد کرتی تھی۔ اسے کبھی مجھ سے کسی قسم کی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ اب لوگ بے پر کی اڑا رہے ہیں کہ وہ میری وجہ سے مارا گیا' یہ سب غلط ہے۔'' معلوم نہیں اس کی سمجھ میں میری بات آئی یا نہیں' وہ باؤلی سی عورت ہے' سوکھی چمرخ مگر بلا کی سخت جان۔ اس عمر میں بھی سیدھا چلتی ہے اور ہر روز تین میل دور سے پہاڑوں کے نشیب و فراز طے کر کے سورج نکلتے ہی کام کرکے پہنچ جاتی ہے۔ شام کو غروب آفتاب کے بعد تنہا واپس جاتے نہیں ڈرتی۔ وہ خلاء میں گھورتی رہی اور ایک ہی بات کہتی رہی۔ وہ اس گھر میں مارا گیا ہے۔ میں اس گھر سے انتقام لوں گی۔ اس کو مارنے والا زندہ نہیں رہے گا۔ بیگم صاحب! اور اپنی جنونی کیفیت میں اسی طرح واپس چلی گئی۔ اگر لوگوں کی بات اس کے دل میں بیٹھ گئی یا اسے کسی نے قائل کردیا کہ اس کے بیٹے کی موت کا سبب میں ہوں تو یہ عین ممکن ہے کہ وہ اصل قاتل کا سراغ نہ ملے تو مجھے نشانہ بنالے۔ پاگل پن میں آدمی کیا نہیں کرسکتا۔''

محمود نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ کسی پاگل کا نہیں' انتہائی ذہین اور چالاک آدمی کا کام ہے۔ وہ بڑھیا سامنے آکر تم پر خنجر سے حملہ کرسکتی ہے مگر دہشت زدہ کرنے کے لیے ایسے پُراسرار طریقے اختیار نہیں کرسکتی۔ اس سے فائدہ بھی کیا ہے اس کو اور اس گھر میں تم ہی تو نہیں ہو۔ یہ چنڈال چوکڑی کب سے تمہارے ساتھ ہے۔''

''مئی سے۔ یہ سب لوگ سیزن کے آغاز میں ہی ہمارے ساتھ آئے تھے۔'' شمائلہ نے کہا۔ ''احمد کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ان کے لیے یہ ہنی مون تھا۔ نظامی نے کہا تو میں جنگل میں منگل کر خاموش نہیں رہ سکتا۔ میرے ساتھ میرے یار بھی چلیں گے۔ یہ پروڈیوسر چوہدری فضل دین ہے۔ دوسرا اس کا چھوٹا بھائی نواز دین دونوں ایک دوسرے کو چھوٹے میاں بڑے میاں کہہ کر بلاتے ہیں۔ چنانچہ دوسرے لوگ

بھی یہی کہتے ہیں۔ شہر میں ان کی سائیکلوں کی ایک بہت بڑی دکان ہے بلکہ تھی جسے انہوں نے فلم بنانے کے لیے بیچ دیا اور ایک بہت بڑا مکان بھی ٹھکانے لگا دیا۔ معلوم نہیں اس سے کتنا پیسہ ملا اور اب کتنا باقی ہے۔

پنجابی فلم پر زیادہ خرچ تو نہیں ہوتا اور ہیروئن تو شاید یہ شاہی محلے سے پکڑ لائے ہیں۔ چھوٹے میاں کی منظور نظر ہے۔ خدا نے چاہا تو وہی انجام ہوگا کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔'' چھوٹے میاں اور بڑے میاں وہیں۔ سائیکلوں کی دکان پر پنکچر لگاتے نظر آئیں گے۔ بڑے میاں صاحب دو چار فلموں میں اسٹنٹ مین رہے ہیں۔ مار دھاڑ کے مناظر میں ڈبل بھی کرتے تھے۔ وہیں سے ہیرو بننے کا شوق چڑھا۔ اب معاہدہ یہ ہوا ہے کہ ہیروئن چھوٹے میاں صاحب کی اور ہیرو خود بڑے میاں صاحب۔ پروڈیوسر کہلائیں گے۔ چھوٹے میاں صاحب تو ہدایت کار۔ بڑے میاں صاحب تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے مگر میں نظامی کی وجہ سے مجبور ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ گئے تو میں بھی چلا جاؤں گا۔''

''فلم بنانے کا اعلان کر کے یہ لوگ یہاں آ کر بیٹھ گئے؟'' محمود نے کہا۔

''نہیں ایک ڈیڑھ مہینے شوٹنگز چلی تھی۔'' شمائلہ نے کہا۔ ''میں نے تو زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ احمد کو انہوں نے مکالمے اور منظر نامہ لکھنے کے لیے کہا تھا۔ وہ بگڑ گیا کہ میں اتنا گیا گزرا ادیب نہیں ہوں۔ رابعہ کو سائیڈ ہیروئن یا ویمپ کا کردار دینا چاہتے تھے اور وہ بھی تیار تھی مگر احمد نہیں مانا۔ شہر سے کچھ لوگ آتے رہے اور لوکیشن پر شوٹنگ بھی ہوتی رہی۔ یہاں کے لوگ اس کے عادی ہیں، اس لیے زیادہ سنسنی نہیں پھیلی۔ ورنہ گھر میں مجمع لگ جاتا یا دروازے پر ہجوم کھڑا رہتا۔ خیریت ہوئی کہ وہ لوگ جون کے آخر میں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر چلے گئے۔ یہ گھر بالکل مسافر خانہ بن گیا تھا۔ میرا بس چلتا تو کسی ہوٹل میں منتقل ہو جاتی لیکن نظامی بڑا خوش تھا کہ یہی تو رونق ہے۔ کچھ ایکٹر وغیرہ بھی چند روز مقیم رہی تھیں۔ دن رات ایک ہنگامہ بپا رہتا تھا۔ اب ان کا کہنا ہے کہ باقی شوٹنگ ان ڈور ہے اور شہر کے بڑے بڑے نگار خانوں میں ہوگی۔ ایسے لوگ فلمیں بنائیں گے تو فلمیں کیا ہوں گی اور صنعت کیا ترقی کرے گا۔''

محمود ہنسا۔ ''تمہیں بعد میں اس وقت مایوسی ہوگی جب یہی فلم باکس آفس پر ہٹ ہو کر سلور جوبلی اور گولڈن جوبلی کرے گی۔ یہ بے وقوف لوگ نہیں ہیں، بزنس مین ہیں۔ اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت کہ جب تک دنیا میں بے وقوف موجود ہیں، عقل مند بھوکے نہیں مر سکتے۔''

احمد اور عینی اندر جا چکے تھے اور غالباً ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ گیٹ سے شمائلہ کی ٹویوٹا مارک ٹو اندر داخل ہوئی، جسے بڑے میاں صاحب چلا رہے تھے۔ چھوٹے میاں صاحب اور نظامی پچھلی سیٹ پر تھے۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی گھوم کر ان دونوں پر پڑی تو انہیں احساس ہوا کہ رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا ہے۔ چنڈال چوکڑی کے ہر رکن نے بطور خاص اس بات کو نوٹ کیا۔

''میرا خیال ہے کہ اب تم بھی سب کے ساتھ مل کر کھانا کھا لو' اندازہ ہو جائے گا کہ کیسے لوگ ہیں۔''

''تمہارے شوہر کے دل میں رقابت کی آگ تو نہیں بھڑک اٹھے گی؟'' محمود نے اس کی تقلید کی۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''وہ جانتا ہے کہ میں کتنی مجبور ہوں۔'' شمائلہ بولی۔ ''پر پنچھی کے بارے میں یہ فکر کون کرتا ہے کہ وہ پنجرے سے نکل کر اڑ جائے گا۔ یہ آگ تو میرے دل میں بھڑک رہی ہے اور خود نظامی نے لگائی ہے۔ تم کیوں ڈرتے ہو۔''

محمود نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر انگڑائی لی اور صبح کی بے حد لطیف اور تازگی بخش ہوا میں گہرے سانس لینے لگا۔ حد نگاہ تک ہر طرف ایک دوسرے

سے ملے ہوئے درختوں کی فصیل تھی جن کے سپاٹ تنے ڈیڑھ سو اور دو سو فٹ تک بلند تھے۔ نیچے بھی زمین پر وہی صورت حال تھی کہ سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی' بن گیا روئے آب پر کائی۔ خودرو پودوں میں ہر رنگ وروپ کے پھول کھلے ہوئے تھے اور فضا یوکلپٹس کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ گیراج کے کھلے دروازے میں سرخ رنگ ٹیوٹا دکھائی دے رہی تھی۔

ساتھ والے سرونٹ کوارٹر میں تالا پڑا ہوا تھا اور چھت کی چمنی کے ساتھ کبوتروں کی ایک چھتری پر تین کبوتر اداس بیٹھے تھے۔ یہ شاید مقتول چوکیدار کا شوق تھا۔ اچانک ان میں سے ایک کبوتر اڑا اور اسی کھڑکی کی دہلیز پر آ بیٹھا جس میں سے محمود صبح کا نظارہ کر رہا تھا۔

کبوتر نے دانہ چگنا شروع کیا تو محمود کو حیرانی ہوئی۔ دہلیز کے باہر سیمنٹ کی منڈیر پر دانہ پہلے سے موجود تھا اور کبوتر شاید اس کی انگڑائی کو اشارہ سمجھ کر آیا تھا یا پالتو کبوتر تھے جو ایک قسم کے ریموٹ کنٹرول کو سمجھتے تھے۔ اس نے کبوتر کے نرم پروں پر ہاتھ پھیرا اور کبوتر نے اس محبت کے جواب میں غٹرغوں سے ''تھینک یو'' جیسی بات کی۔ گھر میں ابھی مکمل سکوت تھا جس کا مطلب تھا کہ جگانے کے لیے بیڈ ٹی لے کر حاضر ہونے والے ملازم بھی ڈیوٹی پر ابھی نہیں پہنچے ہیں۔ دم بدم پھیلتے ہوئے اجالے میں محمود کو ایک متحرک سایہ نظر آیا۔ اس نے نظر جما کر دیکھا۔ ایک فرلانگ سے بھی کم فاصلے پر کوئی دیہاتی عورت آہستہ آہستہ چلتی ایک گھر کے عقب میں پھیلے ہوئے نشیب سے اوپر جا رہی تھی۔ اگر اس کے پاس دوربین ہوتی تو وہ صورت کے نقوش کو قریب لا کر دیکھ سکتا تھا۔

مگر اتنے فاصلے پر بھی یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ وہ کوئی دبلی پتلی اور عمر رسیدہ عورت ہے۔ فاصلے کو دیکھتے ہوئے محمود نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عورت اس چوکیدار کی ماں ہوسکتی ہے۔ وہ پانچویں چھٹے گھر کی طرف رواں تھی جو شائلہ کے کہنے کے مطابق اسی خطرناک عورت' یعنی اس کی سوکن کا گھر تھا جو نظامی کو حاصل کرنے کے لیے ایک دہشت زدہ کرنے والا ڈرامہ رچا رہی تھی۔ خادمہ کے ہاتھ میں لاٹھی تھی جو مری میں فیشن اور ضرورت کے تقاضے پورے کرتی ہے اور بوڑھوں یا جوانوں کے ہاتھ میں چڑھائی پر سہارا دیتی ہے اور اترائی پر بریک کا کام کرتی ہے۔

محمود نے وہیں سے دوسرے کمرے کی پوزیشن دیکھی۔ اوپر کے دو کمرے نچلی سطح کے دو کمروں کی چھت پر تھے اور ایک کمرہ جو اس کے اپنے کمرے کے نیچے تھا۔ شائلہ اور اس کے شوہر کا بیڈروم ہوسکتا تھا۔ چھوٹے اور بڑے میاں صاحب اوپر مقیم تھے جس کا مطلب تھا کہ باقی تین بیڈرومز میں سے ساتھ والا مستقبل کی عظیم ہیروئن کا تھا۔ اس نے ذرا آگے جھک کر دیکھا تو اسے بند کھڑکی ہی نہیں' منڈیر پر بکھرے ہوئے باجرے کے دانے بھی نظر آ گئے۔ یہ کھڑکی مقتول چوکیدار کے سرونٹ کوارٹر اور گیراج کے علاوہ تقریباً پچاس فٹ کی گہرائی پر نظر آنے والی سیاہ پتھر کی چٹان سے بھی نشانہ بناسکتی اور نشانہ بنانے والا اگلے لمحے کود کر گھنے جنگل اور نشیب میں یا درختوں کی اوٹ میں کہیں بھی غائب ہوسکتا تھا۔ اس نے نیچے جلے بنفس نفیس اس صورت حال کا بغور جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ صبح کی ہوا خوری کا عذر کسی کے لیے شک کا سبب نہیں بن سکتا تھا۔

ابھی وہ کھڑکی سے پیچھے ہٹا ہی تھا کہ اسے تالی بجنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی جو صبح کے سکوت میں کسی چھوٹے سے پٹاخے کی طرح تھی مگر وہ فوراً سمجھ گیا کہ یہ آواز کس کی ہے۔ ابھی وہ پلٹا بھی نہ تھا کہ پھڑکتا ہوا کبوتر اس سے ٹکرایا اور نیچے گر گیا۔ نیلی اور سفید دھاریوں والے شب خوابی کے لباس پر خون کے دھبے چمکنے لگے۔ وہ تکلیف سے فرش پر لوٹ لگاتے کبوتر کو چھوڑ کر کھڑکی کی طرف لپکا۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔

کبوتر کا نشانہ یقیناً نیچے سے لیا گیا تھا' ورنہ وہ اچھل کر اوپر نہ آتا۔ وہ خادمہ بھی نظر سے اوجھل ہوگئی تھی۔ محمود کو ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ اس کے

ہاتھ میں سہارے کے لیے لاٹھی تھی یا ایئر گن مگر ایئر گن سے اتنے فاصلے پر نشانہ لینا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ محمود نے جو آواز سنی تھی یا شاید یہ اندازے کی غلطی تھی۔

نیچے پچاس گز تک درختوں میں اڑنے والے پرندوں کے سوا کوئی ذی روح متحرک نہیں تھا۔ اس نے کھڑکی بند کی اور پردے برابر کر دیے مگر درمیان کی ایک جھری سے جھانکتا رہا۔ دس منٹ کے بعد جب کبوتر بھی سرد پڑ چکا تھا' اس نے اس ساکت منظر کو نگاہ میں رکھنا بے سود سمجھا۔ اگر کوئی فائر کر کے فوراً چھپ گیا ہوتا تو اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یقیناً نکل آتا اور غائب ہو جاتا۔ اس نے خون آلود کپڑے تبدیل کیے۔ مردہ کبوتر کو الماری میں بچھا ہوا پرانا اخبار نکال کر لپیٹا اور فرش پر سے خون کے داغ' اپنے اتارے ہوئے کپڑوں سے رگڑ کر صاف کیے۔

پوری طرح مطمئن ہو کر وہ اخبار کا پیکٹ اٹھائے ہوئے باہر آیا تو پو پھٹ چکی تھی۔ سرمئی پہاڑوں کے اوپر سنہرا رنگ یوں لگتا تھا جیسے اس بلندی کے پیچھے جنگل میں آگ لگی ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ اجلی دھوپ نے آسمان کو روشن کر دیا اور اس نے چھٹے گھر کے سامنے رک کر اندر دیکھا۔ دو بیڈروم کی مختصر سی کاٹیج کے گرد چار فٹ اونچی دیوار تھی اور دیوار پر ٹوٹی ہوئی بوتلوں کے رنگ برنگ تیز دھار والے نوکیلے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے۔ لوہے کے گیٹ کے باہر لیٹر بکس پر صرف کاٹیج نمبر لکھا ہوا تھا۔ گیٹ پہ دائیں ہاتھ والے ستون پر سنگ مرمر کی چھوٹی سی تختی پر اصل مالک کا نام اور کاٹیج کا سن تعمیر لکھا ہوا تھا۔ چنانچہ صاف ظاہر تھا کہ وہ موجودہ مکین کرائے دار تھا۔ وہ گیٹ کو دھکیل کر اندر داخل ہوا اور سیدھا برآمدے تک آ گیا اور کبوتر کی بید کو میز پر رکھ کر اطمینان سے چلتا ہوا باہر نکل آیا۔

پچاس قدم چل کر اس نے مڑ کر دیکھا' وہی عمر رسیدہ عورت ایک ہاتھ کمر پر رکھ کر سیدھی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسی بے نیازی سے چلتا گیا پھر ایک پتلی سی سڑک پر دائیں جانب مڑ گیا۔ ایک دیوار کے ختم ہوتے ہی اسے نشیب کی جانب اترنے والی پگڈنڈی نظر آئی اور وہ اس بل کھاتے ہوئے راستے پر چل پڑا جو انسانی قدموں نے برسوں میں تراشا تھا۔ اب وہ شمائلہ اور اس کی سوکن کے گھروں کی قطار کے پیچھے والی وادی میں تھا اور اسے اوپر بنے ہوئے گھروں کی منڈیریں اور مخروطی چھتوں کے روشن دان' دو منزلہ گھروں کی اوپری منزل کے کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ چمنیوں سے اٹھنے والا دھواں باورچی خانے میں ناشتے کی تیاریوں کی خبر دیتا تھا۔

کہیں کہیں کسی گھر میں زندگی کے آثار بھی تھے۔ ایک صاحب ننگے پاؤں شبنم آلود گھاس پر ٹہل رہے تھے۔ ایک گھر میں صبح کا آغاز اسٹیریو نے کیا تھا۔

شمائلہ کے گھر میں نیچے پہنچ کر محمود نے اندازہ کیا کہ اتنی دور سے شکاری رائفل لے کر بھی کوئی وہ کام نہیں کر سکتا جو کوئی اپنی ایئر گن سے کر رہا تھا۔ ذرا اوپر آ کے وہ آدمی کے قد سے اونچی سیاہ پتھر کی چٹان پر کھڑا ہوا' تب بھی اسے سرونٹ کوارٹر اور گیراج کے عقب کی دیواروں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ درختوں کی کثرت کے باعث کاٹیج کی جھلک سی نظر آتی تھی۔ وہ کچھ اور اوپر آنے کے لیے چٹان پر سے اترا ہی تھا کہ اسے چھوٹے اور بڑے میاں صاحب دکھائی دیے۔

وہ دونوں ہی آدھی آستین والے چست اور رنگین بنیان' کینوس کے جوتے اور کریز سے بے نیاز گہرے رنگ کے کارٹرائے کی پتلون پہنے ہوئے تھے۔ بیک وقت وہ دونوں سامنے سے راستہ روک کے یوں کھڑے ہو گئے کہ چٹان اس کے پیچھے رہی۔ ان کے جارحانہ انداز دیکھ کر وہ رک گیا۔

''بڑے میاں صاحب۔'' ایک نے دونوں بازوؤں کو باندھ کر سینے پر رکھا۔ پیر پھیلائے اور سر کو تھوڑا سا خم کر کے کہا۔

"یہ تو اپنے محمود صاحب لگتے ہیں۔" اس کے طاقتور بازوؤں کی مچھلیاں اور نمایاں ہو گئیں۔

"شک کی کیا بات ہے چھوٹے میاں صاحب۔" دوسرے نے سگریٹ کو لبوں میں دبا کے کہا۔ "چوکھٹا نہیں دیکھتے، میں نے تو کل بھی کہا تھا کہ فردوس کو چھوڑیں ان کو ڈالیں۔"

ان کے عزائم کے بارے میں اب تک شبہ نہیں رہا تھا۔ محمود نے دونوں ہاتھ نائٹ گاؤن کے اندر سے نکال لیے۔ خالی ہاتھ ہونے کے باوجود وہ دونوں جوکروں سے نمٹ سکتا تھا جن کو شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ باکسنگ چھوڑنے کے بعد بھی محمود ریلوے کی ٹیم کا کوچ رہا تھا اور نیشنل باکسنگ چیمپئن شپ میں ریفری کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔

"اس فضول بکواس کا کیا مطلب ہے؟" محمود نے برہمی سے کہا۔

"محمود صاحب کا غصہ تیز ہے بڑے میاں صاحب۔" دوسرا بولا۔ "پہلے آپ کہو۔"

"اچھا۔" پہلے نے کہا۔ "تو اپنے محمود صاحب آپ کرتے کیا ہیں کام دھندہ۔"

"کرنے کو بہت کچھ کر سکتا ہوں میاں برادران۔" محمود نے غرا کر کہا۔ "مگر میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔"

"واہ جی واہ...... کیا ستھری بات کی ہے۔" دوسرے نے کہا۔ "رکھنا بھی چاہیے اپنے محمود صاحب تو بڑے سمجھ دار آدمی ہیں۔"

"نہیں بڑے میاں صاحب! یہ ذرا بھی سمجھ دار ہوتے تو یہاں کیوں آتے۔ بھلا یہ کوئی وقت ہے ادھر آنے کا۔" پہلا بولا۔

"او جی...... پھر کیا ہوا۔ یہ اب چلے جائیں گے۔" دوسرے نے کہا۔ "غلطی بندے سے ہی ہوتی ہے جانے دو ان کو۔"

"تم دونوں کو کس بات کا نشہ ہے؟" محمود نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ "شراب کا یا بدمعاشی کی طاقت کا؟ میرا ابھی یہاں سے جانے کا کوئی پروگرام نہیں۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔"

محمود کی نگاہ ایک پل کے لیے بھی ان پر سے نہیں ہٹی تھی مگر وہ دونوں اداکاری سے دھوکہ دینے کے ماہر تھے۔ چھوٹے میاں نے کھڑے کھڑے اتنی پھرتی سے ہاتھ گھمایا اور محمود کے منہ پر مکا مارا کہ وہ سنبھل نہ سکا اور پیچھے چٹان سے ٹکرا کر گرا۔

"ہم بھی تو یہی کہتے تھے محمود صاحب کہ راستے سے ہٹ جاؤ۔" بڑے میاں نے یوں سگریٹ کی راکھ جھاڑی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ چھوٹے میاں صاحب بھی پھر اسی پوز میں بالکل پُرسکون کھڑے تھے۔ "زیادہ چوٹ تو نہیں آئی خدانخواستہ۔"

"ابھی تو نہیں آئی لیکن اگر کوئی بڑا حادثہ ہو گیا۔ خدانخواستہ تو...... نہ جانے کیا ہو جائے......" چھوٹے میاں صاحب بولے۔

"اللہ بچائے چھوٹے میاں صاحب۔" بڑا بولا۔ "پہاڑوں میں آدمی کا پیر بھی پھسل جاتا ہے اور بارش ہو نہ ہو حادثات تو یہاں بڑے ہی خوفناک ہوتے ہیں۔"

محمود کو غیر متوقع وار اور چٹان پر سر لگنے سے چکر آ گیا تھا لیکن وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ اس کے کان دھمکی کے ہر لفظ کا مفہوم اس کے ذہن تک پہنچا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ سنبھل کر پھر کھڑا ہو گیا۔ اس کے اندر کا باکسر اب حریف کا ناک آؤٹ کر دینے کے لیے بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے بیک وقت ان دونوں کو ایک مشتعل کر دینے والی غلیظ گالی دی۔

"تم یہ سمجھتے ہو کہ تم اتنی آسانی سے شائلہ کو ٹھکانے لگا دو گے؟ اسے دہشت زدہ کر کے پاگل کر دو گے تاکہ وہ پہاڑ پر سے کود کر خودکشی کرے یا کسی حادثہ کا شکار ہو جائے اور پھر تم نظامی کے مال کو اپنا سمجھ کر ہڑپ کر سکو۔ میرے ہوتے ہوئے تم کو اس کے پیسے سے کفن بھی نصیب نہیں ہو گا۔" محمود نے دیکھا کہ وہ دونوں گالی سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے ہیں اور اس کی بات پر بھی یوں مسکرا رہے ہیں جیسے یہ

کوئی لطیفہ ہے۔

محمود نے بڑے میاں کے منہ پر تھوک دیا۔ حسب توقع چھوٹے میاں نے پھر ہاتھ گھمایا مگر اب محمود پوری طرح تیار تھا۔

اس نے وار کو ایک ہاتھ پر روکا اور دوسرے ہاتھ کی بھرپور قوت سے اس کے جبڑے پر بھرپور مکا مارا۔ چھوٹے میاں صاحب چار قدم دور جا گرے۔ محمود نے بڑے میاں کو بالکل مہلت نہیں دی۔ دوسرا زبردست گھونسا اس کی ٹھوڑی کے نیچے پڑا۔ وہ گھوم کر کرایا اور مضحکہ خیز طریقے پر بھائی کے پاس جا لپٹا۔ چھوٹے میاں ہاتھ کے سہارے سے اٹھ کر ہونٹ کے کنارے سے رسنے والے خون کو صاف کر رہا تھا۔

"زیادہ چوٹ تو نہیں آئی خدانخواستہ ملک صاحب۔" محمود نے پرسکون لہجے میں طنز سے کہا "جیسا کہ میں بتا چکا ہوں' ابھی میرا قیام یہیں مری میں ہے اور اسی گھر میں رہے گا اور جب تک رہے گا جب تک شائلہ کے گرد منڈلانے والے مردار خور گدھ دفع نہیں ہو جاتے۔ سمجھ دار کو اشارہ ہی کافی ہونا چاہیے۔ چھوٹے میاں اور بڑے میاں صاحبان۔" وہ حقارت سے ہاتھ جھاڑ کر چل پڑے۔

اس وقت دونوں بھائی سنبھل گئے تھے اور محمود کو خون آشام نظروں سے گھور رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کھلی دھمکی تھی کہ محمود کو اپنے کام سے کام رکھنے کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ لیکن محمود یہ چیلنج بہت پہلے قبول کر چکا تھا۔ اس وقت جب اس نے ہوٹل چھوڑ کر شائلہ کے گھر رہنا منظور کیا تھا۔

وہ گھر سے بیس قدم دور تھا۔ جب اس نے شائلہ کے چیخنے کی آواز سنی اس کی آواز میں خوف کا ہسٹیریا تھا اور وہ باری باری نظامی اور محمود کو پکار رہی تھی۔ محمود بے تحاشا دوڑا اور گھوم جانے کے بجائے خاردار تاروں کی باڑھ پر سے کود گیا۔ جب وہ اس کمرے میں پہنچا جو اس کے انداز کے مطابق شائلہ اور نظامی کا مشترکہ بیڈ روم تھا تو اسے شائلہ بستر پر گٹھڑی سی بنی دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے زور زور سے روتی نظر آئی۔ کمرے میں اس کے علاوہ چار افراد تھے۔ اس کا شوہر نظامی نائٹ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سرہانے کی طرف بالکل سیدھا اور کچھ پریشان کھڑا تھا۔ یوں جیسے اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہو۔

شائلہ کا بیٹا احمد دروازے کے قریب موجود تھا اور اس کی صورت پر نفرت آمیز خفت زدہ سی مسکراہٹ تھی۔ جیسے اپنی ماں کے کردار پر۔ اس کے ناقابل فہم رویے پر ہسٹریا کے اس دور سے ہر بار ڈھونگ پر وہ محض رشتے کی مجبوری کی وجہ سے چپ ہے۔ ورنہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے لیے غیر اہم ہے اور قابل افسوس ہے اور باعث صد ملامت' صرف احمد کی بیوی رابعہ نے اسے سنبھال رکھا تھا اور اسے پانی کے چند گھونٹ لینے پر مجبور کر رہی تھی۔ پنجابی ہیروئن کبوتر کی موت پر زیادہ غمگین لگتی تھی۔

"کیا بات ہے۔" محمود نے بے اختیار سوال کیا۔ "کیا ہوا ہے شائلہ کو؟" پھر اس کی نظر کھڑکی پر پڑے لہولہان کبوتر پر پڑی جو کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے اسی طرح اندر آیا تھا۔ جیسے اوپر کی منزل پر کچھ اس کے کمرے میں آ گرا تھا۔ اس نے کھڑکی کا قریب سے جائزہ لیا۔ اس کی منڈیر پر باجرے کے دانے اب بھی پڑے تھے۔ محمود کی نگاہ خود بخود ٹوٹے ہوئے شیشے سے دکھائی دینے والی اس چھتری پر چلی گئی جو مقتول چوکیدار کے کوارٹر کی چھت پر جھول رہا تھا۔ اس پر اب ایک ہی کبوتر سہا ہوا سا پر سمیٹے بیٹھا تھا۔ کسی کا آخری شکار محمود نے سوچا...... اور اس کے بعد...... مگر یہ فرض کر لینا کہ اس کے بعد شائلہ خود شکار ہوگی قبل از وقت تھا۔

بالآخر نظامی نے اپنی بیوی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ محمود نے اسے حوصلہ رکھنے کی رسمی سی تلقین کی اور احمد کی بیوی اسے ایک سکون بخش گولی کھلانے میں کامیاب ہوگئی۔ ہسٹریا کے دورے کی پہلی شدید لہر گزر چکی تھی۔ شائلہ خود بھی اتنے سارے لوگوں کے سامنے تماشا بننے کے احساس سے کچھ پشیمان تھی۔ وہ

آنکھیں بند کر کے بستر پر سیدھی لیٹ گئی۔
''ممی کا یہ نفسیاتی مسئلہ دن بدن زیادہ پریشان کن ہوتا جا رہا ہے۔'' رابعہ نے سر کی جھاڑ جھنکار بالوں کو کھجا کر کہا۔
''کیسا نفسیاتی مسئلہ'' محمود نے حیرانی کا اظہار کیا۔
''یہی فوبیا'' رابعہ نے نفسیات کی مخصوص اصطلاح استعمال کی۔ ''پرنس کا خوف۔ ان کی دہشت کچھ لوگ بظاہر بلاوجہ بند کمروں میں خائف رہتے ہیں۔ کھڑکیاں، دروازے کھلے رکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ کچھ بلندی کے خوف میں مبتلا ہوتے ہیں یا پانی سے ڈرتے ہیں اور کشتی میں بیٹھ کر دریا تک پار نہیں کر سکتے۔ جھیل کی سیریں کرتے اور بحری جہاز کا سفر اختیار نہیں کرتے۔ جانوروں سے یہ ڈر بہت عام ہے۔ ممی کے لاشعور میں بچپن کے ایک ناخوشگوار حادثے کی یاد باقی ہے۔''
پنجابی ہیروئن اس عالمانہ گفتگو سے بڑی مرعوب ہوئی تھی اور احمد اپنی بیوی کی لیاقت کے مظاہرے پر مطمئن تھا جو صورت حال کو سنبھالنے کے بعد اس کا معقول تجزیہ بھی کر رہی تھی۔
''وہ کیا حادثہ تھا؟'' محمود نے انجان بن کر سوال کیا۔ جواب وہ جانتا تھا۔ شمائلہ بچپن سے ہی انتہائی شریر اور چنچل لڑکی تھی اور لڑکوں والے کھیل کھیلتی تھی اور اپنی خوبی کے مظاہرہ کا خمیازہ کئی بار بھگت چکی تھی۔ ایک ہی اولاد ہونے کے باعث اس کی خطرناک شرارتوں سے والدین کی جان سولی پر لٹکی رہتی تھی اور اس کی ماں چلاتی رہتی تھی کہ لڑکی تو خود بھی نہیں جئے گی اور ہمیں بھی نہیں جینے دے گی۔ بعد میں تقدیر نے سچ کر دکھایا۔ گو اس کی ذمہ دار شمائلہ میں تھی۔ ایک بار وہ شرط لگا کر چھت پر سے صحن میں بچھے ہوئے پلنگ پر کودی اور اندازہ غلط ہو جانے کے باعث پٹی سے ٹکرائی تو پٹی کے ساتھ ہی اس کی ایک ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔ وہ تین مہینے پلستر چڑھائے لیٹی رہی اور قبل از وقت اٹھنے کی کوشش میں گری تو ہڈی پھر ٹوٹ گئی۔
دوسری بار ماں نے واضح کر دیا کہ وہ اب رسی سے پلنگ کے ساتھ باندھ دے گی اور دھمکی کو موثر بنانے کے لیے رسی منگوا کر بھی رکھ لی۔
ایک سال بعد وہ درخت پر چڑھ کے پرندوں کے گھونسلوں میں جھانک رہی تھی اور اندر سے برآمد ہونے والے انڈوں پر اور بچوں پر بے حد متعجب ہو رہی تھی کہ اچانک ایک پرندے نے اپنے گھر کی تباہی پر آمادہ نظر آنے والے حملہ آور پر یلغار کی۔ گھونسلے میں اس کی مادہ انڈوں پر بیٹھی ہوئی تھی اور نر کا یہ کام تھا کہ اس کی حفاظت کرے۔
پرندے کا حملہ اتنا شدید اور غیر متوقع تھا کہ شمائلہ گھبرا گئی۔ پرندے نے چلا چلا کر اس پر کئی بار حملے کیے اور اپنی چونچ سے اور اپنے پنجوں سے شمائلہ کی آنکھیں نکال لینے کی بھرپور کوشش کی۔ شمائلہ نے دونوں ہاتھ سامنے رکھ کر چہرے کو بچاتے ہوئے نیچے اترنا شروع کیا۔ مگر مشتعل پرندے نے حملے جاری رکھے۔ اس کے پر کئی بار شمائلہ کے منہ پر لگے اور اس کی نرنازک کھال جگہ جگہ سے ادھڑ گئی۔ خون بہتا ہوا دیکھ کر وہ بدحواس ہو گئی اور اپنا توازن کھو بیٹھی اور اس بار شمائلہ کا بایاں ہاتھ دو جگہ سے ٹوٹا اور وہ چار مہینے تک گلے کا ہار بنائے ہوئے پھری۔
سوئے ہوئے والدین شمائلہ کی چیخوں سے بھاگے آئے۔ تو وہ بے ہوش پڑی تھی اسپتال میں اسے دو دن سکون بخش دواؤں سے سلائے رکھا گیا۔ مگر اس کے باوجود ذہن پر طاری دہشت کا یہ حال تھا کہ جیسے ہی دوا کا اثر کم ہونے لگتا۔ وہ ایک ہاتھ منہ کے سامنے لے جا کر آہستہ آہستہ کراہنے لگتی تھی۔
''امی مجھے بچاؤ...... مجھے بچاؤ...... امی...... وہ دیکھئے۔ وہ پھر آ رہا ہے اور وہ میری آنکھ پھوڑنا چاہتا ہے امی۔''
''یہ نشان دیکھا ہوگا آپ نے۔'' رابعہ نے شمائلہ کی پیشانی پر ایک پکے سے داغ کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ اسی ناخوشگوار حادثے کے زخم کی نشانی

ہے۔''

محمود نے اس کی ساری بات نہیں سنی تھی۔ مگر اس نے سر ہلایا۔ ''میں نفسیات کی اس تاویل سے اتفاق کرتا ہوں مگر یہ مسئلہ کچھ شکاریات کا بھی ہے یہ کبوتر تو کسی فوبیا میں مبتلا نہیں تھا؟''

احمد نے برا سا منہ بنایا۔ ''ہم تو امی کی فریاد وفغاں پر آئے تھے اس وقت یہ کبوتر یہیں موجود تھا۔''

''ہاں...... جناب'' پنجابی ہیروئن نے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے کہا۔ ''میں بھی اپنے کمرے سے بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ کبوتر فوت ہو چکا تھا۔''

''میں ذرا دیر سے پہنچا تھا۔'' نظامی نے سر کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی نائٹ گاؤن کی جیب سے سگریٹ نکالا اور دوسری جیب میں لائٹر کے لیے ہاتھ ڈالا۔

''میں کچن میں اپنے لیے کافی بنا رہا تھا' خانساماں حرام خور اکثر بھول جاتا ہے کہ میں آنکھ کھلتے ہی اس کا عادی ہوں۔'' اس نے لبوں میں دبے ہوئے سگریٹ کو بڑے سکون سے جلایا۔ اس شخص کی صورت میں ہی نہیں انداز و اطوار میں بھی ایک پرکشش وقار آمیز متانت تھی۔

''تم سب اپنی اپنی صفائی پیش کرتے ہو۔'' شمائلہ نے اچانک بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں مر جاؤں گی......''

''ممی کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔'' رابعہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ہم سب کے ہوتے ہوئے ان کبوتروں کو مارنے والا آپ کو نہیں مار سکتا۔ اس خوف کو ذہن سے نکال دیجئے۔''

''کیسے نکال دوں اسی خوف کو ذہن سے؟'' شمائلہ برہم ہو کر بولی۔ ''نشانہ کسی نے کبوتر کو نہیں بنایا تھا۔ مجھے بنایا تھا لیکن میں بچ گئی۔''

''ممی گولی کبوتر کو لگی تھی۔'' احمد نے دیوار کے ایک نشان کی طرف اشارہ کیا جو کھڑکی کے سامنے دیوار پر نظر آ رہا تھا۔

''ہاں ...... ہاں مجھے معلوم ہے......'' شمائلہ چلائی۔ ''لیکن فائر ایک نہیں دو ہوئے تھے۔ منڈیر پر تو ایک ہی کبوتر بیٹھا ہوا تھا۔''

کمرے میں ایک لمحے کے لیے بوجھل قسم کی خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ جس میں ہر شخص کے خیالات کی بازگشت الگ تھی۔

پھر باہر کہیں دور سے ائرگن کے شائس کی آواز آئی اور احمد نے موقع سے فائدہ اٹھا کے اس جمود کو توڑا۔ ''یہ سن لیجئے ممی' یہاں تو لونڈے سارا دن ایرگن اُٹھا' چڑیاں کوے مارتے پھرتے ہیں۔ آپ کی جان کو کوئی خطرہ وغیرہ لاحق نہیں ہے ممی۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔'' شمائلہ نے تلخی سے کہا۔

''میں ہی کچھ سٹھیا رہی ہوں اور حالات یہی رہے تو بالکل پاگل ہو جاؤں گی۔''

''ایسا نہیں ہوگا شمائلہ'' محمود نے کہا۔ ''اگر کوئی تمہیں پاگل بنا کر فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو......''

''تمہارا مطلب جانتے بوجھتے کوئی یہ سب کر رہا ہے؟'' احمد نے مشتعل ہو کر اس کی بات کاٹ دی۔

''ہاں'' محمود نے پلٹ کر سخت لہجے میں کہا۔ ''نہیں تو مجھے بتاؤ اس منڈیر پر کبوتروں کے لیے دانہ کس نے ڈالا ہے؟ دیکھو۔''

احمد آگے بڑھا' اس نے کھڑکی کھولے بغیر باہر دیکھا اور چند سیکنڈ ساکت وجامد کھڑا رہا۔ پنجابی فلموں کی ہیروئن نے محسوس کیا کہ کمرے میں اس کی موجودگی قطعی غیر ضروری ہے۔ چنانچہ وہ یوں باہر آ گئی جیسے یہ منظر کیمرے کی آنکھ دیکھ رہی ہے۔ پھر محمود نے فرش پر پڑے ہوئے کبوتر کو ٹانگ سے اٹھایا۔

''اسے کہاں لے جا رہے ہو؟'' احمد نے پلٹ کر کہا۔

''یہ ٹرافی ایک خاتون کو پیش کرنی ہے۔'' محمود نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ان کا ان معاملات سے

گہرا تعلق ہے۔‘‘
’’کیوں نظامی صاحب آپ کو اعتراض تو نہیں۔‘‘
نظامی کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس نے عادتاً بالوں میں ہاتھ کی انگلیاں پھیریں۔ ’’معلوم نہیں آپ کس کا حوالہ دے رہے ہیں۔‘‘
’’پوشہ جہاں کا‘‘ رابعہ نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ’’وہ جو سوات سے ......‘‘
’’رابعہ!‘‘ احمد نے دہاڑ کر کہا۔ ’’اپنی بکواس بند کرو۔ تمہیں کوئی ضرورت نہیں ان معاملات میں پڑنے کی پہلے ہی ہماری عزت کا بھرم بڑی مشکل سے قائم ہے۔ ہر ایرے غیرے کو گھر میں بلا کر ہر بات بتانے سے کیا ہو گا۔ مسٹر محمود اپنی سراغرسانی کا دفتر سمیٹو۔ ٹھہرنے کو یہاں ہوٹل بھی ہیں۔‘‘
’’احمد۔‘‘ اس کی ماں چلائی۔ محمود آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا۔
’’میاں صاحبزادے‘‘ اس نے احمد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
’’شاید تمہیں علم نہیں کہ میں دس دن سے ہوٹل میں مقیم تھا اور تمہاری ممی کے اصرار پر یہاں آیا ہوں۔ میں ان کا مہمان ہوں۔ تمہارا نہیں۔ سمجھے؟ اور میں اپنی عزت کرانا بھی جانتا ہوں۔ آئندہ مجھے ایرے غیرا جیسے الفاظ سے مخاطب کیا تو تمہارا حلیہ بگاڑ دوں گا۔ آئینے میں خود کو پہچان بھی نہ سکو گے۔ پہلی بار ہے اس لیے معاف کرتا ہوں۔‘‘
احمد کا رنگ اڑ گیا تھا‘ اسے احساس ہو گیا تھا کہ سامنے کھڑے ہوئے محمود کے مقابلے میں وہ کتنا مختصر اور کمزور ہے۔ شمائلہ کے شوہر نظامی نے غیر جانبدار معتبر کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ رابعہ کچھ پریشان اور پشیمان سی کھڑی تھی۔ اس کے لبوں سے نکلنے والے چند الفاظ نے یہ ناخوش گوار صورت حال پیدا کی تھی۔ محمود کمرے سے نکلتے نکلتے اس کے قریب رکا۔
’’آپ اگر نام نہ بتائیں تب بھی فرق نہ پڑتا۔ میں معلوم کر لیتا مجھے اس کا گھر معلوم ہے۔‘‘ وہ بولا۔
’’یہ تم نے اچھا کیا شمائلہ‘‘ نظامی کی آواز آئی پرسکون ٹھہری ہوئی منجمد۔
’’میں نے زندگی میں کبھی اچھا نہیں کیا نظامی جس کا اچھائی سے زندگی میں واسطہ ہی نہ رہا ہو وہ کیا جانے اچھائی کو۔‘‘ شمائلہ نے کہا۔
چھوٹے اور بڑے میاں صاحب اپنے حلیے ٹھیک کر کے اوپر سے نیچے آ رہے تھے۔ محمود ان کے سامنے سے گزرا اور ان کی طرف دیکھے بغیر نکل گیا۔
خانساماں سخت پریشان تھا کہ صبح دم یہ کیا ہنگامہ ہے کہ کسی کو ناشتے کا خیال نہیں اور ٹی کوزی کے نیچے بھی چائے کب تک گرم رہے گی۔ محمود نے کہا کہ ناشتے پر اس کا انتظار نہ کیا جائے اور باہر چلا گیا۔ اس گھر پر کوئی آفت آنے والی ہے۔ خانساماں نے طے کیا۔
چوکیدار مارا جا چکا تھا اور یہ سب ان کبوتروں کی بد دعا تھی جن کے بارے میں اس نے سنا تھا کہ سید ہوتے ہیں۔ اس نے فوری طور پر کسی اور گھر میں ملازمت کے امکانات کا جائزہ لیا مگر سیزن ختم ہو رہا تھا۔ اب تو خدا خیریت سے چند دن گزار دے تو اچھا ہے۔ اگلے سال دیکھا جائے گا۔ مقدر میں کس گھر کا آب و دانہ ہے۔ اگر اگلے سال تک جئے۔
محمود کبوتر کو ٹانگ سے لٹکائے اطمینان سے چلتا گیا۔ سڑک پر اب لوگ آنے جانے لگے تھے۔ معزز خواتین کی ایک فیشن ایبل ٹکڑی نے اتنی سنجیدہ عمر کے آدمی کو کبوتر شکار کرنے کی نامعقول حرکت پر افسوس سے دیکھا۔ ایک لڑکا سائیکل پر زوم سے گزرا۔ اس کے کندھے پر بھی ایرگن تھی۔ چنانچہ اس نے محمود کو رشک سے دیکھا۔ محمود کسی کی طرف دیکھے بغیر اس گھر کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں وہ کچھ دیر پہلے وہ ایک مردہ کبوتر چھوڑ گیا تھا۔ یہ دوسرا تحفہ اس نے خود پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ گیٹ اب کھلا ہوا تھا وہ سیدھا اندر داخل ہو گیا۔
اٹھارہ انیس سال کا ایک پپی نوجوان اچانک

اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔
''بیل کی طرح اندر آتا اولڈ مین باہر بیل کس کے واسطے ہے؟'' وہ بولا اور چھ انچ کے دہری دھار والے خنجر سے ایک خشک شاخ کو چھیلتا رہا۔ وہ ٹیلی ویژن کی مار دھاڑ سے بھرپور فلموں کا دیسی ماڈل بدمعاش نظر آنے والا بنیان جس پر آڑی سرخ اور زرد دھاریاں تھیں۔
ٹینم کی بدوضع پتلون جس کے گھٹنوں پر خاکی کینوس کے گول پیوند تھے افریقن طرز کے پھولے ہوئے سیاہ گھنگھریالے بال......
''مجھے پلوشہ جہاں سے ملنا ہے۔ مجھے معلوم نہیں اس سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔'' محمود نے انگریزی میں کہا۔
''وہ گھر پر نہیں ہے۔'' اس نے محمود کی طرف دیکھے بغیر کہا۔
''گڈ بائی'' چاقو کا پھل شاخ کو چھیلتا ہوا ایک جھٹکے سے دور ہوا اور محمود کے بہت قریب آ گیا۔ نوجوان نے چیونگ کو زور سے تھوکا۔ یہ سب تحقیر و تذلیل کے اور بدمعاشی جتانے کے شریفانہ طریقے تھے۔ جس سے کسی کو بھی مشتعل کیا جا سکتا تھا۔ محمود نے بڑی پھرتی سے ہاتھ مارا اور صرف نوجوان کی کلائی پر یوں پڑی کہ وہ درد سے کراہا۔ چاقو خود بخود اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔ اس نے غوطہ مار کر چاقو اٹھانے کی کوشش کی لیکن محمود نے پینترا بدل کے اپنا بھاری بھرکم پاؤں جوتے سمیت اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ مردہ کبوتر محمود کے بائیں ہاتھ میں تھا۔ دائیں بائیں ہاتھ سے اس نے نوجوان کا دوسرا ہاتھ کلائی سے پکڑ لیا۔ وہ بالکل بے بس ہو گیا۔
''میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ نوجوان دن بدن بدتہذیب اور گستاخ ہوتے جا رہے ہیں۔'' محمود نے کہا۔ ''آج دوسری بار مجھے ثابت کرنا پڑا ہے کہ بوڑھے اب بھی آپ کے باپ ہیں۔'' اس نے آہستہ سے گھٹنا اٹھا کے نوجوان کو دور دھکیل دیا اور خنجر اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔
''خنجر ہر ایک کا قابل اعتماد ساتھی نہیں ہوتا۔''
''خبیث تم نے میرا ہاتھ توڑنے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔'' نوجوان نے پلٹ کر کہا اور بے تحاشا بھاگا۔
''محمود ہاتھ کی جگہ سر ہوتا تو یقیناً توڑ دیتا۔'' وہ بولا اور اطمینان سے اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ اسے پلوشہ جہاں کو تلاش کرنے میں گھر کا کونا کونا چھان مارنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس نوجوان نے یہ خبر پہنچا دی تھی کہ کوئی بلڈوزر قسم کا ملاقاتی اس سے ملنے آیا ہے جو کسی عذر کسی رُکاوٹ سے روکا نہیں جا سکا۔ وہ خود برآمدے میں محمود کے استقبال کے لیے نکل آئی۔ ایک لمحے کے لیے محمود کو اس کے حسن و جمال کی آب و تاب نے مبہوت کر دیا۔
وہ تقریباً تیس سال کی عورت تھی۔ مگر اس کی جلد تازہ گلاب کی پتی کی طرح نرم و نازک اور بے داغ تھی۔ صحت مند رخساروں میں لہو یوں جھلکتا تھا۔ جیسے بلور کے جام میں مٹے ارغوانی اس کے بال روشنی کے پس منظر میں سنہری مہلک دیتے تھے اور سبز آنکھوں سے ہپناٹائز کرنے والی نرمی روشنی پھوٹتی تھی۔ سورت کا حسن یہ شاہکار دست قدرت کی جمال آفرینی کا بے مثال نمونہ تھا۔ نظامی اگر شائلہ جیسی عورت کو چھوڑ کر اس کے دام عشق کا اسیر تھا اور شائلہ اس عورت کو خطرناک عورت کہتی تھی اور اس سے ڈرتی تھی تو اس کا جواز تھا۔
''آؤ...... مسٹر بہادر...... نہیں ٹارزن'' وہ ہنسی اور اس کے موتی جیسے دانتوں کی چمک دکھائی دی۔ محمود کو یوں لگا جیسے فرش پر کسی نے مٹھی بھر چاندی کے سکے اچھال دیئے ہوں۔
''اسے مار کر دل خوش ہوا؟''
''اس...... اس لڑکے نے بدتمیزی کی تھی۔'' محمود نے کہا۔
''اور میں نے اسے مارا ہوتا تو وہ اٹھتا کیسے۔؟''
''بے وقوف ہے۔ سمجھتا ہے کہ کسی کے گھر میں

جانے سے پہلے کال بیل بجانی چاہیے اور اگر کوئی نہ ملنے کے لیے گھر پر نہ ہونے کا بہانہ کرے تو خاموشی سے لوٹ جانا چاہیے۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''مگر تم شریف آدمی نہیں ہو اس لیے یہ بات نہیں سمجھو گے۔''

''بہت اچھا ہوا کہ تم نے یہ بات سمجھ لی۔'' محمود نے مردہ کبوتر اس کے قدموں میں ڈال دیا۔

''ورنہ تم کیا کرتے؟ پلوشہ کو بھی مارتے؟'' وہ اپنے ناخن دیکھتے ہوئے بولی۔

''لوگ تو خود پلوشہ جہاں پر مرتے ہیں۔'' اس نے پھر کہا۔

''پھر پلوشہ جہاں بے زبان کبوتروں کو کیوں مارتی ہے۔'' محمود نے کہا۔

''اور عورت ہو کر عورت کا سہاگ کیوں اجاڑنا چاہتی ہے؟''

''تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔'' وہ اسے غور سے دیکھ کر بولی۔

''لیکن تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ یہ کیا مذاق ہے۔ یہ کبوتر مارنے کا کیا چکر ہے۔''

اس نے نیچے پڑے ہوئے کبوتر کی طرف اشارہ کیا۔ ''آج صبح بھی کوئی ایک مردہ کبوتر اخبار میں لپیٹ کر چھوڑ گیا تھا۔ وہ بھی تمہاری حرکت تھی ناں۔''

''ہاں...... میرا خیال تھا کہ وہ وارننگ کافی ہوگی۔'' محمود نے کہا۔

''مجبوراً مجھے خود بات کرنے آنا پڑا۔''

''یہ کوئی لمبی بات ہے تو بیٹھ جاؤ......'' اس نے برآمدے میں پڑی ہوئی بید کی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود محمود سے پہلے بیٹھ گئی۔

''بات بہت مختصر ہے۔'' محمود نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ کبوتر مار کر شمائلہ کو کیوں ارسال کرتی ہو۔''

''میں......'' وہ حیران ہوئی اور پھر ہنس پڑی۔

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا میں ایسا بے ہودہ مذاق نہیں کرتی' شمائلہ کون ہے؟''

''بات کو مذاق میں مت ڈالو اور یہ مت سمجھو کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' محمود نے برہمی سے کہا۔

''شمائلہ کا شوہر نظامی ہے۔''

''اچھا؟ نظامی کی کوئی بیوی بھی ہے؟'' وہ بالوں کو ایک ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے بولی۔ ''اس نے مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا۔''

''تو تم نظامی کو جانتی ہو؟ اس سے تمہارا ناجائز مراسم ہیں۔ یہ بات تسلیم کرتی ہو تم؟''

''ہاں' مگر تعلقات ہوتے ہیں جائز کیا اور ناجائز کیا۔''

وہ بولی۔ ''وہ جو بات تمہارے نقطہ نظر سے ناجائز ہے۔ وہ میرے لیے بالکل جائز ہے۔ تم کیا کرتے ہو ٹارزن۔ جائز طریقے سے روزی کماتے ہو؟''

''میرا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔'' محمود نے کہا۔ ''اس میں کوئی بات ناجائز نہیں۔''

''جو دھندہ میں کرتی ہوں وہ میرے لیے ناجائز نہیں۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''پیسہ تم بھی کماتے ہو۔ پیسہ میں بھی کماتی ہوں۔ فرق ہمارے پیشوں کا ہے۔ ضروریات کا نہیں۔ اس عمر میں تم بھی زیادہ سے زیادہ کمانا چاہتے ہو۔ تاکہ بڑھاپے میں کام آئے۔ یہ ہی میں چاہتی ہو۔ تم جانتے ہو تمہاری جسمانی صلاحیت عمر کے ساتھ ساتھ ختم ہو گئی۔ یہ بات میں بھی سمجھتی ہوں۔''

محمود اس کی باتوں پر حیرانی سے اس کا منہ دیکھتا رہا۔

''لیکن نظامی ایک شادی شدہ مرد ہے۔''

''پھر میں کیا کروں۔ میرے لیے تو وہ دس ہزار روپے ماہانہ کی آسامی ہے۔'' پلوشہ جہاں نے سپاٹ لہجے میں کہا ''اس نے مجھے یہاں اپنی مرضی اور خوشی سے بلایا ہے۔ یہ مکان لے کر دیا ہے۔ میں انکار کیوں کروں اور یہ کیوں پوچھتی پھروں کہ نظامی

تمہاری کتنی بیویاں ہیں اور کتنے بچے ہیں اور یہ رقم آپ مجھے آپ کہاں سے دیں گے۔ زمانہ کسی کا نقصان ہوتا ہے تو میں کیوں فکر کروں مجھے اپنا فائدہ دیکھنا ہے۔ ابھی تم مجھے ساڑھے دس ہزار کی آفر دو میں نظامی کو چھوڑ کر تمہاری ہو جاؤں گی۔ کوئی گیارہ ہزار والا مل گیا۔ تو تمہاری بھی چھٹی، تم کاروبار میں گھاٹے کا سودا کرتے ہو۔''

''یہ کوئی قابل فخر کاروبار تو نہیں ہے۔ خصوصاً تمہارے جیسی عورت کے لیے۔'' محمود نے نرمی سے کہا۔

''میرے جیسی عورت ہی تو اس کاروبار میں کامیاب رہتی ہے۔'' وہ بولی۔

''اور قابل فخر کون سا کاروبار ہوتا ہے؟ تجارت جس میں لوگ مٹی کو سونا بنائے ہیں۔ ملازمت جس میں رشوت سے گھر بھر لیتے ہیں۔ یا وہ سیاست جس میں ضمیر بیچتے ہیں۔؟ پلوشہ نے اپنے حسن و شباب کے سرمائے سے ڈالی ہے۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ گھٹتا ہے۔''

''تمہیں اس بدنامی سے بالکل ڈر نہیں لگتا جو بڑھتی جا رہی ہے؟'' محمود نے کہا۔

وہ ہنسی ''نیک نام تو وہ بھی نہیں جو معاشرے میں اخلاق و کردار کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرتے ہیں، خواہ یہ جدوجہد نیت کے ساتھ ہو۔ بدنام تو سیاست میں لیڈر کہلانے والے بھی ہیں۔ خدا کے لیے اب یہ مت پوچھ بیٹا کہ میرے جیسی عورت نے یہ پیشہ کیوں اختیار کر لیا۔ اپنا گھر کیوں نہیں بسایا۔ جو ہر عورت کے ارمانوں کی جنت ہوتی ہے۔ جہاں اس کی ممتا کے پھول کھلتے ہیں اور محبت کا سنہرا سایہ رہتا ہے۔ یہ کتابی باتیں ہیں اور لوگوں نے ہمیشہ عورتوں سے پوچھی ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ انکا جواب کیا ہوگا۔ گھر کی جنت کے خواب بھی تم ہی دوغلے مردوں نے تراشے ہیں۔ جو خلوت میں میرے سامنے ناک رگڑتے ہیں اور جلوت میں کہتے ہیں کہ ان کی ناک بہت اونچی ہے اور جو بے وقوف عورتیں کچھ نہیں کر سکتیں یہ خواب قبول کر لیتی ہیں۔''

''تم اپنی باتوں سے بہت تعلیم یافتہ لگتی ہو اور ذہین بھی۔'' محمود نے جیب سے سگریٹ نکالی۔

''بی اے، ایم اے تو میں نہیں ہوں۔'' وہ مسکرائی۔ ''انٹر کر کے کالج چھوڑ دیا گیا۔ مگر پڑھتی اب بھی ہوں۔ ایک دولت مند رشتہ آ گیا تھا۔ چنانچہ غریب ماں باپ نے فوراً سودا کر لیا اور مر گئے۔ شوہر کو میں نے مار دیا۔ میں اس کی بیوی نہیں رشوت تھی جو وہ اعلیٰ حکام کو پیش کرتا تھا۔ تاکہ اس کے کاروبار کو تحفظ حاصل رہے۔ میں نے سوچا کسی کی آلہ کار بننے کے بجائے میں خود یہ کام کیوں نہ کروں۔ کنیز بن کر کیوں رہوں۔ پولیس کے ایک بڑے آفیسر نے مجھ پر آنچ نہیں آنے دی۔''

وہ ہنسی۔ ''بعد میں وہ خود مر گیا۔ حادثات تو سب کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔''

محمود ہکا بکا بیٹھا ایک اور شمائلہ کی زندگی کا افسانہ سنتا رہا۔ جس میں کردار اور واقعات مختلف تھے۔ مگر فرضی نہیں تھے۔ ''تم ...... تم ہر ایک کے سامنے اعتراف کر لیتی ہو...... ان سب باتوں کا''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سب لوگ قابل اعتماد کہاں ہوتے ہیں، تم ہو تمہارا چہرہ بتاتا ہے۔''

محمود ہنس پڑا۔ ''چہرے تو بہت دھوکا دیتے ہیں۔ پلوشہ جہاں چہروں پر تو نقاب بھی ہوتی ہے۔''

''میرے سامنے ہر چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔'' اس نے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا۔

''اگر تم اعتماد کے قابل نہ ہوتے تو میں اپنے بھائی کو ریوالور دے کر کہتی کہ اس بدمعاش کو گولی مار دو۔ جو زبردستی گھسا ہے اور پھر پولیس کو فون کر دو۔ لیکن میں تمہیں دیکھ چکی تھی اور تم مجھے اچھے لگے تھے۔''

محمود نے محسوس کیا کہ وہ نروس ہو رہا ہے۔ ''تم نے مجھے پہلے بھی دیکھا تھا۔؟''

''ہاں ...... آج صبح جب تم ایسا ہی ایک تحفہ لے کر آئے تھے۔ میں اس وقت باغ میں ٹہل رہی تھی

اور بعد میں بہت دیر تک غور کرتی رہی کہ اس حرکت کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ تم آؤ گے تو پوچھ لوں گی۔" وہ بولی۔

"اوہ تمہیں یقین تھا کہ میں آؤں گا؟" محمود نے اس عورت کی بے پناہ کشش کے خلاف مزاحمت جاری رکھی۔

وہ ہنسی "کیا یہ یقین غلط تھا کہ تم تو اس کے بعد بھی آؤ گے کیا پلوشہ جہاں تمہیں اچھی نہیں لگی؟"

"میرے پاس پلوشہ جہاں کو دینے کے لیے ساڑھے دس ہزار روپے ماہانہ اور کاٹج کا کرایہ نہیں ہے۔" محمود نے کہا۔

"وہ تو نظامی دے ہی رہا ہے۔ مگر پلوشہ جہاں جیل میں نہیں ہے کہ کسی سے نہ ملے۔" وہ مصنوعی غصے سے بولی۔ اس کی یہ ادا بھی محمود کو بہت پیاری لگی۔

اچانک وہ دروازہ کھلا اور وہ بوڑھی عورت نمودار ہوئی۔

"بیگم صاحب جی! ناشتہ ادھر حاضر کروں؟"

اس نے نگاہ جما کر محمود کو دیکھا۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی جسے محمود صرف خطرناک کہہ سکتا تھا۔ محمود کو اپنے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ وہ نظریں اس کے وجود میں سوئیوں کی طرح پیوست ہو رہی تھیں۔

"ناشتہ یہیں لاؤ۔ ایک مہمان بھی ہے۔"

پلوشہ جہاں نے سکون سے کہا۔ محمود خاموش بیٹھا رہا۔ جذبات کا وہ دھارا جو اس پلوشہ کے پوچھنے پر بتایا کہ کس طرح چوکیدار کے قتل کے بعد سے اب تک کوئی شمائلہ کو مسلسل دہشت زدہ کر رہا ہے۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی اور مسکراتی رہی۔ محمود نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ شمائلہ سے اس کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ وہ اسے کتنا چاہتا ہے اور اس کی خاطر کیا کچھ کر سکتا ہے۔ کئی سال پہلے اس نے شمائلہ کی زندگی بچانے کے لیے ایک ایسا جوا بھی کھیلا تھا جس سے اس کا ازدواجی مستقبل خطرے میں پڑ سکتا تھا اور جھوٹ کھل جاتا تو اسے جیل بھی جانا پڑتا۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود اس نے پولیس سے کہا تھا کہ شمائلہ اس کی بیوی ہے اور بڑی کوشش سے سال بھر پہلے کا نکاح نامہ حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔

شمائلہ کے ماضی کا ذکر بے سود تھا اور یہ بتانے سے بھی کوئی فائدہ نہ تھا کہ شمائلہ کسی قماش کی عورت تھی یا ہے۔

ان تمام واقعات کو دہرانے سے محمود کو یہ فائدہ ہوا کہ اس خوبصورت عورت کی کشش کا وہ طلسم ٹوٹ گیا تھا۔ جس میں وہ مکڑی کے جالے میں پھنس جانے والی مکھی کی طرح گرفتار ہو گیا تھا۔ اس کا سابقہ اعتماد لوٹ آیا اور اپنی ذمے داری کا احساس پھر غالب آ گیا۔ پلوشہ جہاں کی صورت پر نمودار ہونے والے مایوسی کے سائے اس کی نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ عورت جو تسخیر کے لیے بڑھتی ہے۔ ہزیمت اٹھا کے پلٹتی ہے۔ تو ہتھیار نہیں ڈالتی۔ زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے۔ اس کے رویے میں یکلخت سرد مہری آ گئی۔

"تمہیں اپنی بیوی سے بھی بہت محبت ہے اور اس عورت شمائلہ سی بھی بہت محبت ہے۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "پھر میں کیا کروں؟"

"تم یہ کھیل ختم کر دو۔" محمود نے کہا۔ "اور یہاں سے چلی جاؤ۔ یہ شمائلہ کی خوشی ہے جو مجھے بہت عزیز ہے۔ تم خود کہتی ہو کہ تمہیں چاہنے والوں کی کمی نہیں۔ تمہیں دوسرا نظامی مل جائے گا۔ شمائلہ صرف اسی نظامی کو چاہتی ہے۔ تو اسے بخش دو۔"

"خیرات زبردستی تو نہیں لی جا سکتی۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔

"اچھا تو مجھ سے سودا کر لو۔ کاروباری سودا۔ جس میں تمہیں بھی نقصان نہ ہو اور شمائلہ کو بھی۔" محمود نے کہا۔ "قیمت بتاؤ۔"

"مجبور تم ہو یا تمہاری شمائلہ ہے۔" وہ اٹھ کر بولی۔

"مجبوری کی کیا قیمت ہوتی ہے محمود صاحب"

”میں پچیس ہزار تک میں معاملات طے کراسکتا ہوں۔“ محمود نے زور دے کر کہا۔

”میں پچاس پر بھی بات نہیں کرسکتی۔ کیونکہ میں بھی مجبور ہوں وہ سر کے بل آئے اور میرے سامنے ہاتھ جوڑے، میرے پاؤں پڑے تب بھی نہیں کرسکتی۔ مسٹر ٹارزن تم بہت دیر سے آئے ہو۔“ وہ بولی۔

”لوگ کہتے ہیں پر آید درست آید۔“ محمود نے کہا۔ ”لیکن تم شاید دیر کے ساتھ اندھیر کی قائل ہو۔“

”میں ایک بات بتاؤں؟“ وہ رازدارانہ انداز میں بولی۔ ”اس عورت سے کہو کہ مجھ سے کہو کہ مجھ سے نہ ڈرے۔ میں نظامی سے کبھی شادی نہیں کروں گی۔ شوہر وہ اسی کا رہے گا۔ اس کے لیے زیادہ خطرناک شہری عورت ہے، میری خادمہ جس کی مامتا کا خون اس گھر کی زمین نے پیا ہے۔ اب وہ قاتلوں کے لہو سے اپنے پیاس بجھانا چاہتی ہے۔ اس میں معاف کرنے کا حوصلہ نہیں ہے اور وہ روح کے اس ناسور کا عذاب اپنی قبر میں ساتھ لے جانا نہیں چاہتی۔ وہ اس قرض کو اپنی زندگی میں ضرور چکائے گی۔ ڈرو اس کے انتقام سے۔ ڈرو اس کی آہ...... سے مجھ سے کیا ڈرنا۔“

وہ پلٹی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ چند سیکنڈ بعد وہی لڑکا ہاتھ میں ریوالور لیے نمودار ہوا اور اس نے ریوالور کو اچھالا اور بڑی مہارت سے کیچ کرلیا۔

”چلو میں تم کو دروازے تک سی آف کرآؤں“ اس نے محمود کو اشارہ کیا۔

”آئندہ بیل کی طرح سیدھی اندر نہ آنا۔ پہلے بیل بجانا اور ہاں یہ اپنا شکار اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ گم آن اولڈ مین۔“

محمود چلتے چلتے رک گیا۔ کسی نے بڑی رازداری کے ساتھ اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

”دشش......“ آواز پھر آئی۔ اس مرتبہ محمود نے

☆ آدمی کی قابلیت اس کی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆ اچھے کام کے لیے کسی خاص وقت کا انتظار نہ کرو فوراً شروع کردو۔ (حضرت ابوزیدؒ)

☆ جب یہ پتا چلتا ہے کہ زندگی کیا ہے تو یہ آدھی خرچ ہوچکی ہوتی ہے۔ (امام غزالیؒ)

☆ اگر آپ کچھ بننا چاہتے ہیں تو ایک لمحہ بھی ضائع نہ کریں۔ (قائداعظمؒ)

☆ اچھے ضمیر کے بعد اچھی صحت زندگی کی دوسری بڑی نعمت ہے۔ (آئزک وائسن)

☆ ان کے لیے دنیا ایک طربیہ ہے جو سوچتے ہیں اور ان کے لیے ایک المیہ ہے جو محسوس کرتے ہیں (ارل آف آرفورڈ)

☆ کسی انسان کی عظمت و شرافت پرکھنے کا آخری پیمانہ یہ ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس کا رویہ ان لوگوں سے کیسا ہے جو اسے کچھ نہیں دے سکتے۔

خوف خدا......

☆ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے خدا اس کے لیے آسانی پیدا کردیتا ہے اور کو ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جس کے متعلق اس کے گمان میں بھی نہیں ہوتا۔

☆ اے لوگو! اپنی پرہیزگاری نہ جتایا کرو (اللہ) پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے۔

دوستی

دوستی کتنا اچھا لفظ ہے دل میں اتر جانے والا، دل و دماغ میں ٹھنڈک پہنچانے والا! مگر دوست وہی اچھے اور پیارے ہوتے ہیں جو دوست کی گہرائیوں میں جھانک کر اس کی ذات کو مکمل طور پر پہچان سکیں۔ مخلص دوست یقیناً ہمارے لیے وہی ہوتے ہیں جن کو ہم سوچتے اور محسوس کرتے ہیں جو صرف اور صرف خلوص اور پیار کی راہ بتاتے ہیں۔ دنیا میں اگرچہ دوستوں کی کمی نہیں لیکن اچھے دوست قسمت سے ملتے ہیں۔☆

پتھر کی چٹان کی آڑ میں کھڑی ہوئی رابعہ کو دیکھ لیا۔ انگلی اس کے ہونٹوں پر تھی اور وہ اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ یوں جیسے اسے خطرہ ہے کہ اگر وہ سامنے آئی یا محمود نے بات کی تو کام خراب ہو جائے گا۔ محمود نے اس کی نظر کو بڑے پراسرار طریقے پر اپنے پیچھے مرتکز دیکھا۔ کوئی سوال کیے بغیر وہ خود بھی اسی چٹان کے پیچھے چھپ گیا۔ اب وہ رابعہ سے دو منٹ کے فاصلے پر تھا۔

"کیا بات ہے؟" محمود نے آہستہ سے کہا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"ادھر دیکھو!" رابعہ نے کہا۔ "پلوشہ جہاں کا بھائی تمہارے تعاقب میں ہے اچھا ہوا میں نے دیکھ لیا۔"

محمود نے دیکھا۔ تو اسے پلوشہ جہاں کا بھائی ہاتھ میں بندوق لیے آگے بڑھتا نظر آیا۔ وہ ایک سے دوسرے درخت کے تنے تک یوں دبے پاؤں بڑھتا تھا کہ آہٹ تک نہیں ہوتی تھی۔ چند سیکنڈ توقف کرنے کے بعد وہ ادھر ادھر جھانکتا تھا اور بے آواز قدموں سے ڈور کر تیرے درخت کے پیچھے پہنچ جاتا تھا۔ محمود خاموشی سے اسے اپنے قریب آتے دیکھتا رہا۔ جب وہ چند سیکنڈ کے فاصلے سے گزرنے لگا۔ تو محمود نے یکلخت سامنے آ کر اس کی بندوق پر ہاتھ مارا۔

ایک جھٹکے میں بندوق محمود کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے نال کی جانب سے پکڑ کے بندوق کو چٹان پر دے مارا بندوق کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس نے نیچے پھینک دیئے۔ "اب دفع ہو جاؤ۔ ورنہ تمہارے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔" محمود نے زور سے دھاڑ کر کہا۔

"یہ جنگل کسی کی ملکیت نہیں ہے۔" وہ سرکشی سے بولا۔ "اور میں تمہارے گھر میں بیل بجائے بغیر نہیں آیا ہوں کہ تم مجھے دفع ہو جانے کا حکم دے رہے ہو۔"

"تم میرا تعاقب کیوں کر رہے تھے؟" محمود نے چراغ پا ہو کر کہا۔

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ مسٹر" وہ سکون سے بولا۔

"میں تو جنگلی کبوتروں کا شکار کرنے نکلا تھا۔"

"شکار کس لیے۔ کس کے لیے؟" محمود نے چلا کر پوچھا۔

"تفریح کے لیے اور کس کے لیے۔" وہ اسی لہجے میں بولا۔

"ویسے شکار کیے ہوئے کبوتر پکائے بھی جا سکتے ہیں۔ تم نے میری بندوق توڑی ہے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ مگر تم نے جرم کیا ہے۔ شرافت سے اس کی قیمت ادا کرو۔"

محمود نے اسے مکار رسید کرنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔

"شرافت کے بچے قیمت لو اپنی بہن سے جس کی کمائی کھا کے اینڈتے ہو۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے مقابل وہ ایک بچہ ہی تو تھا۔

وہ لڑکا محمود کو آگے بڑھتا دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ چند قدم دور جا کر وہ رکا۔ "وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گی۔" اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔

"تم نے اس کے بیٹے کو قتل کیا تھا۔ وہ تمہیں بھی قتل کر دے گی۔"

وہ پھر بھاگا اور درختوں میں گم ہو گیا۔

محمود کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس بے وقوف لڑکے نے یہ بات کیوں کہی تھی اور کس سے کہی تھی۔ اس نے رابعہ کی طرف دیکھا تو وہ اب بھی ادھر ہی نظریں جمائے کھڑی تھی۔ جدھر وہ لڑکا غائب ہوا تھا۔ پھر وہ یکلخت سنبھل گئی اور محمود کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ پلوشہ جہاں کا بھائی میرے پیچھے لگا ہوا ہے؟" محمود نے کہا۔ "کیا تم اس کے پیچھے تھیں۔"

"ہاں......" وہ بولی۔ "اور معاف کرنا میں چھپ کر تمہاری اور پلوشہ جہاں کی گفتگو بھی سن رہی

تھی۔"

محمود بھونچکا رہ گیا۔ "کیوں؟" یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔"

"ہاں" اس نے بیا کے گھونسلے جیسے بالوں کو کھینچا۔

"اچھی بات تو نہیں ہے مگر اس میں مزہ آتا ہے۔ لوگوں کی ساری قلعی کھل جاتی ہے کہ وہ سامنے کیا کہتے ہیں اور پیٹھ پیچھے کیا۔ جب تم کبوتر کا جنازہ لے کر نکلے تھے۔ نا تو میں سمجھ گئی تھی کہ اب ہوں گی مزیدار باتیں، میرا شوہر مجھے کئی بار ٹوک چکا ہے۔"

"تمہاری یہ عادت تمہیں دوسروں کی نظر میں ذلیل بھی کر سکتی ہے۔" محمود نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہم سب کی کوئی نہ کوئی عادت ہمیں دوسروں کی نظر میں ذلیل کرتی ہے۔ خواہ وہ اچھی عادت ہو یا بری۔" اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"مثلاً شمائلہ کو ہی لے لو وہ نظامی کی محبت میں ذلیل ہو رہی ہے۔ حالانکہ محبت کرنا کوئی بری بات نہیں۔"

"کیا تم نفسیات پڑھتے پڑھتے خود نفسیاتی کیس نہیں بن گئی ہو؟"

"ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ہاں...... مگر یہ بھی سچ ہے کہ نفسیاتی کیس سب ہیں۔" وہ ہنسی "تم میری بے تکلف گفتگو کا برا تو نہیں مانتے۔ نا تصنع سے مجھے چڑ ہے۔ ادب آداب۔ چھوٹی مروت ظاہری شائستگی خوبصورت لباس میک اپ' یہ سب جھوٹ کے پردے نہیں تو کیا ہیں۔ بھئی میں جیسی ہوں تمہارے سامنے ہوں۔ دل چاہتا ہے تو بات کرو ورنہ مت کرو۔"

"چھوٹے میاں' اور بڑے میاں کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہے تم نے؟"

"ان کے بارے میں میرے مستند رائے یہ ہے جناب کہ دونوں فراڈ ہیں۔" رابعہ نے اطمینان سے کہا۔ "میں نے چھپ کر ان کی جو گفتگو سنی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نظامی صاحب کی پارٹی سے

غور و فکر

حضرت خدیمؓ بن فاتک کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی اور رخ مبارک لوگوں کی طرف پھیرا تو خلاف معمول بیٹھے رہنے کی بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے کھڑے ہو گئے اور تین بار فرمایا:

"جھوٹی گواہی دینا اور شرک کرنا، دونوں برابر کے گناہ ہیں۔"

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بتوں سے دور رہو' جھوٹی بات کہنے سے دور رہو' خدا تعالیٰ کے لیے یکسو ہو جاؤ، شرک چھوڑ دو، توبہ اختیار کرو۔"

اقوال زریں

☆ عبادت جو مخلوق کے لیے کی جاتی ہے' زمین میں دھنسا دیتی ہے اور عبادت جو خالق کے لیے کی جاتی آسمان پر پہنچا دیتی ہے۔

☆ جس کا ظاہر و باطن ایک ہے وہ عالم ہے' جس کا باطن، ظاہر سے افضل ہے، وہ ولی اللہ ہے اور جس کا ظاہر باطن سے افضل ہے' وہ جاہل و مکار ہے۔

☆ خوش مزاج شخص وہ ہے جو دوسروں کو خوش مزاجی دے۔

☆ درویشی بادشاہت سے بہتر ہے بشرطیکہ دنیا کا تعلق شامل نہ ہو۔

☆ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو کچھ ہے کہ جو کچھ بھی سنے بیان کر دے۔

☆ جو اپنی ضرورتیں بڑھا لیتا ہے اسے اکثر محرومی کا غم رہتا ہے۔

☆ بدترین جھوٹ وہ ہے جس میں کچھ سچ بھی شامل ہو۔

☆ برے آدمی سے نیکی ایسے ہے جیسے نیک آدمی سے برائی کر دی جائے۔

☆ غصے پر قابو پانا ہی دانش مندی ہے۔☆

ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ خود تو اپنا سب کچھ بیچ کر اس پنجابی فلم میں لگا چکے جو ابھی چوتھائی بھی نہیں بنی۔ بغرض محال بن بھی گئی تو تیسرے دن اتر جائے گی۔ لیکن یہ جو اوہ نظامی کی بیوی اور احمد کی ماں کے پیسے سے کھیلنا چاہتے ہیں۔ وہ قرض لینا بھی نہیں چاہتے۔ اب یہ چاہنے کے چکر بڑا لمبا چکر ہے۔ چھوٹے میاں اس ہیروئن کو چاہتے ہیں گویا دونوں فلم کی تکمیل سے اپنے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں فلم پیسہ چاہتی ہے۔ پیسہ اب صرف شائلہ کے پاس ہے۔ جو نظامی کو چاہتی ہے مگر نظامی پلوشہ جہاں کو چاہتا ہے۔

چنانچہ اس کے دوست چاہتے ہیں کہ نظامی اپنی بیوی کی کمزوری سے فائدہ اٹھائے اور اس سے کم از کم چار پانچ لاکھ مار لے۔ نظامی یہ نہیں چاہتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے چھوٹے اور بڑے ملک کے پاس رقم کی واپسی کی کوئی ضمانت نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ایک چوتھائی فلم ڈبے میں بند کر کے باقی رقم بانٹ لیں اللہ اللہ خیر صلہ۔ پیسہ وہ بھی مارنا چاہتا ہے۔ مگر ان دونوں بدمعاسوں کو دینے کے لیے نہیں۔ اس کی اپنی ضروریات بھی تو نہیں۔''

''اور احمد کیا چاہتا ہے؟'' محمود نے اچانک کہا۔ ''یہ باتیں تم نے اسے بھی بتائی ہوں گی۔''

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''وہ چاہتا ہے۔ ہم سب پر لعنت بھیج کر یہاں سے نکل جائیں۔ مگر میں نے اسے پٹا ڈال رکھا ہے۔ میری بات کا برا مت ماننا میں اسے چاہتی ہوں میں نے سے سمجھایا ہے کہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں یہ سب کچھ اس کا حق ہے۔ جس پر مردار گدھ منڈلا رہے ہیں۔ دو کوٹھیاں اور لاکھوں نقد چھوڑنے میں کونسی عقلمندی ہے۔ احمد کہتا ہے لعنت ہے اس پیسے پر تم تو جانتے ہو کہ دونوں ماں بیٹوں کے درمیان نفرت کی خلیج تمام عمر حائل رہی ہے۔ دونوں ایک دوسری سے سخت ناخوش ہیں۔ شائلہ اس لیے ناخوش ہے کہ احمد نے مجھ سے شادی کیوں کی۔ احمد اس لیے ناخوش ہے کہ شائلہ نے نظامی سے شادی کیوں کی۔ دونوں احمق ہیں۔'' وہ ہنسی۔

''تمہارے مقابلے میں تو واقعی احمق ہیں۔'' محمود نے کہا۔

''تھینک یو۔'' رابعہ نے سر خم کر کے کہا۔

''احمد کہتا ہے' ممی سے نیکی کی توقع رکھنا عبث ہے۔ انہیں سب سے عزیز وہ شخص ہے جسے ان کی خاک پرواہ نہیں۔ اسے پلوشہ جہاں سے بچانے کی خاطر وہ سب کچھ قربان کرنے کی حماقت کر سکتی ہیں۔ چنانچہ ان کا پیسہ چھوٹے بڑے میاں صاحبان کو ملے نہ ملے نظامی کو ضرور مل جائے گا اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ میرا خیال ہے جب ان کو دادی کہلانے کا شرف حاصل ہوگا۔ تو نفرت کی اس خلیج کا وجود خود بخود مٹ جائے گا۔ جو ماں بیٹے کے درمیان حائل ہے۔''

''یہ خلیج تم تو نہیں ہو؟'' محمود نے مذاق میں کہا۔

''نفرتوں کے بہت سے چھوٹے بڑے دریا ملتے ہیں تو ایک سمندر بن جاتا ہے۔ جس میں ڈوبنے والے کا سراغ نہیں ملتا۔'' اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر جلائی اور دھواں فضا میں منتشر کر دیا۔

''شائلہ کو مجھ سے پلوشہ جہاں سے نظامی کے دوستوں سے حتی کے احمد سے نفرت ہے۔ ان سب سے نفرت رکھنے کے بعد اسے اپنی ذات سے پیار کیسے ہو سکتا ہے۔ تم خود کو دیکھو ایمانداری سے سوچو تم کس کے خلاف نفرت میں مبتلا ہو۔''

''تم تو ہر بات میں اپنی نفسیات لے آئی ہو۔'' محمود نے کہا۔

''یہاں عملی مسائل بھی ہیں' مثلاً اس چوکیدار کا قتل ...... اسے کس نے قتل کیا اور کیوں کیا؟''

''مجھے معلوم ہے۔'' وہ سگریٹ کا کش لے کر کھانسی۔ ''اسے چھوٹے میاں نے قتل کیا ہے۔''

محمود بھونچکا سا رہ گیا۔ اسے اتنے دو ٹوک فیصلہ کن اور قطعی جواب کی بالکل امید نہیں تھی۔

''تم نے یقین کے ساتھ کہہ رہی ہو۔ جیسے......
جیسے تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''
وہ مسکرائی۔ ''قتل ہوتے تو آنکھوں سے نہیں دیکھا مگر اور بہت کچھ تو دیکھا ہے مثلاً میں نے اس چوکیدار کو دیکھا تھا۔ بے حد صحت مند' اسمارٹ اور ہینڈ سم مرد تھا۔ احمد میرے منہ سے ایسی بات سن لے تو دھواں دینے لگے۔'' وہ ہنسی ''لیکن ایک عورت کی نظر سے دیکھا جائے۔ تو وہ واقعی بہت پرکشش تھا اور پنجابی فلم کی یہ چوتھائی ہیروئن اس پر مرمٹی تھی۔ وہ بھی دیہاتی اور کچھ کم عمری کے باعث جذباتی نوجوان تھا اور ایک ہیروئن کے التفات نے اسے گھن چکر بنا دیا تھا۔ ہیروئن خیر سے شاہی محلے کی خاک کا خمیر ہیں۔ ان کے لیے عشق کیا ہے۔ وفا کیا ہے۔ ایک حیوانی جذبہ تھا۔ جس کی پستی میں آ کر وہ دونوں مصلحت کے تقاضوں کو بھی بھول گئے۔ میں نے رات کے وقت انہیں زور زور سے بولتے سنا تھا تو میری آنکھ کھل گئی۔ اس سے وقت یہ واردات ہو چکی تھی۔ ہیروئن جائے واردات سے فرار ہونے۔ میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن لڑکا۔ مارا گیا تھا۔
بعد میں بڑے صاحب کی مداخلت نے حالات کو مزید سنگین ہونے سے بچالیا تھا چھوٹے میاں کو ٹھنڈا کیا۔ ہیروئن کو برا بھلا کہا اور انجام سے خوفزدہ کیا۔ قتل تو ایک ایک لمحے کا ردعمل ہوتا ہے۔ جب عقل اور ہوش ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ لمحہ گزر گیا تھا۔ چنانچہ چھوٹے میاں کی حالت بھی غیر تھی کہ انہوں نے کیا کر دیا اور کس کے لیے۔ جب انہوں نے مل کر سراغ مٹائے جانے کا فیصلہ کیا تو میں واپس اپنے کمرے میں بھاگ آئی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ احمد نہیں جاگا تھا۔''
محمود کو یہ کہانی ہر اعتبار سے قابل یقین لگی۔
''اگر میاں صاحبان تمہیں دیکھ لیتے تو تم کو بھی ٹھکانے لگا دیتے۔''
''یہ خیال مجھے بعد میں آیا تھا'' رابعہ نے اعتراف کیا۔
''اور اسی لیے میں خاموش رہی۔ تم بھی خاموش ہی رہو تو بہتر ہے۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔''
''چوکیدار کی لاش کو خاردار تاروں پر کس نے ڈالا تھا۔؟'' محمود نے کہا۔
''غالباً کسی نے نہیں' اس نے فرار ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ تاروں میں الجھ گیا۔''
رابعہ نے کہا ''پولیس کو خبر نہیں ملا اور اس رات شدید بارش ہوئی تھی۔ چنانچہ قدموں کے نشانات وغیرہ سب برابر ہوگئے۔ اس کے علاوہ تھانیدار کو تفتیش کا دائرہ اس گھر سے باہر رکھنے کی قیمت بھی ادا کر دی گئی تھی۔ میاں صاحبان کے علاوہ یہ تو سب ہی چاہتے تھے' تھانیدار نے یہاں رسمی سے کارروائی کی۔ صرف ایک دن اور پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ اس نے یہ مفروضہ قائم کرلیا تھا۔ کہ کسی پرانے خاندانی تنازعے پر انتقامی نوعیت کی ایسی واردات کا دائرہ اگر سوات یا غیر علاقوں تک پھیلا دیا جائے۔ جہاں پولیس کی رسائی نہیں تو کیس خود بخود فائل ہو جاتا ہے۔''
یہ بات حالات سے مطابقت رکھتی تھی۔ میاں برادران نے اس قتل سے دیگر فوائد بھی حاصل کیے۔ ایک یہ کہ چوکیدار کی جگہ خالی رکھنے کے لیے باتیں مشہور کردیں۔ ایک جاں نثار اور وفا دار چوکیدار کا احساس تحفظ نہ رہا۔ تو سائلہ کو دہشت زدہ کرنا اور بھی آسان ہوگیا۔ پھر یہ کہ بے وفا ہیروئن کو ایک عملی سبق دے دیا گیا۔ کہ وہ دوبارہ ایسے غلطی نہ کرے۔
اب مسئلہ ثبوت کا تھا۔ کیونکہ جو کچھ رابطہ نے دیکھا اور سنا تھا منطقی اور مفروضات پر مبنی تھا اور واحد گواہ وہ خود تھی اور وہ اتنی چالاک عورت تھی کہ محمود سے کہی ہوئی تمام باتوں سے صاف مکر سکتی تھی' کہہ سکتی تھی کہ وہ محمود سے اندر یا باہر کبھی اکیلے میں ملی ہی نہیں۔ گھر کے معاملات میں محمود کی مداخلت کی ذمہ داری سائلہ کی تھی۔ الزام اسی پر آ سکتا تھا۔ کہ اس نے محمود کو ساری باتیں بتائی ہیں۔ اس ناکام و نامراد ہیروئن سے البتہ یہ توقع کی جاسکتی تھی۔ کہ وہ ڈرانے دھمکانے سے یا سمجھانے سے مان جائے۔ پیشہ ور

عورت کا کیا ہے۔ اگر اسے یقین دلایا جائے کہ اعتراف حقیقت کے بعد وہ محفوظ رہے گی تو شاید وہ چھوٹے بڑے میاں صاحب کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے قانون سے تعاون کر لے۔ لیکن دوسری طرف سے امکانات یہ بھی ہے کہ مالی نقصانات کے خیالات سے وہ چھوٹے میاں صاحب کی وفادار رہے۔

کیونکہ کیس تو فائل کرا ہی دیا گیا ہے اسے امید ہو گی کہ شمائلہ کا پیسہ جب نظامی کو اور نظامی کے ہاتھوں میاں برادران کو ملے گا تو چھوٹے میاں صاحب کا مال اسی کی جیب میں آئے گا۔

''تم کس فکر میں پڑ گئے۔؟'' رابعہ نے کہا۔

''تم کچھ ثابت نہیں کر سکتے۔ تم شمائلہ کی بھی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ نظامی کے عشق میں تمہاری عقل کا مشورہ قبول نہیں کرے گی۔ تم تفریح کرو اور چلے جاؤ۔ بھول جاؤ ساری باتیں۔''

''ماشاء اللہ تم بہت ذہین اور اپنی عمر سے کہیں زیادہ عاقل و بالغ ثابت ہوئی ہے۔''

محمود نے کہا ''اور تمہارے بارے میں میرے ابتدائی تاثرات بالکل غلط تھے کہ تم نئی نسل کی نمائندہ غیر ذمے دار اور بے راہ قسم کی لڑکی ہو۔ یہ بتاؤ شمائلہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے کہ اسے قتل کرنے کی سازش؟ اور ہے تو کون کر رہا ہے یا کر سکتا ہے۔''

''سازش کے امکانات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا؟'' وہ مسکرائی۔ ''تمہارے ذہن میں کس کا آنا آتا ہے۔''

''سوال میں نے پہلے کیا تھا۔''

محمود نے کہا۔ ''اپنے خیال کا اظہار میں بعد میں کروں گا آپس کی بات ہے۔''

''اچھا'' وہ ہنسی۔ ''دو افراد کو میں شبہے سے بالا تر سمجھتی ہوں ایک نظامی کو۔ دوسری اس پنجابی ہیروئن کو۔ باقی لوگوں کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''میں تو ابھی کسی ایک کو بھی اتنے یقین کے ساتھ بری نہیں کر سکتا۔'' محمود نے بے بسی سے کہا۔

جو در حقیقت اپنے شکوک کا اظہار نہ کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی۔ محمود کا ذہن بہت سے نتائج کی بھیڑ میں سے ایک نتیجہ نکالنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔

شمائلہ اندھیرے کمرے میں بالکل اکیلی بیٹھی تھی۔

''یہ کیا پاگل پن ہے شمائلہ؟'' محمود نے لائٹ آن کرتے ہوئے کہا۔ ''باقی لوگ کہاں گئے؟''

''میں کیا بتاؤں' کہاں گئے ہیں۔'' وہ دیوار کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''تم خود بھی تو گھر پر نہیں تھے۔ کسی کو بھی میری فکر نہیں۔ نہ میرے شوہر کو' نہ میرے بیٹے کو۔ ان کی بلا سے میں کل مرتی آج مر جاؤں اور کسی دن یہی ہوگا۔ مجھے اکیلا پا کر وہ مجھے گولی مار جائیں گے۔''

''وہ کون؟ کس کی بات کر رہی ہو تم؟'' محمود نے کہا۔

''ایسے انجان مت بنو'' وہ چلائی۔ ''میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ میری زندگی خطرے میں ہے۔ میرا خیال تھا تم میری حفاظت کرو گے۔ میرا خیال رکھو گے۔'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ خوف کی ہسٹیریا میں اس کا رنگ کورے لٹھے کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ وہ بیڈ پر اپنے پیر لٹکائے اور دونوں ہاتھوں سے گود میں رکھے ہوئے ریوالور کو مضبوطی سے پکڑے بیٹھی تھی۔

''لیکن تمہیں بھی فرصت نہیں ہے۔ کس کو کیا' شمائلہ مرے یا جیے۔''

محمود اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے شمائلہ؟ تم تو بہت حوصلہ مند عورت تھیں۔''

''اب نہیں ہے مجھ میں حوصلہ۔ میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ میرے اعصاب جواب دے گئے ہیں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اب مجھ میں کسی سے مقابلے کی سکت نہیں رہی۔ میں کوئی صدمہ برداشت نہیں کر سکتی اور کسی خطرے کا سامنا نہیں

کر سکتی۔ میں ایک بزدل اور بیوقوف عورت بن گئی ہوں۔ حالات نے مجھے ایسا بنا دیا ہے۔''

''یہ سب اس ماحول کا تصور ہے شمائلہ!'' محمود نے کہا۔''یہاں سے نکل چلو' میرے ساتھ۔''

''تمہارے ساتھ۔'' وہ سہم کر بولی۔''نہیں نہیں' نظامی کو چھوڑ کر میں کہیں نہیں جا سکتی۔ وہ مجھے چھوڑ دے گا۔''

''بیوی نہیں تو کیا' میرے گھر میں میری ماں ہے۔ میرے بھائی بہن ہیں۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔'' محمود نے کہا۔''یہاں تمہارے ارد گرد گدھ منڈلا رہے ہیں۔ ان کی بھوکی نظریں تم پر نہیں' تمہاری دولت پر ہیں۔''

''دولت مجھے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز تو نہیں ہے۔'' وہ سنبھل کر بولی''جس کو چاہیے لے لے مگر مجھے سکون سے جینے دے۔ مجھے معلوم ہے کہ نظامی کو ایک لاکھ کی ضرورت ہے۔ آج اس نے میرے سے ایک لاکھ مانگے تھے تاکہ وہ بھی اس میں فلم سرمایہ لگا سکے اور وہ فلم مکمل ہو جائے تو اس کا نام بھی فلمسازوں میں آئے گا۔ اس نے کہا کہ جب فلم سے ایک کے دس وصول ہوں گے تو وہ میرا سرمایہ بمعہ سود ادا کر دے گا لیکن محمود یہ سب جھوٹ ہے' دھوکا ہے۔ وہ فلم کبھی نہیں بنے گی اور نظامی بے وقوف نہیں ہے کہ یہ بات نہ سمجھتا ہو۔ وہ ان بدمعاشوں کا پارٹنر نہیں بنے گا۔ وہ ایک لاکھ اپنی پلوشہ جہاں پر لٹا دے گا' اسی لیے میں نے آج اسے کورا جواب دے دیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ نظامی مجھے مجبور کرنے کے لیے میری کمزوری سے فائدہ اٹھائے گا۔ مجھے دھمکی دے گا کہ میرا اور تمہارا تعلق ختم لیکن محمود! بعد میں مجھے افسوس ہوا' میں اس کا مطالبہ پورا کر دوں گی۔''

''اور تمہارا کیا خیال ہے کہ اس کے بعد وہ کوئی مطالبہ نہیں کرے گا۔ یہ ایک لاکھ اسے کافی ہوں گے؟'' محمود نے کہا۔

''تو جتنے اسے چاہئیں لے لے۔'' شمائلہ نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

واہ بھئی واہ

دلیل

''کیا آپ یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ آپ عین آپریشن کے وقت آپریشن تھیٹر سے فرار کیوں ہو گئے تھے؟'' ہسپتال کے منتظم نے ادھیڑ عمر مریض سے پوچھا۔

سہمے ہوئے مریض نے دو تین گہرے گہرے سانس لیے اور اپنی کیفیت پر قابو پا کر بولا:''مجھے آپریشن تھیٹر لے جایا گیا تو میں تھوڑا سا پریشان ضرور تھا مگر خوفزدہ ہرگز نہیں تھا۔ ایک نوجوان اور حسین نرس نے کہا کہ آپ پریشان اور خوفزدہ نہ ہوں۔ یہ کوئی بڑا آپریشن نہیں ہے۔ آپ کامیابی سے اس مرحلے سے گزر جائیں گے۔''

''تو اس میں آپریشن تھیٹر سے فرار ہونے کی کیا بات تھی؟''

''آپ سمجھے نہیں جناب۔ نرس نے وہ جملے ڈاکٹر کو مخاطب کر کے کہے تھے!''

شادی

کروڑ پتی تاجر نے رازدارانہ انداز میں اپنے گہرے دوست سے کہا''میری عمر تقریباً اڑسٹھ برس ہو چکی ہے۔ میں ایک حسین و جمیل دوشیزہ کی محبت میں گرفتار ہوں' میں اس فتنۂ قامت کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ سترہ سال کی اس خوش جمال لڑکی نے میری راتوں کی نیند حرام کر دی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے' اگر میں اس دوشیزہ کو اپنی عمر پچاس سال بتاؤں تو کیا وہ مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔؟''

''میں تمہیں ایک بہترین مشورہ دے رہا ہوں۔'' بے تکلف دوست نے کہا:''اگر تم اس لڑکی کو اپنی عمر اسی سال بتاؤ تو وہ یقینی طور پر شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔''

☆

"جیتنے کا کیا سوال۔ وہ تم سے سب کچھ لے لے گا اور اس کے بعد پلوشہ کے پاس چلا جائے گا۔" محمود نے کہا۔

"وہ کل کی بات ہے اور کل بہت دور ہے۔ ابھی میں اسے اپنا سب کچھ کہاں دے رہی ہوں۔ میں اگر دوں گی تو تھوڑا تھوڑا کر کے تاکہ وہ دولت کی اس زنجیر سے بندھا رہے۔ اس سے امید کا دامن بندھا رہے گا کہ شاید کل پلوشہ جہاں کو چھوڑ دے یا خود پلوشہ جہاں اسے ٹھکرا دے۔"

"تم پاگل ہوگئی ہو شمائلہ! یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ تم ان کا طویل عرصے تک مقابلہ کرو گی۔ وہ تمہیں یوں بیچ کھائیں گے۔" محمود نے چٹکی بجا کر واضح کیا "اور تم خوار ہو جاؤ گی۔ میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔"

"تم...... تم کیا تم گدھ نہیں ہو؟" شمائلہ نے ریوالور اٹھا لیا۔ "تم اکیلے ہی میرا مال ہضم کرنا چاہتے ہو۔ مجھے میری نظامی سے چھڑانا چاہتے ہو۔ میں تمہیں قتل کر دوں گی۔ تمہارا کیا بھروسہ، تم تو مجھے بلیک میل بھی کر سکتے ہو کیونکہ تم وہ سب کچھ جانتے ہو جو دوسرے نہیں جانتے۔ میں اپنی حفاظت خود کر لوں گی۔ تم جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے، نکل جاؤ میرے گھر سے۔" وہ چیخ کر بولی۔

شمائلہ واقعی پاگل ہوگئی تھی۔ محمود نے ایک قدم آگے بڑھایا اور رک گیا۔ ریوالور شمائلہ کے ہاتھوں میں کانپ رہا تھا اور گولی بلا ارادہ بھی چل سکتی تھی۔

"میں تم سب کو مار دوں گی اور خود بھی مر جاؤں گی۔" وہ ہانپتے ہوئے بولی۔

"شمائلہ...... پلیز......" محمود نے نرمی سے کہا لیکن اس سے زیادہ اسے کچھ کہنے کا موقع نہ ملا۔ کھڑکی کا شیشہ زبردست چھناکے سے ٹوٹا اور کوئی چیز پتھر کی طرح اندر آ گئی۔ اڑتی ہوئی کرچیاں بستر تک پھیل گئیں۔ شمائلہ نے ایک چیخ ماری اور بستر پر گر کر بے ہوش ہوگئی۔ اس کے سامنے ایک مردہ کبوتر آنکھیں کھولے پڑا تھا۔ کبوتر کی گردن کٹی ہوئی تھی اور اس کے پر بھی کاٹ کر باندھ دیے گئے تھے۔ گردن سے نکلنے والے لہو کی مقدار دیکھ کر محمود کو تعجب ہوا۔ اس نے کبوتر کو انگلی سے دبا کر دیکھا۔

کبوتر کا جسم سرد اور اکڑا ہوا تھا۔ اسے مرے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی لیکن خون کا رنگ سرخ اور تازہ تھا۔ محمود نے خون کو چھو کے انگلی کے پورے سے سونگھا۔ اس میں تازہ لہو کی مہک بھی نہ تھی۔ یہ خون نہیں سرخ رنگ تھا۔ کسی نے کبوتر کو مار کے رکھ لیا تھا کیونکہ اسے براہِ راست نشانے سے اندر پہنچانے کے امکانات نہ رہے۔ کبوتر کے پاؤں چھوٹی رسی سے بندھے ہوئے تھے اور اسے گھما کر کھڑکی میں پھینک دیا گیا تھا۔ آٹھ شیشوں میں سے کسی ایک کو توڑ کر کبوتر کا اندر گرنا عین ممکن تھا۔

محمود نے کھڑکی کے قریب جا کر دیکھا۔ مری کے پہاڑوں پر ابر آلودہ آسمان اور اندھیری رات پھیلی ہوئی تھی۔ بلند قامت درخت تیز ہواؤں کی یلغار میں تھے جو بادلوں کو اڑاتی سنسناتی اور سرسراتی ہوئی وادیوں میں سے گزر رہی تھی۔ یہ شور ایک مہیب سناٹے کی بازگشت بن کر ہر طرف گونج رہا تھا۔ اچانک ایک کار کی ہیڈ لائٹس گھوم کر گیٹ پر آئیں اور لکڑی کے تختوں سے بنے ہوئے پٹ روشن ہوگئے۔ آڑھی لکیروں کا سایہ دیوار پر پڑا مگر اندھیرے اجالے کی لکیروں کے اس جال میں ایک شخص کا سایہ بھی گرفتار تھا جو پٹ کے قریب کھڑا تھا۔ اتنے فاصلے سے اس کے کوٹ پتلون کا یا ٹائی کے رنگ کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا مگر ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی سے اس کے لباس سے بھی چوڑائی کے رخ دھاریاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ اوسط قد و قامت کا نوجوان آدمی تھا جس کی صورت کے نقوش بھی سایوں کی دھوپ چھاؤں میں گم تھے۔ دوسرے لمحے وہ جھاڑیوں کی باڑھ کے پیچھے گم ہو گیا اور محمود نے چھوٹے میاں کو کار سے اتر کر گیٹ کھولتے دیکھا پھر بڑے میاں صاحب نے کار آگے بڑھا دی اور محمود نے پلٹ کر دیکھا تو شمائلہ ابھی تک بستر پر آڑی لیٹی

لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ اس نے شمائلہ کو سیدھا لٹایا اور اس کا ریوالور تکیے کے نیچے رکھ کر کبوتر کو اٹھا لیا اور پھر کچھ سوچ کر اس نے کبوتر وہیں پھینکا اور باہر نکل آیا۔

بیڈروم کا دروازہ بند کر کے وہ کچن کی طرف لپکا۔ پچھلی طرف کھلنے والے دروازے سے گیراج کی طرف جانے کے بجائے وہ دوسری سمت سے گھوم کر گیٹ تک جانا چاہتا تھا تاکہ اس پُراسرار شخص کو دیکھ سکے جو بند گیٹ کے پاس کھڑا تھا اور کار کو دیکھتے ہی غائب ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار پلوشہ جہاں کے بھائی کا خیال آتا تھا۔ اگر وہ شریفانہ لباس پہن لے تو شاید ایسا ہی لگے۔

پہلے ہی موڑ پر اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی دیوار سے ٹکرا گیا ہے۔ سر پر پڑنے والی ایک ضرب سے وہ چکرا گیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے جگنو سے جگمگانے لگے۔ زمین اس کے قدموں کے نیچے سے سرکنے لگی اور اس نے بے اختیار مدمقابل کو پکڑنے کے لیے ہاتھ پھیلائے جس کا وجود ایک سیاہ ہیولے کے سوا کچھ نہیں تھا مگر تاریکی اور خلاء کے سوا اس کے ہاتھوں میں کچھ نہ آیا۔ وہ نیچے گرا اور بے حسی کے سمندر میں ڈوب گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو ایک ہاتھ اسے سہارا دیے ہوئے تھا۔ کوئی نام لے کر اسے پکار رہا تھا۔ اس نے غور کیا یہ آواز اسے جانی پہچانی لگی پھر اسے یاد آیا' یہ احمد کی آواز تھی۔ آنکھیں کھول کر دیکھنے سے اس پر انکشاف ہوا کہ وہ وہیں لیٹا ہے' جہاں گرا تھا اور شاید زیادہ دیر ہوش سے بیگانہ نہیں رہا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

''کیا...... کیا ہوا محمود صاحب!'' احمد نے شاید تیسری بار پوچھا۔

''تمہیں...... تمہیں...... کچھ...... کچھ نہیں معلوم؟'' محمود نے سر کو جھٹک کر کہا۔ ''تم نے نہیں دیکھا کہ وہ کون تھا؟''

''وہ کون؟'' احمد نے کہا۔ ''کوئی اور بھی تھا یہاں۔ میں نے تو کسی کو بھی نہیں دیکھا۔''

خوشی اور غم

پہلا شخص: ''یہ یورپ اور امریکا وغیرہ میں شادی کے وقت دلہن سفید لباس کیوں پہنتی ہے؟''

دوسرا شخص: ''اپنی خوشی کے اظہار کے لیے......!''

پہلا شخص: ''اوہ! اب سمجھ میں آیا کہ دلہا ہمیشہ کالا سوٹ کیوں پہنتا ہے۔''

ایمرجنسی

ایک ادھیڑ عمر شخص نے اوزاروں کا بکس اُٹھائے ایک خوبصورت مکان کی اطلاع گھنٹی کا بٹن دبایا۔ ایک خوبصورت خاتون نے دروازہ کھولا اور استفہامیہ نظروں سے ادھیڑ عمر شخص کو دیکھنے لگی۔

''بی بی! میں پلمبر ہوں اور آپ کا نل ٹھیک کرنے آیا ہوں۔''

''لیکن میں نے کسی پلمبر کو طلب نہیں کیا' پھر آپ نے کیوں زحمت فرمائی ہے۔؟''

''کیا کہا؟ کیا آپ مسز جمیل نہیں ہیں؟''

''جی نہیں۔ وہ تین ماہ قبل مکان تبدیل کر چکی ہیں۔ ہم نئے کرائے دار ہیں۔''

''کمال ہے! لوگ بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ پلمبر کو بلواتے ہیں، کہتے ہیں ایمرجنسی ہے، پھر پلمبر آتا ہے تو وہ مکان تبدیل کر چکے ہوتے ہیں۔''

صد شکر

ایک عظیم موسیقار چل بسا' اس نے بہت تاکید سے وصیت کی تھی کہ اسے اس کی بانسری کے ساتھ دفن کیا جائے۔

موسیقار کے دوست نے تدفین کے بعد بیوہ سے کہا: ''آپ کا کیا خیال ہے' آپ کے آنجہانی شوہر کی وصیت عجیب نہیں تھی؟''

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے شوہر نے پیانو کے ساتھ دفن ہونے کی وصیت نہیں کی ورنہ ہمیں بڑی پریشانی ہوتی۔'' ☆

محمود اٹھ کھڑا ہوا۔ کپڑے جھاڑ کر اس نے احمد کو غور سے دیکھا۔ ”میرا خیال ہے‘ تم عملاً غلط بیانی کر رہے ہو۔ کسی نے ابھی ابھی ......“ وہ رک گیا۔

احمد اس کی بات کا سخت برا مان کے پلٹ چکا تھا۔ محمود نے ایک گہری سانس لی اور چند فٹ وہیں کھڑا اس حادثے پر غور کرنے کے علاوہ اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر وہ اندر گیا تو شمائلہ کے کمرے میں اسے رابعہ نظر آئی۔ وہ وہیں رک کر ان کی باتیں سننے لگا۔

رابعہ بستر کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی شمائلہ کو سکون بخش گولی اور گلوکوز ملے پانی کا گلاس دے رہی تھی۔ ”ممی! آخر اس میں دہشت زدہ ہونے کی کیا بات ہے۔ مردہ آدمی بھی کسی بچے کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ یہ تو بے ضرر سا پرندہ ہے اور وہ بھی مردہ...... آپ کو اس سے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

”تم...... تم شاید ٹھیک کہتی ہو بیٹی!“ شمائلہ زبردستی مسکرائی۔ جس لہجے میں اس نے رابعہ کو بیٹی کہا تھا‘ وہ محمود کے لیے بہت اجنبی تھا۔ ”بس جب میں اکیلی رہ جاتی ہوں نا تو معلوم نہیں کیوں خوف طاری ہو جاتا ہے مجھ پر۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ بیٹی...... میں اب...... بوڑھی ہونے لگی ہوں۔ میری دیکھ بھال اگر تم نہیں کرو گے تو کون کرے گا...... تم میرے احمد کی بیوی ہو۔ اکیلے ہونے والے بچے کی ماں ہو۔ میرے پوتے کی ماں...... وہ بھی تو میرا ہی خون ہیں‘ ہیں نا۔“ وہ خوف کی ذہنی کیفیت میں بولتی جا رہی تھی۔ ”میں نے اب تک تمہارے اور احمد کی ساتھ بڑی زیادتی کی۔ میں اس کی تلافی کر دوں گی۔“

”ممی۔“ رابعہ اٹھلا کر بولی۔ ”آج اچانک یہ خیال کیسے آ گیا آپ کو‘ پہلے تو کبھی آپ نے ہمیں اپنا نہیں سمجھا۔“

”کبھی نہ کبھی ہر شخص کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے بیٹی......“ شمائلہ نے کہا۔ ”بس تم میرے پاس رہو۔“

”لیکن ممی...... احمد نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ اب ہم الگ رہیں گے۔“ رابعہ نے کہا۔ ”ہمیں یہاں کوئی اپنا نہیں سمجھتا۔“

”یہ غلط ہے‘ تم مالک ہو اس گھر کی۔“ شمائلہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”میں تمہیں اپنا سمجھتی ہوں۔ میرا جو کچھ ہے وہ تمہارا ہے‘ کل میں دو لاکھ سے اس بچے کا اکاؤنٹ کھول دوں گی۔ وہ پیدائشی لکھ پتی ہو گا۔“ وہ ہذیانی انداز میں ہنسی۔

”یہ آپ رشوت دے رہی ہیں مجھے‘ اس لیے کہ آپکو تنہائی سے خوف آتا ہے اور آپ ہمیں ہر قیمت پر روکنا چاہتی ہیں۔“ رابعہ نے روکھے لہجے میں کہا۔

”آج آپ کی زبان بیٹی کہنے لگی ہے۔ کل کو میں پھر بہو بن جاؤں گی۔ آپ مجھے لالچی ہونے کا طعنہ دیں گی۔ ایسے دو لاکھ کس کام کے۔“

”ایسا نہیں ہو گا‘ میں وعدہ کرتی ہوں۔ احمد کو سمجھا لے‘ وہ تیری بات نہیں ٹالے گا۔“ شمائلہ اس کی منت سماجت کرتے ہوئے بولی۔ ”میں تیرے بچے کی زندگی کی قسم کھاتی ہوں۔“

”اور نظامی صاحب؟ ان کا کیا ہو گا؟“ رابعہ نے کہا۔

”ہم سب ساتھ رہ لیں گے‘ آخر وہ میرا شوہر ہے۔ رابعہ...... احمد کا باپ نہیں تو کیا۔“ شمائلہ نے کہا۔ ”وہ احمد کا دشمن بھی نہیں ہے۔“

”اچھا میں بات کروں گی احمد سے۔“ رابعہ جانے کے لیے اٹھی۔ دروازے کے قریب اسے محمود نظر آیا تو وہ یوں ٹھٹک کر رکی جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔

”میں بھی وہی کر رہا تھا جو تم کرتی ہو۔“ محمود نے آہستہ سے کہا۔

”تم اندر مت جانا۔“ وہ سرگوشی میں محمود سے مخاطب ہوئی۔ ”معلوم نہیں کیوں شمائلہ تمہارے اتنے خلاف ہو رہی ہے اور اس پر ہسٹریا کا ابھی تک اثر ہے۔ تکیے کے نیچے میں نے ابھی ایک ریوالور بھی

دیکھا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" محمود نے کہا۔ "تم اس کو تنہا چھوڑ دو۔ شمائلہ تو آج اپنی دولت تم پر لٹانے کے لیے تل گئی ہے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ اس سے کوئی گڑبڑ ہو جائے۔"

رابعہ نے اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی۔ مگر اسی وقت شمائلہ نے پکار کر کہا۔ "رابعہ بیٹی! کس سے باتیں کر رہی ہو؟"

"کوئی نہیں امی......" رابعہ نے کہا۔ "میں تو کسی سے بات نہیں کر رہی ہوں۔"

محمود بوجھل مگر بے آواز قدموں سے پھر باہر نکل آیا۔ رات کچھ اور سیاہ اور سنسان اور پُرشور ہو گئی تھی۔ ہوا کے جھکڑ درختوں کو ہلا رہے تھے اور پہاڑوں میں گونجنے والا یہ شور چڑھتے ہوئے سمندر کی طوفانی لہروں کی گرج لگتا تھا۔ وہ لان کے آخری حصے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور واقعات کی گتھیاں سلجھانے لگا۔ جن میں تازہ ترین اضافہ اس پر حملہ تھا۔ حملہ آور جو بھی تھا' شاید اسے مار کر کسی گہرے کھڈ میں پھینک دیتا۔ میاں برادران کی دھمکی اس کے ذہن میں تھی۔ پہاڑوں میں آدمی کا پیر بھی پھسل جاتا ہے۔ حادثات تو یہاں بڑے ہی خوفناک ہوتے ہیں لیکن میاں صاحبان اسی وقت کار لے کر پہنچے تھے اور جب اس پر حملہ ہوا تو شاید گیراج سے باہر بھی نہیں آئے تھے۔

حملہ آور وہ دوسرا نامعلوم شخص بھی ہو سکتا تھا جسے محمود نے گیٹ کے اندر روشنی اور سائے کی لکیروں میں کیموفلاج کی طرح اور پھر اگلے لمحے غائب ہوتے دیکھا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ پلوشہ جہاں کا بھائی ہو جو واقعی اسے قتل کرنے آیا ہو۔ پلوشہ جہاں نے محسوس کیا ہو کہ اس کے مستقبل کے لیے خطرات کا باعث بن سکتا ہے۔ اگر شمائلہ کی کار سے اتر کے آنے والا احمد اچانک نہ آ جاتا تو شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتا۔ گھر کے دریچوں کی ہر روشنی بجھ گئی مگر وہ وہیں بیٹھا رہا۔

خدمت

......اینڈ کمپنی

ہنری پر اس کے مالک مکان نے مقدمہ دائر کر دیا۔ کوئی وکیل ہنری کا جاننے والا نہیں تھا چنانچہ اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری سے وکلاء کی ایک فرم کا نام اور ٹیلی فون نمبر نوٹ کر لیا۔ وکلاء کی فرم کا نام "کوارٹ، کوارٹ، کوارٹ اینڈ کوارٹ تھا۔ ہنری نے فون نمبر ڈائل کیا اور رابطہ قائم ہونے پر بولا۔ "کیا مسٹر کوارٹ تشریف رکھتے ہیں؟"

"جی نہیں۔" ایک مرد کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "وہ کسی کام سے باہر گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے' پھر آپ میری بات دوسرے مسٹر کوارٹ سے کرا دیں۔" ہنری نے بے تابی سے کہا۔

"ان کا ہماری فرم سے اب کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ ریٹائر ہو چکے ہیں۔" بھاری آواز والے شخص نے جواب دیا۔

"اچھی بات ہے۔ تب پھر آپ تیسرے مسٹر کوارٹ سے میری سے میری بات کروا دیں۔"

"وہ ایک ہفتے کے کاروباری دورے پر نیویارک گئے ہیں۔"

"بہت خوب، ازراہِ کرم چوتھے مسٹر کوارٹ سے میری بات کروا دیں۔"

"بول رہا ہوں' فرمایئے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

☆

پھر اس کے خیالات کی رو اچانک ٹوٹ گئی۔
اس اندھیرے گھر میں سے چوروں کی طرح نکلا تھا۔ اس کی چال اور قد و قامت کے علاوہ بالو میں انگلیوں سے کنگھی کرنے کی عادت کے باعث محمود نے پہچان لیا تھا کہ وہ نظامی ہے۔ اب وہ اندھیرے میں کھڑا سگریٹ کے کش لے رہا تھا اور بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے ڈائل پر روشن ہندسے تھے۔ محمود چوکس ہو گیا۔ اتنی رات گئے یہ انتظار کس لیے؟ اس نے آہٹ کیے بغیر درختوں کی آڑ لیتے ہوئے اور قدم قدم آگے بڑھتے ہوئے سوچا۔ اس کے سوال کا جواب دس منٹ بعد ہی مل گیا۔ نظامی نائٹ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اندر آنے والے راستے پر ٹہلتا ہوا اس کے سامنے اور گیٹ کے بہت قریب پہنچ چکا تھا کہ باہر سے ایک سایہ نمودار ہوا' یہ پلوشہ تھی۔
''تمہیں پلوشہ نے بلایا تھا۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔ ''تم نے آنے سے انکار کر دیا۔ کیا پاؤں میں مہندی لگا رکھی تھی؟''
''میں نے تمہارے اس بے وقوف بھائی کو بتا دیا تھا کہ میں بیمار ہوں۔'' نظامی نے کہا۔ ''وہ تمہارا پیغام لے کر آیا تھا۔''
''پلوشہ جہاں کا بھائی بے وقوف نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ ''اس نے تمہیں باہر سے آتے دیکھا تھا۔''
''وہ...... وہ تو میں ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔'' نظامی نے چڑ کر کہا۔ ''اور وہ بے وقوف اس لیے ہے کہ گیٹ بند تھا اور وہ اندر کھڑا تھا۔ میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ معلوم نہیں دوسروں کی نظر پڑی یا نہیں۔ تمہیں میرا رقعہ مل گیا تھا؟''
''ہاں...... اب یہ بتاؤ کہ ایسی کون سی ضروری بات تھی جس کے لیے آج اور اسی وقت میرا آنا ضروری تھا۔'' پلوشہ جہاں نے کہا۔
''میں تم سے ایک مجبوری بیان کرنا چاہتا تھا۔'' نظامی نے کہا۔ ''میں اب تم سے مزید تعلق نہیں رکھ سکتا۔''
خاموشی کا مختصر وقفہ آیا پھر پلوشہ جہاں نے کہا۔
''تم بدعہدی کر رہے ہو نظامی!''
''میرا تم سے نکاح تو نہیں ہو گیا تھا۔'' نظامی نے برہمی سے کہا۔
''جب تک میرا تم سے تعلق رہا' میں نے تمہیں منہ مانگا معاوضہ دیا ہے۔ یہ کاروباری تعلق تھا' زندگی بھر کا ٹھیکہ نہیں تھا۔''
''تمہارا لہجہ بھی بہت بدلا ہوا ہے نظامی!'' پلوشہ جہاں نے کہا۔
''جب تم نے مجھے خوبصورت وعدوں کے سبز باغ دکھائے تھے تو تمہارا لہجہ کچھ اور تھا۔ تمہیں یاد ہے' تم نے کیا کہا تھا اور تم کس مقصد کے تحت مجھے یہاں لائے تھے۔ اگر وہ کاروباری معاہدہ تھا تو اس کی تکمیل کہاں ہوئی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ شائلہ رقابت میں پاگل ہو جائے گی اور تمہاری خاطر سب کچھ دے کر بھی اپنا ازدواجی مستقبل بچانے کی کوشش کرے گی اور اس سب کچھ میں اسے آدھا پلوشہ جہاں کا ہو گا جو تمہارے اپنے کہنے کے مطابق دو لاکھ سے کم نہیں ہو گا۔''
''ہاں...... لیکن اب وہ معاہدہ نہیں چل سکتا۔ بہت سی مجبوریاں درمیان میں حائل ہو گئی ہیں۔'' نظامی نے کہا۔
''مجبوری کو بہانہ مت بناؤ' تمہاری نیت میں فتور آ گیا ہے۔'' پلوشہ جہاں نے کہا۔ ''غلطی پلوشہ جہاں کی ہے' اسے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ جو شخص اپنی بیوی کے ساتھ دغا کر سکتا ہے' اس بیوی کے ساتھ جو واقعی اسے چاہتی ہے' کیا وہ ایک طوائف سے کیے گئے معاہدے کا احترام کرے گا۔ تم مجھے شہر سے اس ویرانے میں لے آئے۔ مجھ پر اپنی اجارہ داری رکھی اور میرے بہت سے چاہنے والوں سے میرا تعلق ختم کر دیا اور اب کہتے ہو' جاؤ وہیں لوٹ جاؤ' جہاں سے آئی ہو۔ دو لاکھ کو بھول جاؤ۔ میں نے سوچا تھا کہ دو لاکھ اکٹھے ملیں گے تو میرا بھائی کاروبار کرے گا اور میں باعزت زندگی گزاروں گی۔ کسی شریف آدمی سے شادی کر لوں گی۔ تم نے میرے سارے خواب

توڑ دیے کمینے......دھوکے باز......"
نظامی ہنسا۔ "زبانی وعدوں پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ خصوصاً ایک طوائف کو جس کے اپنے عہدو پیمان صبح وشام بدلتے ہوں۔ سمجھ لو کہ تم نے یہ گھاٹے کا سودا کیا۔ تمہارے جذبات مجروح ہوئے تو مجھے کیا' تم خود بھی تو دوسروں کے جذبات سے ایسے ہی کھیلتی ہو۔"
"اگر یہ کھیل تھا نظامی تو تم کو یہ مہنگا پڑے گا۔ تم پچھتاؤ گے۔" پلوشہ جہاں نے خطرناک لہجے میں کہا۔ "تمہیں اندازہ نہیں پلوشہ جہاں کیا کر سکتی ہے۔ کل تک سوچ لو......اس کے بعد بھی اگر تمہارا فیصلہ یہی رہا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ گھاٹے کا سودا کس نے کیا تھا۔ میں تمہیں تباہ کر دوں گی۔"
"اس سے پہلے میں تجھے قتل کر دوں گا۔ فاحشہ......تو مجھے بلیک میل نہیں کر سکے گی۔" نظامی دانت پیس کر آگے بڑھا۔
پلوشہ جہاں ہنسی۔ "آگے مت بڑھو نظامی! پلوشہ جہاں کبھی رات کے وقت نکلتی ہے تو اپنی زندگی کی حفاظت سے غافل نہیں ہوتی۔ میرا جوان بھائی جانتا ہے کہ پلوشہ جہاں کا دوست کون ہے اور دشمن کون۔ پلوشہ جہاں کبوتر نہیں ہے کہ اس کھیل میں خوامخواہ جان سے جائے۔" وہ پلٹی اور اطمینان سے چلتی ہوئی رات کے اندھیرے میں شامل ہو گئی۔
نظامی غصے اور بے بسی کے عالم میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ محمود ابھی پلوشہ جہاں کے آخری جملے پر غور کر ہی رہا تھا کہ اس نے نظامی کو آہستہ آہستہ آگے قدم بڑھاتے ہوئے دیکھا۔ گیٹ سے باہر نکل کر وہ کچھ دیر تذبذب میں مبتلا رہا اور ادھر ادھر دیکھتا رہا جدھر پلوشہ جہاں گئی تھی پھر کسی نتیجے پر پہنچ کر وہ آگے بڑھا۔ محمود اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور اس کے پیچھے ہو لیا۔
سیدھے راستے پر چلنے کے بجائے وہ اپنی کاٹیج کے گرد گھوم کر نشیب کی جانب ہو لیا تو محمود سمجھ گیا کہ پلوشہ جہاں نے عقل سے کام لے کر جو اپنی جان بچانے کی کوشش کی تھی' وہ ناکام ہو چکی ہے۔ وہ خود چوری چھپے

ہنسیئے......!

قطب مینار

دو افیمی پینک میں تھے۔
قطب مینار کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک کو خیال آیا کہ یہ تاریخی مینار دھوپ میں کھڑے کھڑے خراب ہو گا' اس لیے اس کو سائے میں کر دینا چاہیے۔ دونوں مل کر قطب مینار کو دھکے لگانے لگے۔
دن گزر گیا اور شام ہو گئی تو دونوں مطمئن ہو گئے کہ بالآخر ان کی کوشش کامیاب ہو گئی۔
پلٹ کر دیکھا تو ان کے جوتے غائب تھے۔
ایک افیمی نے کہا "ہماری جوتیاں؟"
دوسرے نے کہا......"بے وقوف وہ دو میل پیچھے دھوپ میں پڑی ہیں جہاں سے ہم نے مینار کو دھکا لگانا شروع کیا تھا۔"

مشورہ

کوک کے ٹن پر لکھا تھا: "اس بات کو غلط ثابت کر دیجیے کہ آپ بے وقوف ہیں" اس کے نیچے جلی حروف میں درج تھا "براہِ کرم ڈبے کو دوسری طرف سے کھولیے یہ پیندا ہے۔"

جدید طریقہ

ایک بے روزگار انجینئر کو سفارش کے بعد محکمہ زراعت میں ملازمت مل گئی۔ چند روز کی تربیت کے بعد اسے گاؤں میں بھیجا گیا کہ کسانوں کو زراعت کے پرانے طریقے ترک کرنے اور جدید زراعت کے اصول اپنانے پر راغب کیا جائے۔ نوجوان نے ایک باغ کے مالک کو جدید طریقوں کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کہ فرسودہ طریقے استعمال کر کے تم اس درخت سے پانچ سیب بھی حاصل کر لو تو مجھے تعجب ہو گا۔
"تعجب تو مجھے ہو گا" کسان نے کہا "کیونکہ وہ درخت ناشپاتی کا ہے۔" ☆

عقبی راستے سے نکل کر آئی تھی اور اس کے بھائی کو شاید اس کی عدم موجودگی کا علم بھی نہیں تھا۔ واپسی کے لیے بھی سڑک چھوڑ کر اس نے گھروں کے پیچھے نشیبی راستے کا انتخاب کیا تھا اور نظامی اس کی چال کو سمجھ گیا تھا۔

اب پلوشہ جہاں کی زندگی خطرے میں تھی، صبح اگر اس کی نعش کھڈ میں پڑی ملتی تو اس حادثے کا الزام نظامی پر کبھی نہیں آتا۔ اس کی بیوی حلفیہ بیان دیتی کہ وہ تمام رات اس کے ساتھ تھا۔ محمود نے قدم تیز کر دیے۔ اسے نظامی کے بھاری قدموں کی اور جھاڑیوں کو پیچھے ہٹا کے آگے بڑھنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاخیں چیخ رہی تھیں اور خشک پتے چور ہو رہے تھے۔ اس کے جوتوں سے گرنے والے پتھر کنکر مسلسل نیچے لڑھکتے جا رہے تھے اور شاخوں سے الجھتی دامن چھڑاتی اونچے نیچے راستوں پر ٹھوکریں کھاتی اور سنبھلتی بھاگ رہی تھی۔ دوبارہ محمود نے اس کی خوفزدہ دبی دبی چیخ سنی۔ نظامی مستقل درندے کی طرح غرانے لگا تھا اور شکار کو قریب پا کر اس کے خون کی پیاس جاگ اٹھی تھی۔ محمود بھی اب اندھا دھند بھاگنے لگا تھا۔ پلوشہ جہاں کو بچانے کے علاوہ اس کے ذہن پر اس ذلیل انسان کو مار مار کر ادھ موا کر دینے کی خواہش بھی غالب تھی جس نے پہلے محبت کرنے والی بیوی کو لوٹنے کے لیے ایک طوائف کا سہارا لیا تھا اور پھر اس طوائف کو بھی دھوکہ دیا تھا۔

رات کے سناٹے میں اچانک ایک فائر کی آواز گونجی اور نظامی کے حلق سے ایک کراہ بلند ہوئی۔ پہلے کوئی بھاری وجود شاخوں سے الجھ کر گرا اور پھر محمود دوڑتے دوڑتے ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گر گیا۔ اس نے زمین پر نزع کے کرب میں مبتلا نظامی کو دیکھا جس کے کنپٹی کے سوراخ سے لہو کا فوارہ ابل رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ نظامی سے کچھ پوچھتا، گھات میں بیٹھے ہوئے چیتے کی طرح کسی نے اس پر جست لگائی۔ محمود نے بڑی پھرتی سے حملہ آور کو اچھال دیا اور کروٹ لیکر کھڑا ہو گیا۔ حملہ آور پھر اس کی طرف لپکا اور رک گیا۔ ''تم۔'' چھوٹے میاں نے حیرت اور خوف سے کہا۔ اپنے سامنے محمود کو موجود پا کے وہ شدید ذہنی صدمے سے دوچار ہوا تھا۔ وہ پلٹ کر بھاگا اور محمود نے اس کے پیچھے تعاقب میں دوڑ لگائی۔ چند قدم کے فاصلے پر محمود نے اسے دبوچ لیا۔

''محمود صاحب...... پلیز میری...... بات سن لیں...... خدا کی قسم میں نے اسے نہیں مارا۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

''پھر کس نے مارا ہے؟'' محمود نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ لی۔ ''تمہارا بھائی کہاں ہے؟''

''مجھے...... مجھے...... مجھے نہیں معلوم...... ہم ایک ساتھ نکلے تھے لیکن ہم نظامی کو قتل کرنا نہیں چاہتے تھے۔'' چھوٹے میاں نے کہا۔ ''ہم تو صرف اس کا تعاقب کر رہے تھے۔''

''کیوں؟'' محمود نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا اور ہتھیار ڈال چکا تھا۔

''اس نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ آج کل میں ہمیں ایک لاکھ دے گا۔'' چھوٹے میاں نے کہا۔ ''اس کی بیوی نے فی الحال اتنی ہی رقم دینے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ نظامی یہ رقم اس فاحشہ پر لٹا دے گا۔ وہ عموماً رات کو اس سے ملنے جاتا ہے۔ آج ہم پہلے سے پلوشہ جہاں کے گھر پہنچ گئے تھے۔ اگر وہ کوئی ایسی ویسی بات کرتا تو ہم سن لیتے مگر وہ زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ آج اس نے پلوشہ جہاں کو ادھر بلوا لیا۔ ہم پلوشہ جہاں کے پیچھے پیچھے آئے تھے اور باہر ہی رک گئے تھے۔''

''اگر تم نے اسے نہیں مارا تو اسے کس نے مارا ہے؟'' محمود نے کہا۔

''میں کیا بتا سکتا ہوں۔'' چھوٹے میاں نے کہا۔ ''تم خود ہی سوچو کہ ہم نظامی کو مار دیتے تو ہمیں اپنی فلم کی تکمیل کے لیے سرمایہ کون فراہم کرتا۔ شمائلہ تو ہمیں آج نکال باہر کرے۔ ہماری ساری امیدیں نظامی سے وابستہ تھیں۔''

چھوٹے میاں صاحب کی بات سو فیصد منطقی تھی

مگر اب محمود کا ذہن ماؤف ہونے لگا تھا۔ وہ شمائلہ کو کیسے بتائے گا کہ نظامی کی نعش اس ویران جنگل میں پڑی ہے اور اس کے سر میں کسی نامعلوم دشمن کی گولی نے سوراخ کر دیا ہے۔ وہ دشمن انہی میں ہے جو دوستی کے اور رشتوں کے نظر فریب نقاب میں چہرے چھپائے اس کے آس پاس موجود ہیں۔ وہ کیسے بتائے گا کہ یہ خون اس کی ذرا سی کوتاہی' معمولی سی غفلت اور تھوڑی سی تاخیر کے باعث ہوا۔ اگر وہ نظامی کو گھر سے نکلتے ہی روک لیتا' اسے دس قدم پہلے پکڑ لیتا تو وہ زندہ رہتا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے گھر کی طرف چلنے لگا۔ میکانکی انداز میں چھوٹے میاں صاحب اس کے پیچھے۔

کسی عورت کی دل دہلانے والی چیخ ان کے کانوں سے اس وقت ٹکرائی جب وہ کاٹیج سے چند قدم دور تھے۔ محمود بے اختیاری طور پر بھاگا۔ تاریک گھر کے دریچے ایک ایک کر کے روشن ہونے لگے اور وہ دلخراش چیخ پھر سنائی دی اور محمود برآمدے میں کھلنے والے دروازے سے اندر داخل ہوا تو اسے مختصر سے کاریڈور میں اپنے سامنے احمد نظر آیا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا اور وہ دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے دیوار سے ٹیک لگائے اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ محمود کو اس کی بزدلی اور کم ہمتی پر تعجب ہوا۔ اندر جا کر اپنی بیوی سے چیخ و پکار کا سبب پوچھنے کے بجائے وہ یہاں دبکا بیٹھا ہے۔ شمائلہ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس میں شائی کے خون کا ذرہ برابر اثر نہیں ہے۔ یہ تو محمود کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ آواز کس کی تھی۔

''احمد۔'' محمود نے چلا کر کہا۔ ''کیا ہوا ہے رابعہ کو؟''

''وہ...... وہ چڑیل...... خونی ڈائن......'' وہ کراہا اور تب محمود نے دیکھا کہ اس کی بغلوں سے خون کا سرخ رنگ جھلک رہا تھا۔ احمد کے دونوں ہاتھوں پر خنجر کے وار کی گہری لکیریں تھیں جن سے خوف بہہ رہا تھا۔ اس خون کو روکنے کے لیے احمد نے اپنے ہاتھ بغلوں میں دبا لیے تھے۔ ''میں اس کو نہیں

مُسکرائیے.....

یاددہانی

نشہ میں دھت ایک شخص لندن کی سڑک پر اس طرح جا رہا تھا کہ اس کا ایک پاؤں فٹ پاتھ پر تھا اور دوسرا سڑک پر۔ ایک کانسٹیبل نے اسے دیکھا تو قریب جا کر اسے فٹ پاتھ پر کر دیا اور تاکید کی کہ اتنی نہیں پینی چاہیے کہ آدمی ہوش کھو بیٹھے۔

راہ گیر نے کانسٹیبل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: ''توجہ دلانے کا شکریہ! ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ میں لنگڑا ہو گیا ہوں۔''

انتظار

سخت دھوپ میں اسکول کے بچے بہت دیر سے ڈرل کر رہے تھے۔ ڈرل ماسٹر نے آخری ڈرل کرانے کے بعد کہا: ''جب میں ''ڈس مس'' کہوں تو تمام لڑکے بھاگ جائیں۔ ابھی ڈرل ماسٹر نے ''ڈس'' ہی کہا تھا کہ ایک کے سوا تمام لڑکے بھاگ گئے۔

ڈرل ماسٹر نے اس اکیلے لڑکے سے پوچھا: ''تم کیوں کھڑے ہو؟''

لڑکے نے معصومیت سے جواب دیا ''سر! میں آپ کی مس کا انتظار کر رہا ہوں۔''

قصوروار

پروفیسر کو کالج جانے کی جلدی تھی۔ عجلت میں کپڑے تبدیل کرتے ہوئے وہ قمیض سے جنگ کر رہے تھے۔ بالآخر تنگ آ کر انہوں نے کہا: ''میرا خیال ہے ہمیں دھوبی بدل دینا چاہیے۔ اس نے قمیض کو اتنا سکیڑ دیا ہے کہ میرے لیے سانس لینا دشوار ہو رہا ہے۔''

''دھوبی کا کوئی قصور نہیں ہے'' بیوی نے توجہ دلاتے ہوئے کہا ''قمیض کی آستین سے سر واپس نکال کر گریبان میں ڈالیے' سانس ٹھیک ہو جائے گا۔''

روک سکا۔"

اس نے بے بسی سے محمود کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ محمود اس کے بیڈ روم کی طرف دوڑا۔ خواب آور گولیاں کھا کے سونے والی شمائلہ بھی اب بیدار ہو چکی تھی اور مسلسل پکار رہی تھی۔ "احمد...... احمد...... یہ کیا ہے۔ نظامی...... نظامی۔"

محمود کمرے میں داخل ہوا اور رک گیا۔ دو دیواروں کے سنگم پر رابعہ کا جسم نیچے پھسلتا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں نے خنجر کے اس دستے کو تھام رکھا تھا جس کا پھل سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست تھا۔ خون اس کے پیٹ کے چاک سے بھی ابل رہا تھا اور اس کے سامنے کھڑی ہوئی پلوشہ جہاں کی خادمہ بڑے سکون سے اسے مرتا دیکھ رہی تھی۔ اس کے بوڑھے ہاتھوں نے پہلے وار میں رابعہ کا پیٹ چاک کیا تھا اور دوسرے وار میں اس کے دل کو نشانہ بنایا تھا۔ رابعہ سے پہلے وہ زندگی ختم ہو چکی تھی جو رابعہ کے وجود میں جنم لینے والی تھی۔ پیدائش سے پہلے لکھ پتی ہو جانے والا بچہ اپنی ماں سے پہلے مر چکا تھا۔

"یہ...... یہ تم نے کیا کیا؟" آواز محمود کے حلق میں پھنس گئی۔

"کچھ نہیں۔" بڑھیا سکون سے بولی۔ "اس نے نظامی کو مارا تھا' میں نے اسے مار دیا۔"

محمود نے رابعہ کو دیکھا جو بڑے مضحکہ خیز طریقے پر گٹھری بنی پڑی تھی اور اس کی آنکھیں کھلی ہوئی محمود پر جمی تھیں۔ وہ آدھی رات کو بھی جیکٹ' ڈینیم کی پتلون اور وہی جوتے پہنے ہوئے تھی۔ اس کے لباس' سر کے بالوں میں اور جوتوں میں خس و خاشاک شاخوں سے ٹوٹے ہوئے تازہ سبز پتے اور سبز گھاس کے خوشے الجھے ہوئے تھے۔ وہ واقعی ابھی ابھی باہر سے آئی تھی۔ وہ بوڑھی عورت شاید غلط نہیں کہہ رہی تھی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا۔" محمود نے کہا۔ "کیا تم نے دیکھا تھا؟"

"میں پلوشہ جہاں کے ساتھ ہی گھر سے نکلی تھی۔" وہ بولی۔ "مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔ میں کام کاج سے فارغ ہو کر گھر جانے کے لیے روانہ ہوئی تھی کہ مجھے اندھیرے میں دو آدمی نظر آئے جو کھڑکی کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک یہ تھا۔" اس نے انگلی سے اشارہ کیا اور محمود نے پلٹ کر دیکھا' وہ چھوٹے میاں کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ "میں بہت دیر تک ان کو دیکھتی رہی۔ پھر پلوشہ جہاں باہر آئی تو یہ اس کے پیچھے چلنے لگے۔ میں پلوشہ جہاں کو آواز دے کر خبردار کرنا چاہتی تھی مگر میں نے سوچا کہ کہیں یہ مجھے بھی ٹھکانے نہ لگا دیں۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی۔ جب تک میں اپنے بیٹے کے قاتل سے انتقام کی آرزو پوری نہ ہوتی میں مر بھی نہیں سکتی تھی۔ اب میں مطمئن ہوں' میں نے انتقام لے لیا۔ نظامی کے قتل سے مجھے کیا' میں نے تو اس کو اپنے بیٹے کے قتل پر سزائے موت دی ہے۔ اس نے میرے جوان بیٹے کو مارا تھا۔ ایک نہ ایک دن مجھے یہ قرض اتارنا ہی تھا۔ آج میں نے پلوشہ جہاں کے ساتھ واپس آتے ہوئے اسے دیکھ لیا مگر پلوشہ جہاں کو معلوم نہ تھا کہ میں اس کے ساتھ ہوں۔ میں تھوڑے فاصلے سے اور ذرا ہٹ کر چل رہی تھی۔ میں نے اسے نہ دیکھا ہوتا تو پلوشہ جہاں گھر چلی جاتی اور میں نیچے چلی جاتی اپنے گھر کی طرف مگر مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی۔

اچانک نظامی ایک درخت کے پیچھے سے نکلا اور اس لڑکی نے گولی چلا دی پھر یہ بھاگی اور میں اطمینان سے اس کے پیچھے چلی آئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس گھر کے کتنے لوگ باہر ہیں۔ صرف اس لڑکی کا شوہر میرا راستہ روک سکتا تھا مگر وہ مجھے نہ روک سکا۔"

محمود کو پورے اعتراف جرم کے دوران ایک لفظ پر بھی شبہ نہیں ہوا تھا۔ رابعہ نے وہ گولی اس ریوالور سے چلائی ہوگی جو شمائلہ کے تکیے کے نیچے موجود تھا۔ یہ بات شمائلہ کو معلوم تھی۔ شمائلہ کے سو جانے کے بعد اس کے لیے ریوالور کا حصول مشکل نہ

تھا۔

''اب تم پولیس کو بلا لو' میں نے ایک قاتل کو مار دیا ہے۔'' بڑھیا قہقہہ مار رہی۔ اس کی یہ دیوانی ہنسی مرگھٹ میں قید ہونے والی چڑیل جیسی تھی۔ آسیب زدہ اور بھیانک۔ ''قاتل تو میں بھی ہوں نا۔ پکڑو مجھے' میں پھانسی سے نہیں ڈرتی' میں موت سے نہیں ڈرتی' میں کسی سے نہیں ڈرتی کیونکہ میں نے قتل نہیں کیا' انصاف کیا ہے۔ دنیا نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا تھا۔''

وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگی پھر اچانک نیچے بیٹھ کر اس نے رابعہ کے بہتے ہوئے خون میں ہاتھ بھر کے منہ پر مل لیے۔ ''ہاہاہا......'' وہ چیخیں مار مار کر ہنسنے لگی۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ میں اپنے بیٹے کے خون کا بدلہ ضرور لوں گی۔'' وہ پھر چلانے لگی۔ ''اس نے میرا گھر اجاڑا تھا' میں بہت خوش ہوں' بہت خوش۔''

وہ پاگل ہو چکی تھی۔ محمود نے دیکھا کہ دروازے میں منجمد چھوٹے میاں کے ساتھ اس کا بڑا بھائی بھی کھڑا تھا۔ ان کے ساتھ وہ فلمی ہیروئن بھی کھڑی تھی اور ان سب کے پیچھے احمد اپنے ہاتھوں سے ٹپکنے والے خون سے بے نیاز کھڑا ہے مگر ان میں سے کسی کی نگاہ شمائلہ پر نہیں تھی' جوان کے قدموں میں بے ہوش پڑی تھی۔

مری کی رونق اور گہما گہمی پر موسم سرما کی ویرانی اور بے سروسامانی غالب آ چکی تھی۔ بازار یوں سنسان پڑے تھے جیسے کبھی آباد ہی نہ تھے اور ان کے مقفل دروازوں کے سامنے کتے لوٹ رہے تھے۔ کافی ہاؤس اور فیشن ایبل خواتین کے شاپنگ سینٹر بیوٹی پارلر' سنیما اور پرہجوم ہوٹل سب آئندہ موسم گرما میں ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے بند تھے جو اگلی بہار تک زندگی کی مسرتوں' نعمتوں اور آسائشوں سے بہرہ ور ہونے کے لیے زندہ رہیں گے۔

تنہا درخت اور سرسبز وادیوں میں اکیلے رہ جانے والے پھول خزاں کے انتظار میں تھے اور صرف ایک ماہ قبل حسن و نکہت و نور کی جلوہ گری پر اب

مُسکرائیے.....

آمدنی

لندن میں ایک پلمبر نے اپنے بریف کیس میں سے چند اوزار نکال کر ذرا سی دیر میں نل درست کیا اور وکیل صاحب کو اپنا بل تھما دیا۔

بل دیکھ کر وکیل صاحب چراغ پا ہو گئے۔

''دوسو ڈالر فی گھنٹہ...... میں تو دن بھر میں بھی اتنی رقم نہیں کما پاتا۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' پلمبر نے پورے خلوص سے تائید کی۔ ''وکالت میں میرا بھی یہی حال تھا' اب خدا کا شکر ہے۔''

کاہلی

ایک کاہل پیڈی نوجوان سے اس کے دوست نے کہا۔

''سنو! سردار کی خوبصورت بیٹی شادی کرنا چاہتی ہے۔ اگر تم گھر جا کر نہا لو اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر سردار کی بیٹی سے مل لو تو مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری بیوی بننا قبول کر لے گی۔''

نوجوان جماہی لے کر بولا: ''ہو سکتا ہے...... لیکن فرض کرو' میں جا کر نہا لوں اور میں نے صاف ستھرے کپڑے بھی پہن لیے اور سردار کی بیٹی نے پھر بھی مجھ سے شادی نہ کی تو......؟''

تحفہ

پہلا دوست: ''میں نے اس بار بیوی کی سالگرہ پر اسے ایک ہیروں کا سیٹ دیا ہے۔''

دوسرا دوست: ''اس سے بہتر تھا کہ کوئی سستی سی گاڑی لا دیتے۔''

پہلا دوست: ''تو کیا نقلی گاڑیاں بھی ملتی ہیں؟''

☆

کسی آسیب زدہ شہر کا گمان ہوتا تھا جس کے مکین کسی بلائے آسمانی سے مرگ ناگہاں کا شکار ہو گئے ہوں۔

اپنے آبائی شہر کی طرف روانہ ہونے والی واحد بس میں، میں بیٹھا ہوا تھا۔ محمود سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اس سال مری نہ آتا یا شمائلہ سے نہ ملتا اور اگر یہ بھی ناگزیر تھا تو اس سے ہمیشہ کی طرح دامن بچا کے نکل جاتا تو اگلے سال مری آ کے کتنا خوش ہوتا لیکن کیا آئندہ سال جب وہ مری آئے گا تو کیا یادوں کے آسیب اس کا پیچھا نہیں کریں گے۔ مری کے قبرستان میں دو کچی قبروں پر کتنی برف پڑ چکی ہوگی اور آنے والے موسم کے کتنے خزاں رسیدہ پتے ڈھیر ہو چکے ہوں گے، وقت کی راہگزر پر ایک سال پیچھے رہ جانے والوں کا ہمسفر کون ہوگا۔ سوائے ان کی اپنی تنہائی کے۔

اس کاٹج میں جہاں پلوشہ جہاں تھی، کوئی اور دلربا خاتون ہوگی اور اس کی چاہت کا نذرانہ ہوگا۔ دس یا بیس یا پچاس ہزار سکہ رائج الوقت اس کے حسن و شباب کی غارت گری کے تناسب سے متاع حسن خریدار کے مطابق اس چوکیدار کی قبر پر کون جائے گا جو کسی کا رقیب نہ تھا مگر رقابت میں گیا۔ صرف اس لیے کہ وہ رابعہ کے الفاظ میں بے حد صحت مند، اسمارٹ اور ہینڈسم مرد تھا۔

اور اسی شہر کی ایک پڑھی لکھی نفسیات میں ایم اے کرنے والی خطرناک حد تک عیار عورت اس پر مرمٹی تھی۔

رابعہ نے اس کے بارے میں جو کچھ محمود کو بتایا تھا، جھوٹ تھا، وہ جھوٹ جو سچ نظر آتا تھا۔ اس چوکیدار کے مقابلے میں احمد کی مردانہ شخصیت دب کر رہ گئی تھی۔ چنانچہ رابعہ نے ایک ٹکٹ میں دو مزے لینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے چاہا تھا کہ وہ دولت مند احمد کی بیوی رہے اور اس کی ماں کی طرف سے ملنے والی تمام دولت کا وارث بنا دے اور اپنی حیوانی خواہشات کی تسکین کے لیے ایک بے حد صحت مند، اسمارٹ اور ہینڈسم خریدے لیکن وہ مرد برائے فروخت نہیں تھا۔ وہ نمک حرام، بے غیرت اور بے ضمیر نہیں تھا۔ اس نے رابعہ سے کہا۔

''رابعہ بی بی...... آپ اس گھر کی عزت ہو، جہاں میں پل کر بڑا ہوا ہوں اور میں اس کی عزت کا رکھوالا ہوں۔ اگر کوئی اور بھی اس کی عزت کو تماشہ بنانے کی کوشش کرے تو خدا کی قسم میں اس کو عبرتناک تماشہ بنا دوں گا۔''

لیکن تماشائے عبرت وہ خود بنا جس کی زخم زخم لاش خاردار تاروں کی باڑھ پر جھولتی ملی تھی۔ احساس ذلت اور شکست کے صدمے نے رابعہ کو اپنی نظروں میں رسوا کر دیا تھا۔ اس جیسی تعلیم یافتہ مہذب اور شہری لڑکی کو ایک دیہاتی نے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ اس عورت کی انا کے غرور کا آئینہ پاش پاش کر دیا تھا اور معمولی ملازم ہونے کے باوجود مالکوں کو بے توقیر کر دیا تھا۔

آتش غضب نے اسے دیوانہ کر دیا تھا۔ اس دیہاتی سے جو وفاداری اور شرافت اور جاں نثاری کے پرانے اصولوں پر کاربند تھا، یہ خطرہ تو نہیں تھا کہ وہ رابعہ کو بلیک میل کرے یا اس بات کی تشہیر سے رسوائی کا سبب بنے مگر رابعہ کے لیے اس کا وجود ہی باعث ندامت تھا۔ وہ اس کے سامنے نظر اٹھا کے نہیں چل سکتی تھی اور احساس جرم و گناہ میں مبتلا رہتی تھی۔ اس نے اپنے عیار ذہن کی مدد سے عذاب ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ بہت سوچ سمجھ کر اس نے ایک ایسا منصوبہ بنایا جو ایک تیر سے دو شکار کرنے کے مترادف تھا۔ وہ ماہر نفسیات نہیں تھی مگر نفسیات کو سمجھتی تھی۔ اس نے مبہم اشاروں میں چھوٹے میاں پر واضح کیا کہ اس کی محبوبہ دلنواز، پنجابی ہیروئن نے ایک نیا ہیرو منتخب کر لیا ہے۔ اس نے ایسے مواقع بھی پیدا کیے کہ چھوٹے میاں کے شکوک کو تقویت ملی۔ مثلاً ایک بار اس نے لالٹین چھپا کر بجلی کا فیوز اڑا دیا۔ بڑے میاں صاحب، نظامی اور شمائلہ کے ساتھ احمد بھی شاپنگ کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ رابعہ نے چوکیدار سے کہا کہ وہ اپنے کوارٹر سے لالٹین لے آئے۔ اس کے

جانے کے بعد رابعہ نے میاں صاحب کی محبوبہ سے کہا کہ "گیراج میں لالٹین رکھی ہے' اٹھالاؤ۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔" ان دونوں کے جانے کے بعد رابعہ نے لالٹین جلائی اور میاں صاحب کو دکھایا کہ ہیرو اور ہیروئن کدھر سے آ رہے ہیں۔ اس پنجابی فلموں کی ہیروئن نے بعد میں محمود کو بتایا کہ رابعہ کی سازش کو وہ سمجھ نہیں سکے تھے۔ واپسی پر وہ لالٹین رابعہ کے ہاتھ میں دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ چوکیدار نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا تھا مگر میاں صاحب نے اپنی محبوبہ سے سوال کیا تھا کہ وہ کہاں گئی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ وہ گیراج سے لالٹین لینے گئی تھی' تو میاں صاحب نے اس کی بات پر اعتبار نہیں کیا تھا۔

پھر رابعہ نے ایک اور چال چلی۔ اس نے چھوٹے میاں صاحب کی محبوبہ کے کپڑوں کا ایک جوڑا' ایک سینڈل' اس کی کنگھی میں اٹکے ہوئے بال اور اس کی استعمال کی مخصوص خوشبو کے چند قطرے چوکیدار کے کوارٹر میں اس کے بستر پر چھڑک کے اور خاموشی سے لوٹ آئی۔ اس عورت کو شاید پتہ بھی نہ چلا کہ کپڑوں میں ایک جوڑا کم ہے یا ایک سینڈل موجود نہیں ہے پھر اس نے چھوٹے میاں صاحب کو مطلع کیا کہ ہیرو اور ہیروئن کی ملاقات کب ہوگی اور چونکہ وہ ہیروئن کی رازدار سہیلی ہے' اس لیے اسے معلوم ہے۔ رات کے وقت اس نے دیکھا کہ وہ فلمی ہیروئن باغ میں ٹہل رہی ہے اور چھوٹے میاں صاحب باتھ روم میں ہیں۔ اس نے باتھ روم کے دروازے پر جا کر کہا۔ "ملک صاحب جا کے دیکھ لو۔"

پھر وہ باہر آنے سے پہلے عقبی راستے سے نکل گئی اور چوکیدار کے ایک کمرے والے کوارٹر کے پیچھے جا چھپی۔ وہ جانتی تھی کہ میاں صاحب کو باہر آنے میں چند منٹ ضرور لگیں گے اور وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھا چوکیدار کے کوارٹر میں جائے گا۔ حسب توقع پانچ سات منٹ بعد میاں صاحب ایک دھماکے سے چوکیدار کے کوارٹر میں کودا۔

رابعہ نے پچھلی طرف والی کھڑکی کو دھکا دیا اور بھاگی۔ چوکیدار اسی وقت واپس پہنچا تھا اور کپڑے بدل رہا تھا۔ اس نے ابھی بستر پر اپنے کسی جرم کے ثبوت پر غور ہی نہیں کیا تھا' وہ میاں صاحب کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا مگر میاں جی نے اس کی گردن دبوچ لی۔ چوکیدار کی وضاحت بے سود ثابت ہوئی۔ میاں جی نے کھڑکی کے پٹوں کی آواز سن لی تھی اور سمجھ گیا تھا کہ اس کی بے وفا محبوبہ فرار ہوگئی۔ کمرے میں اس کے کپڑے موجود تھے اور اس کی موجودگی کی گواہ خوشبو تھی۔ چھوٹے میاں جی نے خنجر نکال لیا تو چوکیدار بھاگا مگر میاں جی نے اسے باہر ہی جالیا اور پے در پے وار کر کے اسے ہلاک کر دیا۔ اتنی دیر میں رابعہ وہاں پہنچ چکی تھی اور لان میں ٹہلنے والی ہیروئن بھی اندر آ گئی تھی جسے کچھ علم ہی نہ تھا کہ اس کے نام پر کیسا خونی ڈرامہ کھیلا گیا ہے۔ چھوٹے میاں نے واپس آ کے اسے پکڑ لیا مگر بڑے میاں صاحب کی موجودگی کے باعث وہ بچ گئی۔ تاہم اس کی بے گناہی کا کسی نے یقین نہیں کیا۔ چھوٹے میاں صاحب قسم کھانے کو تیار تھے کہ وہ چوکیدار کے کوارٹر میں موجود تھی مگر ان کے اندر کودتے ہی وہ جوتے کپڑے چھوڑ کر کھڑکی کے راستے فرار ہوگئی۔

اور گھر میں آتے ہی اس نے لباس تبدیل کر لیا۔ رات کے اندھیرے میں کسی نے اس کو عقبی راستے سے آتے جاتے نہیں دیکھا اور جیسے ہی وہ چوکیدار کے کوارٹر کی کھڑکی سے فرار ہوئی تھی' ایسے ہی اپنے کمرے کی کھڑکی کے راستے اندر پہنچ گئی۔ اس کے بعد پیش آنے والے واقعات وہی تھے جو رابعہ نے بیان کیے تھے۔ یعنی دونوں بھائیوں نے حالات کو سنبھال لیا اور جرم کے داغ مٹا دیے۔ رہی سہی کسر بارش نے پوری کر دی تھی اور تفتیش ختم کرا دی گئی تھی۔

یہ سب باتیں چھوٹے میاں صاحب اور ان کی محبوبہ نے اپنے اپنے بیانات میں بتائی تھیں۔ چھوٹے اور بڑے میاں صاحبان دونوں جیل میں تھے۔ نادانستگی میں سہی' قتل تو انہوں نے کیا ہی تھا اور چھپایا بھی تھا۔ تاہم رابعہ کے منصوبے کا دوسرا حصہ

ناکام رہا۔ اس کا خیال ہوگا کہ چوکیدار کو قتل کرنے کے بعد چھوٹے میاں صاحب اس عورت کو بھی بے وفائی کی سزا دیں گے اور اگر پھانسی نہیں پائیں گے تو جیل تو بہرحال جائیں گے۔ شمائلہ کی دولت پر منڈلانے والے گدھ اڑ جائیں گے اور چوکیدار ایک معزز عورت کی تذلیل کی وہ سزا پائے گا جس کا وہ مستحق تھا مگر دونوں میاں صاحبان زیادہ دوراندیش ثابت ہوئے اور قتل کا الزام ان پر نہیں آیا۔ تاہم جس بے تکلفی سے رابعہ نے محمود کو بتایا تھا کہ چوکیدار کا قاتل کون ہے، اسی بے تکلفی سے اور رازداری سے اس نے شمائلہ کو بھی خبردار کر دیا تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے تاکہ وہ مزید بدظن ہو جائے۔ شمائلہ نے نظامی سے بات کی تھی مگر نظامی بگڑ گیا تھا کہ وہ اس کے دوستوں کو گھر سے نکالنے کا بہانہ چاہتی ہے اور ایک مکار لڑکی کی باتوں پر یقین کر رہی ہے۔ غالباً نظامی نے رابعہ کی فطرت کو بہتر طور پر سمجھ لیا تھا۔ یہ سب شمائلہ نے اپنے بیان میں کہا تھا۔

رابعہ نے یہ کوشش بھی کی تھی کہ شمائلہ کے نفسیاتی خوف سے فائدہ اٹھائے اسے معلوم ہو گیا تھا کہ شمائلہ جانوروں سے ڈرتی ہے اور اس کا سبب کیا ہے۔ یہ نفسیات کی اصطلاح میں فوبیا تھا۔ اس نے شمائلہ کو دہشت زدہ کر کے دیوانگی کی سرحد تک پہنچا دیا تھا اور اگر وہ زندہ رہتی تو شمائلہ کو یقیناً پاگل کر دیتی۔ اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ پاگل آدمی کا کیا ہے۔ خوف اور دہشت میں پہاڑ سے کود جائے۔ اسے یہ بھی امید تھی کہ پاگل ہونے سے پہلے شمائلہ یقیناً نظامی کو چھوڑ دے گی، جس کے تعلقات پلوشہ جہاں سے بڑھتے جا رہے تھے اور جسے اپنی بیوی کی قطعی پروانہ تھی۔ اگر یہ دونوں مرحلے طے ہو جائے تو شمائلہ کی تمام دولت کا وارث احمد رہ جاتا۔ نظامی اور اس کے حواری جو اس دولت میں حصہ بٹانا چاہتے تھے۔ دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیے جاتے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی مگر جان دینے کے بعد اب احمد بلاشرکت غیرے تمام دولت کا مالک تھا۔

مگر خود سے ویرانے میں دو گز زمین کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ بعد میں اس کے بیڈ کے نیچے سے ایک ایئر گن ملی تھی۔

رابعہ جیسی تعلیم یافتہ لڑکی کے عیار اور شاطر ذہن کو شکست دینے والی ایک بوڑھی، کمزور، کم عقل اور جاہل عورت تھی جسے رابعہ نے کبھی درخور اعتنا نہ سمجھا تھا اور اس طرح نظرانداز کیا تھا جیسے اس کا وجود ہی نہیں مگر اس عورت نے اپنے بیٹے سے کہا تھا۔

''بیٹا تو میرے لیے قابل فخر ہے کہ نمک حرام اور بے غیرت یا بے ضمیر نہیں مگر وہ عورت ناگن ہے، وہ تجھے ڈس لے گی، اس سے ہوشیار رہنا۔'' جب دوسری بار بیٹے نے اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ رابعہ واقعی اس کے خلاف سازش کر رہی ہے۔

''معلوم ہے آج کیا ہوا ماں!'' اس نے کہا تھا۔ ''بجلی چلی گئی تو رابعہ نے مجھ سے کہا کہ کوارٹر سے لالٹین لے آؤ پھر اس نے دوسری عورت سے کہا کہ گیراج میں سے لالٹین اٹھا لاؤ۔ جب اسے معلوم تھا کہ لالٹین گیراج میں ہے تو اس نے مجھے کوارٹر میں کیوں بھیجا اور کمال یہ ہے کہ لالٹین گیراج میں بھی نہیں تھی۔ جب ہم واپس آئے تو وہ لالٹین جلائے کھڑی تھی۔''

''ہم کون؟'' اس کی بوڑھی ماں نے کہا تھا۔

''وہ عورت اور میں اور اس کا ایک چاہنے والا ہے۔ چھوٹے میاں جی! وہ نجانے کیا سمجھ رہا تھا۔'' بیٹے نے کہا تھا۔

''بیٹا۔'' ماں نے چلا کر کہا تھا۔ اس زخم خوردہ ناگن سے بچ، وہ تجھے مار دے گی یا مروا دے گی۔''

چنانچہ جب اس کا بیٹا قتل ہوا تھا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ اس قتل کی ذمہ دار کون ہے۔ یہ سب اس نے اپنے بیان میں بتا دیا تھا۔ اب وہ بھی جیل خانے میں تھی مگر اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا اور اس پر خطرناک قسم کے دورے پڑتے تھے۔ محمود کو یقین تھا کہ مقدمے کا فیصلہ ہونے سے پہلے وہ مر جائے گی۔

......☆......